اللہ اور رسول ﷺ کے شہید

ناموس رسالت ﷺ کے سات شہید رحمۃ اللہ علیہ

- غازی علم الدین شہیدؒ
- غازی عبدالرشید شہیدؒ
- غازی عبدالقیوم شہیدؒ
- غازی محمد صدیق شہیدؒ
- غازی مرید حسین شہیدؒ
- غازی میاں محمد شہیدؒ
- غازی محمد عبداللہ شہیدؒ

رائے محمد کمال

اللہ جل جلالہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید رحمۃ اللہ علیہ

ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے سات شہید رحمۃ اللہ علیہ

- غازی علم الدین شہیدؒ
- غازی عبدالرشید شہیدؒ
- غازی عبدالقیوم شہیدؒ
- غازی محمد صدیق شہیدؒ
- غازی مرید حسین شہیدؒ
- غازی میاں محمد شہیدؒ
- غازی محمد عبداللہ شہیدؒ

رائے محمدؐ کمال

جہانگیر بک ڈپو

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی

ناشر: جہانگیر بک ڈپو

طابع: نیاز جہانگیر پرنٹرز، اردو بازار، لاہور

اشاعت: 2006

قیمت: -/250 روپے

تقسیم کنندہ: آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔ فون: 021-2765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔ فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔ فون: 041-2627568
سیلز ڈپو حیدر آباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ۔ فون: 0300-3012131



جہانگیر بک ڈپو

Web Site:http://www.jbdpress.com E-mail:info@jbdpress.com

”آخری الفاظ“

جو موت کے آئینے میں
رُخِ آقا ﷺ کا عکس دیکھ کر
امیؒ حضور کے ہونٹوں پر
مچل گئے تھے

فہرست

گلدستہ

- روحِ ایمان
- مسلمانانِ ہند اور آریہ سماجی تحریک
- غازی عبدالرشید شہیدؒ
- غازی علم الدین شہیدؒ
- غازی عبدالقیوم شہیدؒ
- غازی محمد صدیق شہیدؒ
- غازی مرید حسین شہیدؒ
- غازی میاں محمد شہیدؒ
- غازی محمد عبداللہ شہیدؒ
- شمع رسالت کے دو گمنام پروانے
- چند بھولی بسری یادیں
- انکشافات
- دو قومی نظریے کا پس منظر

تعارف

ماضی قریب میں برصغیر پاک و ہند کے خطے پر کئی شاتمانِ رسول اور گستاخانِ نبی جنم لیتے اور شاہین صفت محبانِ مصطفٰے، ان مردودانِ ازلی پر جھپٹتے رہے۔ ہر نازک موڑ پر کوئی نہ کوئی شہبازِ عشقِ رسول، قسمت آزمائی کے لیے اپنے اپنے کوچہ کی منڈیر سے پرفشاں ہو کر اُٹھتا، اُڑتا، جھپٹتا، مردود رسالت پناہ کا شکار کرتا ہوا لوٹتا، دربار دریتیمؐ کی چوکھٹ چومتا، حیات جاودانہ کی عملی تفسیر بنتا اور شاخِ طوبیٰ پر جا بیٹھتا، انہی نوجوانانِ غیور و جسور کو ''شہیدانِ ناموسِ رسالت'' کہتے ہیں۔

شہیدانِ ناموسِ رسالت

(ضربِ کلیم میں ''لاہور و کراچی'' کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم موجود ہے۔ غازی علم الدین شہیدؒ کی رعایت سے لاہور اور غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی نسبت سے کراچی۔ دراصل یہ جملہ شہیدانِ ناموسِ رسالت کے حضور، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا ایک زندہ جاوید خراجِ عقیدت ہے، جس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاملات میں درویشِ لاہوری کا اندازِ فکر کیا تھا)

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیّور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنیٰ کا سفر!

ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر!

آہ ! اے مردِ مسلماں، تجھے کیا یاد نہیں؟
حرفِ لَا تَدعُ مَعَ اللّٰہ اِلٰھاً آخَرا!



مسلماں اور ایماں!

(شہیدانِ ناموسِ رسالتؐ کے جذبۂ قربانی کی قدر و قیمت اور عشقِ رسولؐ کی اہمیت وافادیت کے تناظر میں مولانا ظفر علی خاں کے مندرجہ ذیل دو شعر زبان زدِ عام و خاص ہیں اور عموماً بطور حوالہ استعمال ہوا کرتے ہیں۔)

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا اور زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اِس کے مسلماں ہو نہیں سکتا

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ یثرب کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

(نوٹ: اہل دل یثرب کے بجائے ''بطحا'' پسند فرماتے ہیں)

مرحلہ تشکیل

ا

ایک نوعمر لڑکا، ۲۴ جنوری ۱۹۸۲ء کو کچھ عرصہ کے لیے باقاعدہ طور پر لاہور میں آ گیا تھا۔ اسے غازی علم الدین شہیدؒ سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ فروری کی ایک صبح وہ دربار روڈ سے اُردو بازار میں داخل ہوا اور پروانہ شمع رسالتؐ سے متعلق کسی کتاب کے بارے میں پوچھا اور پھر سب سے پوچھتا ہی چلا گیا۔ مارکیٹ میں ان پر کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ بالآخر اسے ایک مختصر کتابچے کے بارے میں معلوم ہوا کہ اسے ''مکتبہ میری لائبریری'' کے بشیر احمد چودھری نے شائع کیا ہے۔

''مکتبہ میری لائبریری''، مسلم مسجد کے ہمسائے بلکہ سائے میں آباد تھا اور اس کے مالک و ڈائریکٹر، حنیف رامے صاحب کے بڑے بھائی بشیر احمد چودھری ہوا کرتے تھے۔ ''مکتبہ میری لائبریری''، ہر قسم کی کتابوں کا مرکز تھا۔ اشاعت و فروخت کا مرکز! چھوٹے سائز میں ۹۳ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ، میاں محمد ابوالفتح ایڈووکیٹ کے نام سے شائع کیا گیا۔ موصوف غالباً ''ایوانِ عدل'' یا ضلع کچہری میں پریکٹس کرتے تھے۔ اس دیہاتی، متجسس اور معصوم لڑکے کے لیے اس کتاب میں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ غیر متعلقہ تمہید، غیر ضروری تفصیلات اور غیر اہم واقعات! مقدمے کی غیر مصدقہ روداد، اس پر مستزاد! بس! پھر کیا تھا، اس لڑکے کی پیاس کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

۱۵ اپریل ۱۹۸۲ء کی ایک اور صبح وہ اپنے ایک قریبی اور نسبتاً ہوشیار و سمجھ دار دوست کے ہمراہ غازی علم الدین شہیدؒ کے ورثا و رفقا کی تلاش میں بھاٹی گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ اس کی سنی سنائی معلومات کے مطابق، محافظ ناموسِ رسالتؐ کا تعلق بھاٹی گیٹ ہی سے تھا۔ پوچھتے پوچھتے اور چلتے چلتے، وہ تقریباً دوپہر کے وقت شاہ عالمی کے عقب میں سریانوالہ بازار جا پہنچے، جو، اب غازی علم الدین شہیدؒ کی نسبت سے ''کوچۂ سرفروشاں'' کہلاتا ہے۔



کوچۂ سرفروشاں میں اس کا آنا جانا، شہید ناموسِ رسالتؐ کی سوانح عمری کی تشکیل و تکمیل کا

سبب ٹھہر گیا۔ پاکستان و ہندوستان میں اپنے موضوع پر پہلی باقاعدہ سوانح حیات ''غازی علم الدین شہیدؒ.....آغوش مادر سے حلقۂ تراب تک'' اس باب کا آغاز اور راز تھا۔ وہ تحقیق کی راہ پر نکلا تو اسے یہ بھی پتہ چلا کہ میاں ابوالفتح ایڈووکیٹ کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آنے والی اس مختصر کتاب کا مولف و مرتب بھی دراصل کوئی اور ہے۔ پیر غلام دستگیر نامی مرحوم نے غازی علم الدین شہیدؒ کی قربانی کے فوراً بعد ان کی ایمان پرور کہانی کو ایک قلیل تعداد میں چھاپ کر مفت تقسیم فرما دیا تھا کہ آنے والے وقت میں رہنما ہو۔ ۱۹۷۲ء میں یہی نسخہ، میاں ابوالفتح ایڈووکیٹ کی تصنیف کے طور پر شائع ہوا۔

غازی علم الدین شہیدؒ کے زیور طبع سے آراستہ ہوتے ہی چپکے چپکے چہار سو خوشبو پھیلتی چلی گئی۔ جسے دیکھا وہ پروانہ شمع رسالتؐ کا دیوانہ نظر آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ کتاب لکھی نہیں لکھوائی گئی تھی۔ بھلا کچی عمر کے ایک لڑکے کے قلم میں بلا کی سنجیدگی، متانت اور مقصدیت کیونکر اور کیسے ممکن تھی۔ بس ایک جنون تھا، جو تحریر کا قانون بن گیا۔ اس کے دامن خیال میں خلوص اور جوشِ ارادت کے سوا کوئی کمال تھا ہی نہیں۔ تب اس نے کربِ تخلیق (مقدّمہ) کے عنوان سے اپنے جذبات و احساسات کو بیان کیا اور لکھا تھا:

> ''... میری تنہائیوں کا راز اور سچے جذبوں کا ماحصل ہے۔ یہ راز صرف ان لوگوں پر کھلتا ہے جو جگر کاوی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ دن کے وقت ان کی آنکھیں بنجر بنجر دکھائی دیتی ہیں مگر رات کے سائے میں یہاں رتجگوں کی فصل لہلہا اُٹھتی ہے۔
>
> میں نے گرد و غبار کے کفن میں اٹے ہوئے جاں بلب اوراق کو خونِ جگر دے کر زندگی کی دھڑکنوں سے آشنا کیا۔ ان خوابیدہ لمحات کو صدائے قلم کے ساتھ بڑی مشکل سے جگایا۔ گردش حالات اور مرور ایام میں دربدر بھٹکنے والے حقائق کو کوچہ بہ کوچہ شہر بہ شہر ڈھونڈا۔ یہ کوئی ایک دو سال کی بات نہیں اور نہ پانچ دس برس کا قصہ، بلکہ ان گمشدہ کڑیوں کو نصف صدی سے بھی زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اب پہلے تو ایسے شخص کم ہی موجود ہیں جو حافظے کی قبروں کو کرید سکیں۔ اگر ہیں بھی تو وہ اس سے متعلق کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اپنے پاس کوئی دستاویزی ثبوت رکھتے ہیں۔

کربِ تخلیق اور رتجگوں میں ایک غیر مرئی لذّت و کیفیت ہے، جس کا اثر محسوس تو کیا جاسکتا ہے بیان نہیں۔ کربِ تخلیق کا حاصل اوراق کی تکمیل ہے اور اس کے لیے روحِ فکر خونِ دِل کے قطروں میں منتقل کر کے براہِ نوکِ قلم سینہ قرطاس کی نذر کرنا پڑتی ہے۔ مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ میرے اندازِ نگارش نے فن کی بالائی حدوں کو چھوا لیکن ایک فخر ضرور ہے کہ میں نے لفظوں کا کھیل اس اُمید پر رچایا ہے، شاید کہ روح کی گہرائیوں میں ہل چل مچ جائے۔

کسی بھی تذکرہ نگار کی یہ ایک غیر معمولی خوبی ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کے تاریک کلیسا میں گھنٹیاں بجانے والوں کا چہرہ کردار اپنے الفاظ کے چراغوں کی روشنی میں دکھا سکے۔ ویسے یہ مرحلہ خاصا کرب انگیز ہے۔ تاریخ کے آئینے پر گردشِ ایام کی دھندلاہٹ ایک مدت سے گھونسلا بنائے بیٹھی ہے اور وقت کا تقاضا ہے کہ بڑی احتیاط سے یہ دھول اتار دی جائے۔ مجھے تو اس صحرا کی خاک بہرحال چھاننا ہے۔ اگر آپ بھی دو چار قدم تکلیف گوارا کر لیں تو سفر اچھا رہے گا۔ المختصر یہ کہ احساس کے انگاروں کی راکھ شبانہ روز، روح کے رستے ہوئے زخموں پر چھڑکی، تب کہیں مالا کے برسوں سے بکھرے موتی یکجا ہو سکے۔

میں نے حتیٰ الوسع تاریخ کی کڑیوں کو مربوط رکھا ہے اور عام قارئین کی دلچسپی کا لحاظ بھی۔ آپ شاید میری ان داخلی و خارجی کیفیات سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ تاریخ کے اوراق کے حوالے سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ اس صدی کے ربع اوّل میں حالات کے ماتھے پر بڑی واضح شکن نمودار ہوئی۔ ان نازک مرحلوں کی وہ حسرت بھری داستان، جب پورے برصغیر پاک و ہند میں رسول عربی ﷺ کا تقدس لہولہو تھا۔ بے بس و بے کس مسلمان بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ تکا کرتے تھے۔ یہ انہی دنوں میں جہاد کی روداد ہے۔

یہ ایک تاریخی نسخہ ہے، جو میں اربابِ نقد و نظر کے حضور پیش کرنا چاہتا

ہوں، مگر ابھی کام تمام نہیں ہوا۔ خود میرے خیال میں ہنوز کئی پہلو تشنہ طلب ہیں، جن پر قلم اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے ان حقائق کا پردۂ اخفا سے نکل کر منظر عام پر آ جانا بہت بڑی بات ہوگی۔''

۲

غازی علم الدین شہیدؒ کی سوانح حیات کی برسات میں میرے دل و دماغ کی کائنات مہک مہک سی گئی۔ کیف و سرور اور نکہت و نور کی بارش شہید رسالت کی نسبت مجھے بھی باوقار ٹھہرا گئی۔ وقار بھی دراصل ایک اعتبار ہوتا ہے۔ میرے ایک معصوم دوست ہوا کرتے تھے۔ اسی اعتبار کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ستمبر ۱۹۸۴ء کے ماہنامہ ''ضیائے حرم'' کا شمارہ یہ کہتے ہوئے میری نذر کیا کہ آپ کربِ تخلیق (مقدمۂ کتاب، غازی علم الدین شہیدؒ) میں شہیدان ناموسِ رسالتؐ سیریز پر کام کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ یہ بڑی ایمان پرور داستان ہے، ذرا پڑھئے تو سہی! یہ رمضان المبارک کی ایک رات کی بات ہے۔ اسی سال ۲۲۔ جولائی ۱۹۸۵ء کی صبح میں راولپنڈی میں تھا۔

گرم موسم کا وہ ایک خوشگوار دن تھا۔ شہر کے شور و غل کو جاگے ابھی تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ میں غازی میاں محمد شہیدؒ کے برادرِ خورد ملک نور محمد صاحب کے بتائے ہوئے نقشے کی مدد سے ان کی رہائش گاہ پر پہنچا اور کال بیل دبا دی۔ چند لمحوں بعد گلاب کی طرح مہکتا ہوا ایک پاکیزہ صورت بچہ لہجے میں مٹھاس لئے مجھ سے پوچھ رہا تھا:

''بھائی جان! آپ کن سے ملیں گے؟''

میرے پوچھنے پر بتایا گیا:

''ملک صاحب تو کہیں باہر گئے ہیں، مگر آپ کا نام؟''

''.......................''

''اچھا! اچھا! آپ ہیں''

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ رہے۔ ننھا میزبان جواد اعجاز کے نام سے متعارف ہوا۔ تب یہ چھٹی جماعت کا ایک دلکش اور ہر دلعزیز طالب علم تھا۔ ایک طویل مدت گزر جانے کے باوجود اس کی رفاقت میں گزری ہوئی چند گھڑیوں کی خوب صورت یادیں ابھی تک دل سے محو نہیں پائیں۔

بعض اتفاقات اور واقعات ناقابل فراموش ہوتے ہیں۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ آج

جب میں جواد اعجاز کے بارے میں اپنی حسین یادوں کو تحریر میں لا کر دہرا چکا تو اسی لمحے عرصہ ہائے دراز کے بعد ملک نور محمد صاحب کا ایک تفصیلی خط موصول ہوا، جس میں لکھا ہے کہ اب جواد پاک فوج میں کیپٹن ہیں اور ان کا تقرر کوئٹہ میں ہوا ہے۔ ان کے بڑے بھائی محمود اعجاز بھی کوئٹہ ہی میں ہوتے ہیں اور انشاء اللہ جلد ہی بطور میجر ترقی پا جائیں گے۔

ان کے والد ملک محمد اعجاز مرحوم کو ۲۔ فروری ۱۹۶۶ء میں کمیشنڈ آفیسر منتخب کیا گیا تھا۔ وہ ایم پی کی ایک یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر بھی متعین رہے۔ منگلا کے بعد جی ایچ کیو راولپنڈی میں شفٹ ہوئے۔ ان کا تعلق آرٹلری (توپ خانہ) سے تھا۔ چند برس قبل وہ اچانک داغِ مفارقت دے کر اپنے خالق حقیقی کی رفاقت میں چلے گئے۔

۳

وہ نوعمر لڑکا جو ۱۹۸۲ء کے آغاز میں میٹرک کے بعد کچھ عرصہ کے لیے باقاعدہ طور پر لاہور میں آ گیا تھا، ایک روز میوزیم لائبریری میں انقلاب، سیاست اور ''زمیندار'' کے فائل دیکھ رہا تھا کہ جلی حروف میں لکھا ہوا، رسول پاک ﷺ کے ایک عاشق صادق ''غازی محمد صدیق شہیدؒ'' کا نام اس کی نگاہ کی راہ سے دل میں اتر گیا۔

۱۵۔ اگست ۱۹۸۵ء کی ایک اداس شام وہ اپنے دو مخلص احباب کے ہمراہ قصور میں کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ دن بھر ذوق وشوق، سوز وساز اور محبت و دیوانگی سے ڈھونڈا کیا۔ جب پرندے تھک ہار کر گھونسلوں کو جا رہے تھے تو اللہ اللہ کر کے انہیں مقبرۂ شہید کا سراغ مل سکا۔ صد حیف کہ اہل قصور بھی عموماً شہید ناموسِ رسالتؐ کے نام اور کام سے آشنا نہیں تھے۔ اسی لئے ان کے شہر میں ان کی تربت تک پہنچنے کے لیے زائرین کی ٹولی کو صبح سے شام تک کا سفر کرنا پڑا۔

۴

غازی مرید حسین شہیدؒ، عشق رسول کا ایک عظیم حوالہ ہیں، مگر ان کی جانبازی و سرفرازی کے بارے میں ایک نوجوان کو پہلی بار اپنے بزرگ دوست ملک عبدالکریم صاحب (پنڈی بھٹیاں) سے معلوم ہوا تھا۔ انہوں نے شہید عشق رسول کے کارنامہ سے آگاہ کیا تو شدت عشق کے سبب اسے ۲۹۔ دسمبر ۱۹۸۵ء کو چکوال کا سفر نصیب ہوا۔

حسن وعشق کا یہ ایمان پرور واقعہ ۸۔اگست ۱۹۸۶ء کی صبح تک ترتیب و تشکیل کے مرحلے سے گزر کر پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔ ''شہیدانِ ناموس رسالت سیریز'' کے تحت صاحبزادہ الحاج محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب (ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور) اسے چھاپنے کا ارادہ رکھتے تھے۔اس سلسلے میں قبل ازیں غازی علم الدین شہیدؒ اور غازی میاں محمد شہیدؒ کے حالات و واقعات ضبط تحریر میں آچکے تھے۔ازاں بعد غازی محمد صدیق شہیدؒ کا تذکرۂ حیات بھی شائع ہوا۔الغرض مسودے کی کتابت بھی ہوچکی تھی، جو کہ تاحال ان کی دسترس میں ہے۔ جانے کیوں، اسے کتابی شکل میں سامنے نہیں لایا جاسکا۔غازی مرید حسین شہیدؒ کی داستانِ عشق بڑی بے مثال ولازوال ہے۔

۵

۲۴۔اکتوبر ۱۹۸۷ء کو وہی نوجوان، غازی عبدالقیوم شہید کے مولد ومسکن کی تلاش میں گھر سے نکلا اور بارش وفا میں نہاتا، راولپنڈی سے گزرتا، ٹیکسلا کینٹ کو اپنے پیچھے چھوڑتا، تربیلا روڈ پھلانگتا ہوا ایک قصبہ 'غازی' تحصیل ہری پور، ضلع ہزارہ میں جا پہنچا۔یہی مقام شہبازِ عشق، غازی عبدالقیوم شہید کا آبائی ٹھکانا ہے غازی عبدالقیوم شہیدؒ کا مولد ومسکن کون! غازی عبدالقیوم شہیدؒ؟ غیرت کا بھڑکتا ہوا شعلہ اور گلشن وفا کا مہکتا ہوا گلاب! تاجدار مدینہ ﷺ کا یہ عاشق صادق، مقتل میں ایک عجب سج دھج سے گیا تھا۔موت کو ٹھوکر لگاتے، ہنستے مسکراتے، نعت گنگناتے، تبسم کی بجلیاں گراتے، بقا کا چراغ جلاتے اور رگِ جاں کی تار ہلاتے۔پیکر وفا کے بدن کو چھونے سے پہلے موت خود مرگئی ہوگی۔

۶

غازی امیر احمد شہیدؒ اور غازی عبداللہ خان شہیدؒ کے ایمان پرور حالات و واقعات سے مصدقہ آگاہی، محترمی ومکرمی جناب عابد حسین صاحب (موضع پُھمی / چواسیدن شاہ) کی وساطت سے ممکن ہوئی۔یہ بھی میرے ایک عجیب اجنبی دوست ہیں۔ مخلص، متحرک، متجسس، خوش فکر، علم دوست، دلنواز اور مردم شناس۔انہوں نے کمال مہربانی سے ہفت روزہ ''نیر اسلام'' کی متعلقہ کاپیوں کی نقول مرحمت فرمادیں اور یوں میرا کام نہایت آسان ہوگیا۔اس ادا پر میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے انہیں دُعا دیتا ہوں۔

۷

غازی عبدالرشید شہیدؒ، برصغیر پاک و ہند شہیدانِ ناموس رسالتؐ کے سرخیل ہیں۔سپہ سالار اوّل! غازی علم الدین شہیدؒ کی سوانح حیات کی بات چلی تو اس واقعہ کے پس منظر میں غازی عبدالرشید شہیدؒ کا سراغ بھی ہاتھ لگ گیا۔

۱۵۔نومبر ۱۹۶۹ء کو روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی میں قاضی مبشر حسن راغب ہاشمی کا ایک اہم مضمون، بعنوان ''مولوی قاضی عبدالرشید شہیدؒ'' اشاعت کی زینت بنا۔یہ میرے لیے رہنما ثابت ہوا جو کہ جناب ملک نور محمد صاحب (برادر خورد، غازی میاں محمد شہیدؒ) کی وساطت سے میسر آیا تھا۔علاوہ ازیں، ماہنامہ ''نعت'' لاہور کے ایڈیٹر، راجا رشید محمود صاحب نے بھی اس سلسلے میں بطور خاص قلمی تعاون فرمایا اور وقتاً فوقتاً قابل قدر معلومات ارسال فرماتے رہے۔اگر مجھے واقف و ناواقف کرم فرماؤں کی شفقت و محبت اور معاونت و سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو شاید میں غازی عبدالرشید شہیدؒ کے بارے میں کوئی خاص و مفید تذکرہ سامنے نہ لا پاتا۔

۸

غازی محمد عبداللہ انصاری شہیدؒ قصور کی ایک گمنام بستی سے چپ چاپ اٹھا، بازار سے ایک معمولی چھری خریدی، اسے خوب تیز کیا اور اپنے ''شکار'' کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔بالآخر وہ لاہور سے سرگودھا روڈ پر واقع ایک قصبہ خانقاہ ڈوگراں سے ذرا دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پہنچا اور اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگا لیا۔

۱۰۔اکتوبر ۱۹۸۶ء کو راقم الحروف نے چک ۲۴ خورد سے تفصیلات و معلومات بھی حاصل کیں اور یوں اس داستان عشق و محبت میں حسین اضافہ ممکن ہو سکا۔اس سفر میں صاحبزادہ غلام مرتضٰی شازی (خانقاہ ڈوگراں) میرے ہمرکاب تھے اور یہ باب ان کے تعاون سے ہی مکمل ہوا ہے۔تعلق خاطر کی بنا پر ان کی دعا ہے کہ بندہ کے نوک قلم سے ٹپکنے والا ہر حرف عاشقان رسولؐ کے صلہ قربانی کی صحیح تصویر اور حقیقی تفسیر ہو۔(آمین)

راقم الحروف غازی محمد عبداللہ شہیدؒ سے متعلقہ حقائق کی فراہمی میں راجا رشید محمود کا ممنون احسان ہے۔صاحبزادہ حمید احمد انصاری (حافظ آباد) نے ایک مضمون سے سرفراز فرما کر بار

احسان کیا۔اس داستانِ شوق میں اور بھی کئی حوالے اور اُجالے ہیں۔المختصر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضور آقا و مولا علیہ السلام ﷺ کی رحمت و توجہ سے چراغ سے چراغ جلتا گیا اور احقرا ہندوستان میں رسول عربی ﷺ کے غلاموں سے وابستہ و پیوستہ کڑیوں کو یکجا کرنے میں کامیاب ٹھہرا۔شہیدانِ ناموس رسالتؐ کی بعض گم گشتہ کڑیوں کے بارے میں جناب عبدالغفار شیخ صاحب کی وساطت سے رسائی ممکن ہوئی اور جہلم سے ہومیو پیتھی ڈاکٹر، محمد نور الٰہی مرزا صاحب نے ضروری و مطلوبہ معلومات بہم پہنچائیں۔اس تعاون پر ان کے حق میں ہر لمحہ میرے دل سے دُعا اُٹھتی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ عنداللہ ماجور اور بارگاہ رسالتؐ میں منظور ہوں گے۔

۹

ہندوستان میں آریہ سماج تحریک کا فکری بانی سوامی دیانند سرسوتی تھا۔اس کی نمائندہ تصنیف ''ستیارتھ پرکاش'' ہے۔اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو پاکستان اور بھارت دو الگ مملکتوں کی حیثیت سے شاید کبھی معرض وجود میں نہ آتے۔جس روز یہ شر انگیز رسالہ منظر عام پر آیا، اسی وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں حد فاصل کھنچ گئی تھی۔اس مفسدانہ کتاب پر تبصرہ کے لیے ایک علیحدہ باب درکار ہے۔ ''ستیارتھ پرکاش'' کی ایک اشاعت کے اندرونی سرورق کی پیشانی پر ''صرف یہی ترجمہ مستند ہے'' کے بعد مصنفہ کے ضمن میں ''شری سوامی دیانند سرسوتی جی مہاراج کا مستند اُردو ترجمہ معہ جیون چرتر جس کو شریمتی آریہ پرتی ندھی سبھا پنجاب، سندھ، بلوچستان نے ماسٹر آتما رام جی، پنڈت ریمل جی، بابو نہال سنگھ جی، مہاتما منشی رام جی اور پنڈت چموپتی ایم اے وغیرہ کئی وِدوانوں سے ترجمہ اور تصحیح کرایا'' کے الفاظ درج ہیں۔نیز پرکاشک کے طور پر راجپال مینجر آریہ پستکالیہ انارکلی، لاہور لکھا ہوا ہے۔

نویں بار (ایڈیشن) کے تین صفحات پر مشتمل دیباچہ کے آخر میں راجپال پبلشر اور آریہ پستکالیہ لاہور/ یکم فروری ۱۹۲۸ء نمایاں انداز میں رقم تھا۔

روزنامہ ''پرتاپ'' (سنسکرتی ایڈیشن) جالندھر کے ایڈیٹر، ویریندر نے ۱۹۔ اپریل ۱۹۷۷ء کو اپنے اخبار میں راجپال سے متعلق کئی دیگر باتیں بھی طشت از بام کی ہیں اور غالباً اس بارے میں بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔اس لئے یہ مندرجات خاصے معلوماتی اور اہم قرار دیئے جاسکتے ہیں:

''موجودہ صدی کے آغاز میں جب مشہور آریہ سماجی لیڈر مہاشہ

کرشن نے ہفتہ وار اُردو اخبار لاہور سے نکالنا چاہا تو اخبار کے آغاز سے کچھ عرصہ قبل وہ ضلع امرتسر کے ایک دوسرے آریہ سماجی، مہاشہ راجپال کو لاہور لے آئے اور انہیں اخبار کا جنرل مینجر بنا دیا۔ مہاشہ راجپال نے اس لگن سے کام کیا کہ جب مہاشہ کرشن نے لاہور ہی سے روزانہ اخبار پرتاپ جاری کیا تو مہاشہ راجپال کو بھی اپنے آپ سے وابستہ کر لیا۔ راقم کو بخوبی یاد ہے کہ ان دنوں مہاشہ راجپال 'پرتاپ' کی چھپائی کا بھی انتظام کیا کرتے تھے اور دفتر کا بھی۔ لاہور کی جس سٹریٹ میں روزنامہ 'پرتاپ' کا دفتر تھا اس کے سامنے ہی مہاشہ راجپال نے آریہ سماجی کتابیں چھاپنے اور انہیں بیچنے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مہاشہ راجپال کے اس کتابی ادارے کا نام 'آریہ پستکالیہ' سرسوتی آشرم'' تھا۔ یہ کاروبار ان کا ذاتی تھا۔

۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں آریہ سماج کے مخالفوں، جن میں قادیانی مولوی پیش پیش تھے، نے رشی دیانند سرسوتی کے جیون کے متعلق ایک فضول سی کتاب چھاپی، جس میں رشی جیون پر غلط حملے کئے اور آریہ سماج پر نکتہ چینی بھی کی۔ اس قادیانی کتاب میں رشی دیانند کی توہین بھی کی گئی تھی۔ چنانچہ ایک بڑے آریہ سماجی ودوان نے قادیانی کتاب کے جواب میں اُردو میں ایک کتاب چھاپی جس کا نام 'رنگیلا رسول' تھا۔

بتاتے ہیں کہ راجپال کے زیر نگرانی مطبوعہ یہ رسوائے عالم کتاب ۱۹۔ جون ۱۹۲۴ء کو پہلی مرتبہ فرزندان اسلام کی نظر میں آئی اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے سبب ۲۴۔ مئی ۱۹۲۵ء کو عدالت میں باقاعدہ مرافعے کی سماعت شروع ہوئی اور بالآخر یہ معاملہ راجپال مردود کے قتل تک پہنچا۔

۱۰

آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا، درحقیقت ایک ہی چہرے کے دو روپ تھے۔ اوّل الذکر مذہبی، ثانی الذکر سیاسی! ''پتلون پوش ولی'' نامی ایک کتاب میں ان کے مذموم مقاصد کو قدرے واضح

انداز میں جامۂ الفاظ پہنایا اور بتایا گیا ہے کہ آریہ سماج اور ہندومہاسبھ کے زیر نگرانی ہندو نوجوانوں کی ایک نیم خفیہ تنظیم قائم کی گئی، جس کا نام ''مہابیر دل'' تھا جو بعد میں راشٹر یہ سیوک سنگھ کی صورت اختیار کر گئی۔

ہندو مہاسبھا کے زیر اہتمام ایک اور تنظیم بھی کھڑی ہوئی تھی جسے ''سیوا سمتی'' کہا گیا۔ وہ بظاہر اسے خدمت خلق کے ماٹو پر وجود میں لائے تھے، مگر درحقیقت یہ گروپ بھولے بھٹکے اور لاوارث مسلمان بچوں اور بچیوں کو اغوا کر کے مختلف شہروں میں رکھ کر انہیں ہندو بناتے تھے۔

II

معروف قلم کار جناب اشرف عطاء صاحب کی یادداشتوں پر مبنی ایک کتاب ''کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشان تذکرے'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ سوامی شردھانند نے شدھی اور ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن کی تحریکیں شروع کی تھیں اور یہ کہ شدھی کی تحریک بنیادی طور پر ''ملکانہ'' کے راجپوتوں کو دوبارہ ہندو بنانے کے لیے وجود میں لائی گئی تھی اور ملکانوں کا علاقہ تصادم کا مرکز بن گیا۔

ادھر ہندوؤں نے اکھاڑے قائم کیے، گتکے بازی کی پارٹیاں بنائیں، اکھاڑوں میں ہندو نوجوانوں کو ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت دی جانے لگی۔ ہندوؤں نے اس تحریک کو منظم کرنے کی خاطر لاکھوں روپے خرچ کر ڈالے۔ سنگھٹن کی یہی تحریک بعدازاں ۱۹۴۷ء کے فسادات میں راشٹر یہ سیوک سنگھ کی فوجی تنظیم میں منتقل ہوگئی۔ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ملک میں فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی۔

دوسرے بڑے شہروں کی طرح لاہور میں بھی ہندو مسلم فساد ہوا۔ لاہور کی فضا ''ورتمان'' اور راجپال کی رسوائے زمانہ کتاب کی اشاعت کی وجہ سے سخت کشیدہ ہو رہی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں زبردست کھچاؤ موجود تھا۔ ڈبی بازار میں سکھوں کے گردوارہ باؤلی صاحب میں سکھوں کا ایک دیوان منعقد ہوا جس میں مسلمانوں کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ جب یہ دیوان ختم ہوا تو سکھوں نے سینکڑوں کی تعداد میں حویلی کابلی مل پر دھاوا بول دیا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مسلمان عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ سکھوں نے انہیں آ لیا۔ مسلمان نہتے تھے۔ ایسا کوئی حملہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ سکھوں نے تین چار مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ مولانا ظفر علی خان راتوں رات جائے فساد پر پہنچے اور مسلمانوں کو تسلی دی۔

صبح ہونے سے قبل لاہور کے درو دیوار پر ایک پوسٹر چسپاں تھا جس کا عنوان تھا ''لاہور میں مسلمانوں پر قیامت صغریٰ'' ''زمیندار'' پوسٹر والی سرخی اور سیاہ حاشیہ کے ساتھ شائع ہوا اس کے صفحہ اوّل پر حویلی کابلی مل کے فسادات کی تفصیل درج تھی۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، شیخ عبدالقادر، مولوی محی الدین قصوری، سر میاں محمد شفیع اور بعض دیگر مسلمان لیڈر بھی حویلی کابلی مل میں پہنچے۔ حکیم الامت نے ڈبی بازار میں چائنہ ہاؤس کے سامنے اپنی گاڑی روک کر ہزاروں مسلمانوں سے خطاب کیا اور انہیں منظّم و پُر امن رہنے کی تلقین فرمائی۔

دوپہر کے بعد جب شہدائے حویلی کابلی مل کا جنازہ اٹھا اور جلوس موچی دروازہ سے ہوتا ہوا شاہ عالمی میں سیتلا مندر کے قریب پہنچا تو اس پر مندر سے اینٹ پتھر پھینکے گئے۔ بس فساد ایک بار پھر پھوٹ پڑا، مگر اب کے یہ ہندوؤں کو کافی مہنگا پڑا۔ گلی کوچوں، بازاروں اور چوکوں میں بھی خنجر زنی کی وارداتیں عام ہونے لگیں۔ بالآخر پولیس اور فوج نے آکر حالات پر قابو پایا۔ اس کے بعد گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نتھا چنگڑ کو گرفتار کرلیا گیا، لیکن اس کا بھائی جمال الدین پہلوان فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ مصنف کے بقول: نتھا چنگڑ کو فساد میں حصہ لینے کے بعد عدالت سے پھانسی کی سزا کا حکم ہوا تھا، مگر ہائیکورٹ نے اس میں تخفیف کر کے عمر قید میں بدل دیا۔

۱۴

کراچی میں غازی عبدالقیوم شہیدؒ نے جب جوش غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نتھورام کو واصل فی النّار کر دیا تو اس کے ساتھ ہی ملاپ میں لالہ گوری شنکر اور لالہ نانک چند ناز نظم و نثر کے ذریعہ مردودِ آنجہانی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے اور پیروکارانِ اسلام کے خلاف شرمناک یاوہ گوئیوں کے سلسلے کا آغاز کر دیا۔ ادھر ''احسان'' میں جناب غلام مرتضیٰ میکش اور چراغ حسن حسرت بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔ اسی سبب سے ''احسان'' پر فرقہ وارانہ زہر پھیلانے کے الزام میں پریس ایکٹ کے تحت حکومت پنجاب نے مقدمہ چلایا اور حسب ذیل نظم کی بنا پر دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط کر لی۔ اس نظم کا عنوان تھا: ''شاتم رسول، نتھورام کا انجام''۔

جذبۂ مُسلم کی پیدا ہو نہیں سکتی مثال — عشق اس کا غیر فانی الفت اس کی لازوال
سر بکف رہتا ہے وہ ناموسِ ملت کے لیے — برق ہے باطل کے خرمن کے لیے اس کا جلال

اس کی غیرت کا سمندر موجزن جب بھی ہوا — بہہ گئے خاشاک کی مانند اس میں راجپال
اس کی ہیبت سے سیہ کار تھراتے رہے — اس کی سطوت نے کیا اعدائے حق کو پائمال

۱۳

روزنامہ ''جنگ'' لاہور کے صحافی ظفر اقبال نگینہ نے ''غازی علم الدین شہید'' کی سوانح حیات پر ایک کتاب ترتیب دی تھی جو ''جنگ'' پبلشر ہی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ تاریخی و تحقیقی نوعیت کی اس کتاب میں بھی واضح طور پر صحافیانہ جھلک موجود ہے۔ بلکہ انہوں نے فلمساز حیدر صاحب کے نام ایک خط لکھا جو بغرض پبلسٹی اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا تفننِ طبع کے لیے بہت اہم ہے۔

''حیدر صاحب السلام علیکم! آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ آپ کی فلم دیکھ کر ہی میں نے تاریخ کے اس عظیم الشان باب پر اپنی تصنیف ''غازی علم الدین شہید'' مرتب کی تھی۔ کتاب پڑھے لکھے لوگوں کو متاثر کرسکتی ہے، لیکن فلم کے ذریعے ہر خاص و عام غازی علم الدین شہید کے عظیم کردار سے واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔ عاشقان رسولؐ کو حرمت رسول کے فداکار، غازی علم الدین شہیدؒ پر بنائی جانے والی اس فلم کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ ''

نگینہ صاحب کی کتاب کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی تو انہوں نے اپنے خطاب میں کہا تھا کہ میں نے اس موضوع پر پورے تین برس مسلسل تحقیق کی ہے، حالانکہ اگر بندہ کی کتاب ''غازی علم الدین شہید'' کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو درازئ قامت کا ازخود بھرم کھل جاتا ہے۔ یاد رہے کہ راقم کی یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں منصۂ شہود پر آئی تھی جبکہ نگینہ صاحب کی کاوش چند سال بعد تالیف ہوئی اور مقدمہ میں خصوصاً رائے کمال کی کتاب سے استفادہ کا ذکر کر کے بآسانی کئی باب، صفحے اور اقتباس اپنے تصرف میں لے آئے تھے۔ نگینہ صاحب نے اپنی کتاب، فلم سے متاثر ہو کر لکھی تھی اور شاید اسی لئے تقریب رونمائی میں فلمی اداکار محمد علی بھی مہمان مقرر تھے۔ انہوں نے اس موقع پر نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہا تھا کہ غازی علم الدین شہیدؒ کا کردار فلموں میں بھی فلمایا گیا ہے اور ان میں یہی نعرہ لگایا جاتا رہا ہے اور ہم شروع سے سنتے بھی آرہے تھے کہ علم الدین پکار کر کہتا

ہے کہ راجپال کا قتل میں نے کیا ہے مگر آج اس کتاب سے معلوم ہوا ہے کہ اصل حقائق کیا تھے اور اکاون سال بعد ''شہید'' کا لفظ خطرے میں پڑ گیا ہے۔

۱۴

کل رات میں تاریخ کی متلون مزاجی میں الجھا ہوا تھا، شہیدانِ رسول کی تربت کا منظر آنکھ کے جھروکوں میں اتر آیا۔ درحقیقت میری چشمِ فکر ہزاروں میل دور ہسپانیہ کی جانی پہچانی شاہراہوں پر بھٹک رہی تھی کہ شاید آباء کی لٹی پٹی پونجی مل جائے۔ ساحلِ اندلس پر مسلمانوں کا قافلہ بادشاہوں کی معیت میں اترا تھا۔ ان کے آمادۂ زوال ہو جانے پر صدیوں کے نشانات مٹ گئے۔ اب اس سرزمین پر ڈھونڈے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ملتا۔ اس کے برعکس صوفیائے عظام کے مسکن برصغیر پاک و ہند میں سکھوں کی ستم رانیوں، انگریزوں کی سازشوں اور ہندوؤں کی تحریک احیاء اور مذموم کوششوں کے باوجود ہمارا اسلامی تشخص برقرار رہا اور ہم میں ایسے مجاہد بھی پیدا ہوتے رہے جو قومی وقار کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے اپنی زندگیوں سے کھیل گئے۔

۱۵

میں نے شمعِ رسالت کے ان پروانوں کے کارناموں کو موجودہ اور آئندہ نسل تک پہنچانے کا اپنے حضور ﷺ سے عہد کر رکھا تھا۔ میں کیا اور میرا عہد کیا؟ یہ سب انہی کا کرم اور رحمت و توجہ کا ثمر ہے کہ آج ایک حد تک اس ذمہ داری سے سرخرو ہو رہا ہوں۔ کیا میرے لیے یہ امتیاز کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کے وسیلۂ جمیلہ سے مجھ جیسے کمترین کو ایک منفرد اعزاز سے نواز دیا۔ اولیت و فوقیت کا اعزاز! ماضی میں اس اچھوتے موضوع پر کوئی کام ہوا نہیں تھا اور مستقبل میں تحقیق و تصدیق کی وادیوں میں سفر کرنے اور محبت و عقیدت کی جوت جگانے والے مجھے کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کر پائیں گے۔ راقم، شہیدانِ ناموسِ رسالت کی نسبت غلامی سے خود ایک حوالہ ٹھہر گیا ہے۔ غلامی کا حوالہ! مجھے اس جنون میں بڑا سکون ملا ہے۔ اگر موجودہ صدی کو شہیدانِ ناموس رسالت کی رعایت سے عشق رسول کی صدی قرار دیا گیا ہے تو اس میں یقیناً شہیدان ناموس رسالت کے سوانح نگار کا بھی حصہ ہے۔ یہی میرے قلم کی آبرو اور زندگی کا ماحصل ٹھہرا۔

۱۶

میں نے خوشبو کا سفر (مقدمہ: غازی محمد صدیق شہیدؒ) میں لکھا تھا:

''اگر زندگی نے مہلت دی تو اپنے سرکار ﷺ کے ان دیوانوں اور فرزانوں کی ایمان پرور یادوں اور کومل جذبوں کو ایک نہ ایک دن اوراق کے سینے پر منتقل کر کے رہوں گا۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس مشن کی تکمیل پر بارگاہ نبوت سے مجھ ناچیز کو پروانہ بخشش عطا ہونے والا ہے۔''

میں نے کرب تخلیق (مقدمہ: غازی علم الدین شہیدؒ) میں یہ بھی لکھا تھا کہ بالیقین جب راجپال کا قلم آوارہ ہو جائے تو تقدیر کسی علم الدین کو تلاش کرتی ہے۔ میں مقبرۂ شہید پر بیٹھا اسی سوچ میں گم تھا کہ خدانخواستہ کہیں پھر امتِ مسلمہ کی وفاؤں کے امتحان کا مرحلہ پیش آیا تو میدان خطابت میں بخاری مرحوم نہیں ہیں، جن کی شعلہ نوائیاں خرمن فکر میں آگ بھڑکا سکیں اور علم الدین جیسے نوجوان بھی دکھائی نہیں دیتے، گلاب کی طرح مہکتا ہوا جن کا شباب دار و رسن کو زینت بخشے۔ اس لئے عشق و محبت کی یہ داستان اس قابل ہے کہ روشنائی سے لکھنے کی روش ترک کر کے اسے خونِ جگر کے مقدس قطروں سے غلاف حرم پر رقم کی جائے تا کہ شاتمانِ رسول، حروف کے خنجر سے از خود قتل ہوتے رہیں۔

روحِ ایمان

حضور پُر نور شافع یوم النشور، فخر دو جہاں، نبی آخری الزماں، سیّد المرسلین، خاتم النبین احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذات بابرکات ابتدا سے ہی مومن نگاہوں کا مرکز ہے۔ آپ کا فکرو تصوّر اہل عشق کی نماز ہے اور درود وسلام کا ملکوتی وظیفہ افضل ترین عبادت۔ سرکار مدینہ ﷺ سے محبت و شیفتگی صحابہ کرام کا طرۂ امتیاز تھا۔ آپؐ ناخن ترشواتے تو یہ زمین پر گرنے سے پہلے اپنے دامن میں بطور تبرک سمیٹ لیتے۔ وضو کے وقت استعمال شدہ پانی کو زمین پر نہ گرنے دیا جاتا بلکہ ہاتھوں کے پیالوں میں بھر کر اپنے چہروں پر مل لیتے۔ بال بنواتے تو کٹی ہوئی زلفیں عاشقان رسول سنبھال سنبھال کر رکھتے کہ ان سے دارین کی برکتیں حاصل کی جائیں اور ایسا نہیں کہ آپؐ اس پر خفا ہوں۔ میرے سرکار ﷺ سے بہتر کون جانتا تھا کہ یہ مظاہر عشق ہیں۔

رسول پاک ﷺ سے الفت و ارادت ہی مغز قرآن، روح ایماں اور جان دیں ہے۔ آپؐ کے فضائل، شمائل اور خصائل سے وابستگی ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ ہر سچے مسلمان کا دل آپؐ کی عقیدت و محبت کا مسکن ہے۔ اگر کوئی شخص محبوب خدا ﷺ کے ادب و احترام کا منکر ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فیِ الدنیا
وَالاخر واعدلھم عذابا مھِینا (الاحزاب)
والذین یوذون رسول اللہ لھم عذاب الیم (التوبہ)

مندرجہ بالا آیات مقدسہ کی رو سے آقائے مدنی ﷺ کو کسی بھی طرح ایذا پہنچانے والے کی سزا دنیا میں لعنت و رسوائی ہے اور وہ بہر حال قابل گردن زدنی ہے۔ چاہے یہ دکھ درد سبّ و شتم کی صورت میں ہو یا جنگ وجدل کے طریقے پر، اور ہاں! ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں درد ناک عذاب بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کی شانِ زیبا میں ورفعنالك ذكرك فرمایا ہے اور کہیں فَلاَ وَرَبُّك۔ ایک جگہ ولسوف یعطیك ربك فترضى کہا تو دوسرے مقام پر یا اَیھُاَ المزمل قم اللیل الا قلیلا۔ دراصل قرآن مجید، محسن عالم علیہ التحیۃ والثنا کی مدح و توصیف

اورتعریف سے بھرا پڑا ہے۔ خداوندکریم نے اپنے محبوب پاک ﷺ پر اپنے اور فرشتوں کے درودو سلام بھیجنے کا اعلان فرماتے ہوئے یہ حکم دیا کہ جو اہل ایمان ہیں وہ بھی ہدیۂ محبت پیش کریں۔ آپؐ کو حق کے ساتھ خوشخبری سنانے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجنے کی بات کی۔ انہیں لوگوں کی بہت بھلائی چاہنے والا فرمایا اور مومنوں پر بہت کرم والے، مہربان قرار دیا۔ خالق و مالک نے اس شہر کی قسم کھائی جس میں سید البشر ﷺ تشریف فرما تھے۔ اپنی قسم کھانا مقصود تھی تو بھی فرمایا کہ اے محبوبؐ! مجھے تیرے رب کی قسم! سرکار عالم ﷺ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمانے کا مژدہ سنایا؛ نہ صرف یہ کہ محسن انسانیت ﷺ کو شاہد، مبشر، نذیر، اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور چمکنے والا چراغ فرمایا بلکہ انؐ کی بیعت کو اپنی بیعت اور آپؐ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ فرمایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یاایھا الذین امنو الا تقولو راعنا وقولوا انظر ناواسمعو للکفرین عَذَابٌ اَلِیم (سورۃ البقرہ)

راعنا کا معنی ہماری رعایت فرماؤ ہے مگر یہودی اور منافق راعنا کی ع کو کھینچ کر پڑھتے (راع) جس کا مطلب ہمارا چرواہا ہوتا۔ چونکہ اس لفظ کا ایک مفہوم توہین رسالت پر مبنی تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے راعنا کی بجائے انظرنا استعمال کرنے کو کہا اور فرمایا کہ اب کوئی راعنا کہے گا تو کافر ہو جائے گا اور اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔

بخاری و مسلم میں ہے:

"لایومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین"۔

(کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آقا و مولا ﷺ کو اپنے والدین، اپنی اولاد، اپنی جان اور دیگر تمام علائق سے زیادہ عزیز نہ جانے۔)

امام قسطلانی ارشاد الساری میں لکھتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ کے ایام قریب الوصال میں اصحاب اجمعین نے دیدار کی خاطر نماز چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا تھا۔ لامع الدراری میں ہے کہ تمام صحابہ کی نگاہیں حجرۂ انور کی طرف مرکوز تھیں، جب انہوں نے پردے کا ہٹنا محسوس کیا تو انہوں نے اپنے چہرے اسی جانب کر لیے۔ امام ترمذی کی روایت میں تو یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ قریب تھا لوگوں میں اضطراب پیدا ہو جاتا لیکن آپؐ نے فرمایا اپنی اپنی جگہ کھڑے رہو۔ شیخ ابراہیم بیجوری

فرماتے ہیں کہ شاید صحابہ کرام آپؐ کے شفایاب ہونے کی خوشی میں متحرک ہوجاتے حتیٰ کہ انہوں نے نماز توڑنے کا ارادہ کرلیا اور سمجھے کہ ہمارے آقا ﷺ نماز پڑھانے باہر تشریف لا رہے ہیں، لہٰذا ہم محراب تک کا راستہ خالی کردیں، چنانچہ بعض صحابہ خوشی سے اچھل پڑے۔ امام بخاری نے باب الالتفات فی الصلوٰۃ کے تحت وہ والہانہ کیفیت یوں بیان فرمائی ہے کہ مسلمانوں نے نماز توڑنے کا ارادہ کرلیا، یہاں تک کہ آپؐ نے انہیں نماز کو پورا کرنے کا حکم دیا۔

سیدّنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک مرتبہ فرطِ عقیدت سے فرمایا تھا کہ مجھے محبوب خدا خود، خدا سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ اس مضمون کو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا:۔

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر   بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوت قلب و جگر گردد نبی   از خدا محبوب تر گردد نبی

(اگر تو میری بات کو سمجھے اور اس فلسفے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نگاہ سے نظر ڈالے تو دل و جگر کی تمام تر قوت سید المرسلین ﷺ کے قدوم میمنت لزوم پر قربان ہوا چاہتی ہے اور محبوبؐ خدا کی ذات اقدس خود خدا سے بھی زیادہ پیاری ہوجاتی ہے۔)

حق یہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کی کتاب پر اس لئے ایمان لائے کہ فخرِ کائنات ﷺ نے ہمیں اس کی تعلیم دی۔ کائنات کے اس عظیم اور سب سے سچے انسان نے فرمایا تو ہم نے ذات بے ہمتا کو سچ مان لیا۔ عقیدے میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ ربِّ محمدؐ ہی ہر شے کا خالق و مالک ہے۔ اگر مولائے انبیاء ﷺ کی ذات بابرکات سے ایمان اُٹھ جائے تو اسلام و ایمان بے معنی ولایعنی ہوجاتے ہیں۔

خیر الانام ﷺ کی ذات پاک سے ارادت کیشی کی شدت اس واقعہ سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ جب غزوۂ احد میں دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل ﷺ کا ایک دانت مبارک شہید ہوا تو بعض کے بقول، حضرت اویس قرنی نے فقط اتباع مصطفےٰ کے جذبہ سے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے۔ ایک صحابی، حضور اکرم ﷺ کو اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے کہ لمحہ بھر کے لیے بھی آپ کے چہرہ مبارک سے نظر نہ ہٹتی۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ غلام نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، میں تو آپ کی طرف دیکھ کر نفع حاصل کرتا یعنی اپنے دل و نگاہ کو ٹھنڈک پہنچاتا ہوں۔

ابن اسحاق سے روایت ہے کہ انصار کی ایک عورت تھی جس کا باپ، بھائی اور خاوند سب کے سب احد کے دن حضور پاک ﷺ کے حکم پر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ جب اس عورت کو ان کی شہادت کی اطلاع دی گئی تو اس نے صرف ایک ہی سوال کیا کہ میرے آقا و مولا ﷺ کا کیا حال ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ آپؐ خدا کے فضل و کرم سے بخیریت ہیں، جیسا کہ تو چاہتی ہے۔ تب اس نے کہا کہ مجھے دیدار کروا دو۔ جب سرکارؐ پر نظر پڑی تو پکار اٹھی کہ آپؐ کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت میرے لیے معمولی ہے۔

ابن حمید کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے حضرت امام مالکؒ سے مسجد نبوی میں کسی مسئلہ پر بحث کی تو حضرت امام نے فرمایا کہ دیکھنا، یہاں بلند آواز سے گفتگو نہ ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیِ (الحجرات)

(نہ بلند کرو اپنی آوازوں کو نبی کریم ﷺ کی آواز سے) خلیفہ، امام صاحب سے یہ بات سن کر چپ ہو گیا اور کچھ دیر بعد گویا ہوا کہ اے ابو عبداللہ! میں قبلہ رخ ہو کر دعا مانگوں یا حضور اکرم ﷺ کی طرف متوجہ رہوں؟ امام مالک علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ تم میرے سرکار ﷺ کی طرف سے کیوں منہ پھیرتے ہو، آپ تو اللہ تعالیٰ کی طرف بروزِ قیامت وسیلہ ہیں، لہٰذا آپؐ ہی کی طرف متوجہ رہو اور آپؐ کی شفاعت کے طلب گار بنے رہو۔ تب اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں آپؐ کی شفاعت قبول فرمائے گا، جیسا کہ حکم خداوندی ہے:

ترجمہ: اور جب وہ اپنے نفسوں پر ظلم کر چکیں تو وہ آپؐ کے پاس آ کر گناہوں کا اقرار کر کے مغفرت چاہیں اور آپؐ ان کے لیے دعا فرما دیں تو اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا پائیں گے۔

حضرت امام مالکؒ ایک بار فریضہ حج سے سبکدوش ہو چکے تو پھر تمام زندگی مدینہ منورہ سے باہر نہ نکلے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ زیارت کعبہ کو کیوں نہیں جاتے، تو فرمایا: میں ڈرتا ہوں کہ اگر کہیں جاؤں اور پیغام اجل آ پہنچے تو میری قبر، دیار حبیب ﷺ میں نہیں بن پائے گی۔ کہتے ہیں کہ امام صاحب کا طیبہ کی گلیوں میں سے گزر ہوتا تو پرانی دیواروں کو چومتے اور جھومتے تھے۔ استفسار پر وجہ یہ بتائی کہ ان اینٹوں پر شاید میرے آقا و مولا ﷺ کی نگاہ پڑی ہو۔ روایت ہے کہ امام صاحب مدینہ منورہ میں سواری نہ کرتے اور فرماتے تھے کہ میں اس زمین کو اپنی سواری کے پاؤں سے کس طرح پامال کروں، جس میں حضور پاک ﷺ استراحت فرما ہیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے مدینے کی زمین کو ''ردی'' کہا تو آپ نے فتویٰ دیا کہ اس کو تیس درے لگائے جائیں اور پھر اسے قید کر دیا جائے، حالانکہ دنیوی لحاظ سے وہ ایک معزز شخص تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شخص دراصل لائق گردن زدنی ہے؛ اس لئے کہ حضور پاک ﷺ کے شہر کی زمین کو ایسے کہتا ہے۔

ایک جگہ بیان ہوا کہ رسول عربی ﷺ کو سبزیوں میں کدّو بہت پسند تھا۔ کوئی بدطینت بولا: مگر مجھے تو پسند نہیں ہے۔ یہ بات امام ابو یوسفؒ تک پہنچی تو آپ نے عجیب ایمان افروز بات کہی کہ وہاں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اسے قتل کر دیتا؟ امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ جو کوئی حقارتاً کہے کہ رسول اللہ ﷺ کی چادر کیسی میلی تھی یا آپ کے لیے اور ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے تحقیر کا پہلو نکلتا ہو تو وہ بھی ایمان سے محروم ہو گیا۔ مزید برآں یہ کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ تم تو اُمّی (ان پڑھ) ہو۔ دوسرا بولا ''اُمّی تو حضورؐ بھی تھے'' اس پر امام صاحب نے اس کی سزا کا فتویٰ صادر فرما دیا۔

صحابہ کرامؓ کی جاں سپاری وفدا کاری اظہر من الشّمس ہے۔ تازگیٔ ایمان کے لیے امیر المومنین سیدنا حضرت علی المرتضٰی کی حیاتِ مقدسہ کا ایک حوالہ کافی ہو گا۔

کفارِ مکہ حضور سرورِ کونین ﷺ کے درپے آزار ہیں اور چاہتے ہیں کہ حضورؐ کو قتل کر دیں۔ آپؐ ہجرت کا ارادہ فرماتے ہیں۔ کفار مکہ لمحے لمحے کی خبر رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال دامن گیر ہے کہ اگر انہوں نے حضورؐ کا بستر خالی پایا تو وہ فوراً تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ شمع رسالت کا کوئی پروانہ بستر پر سو جائے تا کہ کفار یہی سمجھیں کہ حضور استراحت فرما رہے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو شخص آپؐ کے بستر پر سوئے گا، اس کے لیے حقیقت حال کھل جانے کے بعد کفار سے جان چھڑانا سخت مشکل ہو گا۔ اس کے باوجود حضرت علی المرتضٰی، نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر کمال دلجمعی کے ساتھ بستر پر لیٹ جاتے ہیں اور صاحب المعراج ﷺ اپنے دوسرے فدائی و شیدائی حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے روانہ ہوتے ہیں۔

یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے آقا و مولا ﷺ کے بغیر طوافِ کعبہ گوارا نہیں فرمایا تھا۔ حضرت زیدؓ ایک دفعہ مشرکین کی قید میں آ گئے، جنہوں نے آپ کو برسرِ عام شہید کر دینے کا اعلان کیا اور دیرینہ عربی روایات کے مطابق پوچھا کہ تمہاری زندگی کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔ انہوں نے بہ ہزار اطمینان جواب دیا: یوں تو ہر انسان فانی ہے مگر

حرمت رسول اقدس ﷺ پر کٹ مرنا حیات جاودانی ہے۔ ایسی موت میرے لیے خوشیوں کا سامان ہوگی۔ تم جس طرح چاہو میری روح کو اس تن خاکی سے آزاد کرا دینا۔ البتہ مجھے دو رکعت نماز بطور شکرانہ ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ نماز ختم ہوتے ہی آپ نے بصد اشتیاق خود کو شہادت کے لیے پیش کر دیا اور کفار نے تڑپا تڑپا کر شہید، کیا لیکن آپ ہر وار پر درود و سلام کا ورد کرتے رہے۔

حضرت حبیبؓ کا موت کی آغوش میں رقص و تبسم بھی کتابِ عشق کا ایک روح پرور باب ہے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت بلالؓ، حضرت زبیرؓ، سعیدؓ بن زید اور سعدؓ بن وقاص کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کے سبب طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں، مگر یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کر سکیں۔

دل میں نبی آخر الزماں ﷺ کی محبت و عقیدت نہ ہونا بھی ایک طرح سے بے ادبی ہے۔ گستاخی کرنا یا گستاخ کے لیے نرم گوشہ رکھنا، گناہ کبیرہ ہے اور اس کو ٹھکانے نہ لگانا ایک ناقابل عفو جرم۔ جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایسے شخص کی سزا دنیا میں قتل ہے خواہ کلمہ گو ہو کافر و مشرک ہو یا اہل کتاب میں سے۔ بعض علماء، مہین عذاب سے بھی قتل مراد لیتے ہیں۔ قرآن و سنت میں شاتم نبی کی سزا، صرف اور صرف موت ہے۔ اگر جرم ثابت ہو جائے تو کسی کو حد کے علاوہ کوئی دوسری سزا دینے کا حق نہیں ہے۔ کسی شخص نے شہنشاہِ عرب و عجم ﷺ کے عہد مبارک میں توہین کی اور آپؐ نے اسے معاف فرما دیا تو یہ حسن خلق اور وصف رحمت العالمین تھا، لیکن امت میں سے کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں۔ حضور اکرم ﷺ ہی اپنا حق معاف فرما سکتے ہیں۔ اگر امتی کسی بدزبان کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو یہ حسن خلق نہیں بلکہ بے حمیتی و بے غیرتی ہوگی۔

۵

علمائے احناف کا موقف ہے کہ توہین رِسول کا مرتکب دائرہ اِسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور مرتد کی سزا موت ہے۔ اس پر قرآن و احادیث کے واضح احکامات ہیں اور صحابہؓ کا اجماع بھی۔ اس باب میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ بن حنبل مکمل طور پر متفق ہیں کہ ایسے بدطینت کو توبہ کا موقع بھی نہیں ملنا چاہیے۔ یہ اس لیے کہ اگر توبہ کا دروازہ کھول دیا جائے تو شیطان پنے عمل خبیثہ کے بعد توبہ کے بہانے اپنے تئیں گرفت سے بچا لے گا۔ تاہم امام اعظمؒ کا ایک قول ملتا ہے کہ گستاخِ رسول کو توبہ کا موقع دیا جائے۔ اگر وہ توبہ کر لے اور دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو تو

اس کی معافی کی درخواست قبول کی جاسکتی ہے۔لیکن اس مسئلے پر ان کے شاگرد امام ابومحمدؒ بھی جناب ابوحنیفہؒ سے اتفاق نہیں کرتے اور یہی نقطۂ نظر قابل عمل وافضل ہے۔ یہ درست ہے کہ بابِ توبہ کفر کی حالت میں بھی کھلا رہے گا۔ مگر رسول اقدس ﷺ کی شان زیبا میں زبان درازی کے بعد اس دنیا میں یہ حق چھن جاتا ہے۔ اگر واقعی توبہ کی نیت مبنی بر خلوص ہوگی تو اس کا تعلق اگلے جہان سے جڑا ہوا ہے۔

حدیث مبارکہ میں متعدد واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس مسلمان کے سامنے حضور پاک ﷺ کی ذات بابرکات میں بدتمیزی کا مظاہرہ کیا گیا ہو وہ اسے ذاتی طور پر فنافی النار کرسکتا ہے۔ تاہم بعض علماء کے نزدیک احسن یہ ہے کہ معاملہ عدالت کے سپرد کیا جائے۔ بنابریں اگر کسی کی عورت ارتکابِ بے ادبی کرے تو اس کو بھی موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔ جبکہ کچھ اہل علم کی رائے میں اسے یوں قید رکھو کہ وہ ازخود مر جائے۔

ابوبکر فارسیؒ نے ایک شافعی المذہب امام سے کتاب الاجماع میں روایت کی ہے کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جو رسالت مآب ﷺ کے متعلق طنز و تنقیص یا کسی طرح کی اہانت کا مرتکب ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ کافر ہے بلکہ اسے قتل کرنے کی سزا کسی طور بھی ختم نہیں کی جاسکتی۔

الوسائل کی جلد ۸ صفحہ ۴۵۹ پر ایک حدیث مبارکہ مندرج ہے کہ پیکر وفا، شہید کربلا حضرت امام حسینؓ نے فرمایا کہ مجھے میرے بزرگوار نے خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! ''تمام لوگ میرے بارے میں ایک جیسے ہیں، اگر تم میں سے کوئی کسی کو میرے متعلق گالی دیتا یا ہرزہ سرائی کرتا ہوا پائے تو سننے والے پر اس کا قتل واجب ہے اور قاتل کو یہ مسئلہ حاکم وقت کی خدمت میں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود اگر سلطان یا قاضی کے پاس مقدمہ پیش کیا جائے تو ان پر بھی اس کا قتل کرنا واجب ہوگا۔''

حضرت ابن عمرؓ کے قریب سے ایک راہب کا گزر ہوا، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ سرور انبیاء ﷺ کی ذات پر زبان طعن و تشنیع دراز کرتا ہے تو انہوں نے کہا اگر میں نے ایسا کہتے سنا تو یقیناً اس کی گردن اڑا دوں گا، کیونکہ ہم حکومت اسلامی میں ذمیوں کی صرف اس شرط پر حفاظت کریں گے کہ وہ ہمارے آقا و مولا ﷺ کی شان میں گستاخی کا نہ سوچیں۔

شاتم رسول کا قتل جائز ہی نہیں بلکہ دینی فرض ہے اور وہ بھی فرض کفایہ۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنی خلافت کے عرصہ میں اطلاع ملی کہ آپ کے ماتحت ایک والی نے اس عورت

کے دانت اکھیڑ دیئے ہیں، جس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت و رفعت کے متعلق ناروا کلمات بکے تھے۔ آپ نے فرمایا: اب سزا دی جا چکی ہے ورنہ میں حکم دیتا کہ عورت کو قتل کر دیا جائے۔

اہل حدیث مکتبہ فکر کے امام و مقتدا، ابن تیمیہ ایک کتاب ''الصارم المسلول علی شاتم الرسول'' لکھ گئے ہیں فرماتے ہیں کہ اللہ اور رسولؐ کی حرمت کی جہت ایک ہے۔ جس نے حضورؐ کو ایذا دی اس نے گویا اللہ کو تکلیف دی اور جس نے حضورؐ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی ہی اطاعت کی۔ کیونکہ امت بلا واسطہ رسول، اس شے کو نہیں پہنچ سکتی جو اللہ اور بندوں کے درمیان ہے، سوائے رسول ﷺ کے، امت کے لئے کوئی سبیل اور واسطہ نہیں ہے۔ رسول پاک ﷺ کے متعلق یاوہ گوئی کرنے والا مرتد سے زیادہ مجرم ہے۔ اس جرم میں کعب بن اشرف، ابن خطل (باوجود کعبہ میں پناہ لینے کے)، ابی رافع اور ابوجہل وغیرہ قتل کئے گئے۔ حضورؐ کی عزت و توقیر ہم پر اللہ نے فرض کر دی ہے۔ حضورؐ کی مدح، آپؐ کی تعظیم اور محبت، ایمان کے لیے شرطِ اوّل ہے۔ آپؐ کی تعظیم و ثنا اور حرمت و وقار کا قیام دین کا قیام ہے۔ حضورؐ کی شان میں گستاخانہ کلام کرنا امت کے لیے جائز نہیں۔ اگر گستاخی کنندہ مسلمان ہو تو اس کے توبہ کرنے پر بھی سزائے قتل ساقط نہیں ہوگی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جو شخص محبوب خدا ﷺ کے نعلین مبارک کی تحقیر کرے، وہ بھی واجب القتل ہے۔

یہ موضوع اس قدر اہم اور نازک ہے کہ تمام تر پیچیدگیوں اور اپنے مسلک کے چند زعماء کی بے احتیاطیوں کے باوجود، مولانا حسین احمد مدنی، الشہاب الثاقب صفحہ ۵۰ پر حوالے کی صورت میں لکھتے ہیں:

> ''جو الفاظ موہم تحقیر سرور کائنات ﷺ ہوں، اگرچہ
> کہنے والے نے، نیت حقارت کی نہ کی ہو مگر ان سے بھی کہنے
> والا کافر ہو جاتا ہے''

مولانا انور شاہ کاشمیری بھی ''اکفار الملحدین فی ضروریات الدین'' میں تسلیم کرتے ہیں:۔

> ''بارگاہ انبیا میں گستاخی کفر ہے، چاہے اس سے قائل
> کی مراد توہین کی نہ بھی ہو... کل امت کا اس پر اجماع ہے
> کہ نبی اکرم ﷺ کی شان میں ناروا الفاظ کہنے والا کافر ہے
> اور جو شخص اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔''

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں ایک پیش امام قرأت جہر میں ہمیشہ سورۃ عَبَسَ وَتَوَلّٰی کی تلاوت کرتا۔ مقتدیوں کی شکایت پر اسے طلب کیا گیا اور پوچھا کہ تم صرف یہی سورت کیوں تلاوت کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا مجھے حظ آتا ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو جھڑکا ہے۔ یہ جواب سن کر فاروق اعظمؓ نے اس کا سر قلم کروا دیا۔

علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں، آپ کو پتہ چلا کہ امام ہمیشہ نماز میں اسی سورۃ کی قرأت کرتا ہے تو انہوں نے ایک آدمی کو بھیجا جس نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ چونکہ وہ حضورؐ کے مرتبہ عالیہ کی تنقیص کے ارادے سے اس کو پڑھتا تھا تاکہ مقتدیوں کے دل میں بھی آقائے نامدار ﷺ کی عظمت کم ہو اس لئے نگاہ فاروقی میں وہ مرتد و منافق ٹھہرا۔

ابن خطل نامی ایک شخص فتح مکہ سے قبل مدینہ منورہ میں آیا اور مسلمان ہو گیا۔ ازاں بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے وصولیٔ زکوٰۃ کے لیے بعض قبیلوں کی طرف بھیجا۔ اس کے ساتھ ایک انصاری تھا اور ایک خزاعی مسلمان خدمت گاری میں تھا۔ وہ ایک منزل میں اُترا اور خزاعی سے کہا کہ بکری ذبح کر کے اس کے لیے کھانا تیار کرے اور خود سو گیا۔ اس خزاعی نے کوتاہی کا ثبوت دیا اور بروقت کھانے کی تیاری نہ کر سکا۔ بیدار ہونے پر اس نے دیکھا کہ کھانا تیار نہیں ہوا تو غصے میں آکر خزاعی کو قتل کر دیا اور صدقہ کے جانور لے کر کفار مکہ سے جا ملا۔ ان سے کہا کہ تمہارے دین کو میں نے حضرت محمد ﷺ کے دین سے بہتر پایا۔ وہ اپنی باندیوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کی ہجو سنا کرتا تھا۔ جب مکہ فتح ہوا تو اس نے خانہ کعبہ میں پناہ لی اور غلاف کعبہ سے لپٹ گیا۔ جس وقت پیغمبر حسن و جمال طواف فرما رہے تھے، کسی صحابی نے اُسے دیکھ لیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ یہ ابن خطل ہے اور غلافِ کعبہ میں لپٹا ہوا ہے۔ ارشاد ہوا: ''جہاں بھی ہے قتل کرو''۔ لہٰذا حکم نبوی ﷺ کے مطابق اُسے ہلاک کر دیا گیا۔

میرے خیال میں شاتم رسول کے سوا نہ تو کسی کو صحن حرم میں فرمان نبوی ﷺ سے قتل کیا گیا اور نہ ہی اس جرم کے علاوہ کسی کو اپنے طور پر کیفر کردار تک پہنچانے کی اجازت ہے۔ یہی وہ پاجیانہ حرکت ہے کہ جس کے مرتکب کو انجام سے دوچار کرنے کے لیے کوئی بھی غیرت مند مسلمان قانون کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اہانت رسول کے موقع پر بھی خاموش رہا تو وہ ہرگز مسلمان نہیں، کافر و مرتد اور مشرک و زندیق ہے۔ حرمت مصطفوی ﷺ پر جان نہ لڑانے والوں کا دعویٰ اسلام و ایمان کسی صورت بھی قابل اعتنا نہیں۔

حضور اکرم ﷺ کے ایک صحابی بینائی سے محروم تھے۔ ان کی بیوی یہودن تھی اور وہ پیغمبر اسلام ﷺ سے عناد قلبی رکھتی تھی۔ ایک دن صحابی خلاف معمول ذرا دیر سے گھر گئے تو بیوی کے استفسار پر بتایا کہ میں ہادی برحق ﷺ کے پند و نصائح سے مستفیض ہوتا رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ کافرہ آگ بگولا ہوگئی اور واہیات بکنے لگی۔ صحابیؓ نے اسے دو ایک بار منع کیا لیکن وہ باز نہ آئی۔ بالآخر غیور مجاہد نے تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے جہنم رسید کر دیا۔ جب مقتولہ کے ورثا کی طرف سے یہ مقدمہ خیر الوریٰ ﷺ کی بارگاہ ناز میں پیش ہوا تو قاتل نے اقبال فعل کیا اور کہا کہ اس خبیثہ نے میرے نازک آبگینے کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ آپؐ نے اس صحابی کو غازی کا خطاب بخشا اور اس کی تعریف و توصیف فرمائی۔

مدارج النبوۃ میں ایک واقعہ اس طرز پر لکھا ہے کہ عصماء بنت مروان زوجہ یزید بن خطمی، زبان دراز یہودن تھی۔ یہ اپنے عمل و بیان سے متواتر مخبر صادق ﷺ کو ایذا پہنچاتی۔ آپؐ نے حضرت عمیرؓ بن عدی نابینا صحابی کو اس کے خاتمہ کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت عمیرؓ رات کو عصماء کے گھر پہنچے جو مدینہ سے باہر تھا اور اپنی تلوار اس کے سینے پر رکھ کر پشت سے گزار دی۔

ابی عفکہ ایک بوڑھا یہودی تھا۔ یہ حضورؐ کے خلاف لوگوں کو ورغلاتا اور ابھارتا تھا۔ ایسے شعر پڑھتا جن سے توہین مقصود ہوتی۔ سید العرب والعجم ﷺ نے حضرت سالم بن عمیرؓ کو اس کے قتل پر مامور فرمایا۔ یہ ادھر گئے اور تلوار اس کے جگر کے نیچے گھونپی اور چیر پھاڑ دیا۔

حارث بن طلاطلا بھی سید الثقلین ﷺ کو ایذا دینے والوں میں سے تھا۔ فتح مکہ کے دن سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ نے اسے انجام تک پہنچایا اور ابن خطل کی دو گانے والی لونڈیوں، قریبہ اور ارنب کو بھی اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑی۔

حویرث بن نقیذ ایک کمینہ فطرت شاعر تھا اور بارگاہ رسالتؐ کی ہجو کیا کرتا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر جب اپنا مباح الدم ہونا سنا تو گھر میں چھپ کر بیٹھ گیا اور دروازہ بند کر رکھا۔ حضرت علیؓ اس کی تلاش میں آئے اور نہ پا کر لوٹ رہے تھے کہ اچانک وہ ایک کوچہ میں مل گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی اور جگہ روپوش ہو۔ بہر کیف شیر خدا نے وہیں اس کی گردن اڑا دی۔

بشر نامی ایک منافق کا کسی یہودی سے جھگڑا تھا۔ یہودی نے کہا: چلو ہم اپنا قضیہ سید عالم ﷺ سے طے کرا لیں۔ منافق نے خیال کیا کہ حضورؐ تو بغیر رو رعایت محض حق فیصلہ دیں گے اور اس کا مطلب حل نہ ہوگا۔ اس لیے باوجود مدعیٔ ایمان ہونے کے کہا کہ کعب بن اشرف یہودی

کو فیصل مانتے ہیں۔ یہودی اس پر رضامند نہ ہوا کیونکہ وہ رشوت خور تھا۔ چار و ناچار منافق کو دربار اقدس ﷺ میں آنا پڑا۔ فیصلہ یہودی کے موافق ہوا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد منافق یہودی کے درپے ہوا اور اسے مجبور کر کے حضرت عمرؓ کے پاس لایا۔ یہودی نے تمام سرگزشت بیان کی کہ میرا اور اس کا معاملہ فخر کائنات ﷺ نپٹا چکے ہیں مگر اب یہ آپ سے بھی فیصلہ چاہتا ہے۔ فرمایا: ہاں! میں ابھی آ کر فیصلہ سناتا ہوں۔ یہ فرما کر مکان میں تشریف لے گئے اور تلوار لا کر اس رذیل و ذلیل کی گردن اڑا دی۔ نیز فرمایا کہ جو اللہ اور رسولؐ کے فیصلہ سے راضی نہ ہو اس کا عمرؓ کے پاس تو یہی فیصلہ ہے۔

ایک شاعر کے قصیدہ میں اس مفہوم کے اشعار تھے کہ دین اسلام کو صرف حضرت محمد ﷺ کی ذاتی کوششوں کے سبب ترقی ملی۔ سلطان صلاح الدین نے اسے بلوایا اور وضاحت چاہی، لیکن اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ لہٰذا سلطان عادل نے اس کے خبث باطن سے آگاہ ہو کر اسے تہ تیغ کروا دیا۔

تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ اور شاتمان نبی کی ہلاکت و بربادی کا اہتمام ملتِ حجاز نے ابتدا سے ہی روا رکھا۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اس باب میں لاتعداد روشن حوالے اور ایمان پرور نمونے چھوڑے ہیں۔ بلاشبہ مسلمان قوم نے جس جذبۂ ایمانی کے ساتھ رسول صادق ﷺ کی حرمتِ و ناموسِ کا تحفظ کیا، اس کی نظیر دنیا کی کوئی اور قوم پیش نہیں کر سکتی۔ تحریک شاتمتِ رسول، صرف ہندوستان میں نہیں چلی بلکہ قبل ازیں اس فتنے نے اندلس میں بھی سر اٹھایا تھا۔ بلاد اسلامیہ میں جب بھی کسی ناہنجار نے جرات تضحیک کی یا حیات مقدسہ کو افسانوی رنگ دے کر تمسخر اڑایا تو مسلم حکمرانوں نے ایسے بدطینتوں کو قتل کروا کر اپنے مومن ہونے کا ثبوت مہیا کیا۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ایک مرتبہ کوفہ کے عالم کے استفسار پر تحریر فرمایا تھا کہ سوائے اس شخص کے جو سرورِ عالم ﷺ کی بارگاہ میں گستاخی کا مرتکب ہو، کسی اور کو گالی دینے کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا۔

موسیٰ بن مہدی الملقب ہادی عباسی کے عہد میں ایک آدمی نے قبیلۂ قریش کو بُرا بھلا کہا اور صاحب الجود والکرم ﷺ کی شان میں بھی اہانت آمیز الفاظ بکے۔ وہ ہادی کے روبرو لایا گیا۔ اس نے علماء و فقہا کو جمع کر کے فتویٰ لیا جو کہ قتل پر مبنی تھا۔ اس پر خلیفہ نے کہا کہ اس کی سزا کے لیے قریش ہی کی توہین کافی تھی (اس لیے کہ یہ سرکار مدینہ ﷺ کا خاندان ہے) مگر اس دشمن خدا نے

رسول اللہ کو بھی شامل کرلیا۔ چنانچہ اس کا سر قلم کردیا گیا۔

◎

مورخین بتاتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے پس منظر میں بھی تحریک شاتت رسول کارفرما تھی۔ مرقوم ہے کہ پرنس ارطاۃ والیِ کرک ریجی نالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر لشکرکشی کا قصد کیا تاکہ گنبد خضرا اور خانہ کعبہ کو شہید کردے۔ جب وہ سمندری راستے سے حملہ آور ہوا تو سرفروشان اسلام مقابلہ کے لیے موجود تھے۔ اس کی فوج اسلامی لشکر وسپاہ کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ پہاڑوں کی جانب بھاگ نکلے، فرزندان توحید نے انہیں پہاڑوں اور باغوں سے پکڑ پکڑ کر نیست ونابود کردیا۔ لیکن ریجی نالڈ خود جان بچانے میں کامیاب ہوگیا اور اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا صاحب قاب قوسین ﷺ کے متعلق بکواس کرنا اس کی فطرت رہا۔

لین پول لکھتا ہے کہ ریجی نالڈ نے ۱۱۷۹ء میں مسلمانوں کا ایک قافلہ لوٹ لیا اور اس کے تمام افراد گرفتار کرلئے۔ ۱۱۸۳ء میں پھر یہی حرکت کی۔ ۱۱۸۶ء میں مسلمان تاجروں کے ایک اور کارواں کو لوٹ کر قیدی بنالیا۔ جب ان لوگوں نے اس سے رہائی کے لیے کہا تو اس نے طعن آمیزی کی: ''تم محمد ﷺ پر ایمان رکھتے ہو، ان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ آکر تمہیں چھڑا لے جائیں''۔ جس وقت سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو شیطان مذکور کی گستاخانہ گفتگو کی خبر ملی تو انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ اگر خدا نے چاہا تو اس کافر کو میں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔

صلیبی لڑائیوں میں ایک موقع پر جب دشمنان رسول کو شکست ہوگئی اور قیدی دربار میں لائے گئے تو ان میں ریجی نالڈ بھی تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے تمام بداعمالیاں گنوائیں اور کہا کہ اس وقت میں اپنے آقا ومولا ﷺ سے مدد چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر اس موذی کو جہنم رسید کردیا۔ پھر فرمایا، ہمارا یہ دستور نہیں ہے کہ خواہ مخواہ قتل کرتے پھریں۔ ریجی نالڈ تو صرف حد سے بڑھی ہوئی اپنی بداعمالیوں اور امام القبلتین ﷺ کے خلاف گستاخی کی پاداش میں مارا گیا ہے۔

ایک اور تاریخی حوالہ بھی غور طلب ہے:

> ''ابراہیم فرازی ماہر علوم اور اپنے زمانے کا مشہور شاعر تھا۔ وہ قاضی ابوالعباس بن طالب کی علمی مجلس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ جب اس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ خاتم الانبیاؑ کی

بارگاہ میں گستاخیاں کرتا ہے اور استخفاف واستہزا کے کلمات کہتا ہے تو قاضی بن عمرو اور دیگر فقہاء نے اس کو عدالت میں طلب کیا اور اس کی کوتاہیوں کے ثبوت مل جانے پر اس کے قتل اور پھانسی کا حکم صادر کیا۔ چنانچہ پہلے اس کے پیٹ میں چھری ماری گئی اور اس کے بعد اس کو اٹھا کر سولی پر لٹکا دیا گیا۔ نیز بعد میں اس کی نعش سولی سے اتار کر جلا دی گئی۔''

سپین میں امیر عبدالرحمٰن کی رواداری اور اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک سے شہہ پا کر عیسائیوں نے اہانت رسول کی جو تحریک شروع کی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:۔

''اندلس میں عیسائیوں کو اپنے مذہبی مراسم آزادی سے انجام دینے کی جو رعایتیں حاصل تھیں، ان کی کج روفطرت سے اس کا عجیب قسم کا نتیجہ ظاہر ہوا۔ اندلس کے پادری کلیساؤں کے سابقہ اقتدار کو بحال کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر اسلامی حکومت کی عدل گستری اور مساویانہ روش سے عیسائیوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کا موقع نہ مل سکتا تھا، اس لئے انہوں نے چند غالی مسیحیوں میں یہ خیالات ابھارے کہ مذہب کی اصل روح تکلیفیں اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے حکمرانوں کو مشتعل کر کے انسانی جسم اور گوشت پوست کو اذیت پہنچائی جائے تا کہ روح کا تزکیہ ہو۔''

اس شیطانی تحریک کا اصل بانی قرطبہ کا ایک راہب یولوجیئس تھا۔ عیسائی اس کو مجاہدے اور راہبانہ زندگی کی وجہ سے عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی کے پروپیگنڈہ سے متاثر مسیحی نوجوانوں نے داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سب وشتم شروع کیا۔

تاریخی ماخذ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تحریک شاتت رسول ۸۵۰ء مطابق ۲۳۴ھ میں شروع ہوئی اور ۸۶۰ء میں اس کا مکمل طور پر قلع قمع ہو گیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس عرصے میں بہت سے شاتمان مصطفیٰ کو واصل جہنم کیا گیا۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں ۵۳ء افراد کی فہرست ہے۔ سٹینلے لین پول کہتا ہے کہ ۸۵۱ء کے موسم گرما کی دو ماہ سے کم مدت میں گیارہ اشخاص کو موت کی نیند

سلا دیا گیا۔ ہیرلڈ لیورمور تعداد بتائے بغیر بہت سے عیسائی افراد کے قتل کا بیان کرتا ہے۔

الغرض یولوجیئس، اس کی محبوبہ فلورا، فلورا کی سہیلی میری، پرفیلکس نامی ایک پادری، عیسائی سوداگر یوحنا، راہب اسحاق، سیسی نند، پواس، تھیودو، منیر آئزک اور جرمیاس و جانتوس سمیت چھ راہب بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان کو بھی گستاخی رسول کے جرم میں موت کی نیند سلایا گیا تھا۔ بالآخر مفسد و مجنوں طبائع کا شر، محمد بن عبدالرحمٰن کے عہد میں یولوجیئس کے قتل سے رفع ہوا۔

الشفا میں قاضی عیاضؒ نے شاتم النبی کی سزا کے بارے میں ایک مستقل باب قائم کیا اور لکھا ہے:۔

ابوبکر بن منذر نے کہا کہ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص نبی اکرم ﷺ کی شان میں واہیات کرتا ہو، اسے قتل کر دینا چاہیے۔ یہ بات حضرت مالک بن انس، لیث، احمد اور اسحاق وغیرہم نے بھی کہی ہے۔ قاضی ابوالفضل نے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیق کے قول کا بھی تقاضا یہی ہے اور تمام علماء کے نزدیک ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ محمد بن سحنون کہتے ہیں کہ تمام علمائے اُمت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شاتم النبی یا وہ شخص جو کوئی ایسے شخص کے کافر اور مستحق عذاب ہونے میں شک کرے وہ خود بھی کافر ہے۔ ابراہیم بن حسین بن خالد الفقیہ نے اس سلسلے میں حضرت خالدؓ بن ولید کے اس عمل سے دلیل پکڑی ہے کہ انہوں نے مالک بن نویرہ کو محض اس لئے قتل کر دیا تھا کہ اس نے حضور پاک ﷺ کو "تمہارے ساتھی" کہا تھا، رسول نہیں۔

مبسوط میں عثمان بن کنانہ سے مروی ہے کہ جو شخص مسلمان ہو کر محبوب خدا ﷺ کے متعلق بُرا لفظ اپنی زبان سے نکالے، اسے قتل کیا جائے یا زندہ سولی دے دی جائے اور اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔

امام احمد بن ابراہیم کی کتاب میں ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا: "جو شخص حضور اکرم ﷺ کو گالی دے اسے قتل کیا جائے اور توبہ قبول کرنا نا قابل معافی گناہ ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر۔" اصبغ تاکید کرتے ہیں کہ اسے ہر صورت میں قتل کیا جائے۔ خواہ وہ اعلانیہ توہین کرے یا خفیہ طور پر۔ ابوالحسن قابسی نے اس آدمی کے بارے میں جس نے سرکار مدینہ ﷺ کے بارے میں یہ کہا کہ آپ جمال (بوجھ ڈھونے والے یا ابوطالب کے یتیم) تھے، فتویٰ دیا کہ اس کی گردن ماردی جائے کیونکہ یہ کہہ کر وہ آپؐ کی توہین کرنا چاہتا ہے۔

ابوعبداللہ بن عقاب نے اس عشار (عشر وصول کرنے پر مامور) کے بارے میں قتل کا حکم

صادر فرمایا تھا جس نے عشر وصول کرتے وقت ایک شخص سے کہا کہ عشر تو پہلے ادا کرو، اس کے بعد شکایت کرنی ہو تو کر لینا۔ میں نے اگر عشر طلب کیا ہے تو اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے طلب کیا۔ اگر میں جاہل ہوں تو (نعوذ باللہ) آپ بھی ایسے تھے کہ انہوں نے بھی عشر وصول کیا۔ فقہائے اندلس نے بالاتفاق ابن حاتم طلیطلی کے قتل اور سولی دینے کا فتویٰ دیا، جس نے ایک مناظرے کے دوران نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے آپؐ کو یتیم اور علیؓ کا خسر کہا تھا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ آپؐ کا زہد اختیاری نہیں تھا بلکہ اگر دنیوی نعمتیں میسر آتیں تو ان کو استعمال فرماتے۔

حبیبؒ بن ربیع فروی نے کہا ہے کہ جو شخص بھی محسن انسانیت ﷺ میں کسی قسم کا نقص نکالے، اسے توبہ کرائے بغیر ہلاک کر دینا چاہیے۔ قاضی عیاضؒ مزید کہتے ہیں کہ جو شخص آپؐ کے مرتبہ کو کم جانے یا آپؐ کو بکریاں چرانے سہو ونسیان اور جادو کے حملے یا آپؐ کو زخم لگنے یا آپؐ کے لشکر کی شکست یا دشمنوں کی ایذا رسانی یا آپؐ پر مصائب وشدائد کے نزول سے عار دلائے یا ہدف تنقید بنائے تو ان سب باتوں کا حکم یہ ہے کہ جو کوئی ان باتوں سے آپؐ میں کمزوریاں اور خامیاں نکالنے کا ارادہ کرے، وہ بہر حال تہ تیغ کیا جائے گا۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ ایک شخص حضور اکرم شفیع معظم ﷺ کا ذکر نازیبا الفاظ میں کرتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے اس دشمن کو کون ٹھکانے لگائے گا؟ تب حضرت خالد بن ولید نے اس ملعون کو دوزخ کا ایندھن بنایا۔

یہ بھی روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے آقائے نامدار پر جھوٹ باندھا تو آپؐ نے حضرت علی المرتضیٰؓ اور حضرت زبیرؓ کو بھیجا کہ اسے مار ڈالو۔

ابن قانع نے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے باپ کو اپنے آقا و مولا ﷺ کی شان میں برے کلمات کہتے ہوئے سنا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے اس کا سر اڑا دیا ہے۔ یہ بات شہ لولاک ﷺ کو ناگوار نہ گزری۔

سرور کائنات فخر موجودات ﷺ سے عشق ومحبت ایمان کے لیے شرط اوّل ہے اور تاریخ اسلام میں جا بجا اس کے عملی مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ وفاء الوفا میں ہے کہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ اگر مسجد نبوی ﷺ کے گرد کسی مکان میں میخ ٹھونکنے کی آواز سنتیں تو کہلوا بھیجتیں کہ ساقی کوثر ﷺ کے سکون کا خیال کرو۔ اسی طرح سیدنا حضرت علی المرتضیٰ نے اپنے گھر کے دروازے کواڑ

مناصح میں بند کرائے کہ مبادا لکڑی کی تیاری میں اس کی آواز سے سلطان امم فخر بنی آدم ﷺ کو اذیت پہنچے۔

حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ عشاء کے وقت سیدنا حضرت عمر فاروق ؓ مسجد نبویؐ میں تھے، ایک شخص کے ہنسنے کی آواز آئی۔ آپؓ نے بلا کر پوچھا، تم کون ہو؟ اس نے اپنا تعلق بنو ثقیف سے بتایا۔ فاروق اعظمؓ نے پھر پوچھا، کیا تم مدینہ منورہ کے ہی رہنے والے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں، میں طائف کا ہوں۔ یہ سن کر آپؓ نے اس کو خفگی کے انداز میں سمجھایا کہ اگر تم یہاں کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا کہ اس مسجد میں آواز بلند نہیں کی جاتی۔



اہل محبت کا امتیازی شیوہ یہ ہے کہ اپنے محبوب کی توہین برداشت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عشق و وفا کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ جب محسوس ہو کہ اس کے محبوب پر افترا باندھا گیا اور نقصان پہنچانے کی کوشش ہوئی تو خرمن دل میں آگ بھڑک اٹھے اور وہ محبوب کے دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس لحاظ سے جتنے راحت انگیز مظاہر امت مسلمہ نے پیش کیے، دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی، حتیٰ کہ آج کے مادیت گزیدہ دور میں بھی جاں نثاران ناموس رسالت کی کمی نہیں۔ بناء بریں ایک اور ایمان افروز حقیقت یہ ہے کہ گستاخانِ رسول کے لیے خدائی فیصلے اور سزائیں بھی اترتی رہی ہیں۔ ابولہب کے بیٹے عتبہ کا جو انجام ہونا تھا سو ہوا لیکن خود ابولہب کا انجام بھی عبرتناک ہے۔ جب دُرِ یتیم ﷺ نے کوہِ صفا پر اہلِ مکہ کو دعوتِ توحید دی تو اس پر مردود مذکور نے (العیاذ باللہ) حضورؐ سے کہا کہ تباہ ہو جاؤ، آپؐ نے ہمیں اس لئے بلوایا تھا۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ اللہب اتاری کہ تباہ ہو جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ ہو ہی گیا۔

جب عاص بن وائل نے آقائے نامدار حبیب کردگار ﷺ کے بارے میں ''ابتر'' کا لفظ استعمال کیا تو خداوند کریم نے سورۂ کوثر نازل فرما دی۔ اس میں حضورؐ کو خیر کثیر عطا فرمانے کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ''ابتر'' تو آپ کا دشمن رہے گا۔

علاوہ ازیں ابولہب کی بیوی ام جمیل (اروہ) کے گلے میں کھجور کی چھال کے رسے کی بابت فرمایا اور وہ اس طرح مری کہ سر پر گٹھا اٹھائے آ رہی تھی، راستہ میں ستانے کو بیٹھی، گٹھا پیچھے کو کھنچا اور اسی سے گردن میں پھانسی پڑ گئی۔ اس پر آگ میں دھنسنے کا ذکر بھی ہے۔

ولید بن مغیرہ نے خالق کائنات کے عظیم ترین ومقدس ومنزہ شاہکار ﷺ کی بے ادبی کی۔ نعوذ باللہ مجنوں کہا تو خالق و مالک نے قلم اور اس کے لکھے کی قسم کھا کر فرمایا:
''آپ تو اپنے رب کے فضل سے مجنوں نہیں ہیں۔'' پھر اس ملعون و ناپاک کی دس برائیاں گنواتے ہوئے آخر میں فرمایا: یہ تو ولدالزنا ہے۔ اس کی ناک داغے جانے کی بھی خبر دی۔ یہ پیشگوئی اس طرح پوری ہوئی کہ غزوہ بدر میں ولید بن مغیرہ کی ناک کٹ گئی اور وہ جہاں سے گزرتا تھا لوگ کہتے کہ یہ وہی ہے جس کے متعلق اللہ نے کہا تھا کہ اس کی ناک داغی جائے گی۔

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

مسلمانانِ ہند اور آریہ سماج تحریک

قصص الانبیاء کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب حضرت آدمؑ جنت سے نکالے گئے تو وہ پہلے ہندوستان کے جنوبی جزیرہ میں آئے اور حوا عرب میں پہنچیں۔ ان دونوں کی ملاقات جدہ میں ہوئی۔ گویا عرب اور ہند سے تعلق رکھنے والوں کی یہ پہلی ملاقات تھی جو اس کرۂ خاکی پر وقوع پذیر ہوئی۔

مستدرک حاکم میں، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آقائے مدنی ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ میری اُمت والے ہندوستان کے کافروں سے جنگ لڑیں گے۔ یہ حدیث یوں شروع ہوتی ہے: ''قال وعدنا رسول اللہ، غزوۃ الہند...'' فرمایا: اس لڑائی میں شریک ہونے والوں کا مقام بہت بلند ہوگا۔ میری امت میں سے ان کا، جو کفار ہند سے لڑیں گے۔

حضرت ابو ہریرہؓ اس بارے میں کہتے ہیں کہ سرورِ کون و مکاں ﷺ نے امت کے ان افراد کی بڑی عظمت بیان فرمائی اور اس کی وجہ سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر میری زندگی میں یہ موقع آیا تو میں اپنی جان و مال سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کردوں گا اور اگر اس میں مارا گیا تو صرف شہید نہیں بلکہ افضل ترین شہیدوں میں میرا شمار ہوگا اور اگر جنگ سے زندہ واپس آ گیا تو غازی بن کر جہنم سے آزادی کا پروانہ لے آؤں گا، کیونکہ رسول پاک ﷺ نے ہم سے انہی باتوں کا وعدہ فرمایا تھا۔ گویا اگر مارا گیا، تب بھی جنتی اور زندہ بچ گیا تو پھر بھی جنت ہاتھ سے نہیں جائے گی۔

اس حدیث مبارکہ کی مزید تائید حضرت ثوبانؓ کی شہادت سے ہوتی ہے۔ ان سے مروی ہے کہ تاجدارِ مدینہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کی دو جماعتوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے آزاد کر دیا ہے۔ ایک وہ جماعت جو ہند کے کافروں سے لڑے گی اور دوسری جو حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے آنے پر ان سے مل کر دجال کا مقابلہ کرے گی۔

رسول اکرم ﷺ کی ایک اور حدیث بیان کی جاتی ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: مجھے ملک ہند کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے — پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے — میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ایک قدیم عربی نسخے ''عجائب الہند'' میں لکھا ہے کہ جب یہاں کے رہنے والوں کو جناب رسالت مآب ﷺ کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے ایک سمجھ دار آدمی تحقیق حالات کے لیے بھیجا۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچا تو رسول اکرم، شفیع معظم، فخر بنی آدم، سلطان ہر عالم ﷺ بلکہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق ؓ بھی وصال پا چکے تھے اور خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کا دور خلافت تھا۔ انہوں نے اس پر خاص توجہ فرمائی اور وہ اپنی تشفی کے بعد ہندوستان کی طرف واپس پھرا۔ راستے میں وہ تو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا مگر اس کا ایک ملازم صحیح سلامت لوٹ آیا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر اور فاروق اعظمؓ کا سارا حال سنایا اور ان کے فقیرانہ و درویشانہ طور طریقوں کا بالتفصیل تذکرہ بیان کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور منکسر المزاج ہیں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے اور مسجد میں سوتے ہیں۔

ایک اور تاریخی نسخہ میں مرقوم ہے کہ راجہ بھوج ایک بڑے مشہور حکمران ہوئے ہیں، جو پلیا کے باشندے تھے۔ اس کو عام لوگ بھوج پور بھی کہتے ہیں۔ وہاں ایک عمارت ''رصد خانہ'' کے نام سے موجود ہے، لیکن ''جنتر منتر'' اس کا عرفِ عام ہے۔ وہ بہت پرانی ہے اور فلکیات کے زائچے اور نجوم کے حسابات اس پر منقش ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسی جگہ راجہ بھوج کے شاہی محلات تھے۔ راجہ مذکور شق القمر کے معجزہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے، ان کا اسلامی نام شیخ عبداللہ تھا۔ ان کے ایمان لانے سے ان کے گھر والے اور سب دوسرے لوگ ان کے مخالف ہو گئے تھے، لہٰذا وہ ترکِ وطن کر کے دھاروار (گجرات) جانے پر مجبور رہے اور بقیہ زندگی انہوں نے سلطنت کو خیرباد کہہ کر یادِ الٰہی میں وہیں گزار دی۔

ایسے حوالوں میں ایک بزرگ بابا رتن کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر ایمان لائے تھے۔ رسول پاک ﷺ نے اپنے دست مبارک سے چھ کھجوریں ان کو کھلائیں، ان کے لیے طویل العمر ہونے کی دعا فرمائی اور اپنا پیرہن مبارک بھی مرحمت فرمایا۔ چنانچہ اس دعا کی تاثیر سے حضرت حاجی بابا رتن کی عمر چھ سو

بتیس سال ہوئی۔ آپ کا مزار بھٹنڈہ اسٹیشن کے قریب ریاست پٹیالہ میں ہے۔

مولانا آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں اس طرح کی کئی روایات قلمبند کی ہیں لیکن دیگر مآخذ بھی موجود ہیں، تحفۃ المجاہدین میں لکھا ہے کہ جب ٹراونکور کا مہاراجہ تخت نشین ہوکر تلوار حاصل کرتا تھا تو اسے کہنا پڑتا: 'میں یہ تلوار اس وقت تک رکھوں گا جب تک مربی جو کہ مکہ معظمہ گیا ہوا ہے، لوٹ نہیں آتا'

بعض روایات مقامی تواریخ اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی یادداشتوں کے ذریعے بہم پہنچتی ہیں۔ اس کے مطابق خطہ ہند میں صحابہ کرامؓ کی آمد بھی ثابت ہے۔ مشہور ہے کہ کراچی کے غازی عبداللہ انہی نفوس قدسیہ میں سے تھے۔ نیز پاکپتن شریف میں بھی ایک صحابی (عزیز مکی) کا مقبرہ ہے۔

اس پہلو پر عموماً مورخین صاد کرتے ہیں کہ موجودہ سندھ میں عہد اسلامی کی سب سے قدیم زیارت گاہ شیخ ابوترابؒ کا مزار ہے۔ بیان ہے کہ شیخ ایک تبع تابعی تھے اور عباسی خلافت کے دوران میں ضلع ساکورہ اور اس علاقہ کے مضبوط قلعہ تھرہ شہر بکار (بھکر) اور مغربی سندھ کے بعض مواضعات پر قابض تھے۔ آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے اور گنبد پر تاریخ ۱۷۱ھ درج ہے۔

اسلامی عرب اور برصغیر پاک و ہند کا پہلا باقاعدہ رابطہ جو کتبِ تواریخ میں مذکور ہے، آغازِ اسلام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد شاید حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ہوا تھا۔ مشہور مورخ طبری لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حکم بن عمرہ تغلبی جو اسلامی فوج لے کر مکران جا رہے تھے کہ راستہ میں ایرانی فوج نے ان کا مقابلہ کیا۔ ایرانیوں نے اپنی مدد کے لیے سندھ کے راجہ سے فوج منگائی تھی، جو عربوں کے خلاف صف آرا ہوئی۔ لیکن ایران اور سندھ کی متحدہ فوجیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور جو مال غنیمت عربوں کے ہاتھ لگا اس میں ہندوستان کے ہاتھی بھی تھے۔ اس زمانے میں بحرین کے عرب گورنر عثمان بن ابی العاص الثقفی نے عمان کے راستے ساحل ہند پر ایک لشکر بھیج دیا جو علاقہ بمبئی میں مقام تانہ (تھانہ) تک آیا۔

علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت سواد بن قارب کا ایک انتہائی قابل غور، دلچسپ اور روح پرور واقعہ قلمبند کیا ہے۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں۔ ایک روز حضرت عمرؓ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپ نے پوچھا تم میں سواد بن قارب ہے؟ خاموشی طاری رہی۔ آئندہ سال

آپ نے پھر یہی سوال دہرایا۔ میں نے عرض کیا: یہ سواد کون صاحب ہیں؟ فرمایا، ان کے ایمان لانے کا واقعہ بڑا عجیب وغریب ہے۔ اسی اثنا میں حضرت سواد بھی آ پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اے سوادؓ، اپنے ایمان لانے کا واقعہ بیان کرو۔

سواد بولے: اے امیر المومنین! میں ہند میں تھا۔ ایک جن میرے تابع تھا۔ ایک شب میں سویا ہوا تھا۔ اس جن نے آ کر مجھے خواب میں کہا: اٹھو اور میری بات سنو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبیؐ مبعوث فرمایا ہے۔ دوڑو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ تین رات یونہی ہوتا رہا۔ اس کے بار بار کہنے سے میرے دل میں اسلام کی محبت پیدا ہوگئی اور میں اونٹنی پر سوار ہو کر مکہ مکرمہ پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ حضور پاکؐ کے آس پاس حلقہ بنائے بیٹھے ہیں۔ جب حضورؐ کی نگاہ مجھ پر پڑی تو فرمایا: اے سواد! خوش آمدید، جو تجھے لے آیا ہے ہم اس کو بھی جانتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میں نے چند شعر نظم کئے ہیں، اجازت ہو تو پیش کروں؟ آپؐ نے اجازت فرمائی اور میں نے قصیدہ پیش کیا۔

حضرت سواد کا یہ تاریخی قصیدہ عربی میں ہے اور نام بھی اسی طرز پر ہے۔ حضرت سواد عربی النسل تھے اور یوں لگتا ہے کہ وہ بغرض سیاحت وتجارت ہندوستان تشریف لائے ہوں گے اور پھر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا ہوگا۔ اس سے عرب و ہند میں آمد و رفت اور تجارتی لین دین کے کئی مزید گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔ کفار ہند کے خلاف جہاد کی رعایت سے یہ روایات و واقعات مسلمان ہند کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

اس خطہ ارض پر ہندومت اور اسلام کی کشمکش بھی صدیوں پر محیط ہے۔ مسلمانوں کی تمام تر رواداری، حُسن سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کے باوجود متعصب ہندوؤں اور لالچی پروہتوں نے باہم چپقلش کا ماحول آغاز ہی میں پیدا کر دیا تھا۔ میدان جنگ میں آمنا سامنا اور جغرافیائی عداوت علیحدہ موضوع ٹھہرا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فکری تصادم اور مذہبی قیادتوں کے ٹکراؤ کا سلسلہ بھی بہت پرانا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندومت کے پیروکاروں نے بہت پہلے رسول عربی ﷺ کے نام لیواؤں کے خلاف طبل جنگ بجا دیا تھا۔

ایک مشہور مورخ جو التمش کے عہد میں ہندوستان آیا تھا، اپنے مشاہدات قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”مجھے ایک مرتبہ کھنبائت جانے کا اتفاق ہوا جو سمندر کے کنارے

ایک شہر ہے اور وہاں دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت آباد ہے۔ یہاں میں نے سنا کہ راجا جنک کے زمانے میں مسجد تھی۔ اس کے ساتھ ایک مینار تھا جس پر چڑھ کر مسلمان اذان دیا کرتے تھے۔ پارسیوں (اصل کتاب میں لفظ ''ترسایاں'' ہے۔ سید سلیمان ندوی اس سے پارسی مراد لیتے ہیں جب کہ پروفیسر ہوڈی کی تحقیق کے مطابق اس سے ''جین'' مراد ہیں) نے ہندوؤں کو بھڑکا کر مسلمانوں سے لڑا دیا۔ ہندوؤں نے مینار توڑ دیا اور مسجد کو مع ۸۰ مسلمانوں کے شہید کر دیا۔''

ہندوؤں کی تنگ نظری اور جھگڑالو فطرت، شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دور حکومت میں انتہا کو پہنچ گئی۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے بڑا نازک اور تکلیف دہ تھا۔ مسلمانوں کو سماجی اور سیاسی طور سے ختم کرنے کی ایک پیچ در پیچ سازش ہوئی۔ حضرت مجدد الف ثانی اس بارے میں گہرے دکھ اور کرب کے انداز میں لکھتے ہیں:۔

''ہندوستان کے کفار بے تحاشا مسجدوں کو ڈھاتے ہیں اور ان کی جگہ مندر بناتے ہیں۔ اس طرح کفار، علانیہ کفر کی رسمیں انجام دیتے ہیں لیکن مسلمان اسلام کے اکثر احکام بجالانے سے مجبور ہیں''۔

ان کی تشویش دوسری جگہ مزید بڑھ جاتی ہے:

''ہندو صرف اس پر راضی نہیں کہ اسلامی حکومت میں کھلے بندوں ان کے کافرانہ قوانین نافذ ہو جائیں بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام اور قوانین سرے سے ناپید اور نابود کر دیئے جائیں۔ ان کو مٹا دیا جائے کہ شعائر اسلامی اور مسلمانوں کا کوئی اثر اور نشان یہاں باقی نہ رہے''۔

مغل اعظم کے مزاج میں دخیل ہونے اور انتظامیہ پر گرفت کا ہی اثر تھا کہ صورتحال نہایت مخدوش ہو گئی۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ایک مکتوب میں اس کی وضاحت فرماتے ہیں:

''اسلام کی کسمپرسی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ کفار برملا اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں اور اہلِ کفر کی تعریفیں کرتے ہیں اور اس کے برعکس مسلمانوں کو احکام اسلام کی ادائیگی سے منع کیا جاتا ہے اور انہیں رسوا

کیا جاتا ہے اور انہیں طعنے دیئے جاتے ہیں"۔

"ہندوؤں کے برت کے دنوں میں یہ اہتمام ہوتا ہے کہ دن میں کوئی مسلمان روٹی نہ پکائے اور نہ فروخت کرے اور اس کے برعکس ماہ رمضان المبارک میں وہ برملا روٹی/کھانا بیچتے ہیں اور اسلام کی کسمپرسی کی وجہ سے انہیں کوئی روک نہیں سکتا"۔

اس موڑ پر حد درجہ اذیت ناک واقعات پیش آئے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ نگرکوٹ کے قریب ہندوؤں نے مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے اور تھانیسر میں ایک مسجد اور مقبرہ منہدم کر کے مندر بنا دیا گیا۔ ان دنوں فخر ہر عالم سرور کون و مکاں ﷺ کی شانِ رفیع میں کھلم کھلا بے ادبی کی جانے لگی تھی۔ ایک ثقہ مورخ لکھتا ہے:

"چند بدبخت ہندو اور بعض ہندو مزاج مسلمان حضور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر صراحتاً اعتراض کرتے تھے"۔



تاریخی لحاظ سے مغلیہ حکومت کے دو حصے ہیں۔ بابر سے عالمگیر تک اور عالمگیر سے بہادر شاہ ظفر تک۔ اورنگ زیب عالمگیر مغلیہ ترکش کا آخری تیر تھا، جس کے بعد شاہی سطوت و طنطنہ کبھی ان کا مقدر نہ ہوا۔ اب وہ تلوار کی جھنکار سے گھبراتے اور قلقل کو حاصل زیست سمجھتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد گوروں کا راستہ صاف تھا۔ دہلی کا یادگار دور ختم ہوا اور بزم مغلیہ کا آخری چراغ آخری ٹمٹماہٹ کے ساتھ بجھ گیا اور مسلمان ذلت ناک شکست سے دوچار ہوئے۔ جب قومیں شکست سے دوچار ہو جائیں تو معرکہ خاک و خون کو "بغاوت" اور آزادی کی جنگ کو "غدر" کا نام مل جاتا ہے۔ چونکہ اس سے قبل مسلمان ہی حکمران تھے اور جنگ میں مزاحمت کے روحِ رواں بھی۔ اس لئے ملتِ اسلامیہ ہند نو وارد قوم کے دل میں کھٹک رہی تھی۔ ہندو کی ہرجائی فطرت نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ روایتی چاپلوسی سے انہوں نے انگریز کو رام کر لیا۔ وہ اپنے خوشامدانہ لہجے کی کرشمہ سازیوں سے ان کے قریب قریب اور مسلمان تنفر کی چنگاریوں کے سبب دور دور ہوتے چلے گئے۔ گویا جنگ آزادی کی انتہا مسلمانوں پر مظالم کی ابتدا تھی۔

تاج برطانیہ نے مسلمانانِ ہند کے جذبۂ حریت کو گہری نیند سلانے کے لیے کئی نسخے آزمائے۔ ان میں سب سے خطرناک اور پریشان کن ہندو احیا کی انتہا پسندانہ تحریکیں، شدھی اور

سنگھٹن تھیں۔ انگریز اور ہندو کی مشترکہ خواہش تھی کہ مسلمان ایک فعال قوم کی حیثیت سے دوبارہ نہ ابھر سکیں تاکہ وہ بلاشرکت غیرے پاک و ہند کے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھیں اور یہاں رام راج قائم ہو۔ چنانچہ ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندو مہاسبھا کو ازسرنو منظم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ سوامی شردھانند اور لالہ لاجپت رائے نے ہندو دماغ میں یہ خیال جاگزیں کیا کہ بھارت ورش کی حقیقی مالک آریہ جاتی ہے۔

حق دشمنی اور مسلم کشی کے منشور پر مختلف الخیال ہندوؤں میں اتحاد پیدا ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ چنانچہ اس دھرتی پر مسلمانوں کو ترغیب وتحریص اور جبر وتشدد کے ذریعے دام غلامی میں لانے اور مرتد بنانے کا خطرناک کھیل کھیلا گیا۔ اس میں سب سے گھناؤنا اور روح فرسا طریقۂ واردات شانِ رسالت مآب ﷺ میں گستاخی کا تھا۔ تحریک شماتتِ رسول کو ہندوؤں اور انگریزوں نے اپنی زندگیوں کا مقصد بنالیا تھا۔

قبل ازیں اس فتنے نے اندلس میں بھی سر اٹھایا، لیکن فرق یہ ہے کہ بلاد اسلامیہ میں جب بھی کسی افترا پرداز نے ذات اقدس ﷺ کی طرف انگلی اٹھائی یا تمسخر اڑایا تو مسلم حکمرانوں نے انہیں قتل کروا کر اپنے مومن ہونے کا ثبوت دیا۔ جبکہ ہندوستان میں گوروں کی حکومت تھی، لہٰذا تخصیص یہ ہے کہ دہن دراز گستاخانِ نبی کا قلع قمع کرنے والوں نے خود بھی جام شہادت نوش فرمایا۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا عہدِ حکومت مسلمانان عالم کا دورِ عروج تھا۔ تاہم سیاسی زوال شروع ہوتے ہی بعض متعصب مسیحی مورخین، یہودی اہل قلم اور پیروکاران ہندومت نے بار بار اپنی گھٹیا فطرت کا مظاہرہ کیا۔ کوئی نہ کوئی غلیظ زبان اور کج فکر مذہبی دلآزاری کا سامان کر کے مسلمانوں کے تاریخی ورثے اور جذبات واحساسات کا تمسخر اڑاتا رہا ہے۔ مشاہیر ملتِ اسلامیہ کو مطعون کرنے کی ناپاک جسارت ان کی دیرینہ فطرت ہے۔

مختلف ادوار میں رسولِ عربی ﷺ کی اہانت پر مبنی متعدد رسائل طبع ہوئے۔ کفار کی ایک تعداد نشتر قلم سے تاریخی حقائق کا پیٹ چاک کر کے اور من گھڑت قصوں کے بل بوتے پر ہمیشہ فتنے جگانے میں ہمہ تن مصروف رہی۔ اس سے اہل ایمان کے دلوں میں غیظ وغضب کا لاوا اُبلتا اور غم و اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے اور مودت کیش مسلمانوں کے نازک آبگینوں کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے۔ کئی بار شعائر اسلام کی صداقت وعظمت کو جھٹلایا اور افضل البشر ﷺ کی پاکیزہ سیرت پر سوقیانہ

در کیک حملے کر کے اہل ایمان کی عقیدت کو آزمائش میں ڈالا گیا۔

دراصل اجنبی حکمران بہت جلد یہاں کے باشندوں کو عیسائی بنانے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کی مجلس کے صدر مسٹر مینکلز نے ۱۸۵۷ء میں حالات پر گرفت پا چکنے کے فوراً بعد برطانوی پارلیمنٹ میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

''قدرت نے ہندوستان کی وسیع سلطنت انگلستان کو اس لئے تفویض کی ہے کہ خداوند مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک فاتحانہ لہرائے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی قوت صرف کر دے تا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کا کام جاری رکھنے میں کسی وجہ سے کوئی تعویق نہ ہو سکے''۔

ہندوستان میں انگریز کی مشنری سرگرمیاں سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' (Life Of Mohammad) سے شروع ہوتی ہیں۔ غالباً یہ کتاب چار جلدوں میں تھی اور جب شائع ہو کر ہندوستان میں پہنچی تو سر سید احمد خاں کا درد وغم اور جوش وخروش قابل دید تھا۔ سید صاحب ولایت سے مولوی مہدی علی خاں کے نام ارسال کئے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ولیم میور کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں، تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتابیں منگانی شروع کر دی ہیں۔''

الغرض انہوں نے شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ خطبے یا مضمون لکھ کر ایک قابلِ اعتماد انگریز سے انگلش میں ترجمہ کرائے اور لندن میں ہی ''خطبات احمدیہ'' کے نام سے چھاپ کر ان کو مشتہر کیا۔

رسوائے زمانہ ولیم میور کے طرز پر اب بھی کئی ایک ناول مغربی عزائم کے آئینہ دار ہیں۔ صیہونی منصوبے کی ایک کڑی "The Mahdi" (دی مہدی) ہے۔ اس ناول میں امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کی مشترکہ سازش سے ایک ایجنٹ ''ابو قادر کو مکہ معظّمہ میں حج کے موقع پر امام مہدی بنا

کر پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۷۷ء میں جب شاہِ ایران، اقتدار سے مضبوطی کے ساتھ چمٹا ہوا تھا تو اچانک مغربی مارکیٹ میں ایک ناول "The Crash of 79" (۷۹ کا بحران) منظر عام پر آیا۔اس میں دکھایا گیا تھا کہ عراق نے شط العرب پر مکمل قبضہ حاصل کرنے کے لیے اہواز اور ابادان پر حملہ کر دیا ہے۔ سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک عراق کی امداد پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ایران نے عراق پر جوابی حملہ کر کے اس کے جنوب مشرقی علاقے پر بھی حملے شروع کر دیئے ہیں، یہاں تک کہ پورے خلیجی علاقے میں ایٹمی تابکاری پھیلنے سے زبردست جانی اور مالی تباہی پھیل جاتی ہے۔اس ناول کی اشاعت کے تین سال بعد خلیج میں ایران عراق جنگ چھڑ گئی، مگر حیران کن پہلو یہ ہے کہ بہت پہلے ''ڈیلی ٹیلی گراف'' نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھ دیا تھا: ''یہ ہے تو ناول ہی، مگر کل کلاں یہ کمر توڑ دینے والی حقیقت کا روپ بھی دھار سکتا ہے''۔

ایلن ولیمز کا ایک ناول "Holy Of Holies" (مقدس ترین) بھی چھپ چکا ہے۔اسے برطانیہ کی ''گراناڈا پبلشنگ کمپنی'' نے شائع کیا تھا۔اس میں اسلام کو کینسر کا نام دیا گیا ہے، جس کے وجود سے کرہ ارضی کو نجات دلانے کے لیے ایک مہیب آپریشن کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔اس پروگرام میں روس، فرانس، برطانیہ، امریکہ اور اسرائیل کی خفیہ تنظیموں کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ پانچ دیو قامت ہرکولیس جہاز جزیرہ قبرص میں جمع کیے جاتے ہیں جن میں جوہری بموں کے علاوہ ایک خاص اعلان کا ٹیپ نصب ہے۔اڑان سے پہلے مشن کے ارکان کو بتایا جاتا ہے کہ وہ ایسے خوش قسمت افراد ہیں جو مغرب کی تہذیب کے دفاع کی خاطر اور ایک غیر مہذب، جاہل اور ظالم طاقت ''اسلام'' کو تباہ کرنے جارہے ہیں اور یہ کہ تاریخ میں وہ مغرب کے ہیرو قرار پائیں گے۔ الغرض ناول کے پلاٹ کے مطابق پانچوں طیاروں سے خفیہ جوہری بم پھٹتے ہیں اور قیامت کی سی تباہی آجاتی ہے۔حرم کعبہ اور مکہ مکرمہ کا پورا شہر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔وہاں موجود تیس لاکھ حجاج میں سے پانچ لاکھ فوری طور پر لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔

مزید برآں یہ کہ چند برس قبل ''نیوز ویک'' نے بھی یوگوسلاویہ کے ایک فرضی مسلم پروفیسر ''کروزدانی'' کی زبان سے اسلام کے بنیادی عقائد کا مذاق اڑاتے ہوئے انہیں خالص زہر کا نام دیا تھا۔

جناب مسعود کھدر پوش کے ایک خط مطبوعہ ''روزنامہ جنگ'' لاہور سے بھی اہل مغرب کی

شیطانی جدوجہد اور خطرناک منصوبہ بندی کا ایک لرزہ خیز انکشاف ہوتا ہے:

''میں ۱۹۵۰ء میں امریکہ لیکچر دینے گیا۔ اس کے منتظم ایک یہودی کمپنی کے سربراہ مسٹر سکا نیک تھے جو پاکستان میں چار پانچ ماہ قیام کر چکے تھے...... وہاں کئی یہودیوں نے مجھ سے ملاقاتیں شروع کر دیں جن میں وہ بار بار یہ کہتے کہ دنیا جنگ کے خوف سے بہت پریشان ہے۔ ان حالات میں کسی 'مہدی' کی آمد کی شدید ضرورت ہے۔ پھر کبھی کبھی مجھے سمجھاتے کہ آپ میں 'مہدی' بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ آخر کار ایک روز تین حضرات میرے پاس نہایت ہی رازداری میں یہ بات کہنے آئے کہ ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ آپ مہدی بن سکتے ہیں۔ اگر آپ کچھ عرصہ امریکہ میں ٹھہر جائیں تو ہم آپ پر دس لاکھ ڈالر لگا کر آپ کو 'مہدی' مشہور کر سکتے ہیں، پھر آپ کو پاکستان اور ہندوستان کا دورہ کرایا جائے گا اور آپ کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو جائے گی''۔

مائیکل ہارٹ کی کتاب "The Hundred" بھی زہر آلود حوالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس ازلی بدبخت نے ایک نئی طرز گستاخی ایجاد کی۔ دیباچے میں معیار انتخاب کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: سر فہرست پیغمبر اسلام ﷺ کا نام پڑھ کر حیران ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ فہرست ہے تاریخ کے بااثر ترین افراد کی نہ کہ دنیا کے عظیم ترین افراد کی۔

آگے چل کر کئی اور قابل اعتراض جملے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً: ۶۲۲ء میں ذاتی عدم تحفظ کے خوف سے حضرت محمد ﷺ مدینے کی طرف فرار ہو گئے۔ اور یہ کہ آپ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن کے مصنف تھے۔

۱۹۳۵ء کے اوائل میں لندن کی ایک فرم جارج ہیرپ اینڈ کمپنی نے ایک انگریز مصنف ایڈتھ ہینڈ کا بدنام زمانہ رسالہ "Story Of Mohammad" شائع کیا، جس میں نبی آخر الزماں ﷺ کی پانچ فرضی تصاویر شامل تھیں جو کہ ایک بدبخت مصور ایم ایم ولیم نے تیار کیں۔ علاوہ ان کے کئی دیگر قابل اعتراض باتیں بھی درج تھیں۔

زمانہ حال میں رسول پاک ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور دین اسلام پر سب سے بڑا حملہ ''شیطانی آیات'' ہے۔ مجہول النسب سلمان رشدی ۱۹۴۷ء میں بمبئی کے ایک ماڈرن مسلم گھرانے میں پیدا

ہوااور کچھ عرصہ بعداپنے والدین کے ہمراہ کراچی آیالیکن دوبارہ بمبئی چلا گیا۔اس کے بہت سے رشتہ دار اب بھی پاکستان میں ہیں، جن میں جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں ایک وفاقی وزیر، میجر جنرل (ریٹائرڈ) شاہد حامد، بھی شامل بتائے جاتے ہیں۔

سلمان رشدی کیمبرج یونیورسٹی میں بھی زیرتعلیم رہااور تاریخ کے مضمون میں ڈگری لی۔اس کا کہنا ہے کہ میں نے اسلام کا مطالعہ کیمبرج میں زمانہ طالب علمی کے دوران کیا تھااور میں نے اسی وقت ارادہ کرلیا تھا کہ اسلامی تاریخ کو سامنے رکھ کرایک ناول لکھوں گا، جس کے کردار علامتی ہوں گے۔

شیطان مذکورتمام ترکوششوں اور چال بازیوں کے باوجوداپنے آپ کوادبی حلقوں میں نہ منوا سکا تواس نے ایڈورٹائزنگ کا پیشہ اختیار کرلیااور ساتھ ساتھ اخبارات میں بھی لکھنے لگا۔تاہم اس کے کرائمنز،مڈنائٹ چلڈرن اورشیم کوسنسنی خیزی اور بے ہودہ گوئی کے سبب جانا گیا۔فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ مغرب کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہوگی کہ سلمان رشدی ایسا گنوار برطانیہ کے معروف ناول نگاروں میں سے ایک ہے۔

شیطان کی ''شیطانی آیات'' اسلام، رسول اللہ ﷺ اور مسلمانانِ عالم کے خلاف ایک واضح سازش ہے۔چونکہ یہ سازش ''بڑی طاقتوں'' کے تخیل کا عملی اظہار ہےاس لئے مغربی ذرائع ابلاغ ابھی تک اس کی حمایت میں ہیں۔برطانیہ کی لیبر پارٹی کے ایک لیڈر مائیکل فٹ نے سلمان رشدی کے حق میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس پراعتراض کرنے والے جاہل ہیں، کیونکہ مصنف نے ناول میں تاریخ بیان نہیں کی بلکہ کچھ تخیلاتی کردار پیش کئے ہیں۔ اہلِ اسلام کے سربراہوں میں سب سے غیرت مندانہ اور بے باکانہ اور حقیقت پسندانہ موقف محض امام آیت اللہ خمینی نے اختیار کیا۔انہوں نے کہا:

> ''شیطانی آیات کا مصنف اور پبلشر واجب القتل ہیں۔جو شخص بھی اِن افراد کو قتل کرتے ہوئے جاں بحق ہوا اسے شہادت کا درجہ ملے گا...ہر وہ شخص واجب القتل ہے جس نے کتاب ''شیطانی آیات'' کی اشاعت میں کسی طرح بھی حصہ لیا۔''

امام خمینی نے جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایرانی ٹیلی ویژن پراعلان کیا کہ رشدی کے سر کی قیمت ۳۰ لاکھ ڈالر مقرر کردی گئی ہے۔اگر کوئی غیر ایرانی باشندہ اُسے جہنم رسید کرتا

ہے تو اس کو بھی ۱۰ لاکھ ڈالر بطور انعام دیئے جائیں گے اے کاش انہوں نے اپنے فتویٰ میں ایرانی وغیر ایرانی کا امتیاز نہ روا رکھا ہوتا۔

مغربی ممالک میں وقفے وقفے سے پیغمبر اسلام علیہ وسلم کے خلاف اس قسم کی کتابوں کی اشاعت ایک وطیرہ بن چکا ہے۔ایک ایسی ہی دل آزار کتاب، انگریز مصنف مارٹن کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔ کتاب مذکورہ کا عنوان "Mohammad" ہے۔سلمان رشدی کی کتاب سے بھی زیادہ زہریلی اور گمراہ کن! اس میں رسول اللہ علیہ وسلم کا نعوذ باللہ، حضرت زیدؓ کی بیوی زینبؓ سے معاشقہ دکھایا گیا ہے اور آپؐ کو (نقل کفر کفر نباشد) لٹیرا کہا گیا ہے۔مگر لائق ماتم یہ بات ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں پاکستان کی وزارت مذہبی امور نے اسے سیرت النبی پر بہترین کتاب قرار دے کر ستر ہزار روپے انعام کا مستحق ٹھہرا دیا۔انعامی تقریب کے بعد یہ کتاب پاکستان میں بھی تین بار چھپ کر ملک کی ہر قابلِ ذکر لائبریری اور ''علمی'' گھرانوں میں پہنچی۔

جنرل صاحب کے عہد میں ایک عیسائی مصنف لوتھر نامی کو ایوارڈ دیا گیا۔اس میں بھی سرکارِ اقدس علیہ وسلم کی سیرت عالیہ کو داغدار کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی تھی اور آپ کی ولادت باسعادت کے بارے میں نہایت ہی سوقیانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔



ہندومت احیاء کی تحریک اور ''تھیوسوفیکل سوسائٹی'' کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔اس سوسائٹی نے انتہا پسند آریہ سماجی ذہنیت کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے اسلام کو زک پہنچانے کی بھرپور سعی کی۔اس کے زیرِ نگرانی شائع ہونے والے رسالوں کا ایک ایک حرف زہر میں بجھا ہوتا۔ہر لفظ میں چھپی ہوئی آگ خرمنِ دل کو جلا دیتی۔انگریز چاہتے تھے کہ ہندوستان میں مذہبی فسادات کی بنیاد پڑ جائے، مقامی باشندے کمزور سے کمزور تر ہوں۔سوسائٹی کا پلان انہی کے زرخیز دماغ کی پیداوار تو تھا ہی، عملاً سرپرستی اور ہر موقع پر بھاری مالی امداد نے کچھ زیادہ ہی رخنے پیدا کر دیئے۔

تھیوسوفیکل سوسائٹی ۱۸۷۵ء میں تشکیلی مراحل سے گزری۔اس کی بانی مادام بلیوتسکائی (Madam Blavat Sky) تھی، اس کی رگوں میں روس و جرمن کا مشترک خون دوڑ رہا تھا۔یہ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئی۔اپنے روسی شوہر کو چھوڑ کر ۱۸۴۸ء میں اس نے دنیا کی سیاحت کا آغاز کیا۔امریکہ میں رہ کر اس نے بہت سے لوگوں کے ساتھ تعلق پیدا کئے، ان میں ایک کرنل الکاٹ

بھی تھا۔ کرنل الکاٹ کی وجہ سے اس فتنہ پرور اور طالع آزما عورت کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ بھگوت گیتا اور سیوا جی کی تعلیمات کا فروغ چاہتی تھی۔ اس کے اپنے الفاظ ہیں:

''ہندوستان میں اس سوسائٹی کا مقصد یہ ہے کہ سب سے پہلے پرانے مذاہب زرتشت، بدھ مت اور بالخصوص ہندو مذہب کا احیا کیا جائے۔ یہ سوسائٹی خود اعتمادی، اپنے ماضی پر فخر اور مستقبل کی امیدیں اپنے ساتھ لائی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ شدید حب الوطنی اور 'ایک قوم' کی تعمیر نو کا آغاز ہوگا''۔

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کا اصل نام مول شنکر تھا وہ ۱۸۲۴ء میں گجرات (کاٹھیاواڑ) میں پیدا ہوا۔ ۱۸۴۵ء کے وسط میں وہ گھر بار چھوڑ کر نکلا۔ قریہ قریہ اور در بدر پھرا۔ جدید علوم سے سوجھ بوجھ حاصل کی۔ ازاں بعد اس کے گرو نے جدید علوم وفنون کی کتب پھینک کر ویدک کی تعلیمات پر غور وفکر کا حکم دیا۔ اس نے ۱۸۷۸ء میں بمبئی میں ''آریہ سماج'' کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ قبل ازیں وہ ۱۸۷۴ء میں اپنی رسوائے زمانہ کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' مکمل کر چکا تھا۔ یہ اس کی تعلیمات وافکار کا نچوڑ ہے۔ یہی وہ شرانگیز رسالہ ہے، جس کے چودھویں باب میں رسول عربی ﷺ کی حیات طیبہ پر فضول اور بے جا تنقید کے تیر چلائے گئے۔ تعدد ازواج مطہرات پر گستاخانہ تبصرہ ہوا اور قرآن حکیم کی بعض آیات میں ترمیم وتنسیخ کا مطالبہ پیش کیا گیا۔

آریہ سماج دیگر مذاہب کے علاوہ بالخصوص اسلام کے خلاف ایک انتہا پسند تحریک تھی۔ سوامی مذکور مذہبی معاملات میں جارحیت کو جائز قرار دیتا تھا۔ اس کا نعرہ تھا کہ ''ہندوستان صرف ہندوؤں کیلئے ہے۔'' جہاں تک اس کی تعلیمات کا تعلق ہے، بے شک اس میں بعض اچھی باتیں بھی شامل تھیں۔ لیکن ان کا تعلق فقط ہندو اور ہندو ازم سے ہے۔ وہ خدا کی وحدانیت کا قائل تھا اور دیوی دیوتاؤں اور مورتیوں کی پوجا کے خلاف۔ ستی کی جارحانہ رسم، بچپن کی شادی اور ذات پات کی تقسیم کی مخالفت میں اس نے موثر آواز بلند کی۔ نیز بحری سفر کو مذہبی روایات کے خلاف نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا: برصغیر میں اسلام کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ اُسے خاص دشمنی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں گئو رکھشا سبھائیں تشکیل دیں اور ذبیحہ گائے کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ اس نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ گائے کا ذبیحہ خلافِ قانون قرار دیا جائے۔ الغرض آریہ سماجیوں نے اسلام کے خلاف مناظروں کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہر جگہ فرقہ وارانہ

فسادات کو ہوا دی۔

سوامی دیانند سرسوتی کی موت کے بعد اس مذموم مشن کو آگے بڑھانے والوں میں لالہ ہنس راج، پنڈت گورودت، لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کی تنگ نظری کا رجحان اس قدر بڑھا کہ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ چونکہ سوامی مذکور کو صوبہ یوپی کے علاوہ سب سے زیادہ پنجاب میں قبولِ عام حاصل ہوا تھا، یہاں اس کے چیلوں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی تھی۔ اس لئے یہی علاقے ہنگاموں کا مرکز و محور بنے۔

ایک ثقہ مورخ لکھتے ہیں:۔

''انگریزوں نے ہی سوامی دیانند سرسوتی کی شخصیت کی تعمیر کی، ورنہ وہ متھرا میں محض ایک ذہین طالب علم تھا... لالہ لاجپت رائے نے ہندو سنگھٹن کی تحریک شروع کر کے فرقہ ورانہ ہنگاموں کے لیے ہندوؤں میں ایک ولولہ پیدا کر دیا۔ اب ہندوؤں کی تمام تنظیموں اور تحریکوں کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیر دیا گیا... انگریز حکومت نے ایک اہم مقدمے سے سوامی شردھانند کو رہا ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ ہنگاموں کی بنیاد رکھے۔ سو اس نے یہ غرض پوری کر دی اور شدھی تحریک چلائی۔ دوسری جانب لالہ لاجپت رائے نے ہندو سنگھٹن کی نیو اٹھائی، جس کے پروگرام میں پریڈ، لکڑی اور تلواروں وغیرہ کا استعمال تھا اور یہ سب مسلمانوں سے لڑنے کے لیے''۔

سوامی دیانند سرسوتی، ہندو قوم کے ایک ریفارمر کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک توہم پرستی اور دیگر خلافِ عقل رسومات سے بغاوت نہ کی جائے مبلغین اسلام کی یلغار نہ رک سکے گی۔ مزید برآں یہ کہ تعلیم یافتہ طبقے کی عقلیت پسندی کے باعث ایسے عقائد ساتھ نہیں چل سکتے۔ سوامی مذکور کی فکر و تربیت سے ہندو ذہنیت نے جو اثر قبول کیا تھا اس کی ایک ہلکی سی جھلک بنکم چندر چیٹر جی کے کردار میں ملتی ہے۔ اگرچہ یہ شخص کسی علیحدہ تحریک کا بانی نہ تھا لیکن ہندو نیتاؤں نے جو ذہن پیدا کیا، اس کا بھرپور شاہکار ہے۔

اس بنگالی مصنف نے ۱۸۸۲ء میں اپنا معروف ناول ''انند ناتھ'' شائع کروایا۔ اس میں کالی ماتا کے بچوں کو یہ ترغیب دلائی گئی تھی کہ اپنے وطن کو ناپاک مسلمانوں سے خالی کرائیں۔ اس کا ہیرو

''جیوانند'' تلوار ہاتھ میں لئے مندر کے دروازے پر کھڑا ہو کر خطاب کرتا ہے:

''ہم نے اکثر پرندوں کے اس گھونسلے سے مسلمانوں کی حکومت کو ختم کرنے اور غداروں کے اس شہر کو تباہ کرنے اور غداروں کو دریا میں غرق کر دینے کے بارے میں سوچا ہے اور اس بات کا ارادہ کیا ہے کہ اس غلاظت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دھرتی ماتا کو ملیچھ لوگوں سے دوبارہ پاک کر دیں گے۔ دوستو! وہ دن اب آ پہنچا ہے''۔

یہی وہ ناول ہے جس میں 'بندے ماترم' گایا گیا۔ اسی کو بعد میں کانگریس نے پورے ملک کا قومی ترانہ بنانے کی کوشش کی اور مسلمانوں نے ماننے سے انکار کیا تھا۔ یہی شخص شیخ مجیب الرحمٰن کے بنگلہ دیش کے ترانے ''سنہرے بنگال'' کا بھی خالق ہے۔

ہندو تحریکوں کے پس منظر کا جائزہ لینے کے لیے 'بال گنگا دھر تلک' جیسی شخصیات کا مطالعہ بھی لازم ہے۔ بال گنگا دھر تلک ۲۳۔ جولائی ۱۸۵۶ء کو مہاراشٹر کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا۔ اگر چہ بنیادی طور پر یہ ایک سیاسی لیڈر تھا، لیکن اس کی سیاست مذہبی جارحانہ پالیسی پر مبنی تھی۔ وہ بھگوت گیتا کی تعلیمات کا علمبردار تھا۔ سیوا جی کو قومی ہیرو سمجھتا تھا۔ اُس نے بھگوت گیتا اور سیوا جی کی زندگی سے یہ اصول اخذ کیا کہ دشمن کو ختم کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کئے جا سکتے ہیں اور سیوا جی نے مسلمان جرنیل افضل خاں کو دھوکے سے قتل کر کے نیکی کا کام کیا تھا۔ نیز سب سے اہم کارنامہ مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانا اور گائے کی حفاظت کی انجمنیں قائم کرنا ہے۔ لہٰذا گئو کش لوگوں کے استیصال و احتساب کیلئے اس نے لاٹھی کلب قائم کئے۔ مخصوص میلوں کا انعقاد بھی اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے تھا اور اس طرح کے اجتماعات میں مسلمانوں پر حملہ، ان کا قتل عام اور ان کے مال کو لوٹنا معمول تھا۔ آریہ سماج کے بطن سے دو خطرناک تحریکوں نے جنم لیا۔ شدھی کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے تمام غیر ہندوؤں کو ہندو بنایا جائے۔ کسی کو ہندو بنانے کے لیے گائے کا پیشاب، گوبر، دہی، دودھ اور مکھن ملا کر کھلایا جاتا تھا۔ اس آمیزہ کو پنج رتن کے نام سے پکارتے۔ ابتدا اس کی باگ ڈور ہندوؤں کی مذہبی قیادت کے ہاتھ میں رہی اور سوامی شردھانند کے سبب اس عمل میں خاص شدت آ گئی۔

شدھی کی اس اشتعال انگیز اور مسلم کش جدوجہد کو ایک ہندو منشی رام نے منظم کیا تھا، جو چند برس پنجاب پولیس میں ملازمت کرتا رہا۔ پھر وکیل بنا اور ازاں بعد ترکِ دنیا کا ڈھونگ رچا کر

گیان دھیان کی نام نہاد زندگی گزارنے لگا۔ اس دورا ہے پر اس کو سوامی شردھانند کا خطاب ملا۔ اب وہ منشی رام کی بجائے سوامی شردھانند کے روپ میں ایک مذہبی پیشوا تھا۔ جلد ہی وہ پنجاب کو چھوڑ کر یو پی چلا گیا، جہاں ۱۹۲۳ء میں شدھی ایسی پرفتن تحریک کی بنیاد رکھی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اپنا مرکز دہلی بنا لیا اور مذہبی دلآزاری پر مبنی شرانگیز لٹریچر شائع کرنے لگا۔ اسے بعد میں قاضی عبدالرشید شہیدؒ ایک مسلم مجاہد نے موت کے گھاٹ اتارا اور خود زندۂ جاوید ہوا۔

ان معاندانہ تنظیموں کے مقاصد کی فہرست خاصی طویل ہے، جن میں برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو بنانا اور شدھی کے دام گرفت سے بچ نکلنے والوں کا جبر و تشدد کے ساتھ سنگھٹن کے پلیٹ فارم سے خاتمہ شامل تھا۔

چند محققین کا خیال ہے کہ ''ستیارتھ پرکاش'' کا چودھواں باب سوامی دیانند سرسوتی کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ آنجہانی کے زیر اہتمام فقط تیرہ باب شائع ہوئے تھے اور اس شیطانی مواد کا اضافہ بعد میں ہوا، جب قادیانی مولویوں نے انگریز آقا کی شہ پر آریہ سماجیوں سے اور آریہ سماج کے قائدین نے مرزائی پروہتوں سے لڑنا جھگڑنا شروع کیا۔ مناظرے کے نام پر گالی گلوچ اور اشاعتِ اسلام کے پردے میں توہین رسالت کا سامان! ۔ چودہویں باب کے بارے میں یہ رائے مبنی برصداقت ہے کہ قادیانی رویوں کے ردعمل کے طور پر ہی چودہویں باب کا اضافہ کیا گیا تھا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے یہ موقف بالکل بجا ہے کہ تحریک شماتتِ رسول بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ گویا یہ دونوں طبقے برطانوی شطرنج کے مہرے تھے اور شاطر افرنگ کے اشارے پر ہی فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دی گئی۔ مگر سبب کچھ یوں پیدا ہوا کہ مرزا قادیانی نے آریہ سماجیوں کو اپنے رجحان طبعی کے موافق مسلسل غلیظ گالیاں سنائیں اور ہندو دھرم پر سوقیانہ انداز میں حملے کئے۔ نتیجتاً، آریہ سماج نے رسول اکرم ﷺ، قرآن اور اسلام کے خلاف دریدہ دہنی کا آغاز کر دیا۔

آنجہانی مرزا کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ وہ ہندو مت اور عیسائی مذہب کو کھلم کھلا مغلظات سنایا کرتا۔ جواب آں غزل کے طور پر، نبیٔ رحمت ﷺ کے خلاف بدزبانی کا دروازہ کھل گیا اور ہمارے آقا و مولا ﷺ پر سب و شتم روزمرہ ہو گیا۔

مسٹر گاندھی نے بھی ایک مضمون میں اس موضوع سے متعلق لکھا تھا کہ اس فتنے کا آغاز مرزائی مولویوں نے کیا ہے، جنہوں نے اپنے لٹریچر میں ہندو مذہب کو ہمیشہ نشانہ طنز بنایا۔

ہندوؤں کو غلیظ سے غلیظ گالیاں دیں اور ہندووانہ رسوم ورواج اور عقائد واعمال پر طنز وتمسخر کیا۔ اس پر بعض نادان آریہ سماجیوں نے انتقاماً حضرت محمد ﷺ کی توہین شروع کر دی۔

۱۹۲۵ء میں ہندوؤں نے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی یاد میں تقریبات منانی شروع کیں تو ایک جلسے میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہندومت کے پیروکار جمع ہوئے اور مسلمانوں کو دین حق سے برگشتہ کرنے کی خاطر ایک گہری سازش تیار کی گئی۔ اس میں طے پایا کہ مذہبی تبلیغ تیز تر کر دی جائے اور اس طرح اسلام اور داعیٔ اسلام ﷺ کے خلاف شکوک وشبہات پھیلا کر سیدھے سادے مسلمانوں کو ورغلا دیں، نیز انہیں احساس دلائیں کہ تمہارے آبا واجداد ہندو تھے۔ یہ ملک ہندو کا ہے اور اسلام تو دیارِ غیر سے آیا ہوا مذہب ہے۔ تمہیں دوبارہ ہندو مذہب اختیار کر لینا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں افراد دولتِ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں غالب اکثریت نومسلموں اور ہندوؤں کے اکثریتی علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کی تھی۔

اس مشن کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ابتدأ ترغیب وتحریص دلائی گئی، پھر تبلیغ کا بازار گرم ہوا۔ ازاں بعد طاقت کا استعمال ہونے لگا۔ بالآخر ایک عجیب وغریب ہتھکنڈا اپنایا گیا۔ اب کے رسول پاک ﷺ کی شان بابرکات میں بے ادبیاں شروع ہوئیں۔ جگہ جگہ شاتم نبی جنم لینے لگے۔ ان کا قلم زہر اگلتا تھا اور زبان ناقابل برداشت بکواس بکتی۔ ان کی زبانیں ناپاک اور الفاظ غلیظ ہوتے۔ اس گروہ کی روش اس قدر تکلیف دہ تھی کہ تذکرہ رقم کرنا چاہیں تو بھی دل ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔

آریہ سماجیوں کے گمراہ کن رسائل اور دلآزار کتب ناشائستہ زبان کا مرقع ہوا کرتی تھیں۔ ان کی اشاعت بھی کسی ایک جگہ سے خاص نہ تھی بلکہ آگرہ، کلکتہ، دہلی، کراچی اور لاہور میں ان کا تانتا بندھ گیا۔ علاوہ ازیں ملکانہ، متھرا، بھرتپور، گوڑگانواں، گوبندگڑھ، جے پور، کشن گڑھ، مضافات اجمیر، قصور، ننکانہ کا کچھ علاقہ اور منڈی بہاؤالدین کے چند نواحی دیہات بھی دہن وراز ہندو وسکھ غنڈوں کے مراکز قرار پائے۔ ستیارتھ پرکاش اور انندناتھ کا تذکرہ بیان میں آچکا ہے۔ اس جگہ سوامی شردھانند کی تصنیف ''سنگھٹن کا بگل'' زیر بحث ہے، جس میں مسلمانانِ ہند کو جبر وتشدد کے ساتھ ہندو بنانے کی اہمیت وافادیت پر زور دیا گیا اور ہندوؤں کو اس کے ہزاروں فوائد وثمرات گنوائے ہیں۔ یکم جولائی تا ۱۵۔ اگست مختلف جگہوں پر مسلمانوں کے گمراہ ومرتد بن جانے کی خبریں شائع ہوتی رہیں۔ اس دوران سوامی ستیہ دیو نے ایک طوفان اٹھائے رکھا۔ ۶۔ جولائی کی رپورٹ درج ہوئی کہ آج نو بجے، لاہور کے ایک جلسہ عام میں ستیہ دیو کی تقریر کے بعد

"سنگھٹن کا بگل" سے ایک باب پڑھ کر سنایا گیا اور ایک مسلمان کو شدھ کرنے کی رسم ادا ہوئی۔

رسوائے عالم رسالہ "رنگیلا رسول" کے ناشر، راجپال مردود کی اپنی دو کتابیں بھی مرحلہ اشاعت سے گزریں۔ "بلیدان چتر اولی" میں اسلام کے متعلق قیاسی یاوہ گوئیاں درج تھیں جبکہ اس کی ہلاکت کے سبب زیر طبع کتابچہ "چودھویں صدی کا چاند" مکمل نہ ہوسکا۔ مندرجات میں بزرگان اسلام کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

۱۲۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو روزنامہ "انقلاب" لاہور میں ایک ناقابل برداشت خبر شائع ہوئی۔ لکھا تھا کہ جموں میں دیوان جوالا سہائے کے مندر میں ایک آریہ پرچارک ستیہ دیو نے قرآنِ حکیم کو (نعوذ باللہ) ریاکاری اور منافقت کا مجموعہ اور قابلِ ضبطی قرار دیا۔ نیز سرکارِ عالم ﷺ کی جناب میں بھی ہرزہ سرائیاں کیں۔

ان دنوں دو اور کتابوں کا تذکرہ بھی زبان زد عام و خاص رہا۔ ان کا ایک ایک حرف تاریخ اسلام، تمدن اسلام اور مذہب اسلام پر ناروا اعتراضات پر مبنی تھا۔ پے در پے مسلمانوں کے قلوب پر تیروں کی بارش کی جاتی رہی۔ رسول عربی ﷺ کے نام لیوا ؤں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے یہ پمفلٹ 'انیسویں صدی کا مہرشی' اور 'کفر توڑ و اسلام توڑ' تھے۔

بے گدی، موجِ چاندنی اور ٹائمز آف انڈیا ایسے پرچے تھے جو بالعموم اشتعال انگیز تحریریں چھاپتے۔ مثال کے لیے ۳۔ مارچ ۱۹۲۶ء کے آخرالذکر پرچہ صفحہ ۴ کالم ۵ کا حوالہ کافی ہے کہ اس عبارت کو کوئی غیرت مند مسلمان پڑھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔

۴۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو لاہور کی سرزمین پر ایک زبردست ہنگامہ ہوا چاہتا تھا۔ اس روز کتاب "دیدار رسول" کے سرورق پر ایک قابلِ اعتراض تصویر کے متعلق مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوگیا۔ ممکن تھا کہ غلامان مصطفےٰ کا احتجاج جس کی ابھی ابتدا ہوئی تھی، خطرناک صورت اختیار کر جاتا کہ آریہ سماجی ناشر کو اپنا خوفناک انجام صاف نظر آنے لگا اور اس نے مسلمانان ہند سے گڑگڑا کر معافی مانگ لی۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کی دلآزاری کی خاطر جو رسالے طبع ہوئے اور جن میں نبی اکرمؐ کی سخت توہین تھی، ان میں تہذیب الاسلام، آریہ مسافر (جالندھر) آریہ مسافر (میگزین)، مسافر بہڑائچ، آریہ پتر (بریلی) ملیکھش توڑ، جڑپٹ اور ترکِ اسلام شامل ہیں۔ بمبئی میں ایک ماہوار رسالہ "گجرات" نامی میں اس کے ایڈیٹر کھنیا لال منشی نے بھی اداریے میں اپنی خباثت کا بھرپور

مظاہرہ کیا تھا۔

امرتسر میں ۱۴۔ اگست ۱۹۲۷ء بعداز دوپہر کارخانہ قالین بافی واقع کٹڑہ حکیماں کے ایک اکاؤنٹنٹ بابورام نندا نے قرآن پاک کی شان میں چند بے ہودہ کلمات اپنی ناپاک زبان سے ادا کیے۔ یہ طرز گستاخی ہندومت کے پیروکاروں کا ایک عام معمول بن چکا تھا۔

۴۔ ستمبر ۱۹۲۹ء کے روزنامہ انقلاب لاہور میں ایک ایسی زہریلی خبر درج ہے کہ تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور کوئی مسلمان نقل کفر کفر نباشد کے مصداق بھی اسے دہرانے کا روادار نہیں ہوسکتا۔ حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ اور حضرت بی بی زینبؓ کی شان میں ایک آریہ سنار نے نہایت بیدردی کے ساتھ یاوہ گوئی کی تھی۔

دہلی میں نو آریہ کانفرنس کے ارکان نے ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ قرآن پاک کی ان آیات کو ضبط کیا جائے جن میں کافروں کے قتل کی تلقین کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اخبار ''تیج'' کا ایڈیٹر دیش بندھو جی پیش پیش تھا۔ نیز بغداد کا چور، عمر خیام اور شیراز ایسی فلمیں جو کہ ان دنوں خطہ ہند میں پردہ سکرین پر کھلے عام دکھائی گئی تھیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اگر حکمرانوں کے حوالہ سے بات کی جائے تو مغلوں کے دورِ آخر میں ایک شخص کو توہین رسالت کے جرم میں قید اور پھر موت کی سزا دیئے جانے کی مثال ملتی ہے۔ بنا بریں تاریخ کے اوراق پر ان لوگوں کی داستان محبت بھی رقم ہے، جنھوں نے مورخ کو ایک تازہ عنوان بخشا۔ یہ حقیقت انتہائی ایمان افروز ہے کہ گستاخوں کے ٹولے سے اگر کسی ایک نے مقام مصطفیٰ کی طرف نگاہِ غلط انداز اٹھائی تو محبت ووفا کے ہزار بندے اس کی آنکھ نکال دینے پر کمر بستہ ہوگئے۔ جوانانِ ملت کا جوش وولولہ دیدنی تھا جو انہیں شہادت کے بلند رتبے پر فائز کر گیا۔ وہ دیوانے بڑے خوش نصیب ہیں جن کے پیاسے خنجر وقتاً فوقتاً ناپاک سینوں میں اترتے رہے۔



تاریخ کے ان نازک ایام میں مسلمانانِ ہند خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھے تھے۔ رسولِ مقبول ﷺ کے نام لیواؤں نے کتاب عشق میں اپنی وفاؤں سے نئے باب کا اضافہ کیا۔ ہندو گستاخی رسول کے لیے آگے بڑھتے اور مسلمان تحفظ ناموسِ رسالت کی خاطر قربان ہوتے رہے۔ ایک باقاعدہ جماعت جس نے تبلیغ دین کا بیڑا اٹھایا۔ نوجوانانِ قوم کی ان خطوط پر تربیت کی جو آگے چل کر حق غلامی ادا کر گئے۔

ستیارتھ پرکاش کے رد میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ''حق پرکاش'' کے نام سے ایک مدلل کتاب لکھی تھی۔ علاوہ ازیں صدرالافاضل مولانا مفتی محمد نعیم الدین مراد آبادی کی مقبول عام تصنیف ''احقاقِ حق'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ''ترک اسلام'' کے جواب میں ''تُرک اسلام'' اور ''رنگیلا رسول'' کی تردید میں ''مقدس رسول'' بہت اہم رسالے ہیں۔

صدرالافاضل تبلیغ اسلام اور ناموسِ مصطفےٰ ﷺ کی حفاظت وحمایت میں شب و روز کوشاں رہے۔ آپ نے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے کامیاب مناظرے فرمائے۔ آپ نے تبلیغ اسلام کے لیے المموڑہ، نینی تال، بلاوانی وغیرہ کے پہاڑی علاقوں کا نہ صرف دورہ کیا بلکہ وہاں کچھ عرصہ قیام بھی فرمایا اور ایک رسالہ ''پراچین کال'' تحریر کیا تھا جو غالباً پہاڑی زبان میں ہے اور اس کا اُردو ترجمہ بھی ساتھ ہے۔

تحریک شدھی میں شردھانند، پنڈت کالی چرن، پنڈت رام چندر اور دھرم بھکشو لکھوی وغیرہ نے آندھی اُٹھائی تو اس کے مقابلے کے لیے بریلی سے جماعت رضائے مصطفےٰ میدانِ عمل میں آئی۔ حضرت شاہ علی حسین اشرفیؒ نے باوجود کبرسنی کے تحریک شدھی کا پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ مولانا سید قطب الدین برہمچاری اور ان کے شاگرد مولانا غلام قادر اشرفی نے بھیس بدل کر نہ صرف مرتدین کو مشرف بہ اسلام کیا بلکہ بہت سے ہندو بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ مجموعی طور پر ساڑھے چار لاکھ مرتد، دین فطرت کو لوٹ آئے اور ڈیڑھ لاکھ ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ معالج حیوانات، وید حکیم، گانے والے طائفے اور سادھوؤں کا بھیس بدل کر اشاعت اسلام کی جو کوشش کی گئی تھی، اس سے پچاس ہزار کے لگ بھگ ہندو مسلمان ہو گئے تھے۔

ایک بار اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا سے ان مسلمانوں کے بارے میں پوچھا گیا جو آریہ سماجیوں میں جا کر کاپی نویسی کرتے ہیں یا پریس میں ہیں یا ان کے اخبار اور مذہبی پرچے روانہ یا تقسیم کرتے ہیں۔ یہ سوال سن کر فاضل بریلوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کیونکہ ان پرچوں میں قرآن کریم اور رسول رحیم ﷺ پر کھلے کھلے اعتراض والزام ہوتے تھے۔ آپ نے فتویٰ ارشاد فرمایا:

> ''اللہ عزوجل اپنے غضب سے پناہ دے۔ الحمدللہ، فقیر نے وہ ناپاک ملعون کلمات نہ دیکھے کہ جب سوال کی سطر پر آیا، جس سے معلوم ہوا کہ آگے کلمات بعینہٖ ملعونہ نقل ہیں، ان پر نگاہ نہ کی، نیچے کی سطریں جن

میں سوال ہے بہ احتیاط دیکھیں۔ایک ہی لفظ جو اوپر سائل نے نقل کیا اور نادانستگی میں نظر پڑا، وہی مسلمان کے دل پر زخم کو کافی ہے۔اب جب کہ لکھ رہا ہوں، کاغذ تہہ کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ،ملعونات کو نہ دکھائے نہ سنائے۔ جو نام کے مسلمان کاپی نویسی کرتے ہیں اور اللہ عزوجل،قرآن عظیم اور محمدؐ رسول اللہ کی شان میں ایسے ملعون کلمات ایسی گالیاں اپنے قلم سے لکھتے یا چھاپتے یا کسی طرح اس میں اعانت کرتے ہیں،ان سب پر اللہ عزوجل کی لعنت اُترتی ہے۔وہ اللہ و رسولؐ کے مخالف اور اپنے ایمان کے دشمن ہیں۔قہر الٰہی کی آگ اُن کے لیے بھڑکتی ہے۔صبح کرتے ہیں تو اللہ کے غضب میں اور شام کرتے ہیں تو اللہ کے غضب میں، اور خاص جس وقت ان ملعون کلموں کو آنکھ سے دیکھتے،قلم سے لکھتے اور مقابلہ وغیرہ میں زبان سے نکالتے یا پتھر پر اس کا نقش بناتے ہیں۔ ہر کلمہ پر اللہ تعالیٰ کی سخت لعنتیں، ملائکۃُ اللہ کی شدید لعنتیں اترتی ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا، قرآن فرماتا ہے:

ترجمہ: (بے شک وہ لوگ جو ایذا دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کو،ان پر اللہ کی لعنت ہے، دنیا اور آخرت میں،اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے ذلت کا عذاب)

ان ناپاکوں کا یہ گمان کہ گناہ تو اس خبیث کا ہے جو مصنف ہے۔ہم تو نقل کر دیتے یا چھاپ دیتے ہیں۔سخت ملعون و مردود گماں ہے۔زید کسی دنیا کے عزت دار کو گالیاں لکھ کر چھپوانا چاہے تو ہرگز نہ چھاپیں گے۔ جانتے ہیں کہ مصنف کے ساتھ چھاپنے والے بھی گرفتار ہوں گے۔مگر ان کو اللہ واحد قہار کے قہر و عذاب و لعنت و عتاب کی کیا پروا ہے؟ یقیناً یقیناً کاپی لکھنے والا، پتھر بنانے والا، چھاپنے والا،کل چلانے والا،غرض جان کر کہ اس میں یہ کچھ ہے،کسی طرح اس میں اعانت کرنے والا ایک ہی رسی میں باندھ کر جہنم کی آگ میں ڈالے جانے کے مستحق ہیں۔اللہ عزوجل فرماتا ہے:

ترجمہ: (گناہ اور حد سے بڑھنے میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

ترجمہ: (جو دانستہ کسی ظالم کے ساتھ اس کو مدد دینے چلا وہ یقیناً اسلام سے نکل گیا)

یہ اس ظالم کے لیے ہے جو گرہ بھر زمین یا چار پیسے کسی کے دبا لے۔ یا زید و عمرو کسی کو ناحق سخت سُست کہے۔ اس کے مددگار کے لیے ارشاد ہوا کہ اسلام سے نکل جاتا ہے، ورنہ یہ کہ اشد ظالمین جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتے ہیں، ان باتوں میں ان کا مددگار کیونکر مسلمان رہ سکتا ہے۔ ایسے اشد فاسق اور فاجر اگر توبہ نہ کریں تو ان سے میل جول ناجائز ہے۔ ان کے پاس دوستانہ اٹھنا بیٹھنا حرام ہے، پھر مناکحت تو بڑی چیز ہے۔ فقیر کے یہاں فتاویٰ مجموعہ پر نقل ہوتے ہیں۔ میں نے نقل فرمانے والے صاحب سے کہہ دیا ہے کہ ان ملعون الفاظ کی نقل نہ کریں۔ سنا گیا ہے کہ سائل کا قصد اس فتوے کے چھاپنے کا ہے۔ درخواست کرتا ہوں کہ ان ملعونات کو نکال ڈالیں اور ان کی جگہ دو ایک سطریں خالی صرف نقطے لگا کر چھوڑ دیں کہ مسلمانوں کی آنکھیں ان لعنتی ناپاکیوں کے دیکھنے سے باذنہٖ تعالیٰ محفوظ رہیں۔"

آریہ سماجی اپنی کتابوں اور رسائل میں اس قدر غلیظ اور سفیہانہ زبان استعمال کرتے تھے کہ فاضل بریلوی نے وہ کلمات چھوڑ دینے کا حکم دیا اور قطعاً یہ پسند نہیں کیا کہ کوئی مسلمان حصول نان و نفقہ کی خاطر گستاخیٔ رسول کے امور میں معاونت کرے۔

جب قلم کی زبان شاتمانِ نبی کی سمجھ میں نہ آسکی تو غیور و جسور مسلمان مجاہد، اپنے ہاتھوں میں خنجر، ہونٹوں پر درود و سلام کے ترانے اور دلوں میں شوق و محبت کے لازوال ولولے لئے آگے بڑھے اور دریدہ دہنوں کو واصل فی النار کر دیا۔ شمع رسالت کے پروانوں اور حرمت مصطفیٰ ﷺ پر جان نچھاور کرنے والے عشاق کی فکری وابستگیاں اسی تاریخ ساز شخصیت کے ساتھ تھیں جو تاریخ عشق رسول ﷺ کے ماتھے کا جھومر ہے۔ چودھویں صدی کے اس امام حریت و محبت کا ہی فیض وجود تھا کہ گستاخ مقام رسول ﷺ پر انگلی اٹھانے بھی نہ پاتا کہ شمع رسالت کا کوئی نہ کوئی پروانہ اس کا گلا کاٹ کر

رکھ دیتا۔ تمام شہیدان ناموس رسالت نے سولی پر لٹک جانے تک الصلوٰۃ والسلام علیک یا سیدی یا رسول اللہ کا ملکوتی وظیفہ اپنے ہونٹوں پر سجائے رکھا۔ وہ عاشقانِ مصطفٰے، گلاب کی طرح مہکتی ہوئی جن کی جوانیاں، حرمت و ناموسِ رسول ﷺ پر قربان ہوئیں اور شاتمانِ نبی کے لیے جو لپکتا ہوا شعلہ اور کڑکتی ہوئی بجلی تھے، وہ دراصل فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاںؒ ہی کے مکتبہ فکر و حریت سے وابستہ و پیوستہ مانے اور جانے گئے ہیں۔

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

غازی عبدالرشید شہیدؒ

بلند شہر اور میرٹھ کے بارہ دیہات وقصبات پر مشتمل ایک علاقہ ''بارہ بستی افغانان'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مرکزی مقام بگراسی ضلع بلند شہر میں ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں بگراسی میں، مولوی قاضی سید حبیب علی اور مولوی قاضی سید خدا بخش خاندان سادات میں مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ غازی عبدالرشید شہید اسی معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے تایازاد بھائی مولانا قاضی سید محمد بشیر سے حاصل کی اور درس نظامی کے لیے گلاوٹھی کے ایک عربی مدرسہ میں داخل ہوئے۔ ازاں بعد اپنے والدین کے ہمراہ بگراسی سے ترک وطن کر کے دہلی میں آبسے۔

تاریخ میں سادات بارہہ کا تذکرہ بالتفصیل ملتا ہے جو کہ زیدی ہیں۔ ایک جگہ آپ کو اسی سلسلے سے متعلق بتایا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سلطان محمد غوری کی ہمراہی میں ان کے اسلاف نے جنگوں میں حصہ لیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ان کے ایک بزرگ سید رکن الدین مسعود کو رائے پرتھوری کے پاس شاہی قاصد کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ سید حسین میراں جنگ سوار جنہیں تارا گڑھ کی پہاڑی پر سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے شہادت کے بعد دفنایا، بھی اسی خاندان سے متعلق ہیں۔ تذکار تصوف میں ہے کہ اسی معزز قبیلہ کے ایک نامور بزرگ صوفی سید ابوالحسن، سلطان قطب الدین ایبک کے ساتھ فتح میرٹھ کے وقت موجود تھے اور وہیں ان کا مدفن ''مزار پیر جھنڈا'' کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ لوگ مغل اعظم، نورالدین جہانگیر، شاہجہان، اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں اہم انتظامی وفوجی عہدوں پر فائز رہے۔ خاندانِ مغلیہ کے عرصہ زوال میں قطب الملک سید عبداللہ اور امیر الامرا سید حسین علی خاں ''بادشاہ گر'' معروف تھے۔ محلاتی سازشوں میں ان کا بڑا نام تھا۔ ایک ایک واقعہ پراسرار ہے۔ فرخ سیر نے سادات بارہہ کا زور توڑنے کی بہت کوشش کی، مگر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بالآخر محمد شاہی عہد میں محمد امین خاں کی کامیاب منصوبہ بندی سے یہ خاندان تباہی سے دوچار ہوسکا۔ برعکس ان کے ''بارہ بستی افغان'' کی شاخ سیاسی پخت وپز سے ہمیشہ الگ تھلگ رہی۔ درس وتدریس، علم وفضل اور تصوف وروحانیت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اور شاید افتا کی

رعایت سے قاضی کہلواتے۔ پروانہ شمع رسالت قاضی عبدالرشید بھی اسی خاندان سے متعلق ہیں۔

غازی عبدالرشید شہیدؒ، پیشہ کے اعتبار سے خوش نویس تھے۔ سرو قد، چھریرا بدن، گندمی رنگ اور بیضوی چہرہ، کرتہ پاجامہ اور ترکی ٹوپی ان کی عام پوشاک تھی۔ عشق رسول مقبول ﷺ ان کا سرمایۂ حیات تھا اور شعائر اسلامی سے گہرا لگاؤ۔ آپ شروع ہی سے انگریز کے سخت مخالف تھے، اور آزادی کے حامی! مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد صدیقی اور حکیم اجمل خاں سے نشست و برخاست رہتی۔ بنا بریں وہ روحانی پاکیزگی اور حصول برکت و رہنمائی کے لیے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محل سے باقاعدہ بیعت ہوئے۔ انہوں نے کچھ وقت ملکانہ، راجپوتانہ اور میوات میں بھی بغرض تبلیغ گزارا، کیونکہ یہاں شدھی کے زہریلے اثرات متواتر پھیل رہے تھے۔

ابوالفضل صدیقی صاحب لکھتے ہیں کہ غازی عبدالرشید شہیدؒ نے ابتدائی تعلیم کے بعد کتابت سیکھی اور اسی کو ذریعہ معاش بنایا۔ روزگار کی تلاش میں ترک سکونت کر کے دہلی چلے آئے اور پھر مستقلاً یہیں قیام کیے رکھا۔ وہ بوڑھی ماں، ایک بیوہ بہن، جواں سال بیوی اور دو بچوں پر مشتمل خاندان کے کفیل تھے۔ قاضی صاحب مختلف جرائد و رسائل میں خوش نویسی سے بقدر ضرورت کما لیتے۔ غریب مگر بڑے خوددار تھے۔ قناعت پسند اور معاملے کے کھرے۔ انہوں نے نظام المشائخ۔ عصمت۔ منادی اور دین و دنیا میں بھی کام کیا۔

مولانا رزاق الخیری صاحب کا بیان ہے:

> ''جبلتاً مخصوص نوعیت کے جذباتی نوجوان تھے۔ ذات رسالت پاک ﷺ سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ رسول پاکؐ کی شان میں شدھی والے جو گستاخیاں کرتے تھے، انہیں پڑھ کر اور سن کر وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ کبھی کبھی جو شیلے انداز میں اس اذیت کا اظہار کرتے کہ سننے والوں کو بھی تڑپا دیتے۔''

جناب صادق الخیری اور ملا واحدی صاحب (جن کے ہاں وہ کام کرتے تھے) فرماتے ہیں:

> ''وہ خاموش طبع اور داخلی طور پر بے چین طبیعت کے مالک تھے۔ اس موضوع پر بہت کم بولتے تھے لیکن جب بولتے تو دل کے تمام زخم نمایاں کر دیتے، جس سے اندازہ ہوتا کہ اس معاملے میں وہ شدید داخلی ہیجان میں مبتلا ہیں اور ہمہ وقت ابلتے رہتے ہیں۔ زود نویس کاتب

تھے۔اس لئے انہیں ہرادارے میں پذیرائی حاصل تھی،لیکن ان کی متلون مزاجی اور تیکھا پن انہیں ٹک کر کام نہیں کرنے دیتا تھا''

آپ کے تیکھے پن اور غیرت ایمانی کا تذکرہ دیوان سنگھ مفتون نے اپنی کتاب 'ناقابل فراموش' میں ''سوامی شردھانند اور خواجہ حسن نظامی'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے، ظاہر ہے۔اس نے معاملہ مذکور اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھا تھا۔بین السطور ''غازی عبدالرشید شہید'' کے بارے میں اپنی یادداشتیں ضبط تحریر میں لاتے ہوئے لکھا:۔

''میں میٹرک پریڈ والے دفتر 'ریاست' میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ سوامی برامانند (جو سوامی شردھانند کی شدھی تحریکوں کا انچارج تھا) کا ٹیلی فون آیا کہ سوامی شردھانند کو ابھی ایک مسلمان نے قتل کر دیا ہے... میں فوراً سوامی جی کے نیا بازار والے مکان پر پہنچا۔اس وقت واقعہ کو ہوئے ایک گھنٹہ سے کم عرصہ ہوا تھا۔سوامی جی مقتول حالت میں خون سے لت پت لکڑی کے تخت پوش پر پڑے تھے۔قاتل عبدالرشید حراست میں تھا۔ہزار ہا لوگ جمع تھے اور شیخ نذیر الحق انسپکٹر ابتدائی تحقیقات میں مصروف تھے۔میں نے جب عبدالرشید کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ قتل عبدالرشید کی مذہبی دیوانگی کا نتیجہ ہے، کیونکہ اس کی دیوانگی کی علامات ایک عرصہ پہلے ذیل کی صورت میں دفتر 'ریاست' میں ظاہر ہو چکی تھیں اور وہ واقعات یہ تھے:

افغانستان میں کنگ امان اللہ کے حکم سے چند احمدی سنگسار کر دیئے گئے جو وہاں اپنے احمدی خیالات کی تبلیغ کرتے تھے۔چنانچہ میں نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے افغان گورنمنٹ کے خلاف ایک سخت ایڈیٹوریل نوٹ لکھا اور یہ نوٹ اس کاتب عبدالرشید کو کتابت کیلئے دیا۔عبدالرشید نے ابھی چند سطروں کی کتابت کی تھی کہ وہ میرے پاس آیا۔اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔چہرے پر غصہ کے جذبات تھے۔کہنے لگا:

''آپ کو شرعی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق حاصل ہے؟ اسلام کی تعلیم کے مطابق سنگساری جائز ہے اور احمدیوں کو ضرور سنگسار کیا جانا چاہیے تھا، کیونکہ یہ مرزا قادیانی کے نبی ہونے کے دعویدار ہیں۔میں

یہ کافرانہ نوٹ نہیں لکھ سکتا، میں نے اس کو جب انتہائی غصہ کی حالت میں دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اس سے نوٹ واپس لے کر دوسرے کاتب کو دے دیا اور اس کا حساب کر کے اپنے دفتر سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد عبدالرشید کے جو حالات مجھے معلوم ہوئے وہ یہ تھے کہ ہجرت کی تحریک میں یہ افغانستان چلا گیا تھا اور وہاں سے جب مہاجر واپس ہندوستان آئے تو یہ بھی واپس آ گیا اور آتے ہوئے وہاں سے ایک ریوالور اپنے ساتھ لے آیا اور اس ریوالور سے ہی اس نے سوامی شردھانند کو قتل کیا''۔



غازی عبدالرشید شہیدؒ نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے تایا زاد بھائی سے حاصل کی اور بعدازاں گلاوٹھی، ضلع بلند شہر کے عربی مدرسہ میں درس نظامی کیلئے داخلہ لیا تھا۔ آپ کے حالات زندگی میں دیوان سنگھ مفتون نے افغانستان کی طرف سفر ہجرت کا اشارہ دیا ہے، حالانکہ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ ان دنوں حکیم اجمل خاں نے مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے مشورہ سے شاہ افغانستان کے نام ایک خط لکھا۔ اس میں درخواست کی گئی تھی کہ آپ ہندوستان پر حملہ کر دیں۔ اس وقت انگریز کے خلاف مسلمان اور ہندو بھی باہم متفق ہیں۔ یہاں کے سب لوگ آپ کا ساتھ دیں گے اور انشاءاللہ فتح حاصل ہوگی اور یوں آپ کے ذریعے ہندوستان میں اسلام کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔

خط پہنچانے کے لیے حکیم صاحب کی نگاہِ انتخاب مولانا قاضی عبدالرشید پر پڑی۔ کہا گیا کہ آپ افغانستان ہجرت کر جائیں اور مکتوب شاہِ افغانستان کی خدمت میں ذاتی طور پر پیش کریں۔ دوسرا خط مولانا محمد علی مرحوم کا تھا جو کابل کے گورنر کے نام تھا اور اس میں سفارش کی گئی تھی کہ قاضی صاحب کو رہائش وغیرہ کی سہولت بہم پہنچائی جائے اور ہر ممکن تعاون فرمائیں۔ قاضی صاحب نے یہ دونوں خط محفوظ کر لیے اور مع اپنی اہلیہ اور صاحبزادہ کے روانہ ہو گئے۔ کابل پہنچ کر آپ نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حکیم اجمل خان کا خط غائب ہے۔

مکتوب مذکور کے یوں غائب ہو جانے کا معاملہ بہت پیچیدہ تھا، لیکن کافی عرصہ تک یہ حل نہ

ہوسکا۔ قاضی عبدالرشید شہیدؒ کا ایک خالہ زاد بھائی احمد حسن تھا۔ اس نے ڈاکٹر انصاری کے وظیفہ پر علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ قاضی صاحب کے گھر بھائی کے رشتہ سے اس کی بے تکلفانہ آمد و رفت تھی۔ دراصل احمد حسن سی۔ آئی۔ ڈی کا ایک در پردہ افسر تھا، جس کا تعلق براہ راست وائسرائے سے تھا۔ حکیم صاحب کا وہ خفیہ خط اسی نے اڑایا تھا البتہ کسی مصلحت سے وائسرائے تک نہیں پہنچایا۔ تاہم اس نے یہ رپورٹ ضرور دی کہ مسلمان لیڈر شاہ افغانستان کو برطانوی ہند پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔

یہ راز یوں کھلا کہ احمد حسن کا قیام قاضی عبدالرشید کے مکان پر تھا۔ ایک روز آپ تبلیغی دورہ کے بعد گھر پہنچے۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ دیکھا کہ احمد حسن کے کمرے سے روشنی آ رہی ہے۔ آپ نے دروازے کی دراڑ سے جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ کاغذات پھیلے ہوئے ہیں اور احمد حسن کچھ لکھ رہا ہے۔ آپ نے اسے دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو وہ ایک دم گھبرا سا گیا۔ بہرحال کاغذات کا پلندہ بستر کے نیچے چھپا کر دروازہ کھولا۔ قاضی صاحب کو اس حرکت پر شبہ پڑ گیا اور پوچھا کہ تم کیا لکھ رہے تھے؟ مجھے بھی دکھاؤ۔ ''کچھ نہیں ایک دوست کو خط لکھ رہا تھا'' اس نے کہا۔ آپ کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ قاضی صاحب، احمد حسن کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر سوار ہو گئے اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا لیا اور کڑک کر بولے:

''اب بتا تو یہ کیا لکھ رہا تھا؟ تو نے وہ حکیم اجمل خان کا خط کیسے اڑایا تھا؟ اور اب تک تو میرے خلاف کیا کیا کرتا رہا؟''

اس نے اپنے کرتوت بتاتے ہوئے کہا کہ ''بھائی صاحب! تم لوگوں کو تو میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میں نے ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور آپ کو سزائے موت سے بچا لیا۔ اگر وہ خط میں وائسرائے کو پہنچا دیتا تو آپ سب تختہ دار پر چڑھ چکے ہوتے۔ وائسرائے کے حکم خاص سے میں آپ کے پیچھے افغانستان بھی گیا تھا تا کہ ایسی اسکیموں اور تمام معلومات سے حکومت کو آگاہ کر سکوں۔''

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب آریہ سماجی چیلے قریہ قریہ اور شہر شہر پھیل چکے تھے۔ نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ ہندو استریاں بھی ''شدھ ہو جاؤ اور پسند کر لو' کے اشتہار آویزاں کر کے کھلی گاڑیوں میں جلوس نکالنے لگیں۔ شدھی تحریک کے نت نئے فتنے اٹھنے لگے تو قاضی صاحب دل ہی دل میں سوچا کرتے تھے کہ اس فتنہ و شر کو کیسے ختم کیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کے

خبیث، بے غیرت گورو کو فنا کے گھاٹ اتار دیں۔ بالآخر کابل میں قیام کے دوران ان کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ انہوں نے حضور رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ میں زبان درازی کی جسارت کرنے والے گروہ کے سرغنہ کا قصہ تمام کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ آپ افغانستان سے واپسی پر ایک پستول اور چند گولیاں خرید لائے۔ اب یہ مرد غازی موقع کی تلاش میں تھا۔ قدرت نے جلد ہی تکمیل جہاد سے سرفراز فرما دیا۔

۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں ایک گہری سازش کے تحت تحریک شاتمِ رسول کا بانی، سوامی شردھانند دہلی میں اپنے مکان میں موجود تھا کہ آپ نے پستول سے پے در پے فائر کر کے اسے فنا فی النار کر دیا۔ اس غیور مرد مجاہد نے تاریخ میں غازی عبدالرشید شہیدؒ کے نام سے شہرت پائی۔

اس حوالے سے مولانا رازق الخیری صاحب کا ایک بیان بڑا دلچسپ اور روح پرور ہے:

''وہ (غازی عبدالرشید شہیدؒ) اکثر خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی اور ہمارے ہاں کام کرتے تھے۔ بڑے شائستہ غریب طبیعت اور مسکین صفت تھے۔ ان کی کم آمیزی اور کم گوئی کے باوجود ہم ان کی فطرت کے اتنے محرم ہو گئے تھے کہ ان کے اس اقدام پر چنداں حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ رسول پاکؐ کی تضحیک و توہین بھرے کلمات پڑھ کر اور سن کر ان کے سینے میں جو الاؤ کبھی ابلنے لگتا تھا اور ہر وقت اندیشہ رہتا تھا کہ نہ معلوم یہ لاوا کس وقت ابل پڑے۔''

دشمن رسولؐ سوامی شردھانند کو جہنم رسید کر کے انہیں چین سا آ گیا تھا۔ دن دیہاڑے اتنا بڑا اقدام کرنے کے باوجود چنداں ہراساں نہ ہوئے بلکہ تختہ دار پر جام شہادت نوش کرنے تک انہیں پورا اطمینان قلب حاصل تھا۔ کہنے کو مزدور پیشہ کاتب تھے لیکن عشق رسولؐ اور جذبہ و مستی کے طفیل اس اعلیٰ مقام اور بلند منزل پر جا پہنچے تھے۔ تحفظ ناموس رسالت کا فرض کفایہ ادا کر کے سچے عاشقوں اور راز دانوں میں اپنا نام لکھوا لیا۔ مانا کہ بے کس و بے بس اور بے زور و بے پر تھے لیکن بلند نصب العین کی پرواز تو عرش بریں تک ہوتی ہے۔ اس کی بدولت وہ اس مرتبے پر جا پہنچے جہاں کائنات کی وسعتیں سمٹ جاتیں اور پائے استقامت کے تلوے چاٹتی ہیں۔

غازی عبدالرشید شہیدؒ کے ایک رفیق کار محترم سردار علی صابری بتاتے ہیں کہ جن دنوں

حضرت قبلہ غازی صاحب، اخبار ''ریاست'' میں فرائض کتابت سرانجام دیتے تھے، دفتر کوچہ بلاقی بیگم، دہلی میں تھا۔ گلی میں دروازہ اور اسپلنیڈ روڈ کے سامنے برآمدہ۔ قید علائق سے آزاد ہونے کے باعث ''ریاست'' کے دفتر میں ہی دن رات قیام رہتا تھا۔ قاضی صاحب کی نشست میری میز کے قریب ہوا کرتی تھی۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ دفتر کے اوقات میں ظہر وعصر کی نمازیں ''دریبہ'' کی مسجد میں باجماعت ادا کرتے اور آریہ سماجیوں کی نجس وناپاک حرکتوں سے ان کے جذبات بے حد مجروح ہو چکے تھے۔

۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۶ء جمعرات کا دن تھا۔ چار پانچ بجے شام دریبہ کے ہندو علاقہ میں ہنگامے کی اطلاعات آنے لگیں۔ پورے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ ازاں بعد روزنامہ ''تیج'' کا ضمیمہ شائع ہوا۔ اس میں شردھانند کے قتل کی خبر اور غازی صاحب کی تصویر بھی تھی کہ ہتھکڑیاں پہنے پولیس کی حراست میں کھڑے ہوئے ہیں اور جسم پر چادر ہے۔ معلوم ہوا غازی عبدالرشید اسی چادر میں پستول چھپا کر شردھانند تک گئے تھے اور ملعون ازلی کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ سوامی شردھانند کے قتل کی خبر آناً فاناً پورے شہر میں پھیل گئی۔ ہندوؤں نے اپنی دکانیں بند کر دی تھیں اور مسلمانوں کے خلاف احتجاج کرنے لگے، جب کہ دوسری طرف مسلمانوں نے اس پر اظہار مسرت کیا۔ خوشی سے بتاشے بانٹے۔ بعض نے محفل میلاد کروائی اور اگلے روز مختلف جگہوں پر باقاعدہ نماز شکرانہ بھی ادا کی گئی۔

ہندوؤں نے اس خبر کو انتہائی دکھ کے ساتھ سنا اور اسی وقت ایک فسادکوش جماعت نے محض نہتے اور ناکردہ راہ گیر مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ اس میں کئی مسلمان زخمی اور ایک اکہتر سالہ بزرگ محبوب علی خاں، جاں بحق ہوئے۔

غازی عبدالرشید کے پسماندگان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی بیوہ لیڈی ڈاکٹر اصغری بیگم کا ۷۔ مئی ۱۹۶۹ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ آپ کے ایک بھائی مولوی قاضی جمیل احمد نے نومبر ۱۹۶۸ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور آپکے سب سے چھوٹے بھائی مولوی قاضی خلیل احمد کا قیام لیاقت آباد کراچی میں ہے۔ اپنا وقت زہد وعبادت میں صرف کرتے شہید محبت کے صاحبزادے مولوی حکیم قاضی محمود الحسن صاحب دہلی میں مقیم ہیں۔ غازی صاحب نے تین شادیاں کی تھیں۔ چونکہ وہ دنیاداری کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دیتے اور اکثر وقت اوراد ووظائف میں گم رہتے، اس لیے بھی اور طبعی عدم موافقت کی بنا پر پہلی دو بیویوں کو طلاق دینا پڑ گئی تھی۔ غازی

عبدالرشید شہید کے ایک حقیقی بھانجے ڈاکٹر احسن کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ عزیز آباد نمبر ۳، کراچی میں مقیم ہیں۔



سوامی شردھانند

بھارت کی راجدھانی کے چاندنی چوک میں موتی مسجد اور اس کے بالکل سامنے دہلی کارپوریشن کا مرکزی دفتر واقع ہے۔ اگر بلدیہ کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوں تو صحن میں نصب ایک مجسمہ نظر پڑے گا۔ یہ ایک دہن دراز آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند کی یادگار ہے۔

سوامی شردھانند جالندھر کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصلی نام لالہ منشی رام بتایا جاتا ہے۔ ابتدائی چند سال پنجاب پولیس میں ملازم رہا۔ پھر محکمہ قانون میں مختار عدالت ہوا۔ ازاں بعد لاہور میں دیانند اینگلوویدک کالج سے وابستہ ہوگیا۔ انتظامی امور میں ادارہ کے پرنسپل ہنس راج سے اختلاف ہوا تو ڈی۔ اے۔ وی کے مقابلے میں ہردوار کے قریب موضع کانگڑی میں ایک گوروکالج قائم کر ڈالا۔ غالباً وہ کچھ عرصہ یو۔ پی میں بھی رہا۔ اس کے بعد سنیاس لے لی اور ابروؤں کا صفایا کر کے دھونی رمائی۔ یوں وہ ایک سادھو بن چکا تھا اور اسی وجہ سے ''سوامی شردھانند'' کہلایا۔ بہرحال اسے ہندو حلقوں میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں جب آل انڈیا کانگریس کے اجلاس، پنڈت موتی لعل نہرو کی زیرِ صدارت امرتسر میں منعقد ہوئے تو شردھانند مجلس استقبالیہ کا چیئرمین تھا۔

شردھانند نے سیاسی اعتبار سے کئی رنگ بھرے۔ اولاً، قوم پرستی کی دعوت۔ ثانیاً، ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ۔ ثالثاً تحریک گستاخیٔ رسول۔ اس کا آخر الذکر روپ انتہائی اشتعال انگیز، قابل نفرین، روح فرسا، پاجیانہ، زلزلہ خیز اور گھناؤنا تھا۔

۱۹۲۳ء کے دوران اسے دفعہ ۱۲۴۔الف کے تحت قید سخت کی سزا سنائی گئی۔ معافی نامہ گزار کر جیل سے رہا ہوا تو برملا اپنے خبث باطن کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے سب سے پہلے روزنامہ ''تیج'' کے ایک مضمون میں اسلام پر پہلا وار کیا۔ الفاظ اس قدر نجس تھے کہ ہرگز لائق تذکرہ نہیں۔ سوامی شردھانند ایک مدت سے دہلی میں مقیم تھا۔ اُردو اخبار ''تیج'' اس کے زیرِ نگرانی یہیں سے نکلتا، جبکہ مذکور مردود کے بیٹے نے ہندی میں روزنامہ ''ارجن'' جاری کر رکھا تھا۔ سوامی شردھانند کا

قد لمبا، داڑھی مونچھ صاف، سر منڈا ہوا، آواز بہت بھاری اور لباس سادھوؤں سا رنگدار۔ قتل کے وقت عمر پینسٹھ کے لگ بھگ اور رہائش نیا بازار والے مکان میں تھی۔

شردھانند نے ابتداً خاندان مغلیہ کی شہزادیوں کے خلاف فحش ڈرامے لکھے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک انتہا پسند ہندوؤں کا معمول ہو گئی۔ ایک مرتبہ زینت آراء بیگم کے متعلق لکھا گیا کہ وہ انتہائی بدچلن عورت تھی۔ بنا بریں ہندوؤں کو مشتعل کرنے کے لیے عہدِ سابق کے مسلم سلاطین کے فرضی مظالم کی کہانیاں بہت بڑھا چڑھا کر شائع کی جاتیں۔ نیز ہندو عورتوں کے اغوا اور پیروکاران اسلام کے ہاتھوں ان کی عزت لٹ جانے کا کوئی نہ کوئی قصہ بہر حال گھڑ لیا جاتا۔

ایک ہندو چیلے نے قرآن پاک کی مخالفت میں لکھنا شروع کیا۔ سوامی شردھانند کی اشیرباد سے ہی ایک اور اخبار ''گورو گھنٹال'' جاری ہوا۔ اس میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں پر کیچڑ اچھالتے۔ آشرم کے کارکنوں نے اولیائے کرام، دین اسلام اور کتاب مبین کے خلاف افترا پردازی، بہتان تراشی، اور دشنام طرازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ گندے لہجے میں فحش الفاظ، حرف حرف زہر میں بجھا ہوا۔

المختصر آریہ سماجیوں کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اب وہ اپنی ناپاک زبان اور پلید قلم سے سرکار مدینہ ﷺ کی ذات بابرکات کو نشانہ طنز و استہزا بناتے۔ تحریکِ گستاخی رسول کی پہلی واضح علامت ،سوامی دیانند سرسوتی کے اس انتہا پسند چیلے شردھانند کی شکل میں سامنے آئی تھی۔ مسلمانوں کی دل آزاری، ضبطی قرآن کی قرار دادیں، مشاہیر اسلام پر گستاخانہ تبصرے، صوفیائے عظام کی ہتک، صحابہ کرام کے متعلق مغلظات و بکواسات، شان اہل بیت میں ہرزہ سرائی اور آقائے مدنی ﷺ کی حرمت و تقدیس کو نشانہ بنانا اس کا وطیرہ تھا۔ وہ برملا کہا کرتا کہ اگر ہندو بقا چاہتے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کو فنا کر دیں۔

رسول عربی ﷺ کے مقام رفیع پر حملہ ہو اور شیدایان مصطفیٰ بزم دار و رسن نہ سجائیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نازک مرحلے پر بھی ایک بلند مرتبہ شہباز عشق، مردود پر جھپٹا، پلٹا اور پلٹ کر جھپٹا۔ یہ خوش قسمت مجاہد ''غازی عبدالرشید شہید'' تھا جو برصغیر پاک و ہند میں شہیدان ناموس رسالت کا سپہ سالار اول ٹھہرا اور تاریخ حریت و جانبازی کی آبرو قرار دیا گیا ہے۔

گستاخ رسول قتل ہوتا ہے

وہ ایک غیر معمولی دن تھا۔ ناموس نبی کا غیور محافظ غازی عبدالرشید شہیدؒ، دشمن رسولؐ کو

ٹھکانے لگانے انتہائی اعتماد کے ساتھ شردھانند کے آشرم میں جا گھسا۔ اتفاق سے اس وقت دریدہ دہن تنہا موجود تھا۔ غازی صاحب نے ایک ثانیے کمرے کا جائزہ لیا اور للکارا:

''بے غیرت کمینے! تو نے مسلسل میرے رسولؐ سے دشمنی کی اور بکواس بکتا رہا ہے، اب میں تجھے ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ ذلت و رسوائی کی موت کے لیے تیار ہو جا۔''

آتش غضب میں یہ کہتے ہوئے لبلبی دبا کر چھ کی چھ گولیاں دشمن رسولؐ کے سینے میں اتار دیں۔ فائر کی آواز سن کر لوگ دوڑ کر آئے اور دیکھا کہ تڑپتے، پھڑکتے اور کراہتے ہوئے شردھانند کے جسم کو ایک شخص انتہائی غصہ کے عالم میں جوتوں سے ٹھوکریں لگا رہا ہے۔ یہ کیفیت دیدنی تھی۔ اگر غازی صاحب شاتم نبی کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد راہ فرار اختیار کرنا چاہتے تو ممکن تھا، لیکن عاشق رسول یہ کیونکر گوارا فرماتے۔ آپ نے جائے واردات سے بھاگنے کی قطعاً کوشش نہ کی بلکہ بصد شوق خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ جب آپ کو ہتھکڑی پہنا دی گئی تو مسکراتے ہوئے فرمایا: یہ راہ شوق میں پھولوں کے گجرے ہیں۔

ہندوؤں نے سوامی شردھانند کی ارتھی کا جلوس نکالا جس میں ہزارہا آدمی شریک تھے۔ جگہ جگہ جوشیلی نظمیں پڑھی جا رہی تھیں اور تقریریں کر کے ہندو عوام کو اشتعال دلایا گیا۔ اس سے نقص امن عامہ کا سخت اندیشہ لاحق ہو گیا۔ ہندو قانونی چارہ جوئی اور عدالتی کارروائی کے بجائے انتقام، انتقام کا شور مچا رہے تھے۔

۲۵۔ دسمبر کو مہاتما گاندھی نے ایک جامع مضمون ''شردھانند جی شہید'' کے عنوان سے اپنے اخبار ''ینگ انڈیا'' کی آئندہ اشاعت کے لیے لکھا اور اس کی ایک نقل ایسوسی ایٹڈ پریس کو بھی جاری کر دی۔ اس میں گاندھی جی نے سوامی شردھانند کی مفسدانہ فطرت پر اظہار خیال کیا اور آئندہ خدشات کا تذکرہ بھی چھیڑا۔ مرقوم تھا:

''عبدالرشید کے فعل کے ذمہ دار ہم ہیں۔ میں عبدالرشید کی بریت ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ میں واقف نہیں کہ وہ کون ہے۔ یہ امر بھی درخور اعتنا نہیں کہ اس فعل کی محرک کیا بات ہے۔ یہ قصور ہمارا ہے، کیونکہ اخبار کا مالک ایک چلتا پھرتا طاعون بن کر رہ گیا ہے۔ تہمتوں اور دروغ بافیوں کی وبا پھیلاتا ہے۔ وہ اپنی زبان کے تمام ذلیل اور اشتعال انگیز لغات ختم کر

دیتا ہے اور یہ زہریلا مادہ وہ اپنے قارئین کے صاف دماغوں میں ٹھونس دیتا ہے۔ لیڈر خود اپنا راگ الاپے جا رہے ہیں اور اپنی ہی یاوہ گوئی میں مدہوش ہیں اور ان کو علم نہیں کہ انہیں اپنی زبانوں اور قلموں کو لگام دینی چاہیے۔ سیاہ کارانہ اور ناپاک پراپیگنڈے کی تاثیر آزادانہ اور بے حجابانہ طور پر اپنا کام کر رہی ہے۔ لہٰذا یہ ہم تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عبدالرشید کے مجنونانہ جوش کے ذمہ دار ہیں۔ دروغ بافیوں یا مبالغہ آمیزیوں کو تحفظ ذاتی اور اظہار صفائی سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے آئندہ بھی یہ توقع کچھ زیادہ نہیں کہ سوامی جی کا خون ہمارے جرموں کے سیاہ داغوں کو دھوڈالے اور ہمارے دلوں کی صفائی کا باعث ہوگا''۔

اس کے برعکس ۵۔جنوری کو یہ خبر شائع ہوئی کہ راجہ نریندر، پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے نے بنارس میں ہندو قوم سے چندے کی اپیل کی ہے تا کہ سوامی شردھانند کے مشن کو مزید آگے بڑھایا جا سکے اور شدھی کی تحریک تیز ہو۔ باقاعدہ اعلان کیا گیا کہ ۹۔جنوری کو پورے دیش میں شردھانند جی کا یوم ماتم منایا اور دس لاکھ روپیہ چندہ جمع کیا جائے گا۔ شام کو جلسے منعقد ہوں گے تا کہ مسلمانوں کو شدھ کرنے پر زور دیا جائے۔

سوامی شردھانند کے مقدمہ قتل کی تفتیش جاری تھی۔ حکام بالا نے پولیس کو سخت تاکید کی کہ وہ اندر سات یوم تحقیقات مکمل کریں، اس لیے کہ مزید مہلت نہیں دی جا سکتی۔ علاوہ ازیں بعض ہندو زعما چاہتے تھے کہ اس واقعے کو ایک گہری سازش کے طور پر لیا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان ملوث ہوں۔

روزنامہ ''ہمدرد'' دہلی کے مطابق ۲۸۔دسمبر سوا گیارہ بجے قبل از دوپہر، دو پولیس اہلکار مفتی کفایت اللہ صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ کپتان پولیس آپ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا انہیں اپنے ہمراہ لے گئے، ان سے غازی صاحب کے متعلق پوچھ گچھ ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ میں موصوف کو عرصہ تین سال سے جانتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ کوئی سازش نہیں ہے بلکہ اس فعل کا ذمہ دار فرد واحد ہے جو کہ تمہاری تحویل میں ہے۔

سازش سازی کے حوالے سے دیوان سنگھ مفتون کا بیان بالخصوص ملاحظہ کرنا چاہیے:

''سوامی شردھانند کے مکان پر جب عبدالرشید حراست میں تھا تو

مجمع میں لوگ اس قتل کی ذمہ داری خواجہ حسن نظامی پر ڈال رہے تھے اور کہا جارہا تھا کہ قاتل، خواجہ حسن نظامی کا ایجنٹ اور بھیجا ہوا ہے۔''

سوانح عمری حضرت خواجہ حسن نظامی میں ملا واحدی دہلوی مرحوم صراحتاً تحریر فرماتے ہیں:

''خواجہ صاحب شردھانند کے خلاف لکھتے تو رہتے ہی تھے۔ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کو جو سوامی جی کے قتل کا دن تھا صبح ہی صبح خواجہ صاحب نے کوئی کارٹون یا مضمون نکالا تھا یا پوسٹر چسپاں کیا گیا تھا جس میں کچھ ایسا اشارہ تھا جسے آریوں نے اپنے دعوے کی دلیل بنایا۔ نیز اسی دن انہوں نے تیسرے پہر پنجاب نیشنل بینک سے ایک ہزار روپے لیے تھے۔ بینک کے ہندو عملے نے مشہور کر دیا کہ خواجہ صاحب نے کسی شخص کو ایک ہزار دلوائے تھے اور روپے دلوانے خود ساتھ آئے تھے اور ہم نے خود روپوں کا دینا دیکھا تھا۔ ہندوؤں کا عام گمان تھا کہ ہزار روپے لینے والے منشی عبدالرشید تھے جنہوں نے سوامی جی پر گولی چلائی۔ خواجہ صاحب نیشنل بینک سے واپس آکر اپنے مکان میں تشریف فرما تھے۔ جمعرات کا دن تھا، اس لیے بڑا مجمع تھا۔ یکا یک سنا کہ ایک مسلمان نے سوامی شردھانند کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد فوراً ٹیلی فون پر خواجہ صاحب سے کہا جانے لگا کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ عبدالرشید تمہارے ہاں کاپی نویس تھا۔ تم نے اس سے سوامی جی کو قتل کروا دیا۔ تم بھی قتل ہونے کے لیے تیار رہو''

اخبار 'ارجن' اور اخبار 'تیج' کے ضمیموں میں جو کہ شردھانند کے واقعہ کی نسبت شائع ہوئے تھے، صاف صاف خواجہ صاحب کا نام لکھ دیا گیا کہ یہ ان کے کارٹون اور نظم کا نتیجہ ہے۔ ان دو اخباروں کے علاوہ اور بھی ہندو آریہ اخبارات میں ان کو نامزد کرنے کی تجویز دی گئی۔ خواجہ صاحب آریوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود کسی معمولی قانونی زد میں بھی نہ آسکے۔ تاہم پولیس افسران نے یہ پوچھ گچھ ضرور کی تھی کہ سوامی جی کے قتل کے دن جو ہزار روپے نکلوائے گئے تھے، کس کام پر خرچ ہوئے۔ حساب پڑتالا گیا تو شک رفع ہو گیا۔ بد بخت ہندو یہ کسی طور نہ سمجھ سکتے تھے کہ تحفظ ناموسِ رسالت میں پیسوں کا کاروبار نہیں ہوتا۔ یہ قوم اپنے آقا و مولاؐ کی حرمت و تقدیس کے لیے سب کچھ لٹا سکتی ہے۔ تن، من، دھن اور ہر شے قربان کر سکتی ہے۔ ملت اسلامیہ اپنے رسول ﷺ

سے محبت وعقیدت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ بہی کھاتوں کا رواج عشق کے دھرم میں نہیں چلا کرتا۔

ملا واحدی اس سلسلے میں مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے مکان کے قریب پٹودی ہاؤس میں آریوں کا گڑھ تھا۔ پٹودی ہاؤس کے سامنے بالا خانے پر مولانا زاہد القادری رہتے تھے۔ ان کے نام کا ایک لفافہ جسے انہوں نے بغیر چاک کیے ڈال دیا تھا، ہوا سے اڑ کر پٹودی ہاؤس میں جا گرا۔ پٹودی ہاؤس والوں نے اس لفافے کو اٹھالیا اور پتے سے مشابہ خط لکھ کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بھیج دیا کہ دیکھیے مسلمان ایسی سازشیں کر رہے ہیں۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کوتوال شہر کو حکم دیا کہ تحقیقات کرو''۔

الغرض ٦ جنوری صبح ١٠ بجے، سب انسپکٹر تھانہ دریا گنج مولانا زاہد القادری صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈپٹی اکرام الحق نے ان سے معاملہ دریافت کیا اور مختلف سوال جواب ہوئے۔ مولانا موصوف کا آبائی وطن، ''اترولی''، ضلع علی گڑھ تھا اور ١٩١٩ء کے دوران دلی میں آکر کوچہ چیلاں میں رہائش پذیر ہوگئے تھے۔ سازش کا سراغ لگانے کے لیے مولانا مظہر الدین شیرکوٹی ایڈیٹر ''الامان'' اور منشی محمد فردوس کاتب کی بھی طلبی ہوئی لیکن ایسا کوئی اشارہ نہ مل سکا۔ تفتیشی افسران میں اکرام الحق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی مسٹر نذیر الحق، انسپکٹر سی۔ آئی۔ ڈی اور سکھ افسر اجیت سنگھ، مسٹر مارگن، ملک دیوی ڈیال ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سٹی اور مسٹر آرڈ ایس ایس پی کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ ''ہمدرد'' دہلی، ١١۔ جنوری ١٩٢٧ء کے مطابق مولانا محمد علی جوہر، غازی عبدالرشید صاحب سے ملنے کوتوالی گئے۔ یہ ملاقات مسٹر آرڈ ایس ایس پی کی خصوصی اجازت سے ممکن ہوسکی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر ایک بجے کے قریب تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت قبلہ غازی صاحب کو ایک سلاخ دار کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے۔ بوقت ملاقات کئی ہندو افسران ذاتی طور پر موجود رہے۔ مولانا جوہر کے استفسار پر مرد غازی نے بتایا کہ مجھے صاف کپڑوں کی ضرورت ہے اور نماز وغیرہ کے لیے وضو کی سہولت چاہتا ہوں۔ نیز یہ کہ تحریری بیان لکھنے کے لیے قلم، دوات اور کاغذ فراہم کیا جائے۔

◉

روودادِ مقدمہ

پولیس کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ لہٰذا ۱۴۔ جنوری ۱۹۲۷ء کو مرافعہ کی باقاعدہ سماعت مسٹر بہنوت (آئی۔سی۔ایس) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں ۱۲ بجے دوپہر شروع ہوئی۔ مسٹر سورج نرائن پبلک پراسیکیوٹر، استغاثہ کی طرف سے پیش ہوئے۔ اس روز وکیل سرکار نے غازی صاحب سے مختلف سوالات کیے مگر آپ نے کوئی جواب دینے کی قطعاً کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

معمول کی کارروائی کے دوران خان نذیر الحق انسپکٹر آف پولیس سی۔آئی۔ڈی نے بتایا کہ میں بھی اس مقدمے کی تفتیش سے متعلق رہا ہوں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد یعنی ۶ بجے کے قریب وقوعہ کی جگہ پہنچا تھا۔ سوامی جی کی مضروبیت کے اور دیگر نقشے میں نے ہی تیار کیے۔ موقع واردات سے پستول کا ایک خالی کارتوس دستیاب ہوا تھا جو کہ سریندر ناتھ نے برآمد کیا۔ میں نے ملزم کے جسم سے خون آلود پاجامہ اتارا اور اس کا پلندہ بنا کر کیمیکل ایگزامینیشن کے لیے بھیجا تھا۔ پستول میرے آنے سے پہلے پکڑا جا چکا تھا۔ مقتول کے جسم سے کپڑے اتارے گئے تو ان میں سے ایک چلی ہوئی گولی نکلی اور وہ موجود ہے۔ میں اس تفتیش کا انچارج ہوں۔ ہم نے چودہ پندرہ یوم کے اندر قانونی کارروائی مکمل کی۔ ملزم کے حالات دریافت کرنے کے لیے پنڈت ہربنس رام اور آغا محمد اکبر کو تعینات کیا گیا تھا۔ ملزم کا مکان فیض بازار تھانہ کے علاقے میں ہے۔ واقعہ کے متعلق ابھی تک کسی سازش کا علم نہیں ہو سکا۔

عابد ہیڈ کانسٹیبل نمبر ۱۹۸ متعین کوتوالی نے اپنے بیان میں کہا:

> ''مقتول کی نعش کا پوسٹ مارٹم ڈاکٹر فرینکلن نے ۲۴۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ساڑھے گیارہ بجے کیا۔ اور اس کے جسم سے ڈاکٹر نے جو خون آلود پارچات اتارے اس کی فرد میں نے بنائی تھی اور دیگر فردیں بھی میری بنی ہوئی ہیں۔ دھرم پال میرا معاون تھا۔''

سریندر چند ولد لالہ کان چند قوم کھتری عمر ۲۳ سال جو کہ دیوان چند اینڈ کو ایک فرم میں ملازم تھا، نے بتایا کہ میں ساکن وہالی ضلع جہلم کا رہنے والا ہوں اور اب گلی قاسم جان، دہلی میں رہائش ہے۔ جس تاریخ کو سوامی جی قتل ہوئے، وقوعہ پر کوئی ۵ بجے کے قریب لایا گیا۔ ایل اینڈ ایم فردوں پر میرے ہی دستخط ہیں۔ ملزم کو اندازاً دو اڑھائی گھنٹے اسی جگہ رکھا گیا، جہاں واقعہ قتل

پیش آیا تھا۔ پولیس کی ابتدائی کارروائی کا بھی عینی شاہد ہوں۔ میرے علاوہ کئی اور اشخاص بھی موجود تھے۔

ایک اور گواہ رام لال ولد موہر لال قوم برہمن عمر ۲۲ سال نے بیان دیتے ہوئے بتایا کہ میں پان فروشی کا کاروبار کرتا ہوں۔ مجھے دن تو یاد نہیں ہے لیکن واقعہ سے کچھ دیر قبل اس ملزم نے (غازی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ایک پیسہ کا پان لے کر کسی دوسرے شخص کو دے دیا اور مجھ سے پوچھا کہ سوامی جی کا مکان کہاں ہے۔ میں نے بتا دیا کہ یہی ہے۔ اس نے جس آدمی کو پان دیا وہ دور کھڑا تھا اور میں اسے نہیں پہچان سکا۔ پھر یہ اوپر چڑھ گیا اور میں نے ایسی آواز سنی جیسے کہ پٹاخہ بارود چھوڑتے ہیں۔ نئے بازار میں آٹھ سال سے بیٹھا ہوں اور چھ روپیہ کرایہ دیا کرتا ہوں۔

ازاں بعد پروفیسر اندر کے علاوہ پولیس ملازم چھجو خاں نمبر ۱۰۵ جو کہ کوتوالی میں متعین ہے، نے بتایا کہ مجھے مہر شدہ کپڑوں کا پلندہ ملا تھا اور میں پولیس کے دفتر میں دے آیا تھا۔

پہلے روز سماعت کے آغاز میں عدالت کے احاطے میں بالکل ہجوم نہیں تھا۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ایک اہم مقدمہ پیش ہے۔ البتہ کچھ وقت بعد کافی اجتماع ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ آئندہ پیشی پر عطاء الرحمٰن ایڈووکیٹ ملزم کی طرف سے پیش ہو رہے ہیں۔ غازی صاحب کو دو سپاہی ہتھکڑیوں میں لائے اور کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ جب استغاثہ کی شہادتیں ختم ہو گئیں تو ملزم کی طرف سے ذکر الرحمٰن صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں عدالت کی توجہ ضابطہ فوجداری کے باب ۱۸ کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔

دو تین روز کی رسمی کارروائی کے بعد ۱۷۔ جنوری کو مقدمہ سیشن کورٹ کے سپرد کر دیا گیا، چوبیس تاریخ کو باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔ قبل ازیں گواہان صفائی کی فہرست عدالت میں پیش کی جا چکی تھی۔ سماعت کے ابتدائی مرحلے میں مسٹر محمد سلیم بیرسٹر نے ثابت کرنا چاہا کہ مقدمہ کو قانونی تقاضے پورے کئے بغیر سیشن کورٹ کے سپرد کر دیا گیا جو کہ غلط ہے۔ لہٰذا اسے دوبارہ مجسٹریٹ کے پاس بھیج دیں مگر یہ دلیل قبول نہیں کی گئی۔

سیشن کورٹ میں مرافعہ کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ مسٹر محمد سلیم بیرسٹر نے یہ موقف اختیار کیا کہ ملزم عبدالرشید کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا از روئے قانون وہ کسی فعل کا ذمہ دار نہیں گردانا جا سکتا۔ ۲۵۔ جنوری ۱۹۲۷ء غازی عبدالرشید صاحب کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا

گیا۔ آپ نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ تاریخ مقدمہ پر نہیں بلکہ شادی میں آئے ہوئے ہیں۔ پروانۂ شمع رسالت کے وکیل کے جواب میں مسٹر سورج نرائن، پبلک پراسیکیوٹر نے کہا کہ ملزم ہرگز فاتر العقل یا مخبوط الحواس نہیں ہے۔ خان بہادر اکرام الحق نے بھی اس بیان کی تائید کی۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل حضرات کو اسیسر منتخب کیا گیا۔

مسٹر نذیر حسین، مسٹر ایس۔ بی سنگھ، مسٹر سنیکلر، مسٹر ٹامس لیک، خواجہ عبدالمجید، نیاز محمد۔

جب یہ مرحلہ طے ہو چکا تو مسٹر محمد سلیم بیرسٹر کے موقف پر توجہ دی گئی کہ آیا ملزم پاگل ہے یا نہیں؟ غازی ممدوح کو وکلاء صاحبان کی طرف سے سختی سے کہا گیا تھا کہ وہ کسی سوال کا جواب نہ دیں اور بالکل خاموش رہیں گے۔ پیش کار نے پکارا تو آپ چپ رہے۔ جج نے چلا کر کہا:

'عبدالرشید'!

آپ ذرا سا مسکرائے۔

غازی صاحب کے وکیل نے آواز دی ''عبدالرشید! تم سنتے نہیں ہو؟''

لیکن آپ نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ مختلف آوازیں مگر ادھر خاموشی۔

''جناب یہ پاگل ہے'' ایک آواز آئی۔

آپ نے بڑی تمکنت سے سر اوپر اٹھایا اور جذباتی لہجہ میں بولے:

''کون کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں؟ پاگل تو تم ہو۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ایک دشمن رسول کو ٹھکانے لگایا ہے۔ تمہارے تفتیشی افسر اور اپنے اقربا و احباب کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں نے مردود کو موت کے گھاٹ اس لیے اتارا کہ خواب میں سید الشہداء حضرت امام حسینؓ نے مجھ سے فرمایا تھا ''تمہارے شہر میں میرے نانا نبی پاک ﷺ کی توہین کی جا رہی ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ اپنے آقا و مولا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ جو میرے نانا کی عظمت و ناموس کا تحفظ نہیں کرتا، اس کا مجھ سے کیا تعلق؟''

لیکن اس کے باوجود مسٹر محمد سلیم بیرسٹر اپنے استدلال اور قانونی نکات کے باعث عدالت سے یہ منوانے میں کامیاب ہو گئے کہ مبینہ ملزم کو معائنہ کے لیے دماغی ہسپتال بھجوا دیا جائے۔ سیشن جج کے حکم پر غازی عبدالرشید صاحب ۲۸۔ جنوری کو لاہور لائے گئے تاکہ طبی نگرانی میں ان کے

دماغی توازن سے متعلق معلوم کیا جائے۔میڈیکل بورڈ نے اپنی متفقہ رائے دی اور لکھا کہ ہمارے اندازے کے مطابق ملزم مذکور میں فاترالعقل ہونے کے ہرگز کوئی آثار نہیں۔اس نے ہمارے سامنے کئی بار بالکل صحیح انداز میں نماز پڑھی اور بڑی شائستہ گفتگو کی ہے۔اس کے رویوں اور حرکات وسکنات میں مخبوط الحواسی کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں ہے۔

آئندہ پیشی پر مقدمہ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی۔پبلک پراسیکیوٹر نے مقدمے کا آغاز کرتے ہوئے واقعہ کی تفصیل بیان کی اور بتایا کہ کن کن وجوہ سے استغاثہ کا موقف درست معلوم ہوتا ہے۔

پہلے عینی شاہد دھرم سنگھ پیش ہوا۔اس نے بتایا کہ میں شوروغل سن کر سوامی جی کے کمرے کی طرف لپکا۔سوامی جی ملزم سے کہہ رہے تھے کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟اس آدمی (عبدالرشید) نے چیخ کر کہا کہ میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔میرے جاتے ہی ملزم نے سوامی جی پر اپنی پستول سے پے در پے فائر کھول دیئے۔میں آگے بڑھا تو ایک گولی میرے بھی لگی۔لیکن مجھے کوئی شدید زخم نہیں آیا۔میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پر جان بوجھ کر گولی چلائی گئی تھی یا اتفاقاً ایسا ہوا۔

دوسرا گواہ دھرم پال تھا۔اس کیبقول:۔میں سوامی جی کا پرائیویٹ سیکرٹری ہوں۔میں ہر وقت ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔سوامی صاحب ٦۔دسمبر کو بیمار پڑ گئے تو میں تیمارداری پر بھی مامور ہوا۔میں نے پستول کی آواز سنی اور بھاگ کر کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ دھرم سنگھ اور ملزم گتھم گتھا ہیں اور دھرم سنگھ کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ہم نے مل کر ملزم کو قابو کیا اور پھر پولیس کو اطلاع دی۔

چندانند نے مذکورہ بالا گواہان کی تائید میں بیان کیا کہ سوامی جی کے دو کمرے ہیں۔ایک کمرے میں ان کے ساتھ حادثۂ موت پیش آیا، جب کہ دوسرے میں وہ بھوجن کرتے تھے۔ ہمارے مکان اور ان کے کمرہ میں ایک دیوار حائل ہے۔میں مہر چند کو حساب دے رہا تھا کہ اس امر کی اطلاع ملی اور میں نے بچشم خود ملزم کو ان کی گرفت میں دیکھا۔اس کے بعد مہر چند، اندر جی، رام لال، سردار اجیت سنگھ، گندا مل نقشہ نویس، سعادت خاں، محمد مشتاق ہیڈ کانسٹیبل اور شیخ عزیز الدین پراسیکیوٹر انسپکٹر کے بیانات قلم بند کئے گئے۔آج غازی عبدالرشید کی طرف سے چوہدری ظفر اللہ خان ایڈووکیٹ بھی عدالت میں موجود تھے۔ان کی جرح سے متاثر ہو کر خواجہ عبدالمجید اور مسٹر ایس بی سنگھ نے قرار دیا کہ بادی النظر میں چشم دید گواہ جھوٹے ہیں۔

ڈاکٹر فرینکلن کے بیان کے بعد خان بہادر اکرام الحق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا بیان شروع ہوا:

''میں بھی مسٹر آرڈ کے ہمراہ ملزم سے حالات دریافت کرنے گیا جو بقول ان کے یہ ہیں۔ وہ ہمیشہ کتابت کا پیشہ کرتا رہا ہے۔۱۹۱۳ء میں لاہور میں تھا۔ ہمدرد کے دفتر میں خوش نویس کی حیثیت سے رہا۔۱۹۱۴ء کے آغاز میں لکھنؤ چلا گیا۔ وہاں تقریباً چھ ماہ 'ہمدرد' کے سٹاف میں بطور کاتب کام کیا اور پھر دہلی آ گیا۔ اس کے بعد ۲۶۔ جنوری ۱۹۲۰ء کو وہ ہجرت کر کے افغانستان چلا گیا''۔

۷۔ مارچ ۱۹۲۷ء بوقت ۳ بجے سہ پہر مقدمے کی دوبارہ سماعت ہوئی۔ عدالت کے احاطہ میں لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم تھا۔ اب کے مسٹر محمد سلیم بیرسٹر نے اپنا موقف تبدیل کرتے ہوئے کہا کہ ملزم کا دماغی توازن درست قرار دیئے جانے کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سارا واقعہ مذہبی جوش وجنون کے باعث پیش آیا۔ اس صورت میں بھی عبدالرشید کو قانونی فائدہ پہنچتا ہے۔ جبکہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ مقتول شردھانند نے مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچائی اور اسلامی عقائد کا مذاق اڑایا۔ سرکاری وکیل نے اس کی تردید میں تقریر کی۔ جب وکلا کے مابین قانونی بحث مکمل ہو چکی تو اسیسران، مشورہ کے لیے باہر چلے گئے۔ یہ واپس پہنچے تو سیشن جج نے نیاز محمد سے سوال کیا:

''آپ کے خیال میں ملزم نے سوامی کو گولی ماری اور انہیں قتل کیا یا نہیں؟''

''ہاں! مگر یہ مذہبی جذبے سے ہوا'' نیاز محمد نے جواب دیا:

دیگر آسیران نے بھی اقرار کیا کہ واقعی ملزم نے سوامی شردھانند کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ لیکن پروفیسر خواجہ عبدالمجید نے کہا کہ عینی گواہ بالکل جھوٹے ہیں وہ موقع پر موجود نہ تھے۔ تاہم میں یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آیا ملزم نے گولی چلائی اور قتل کیا ہے یا نہیں؟ اس کے بعد مقدمہ ملتوی ہو گیا۔

فیصلہ کے لیے ۱۴۔ مارچ کی تاریخ مقرر تھی۔ اس روز صبح ہی عدالت میں کافی رش تھا۔ مسلمانانِ دہلی بھاری تعداد میں اپنے غازی اور محبوب ہیرو کا دمکتا چمکتا چہرہ دیکھنے کے لیے احاطے میں پہنچ چکے تھے۔ عدالتی کارروائی کا وقت شروع ہوا تو پولیس اہلکار پروانۂ شمع رسالت سید قاضی عبدالرشید کو لے کر آئے۔ قاضی صاحب نے خوش نما لباس پہن رکھا تھا اور خوشبو بھی استعمال کی ہوئی تھی۔ ان کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ ہوتا تھا بلکہ تمام وقت متبسم رہے۔

درمیانی وقفہ کے بعد سیشن جج نے فیصلہ سنایا:

''عینی شہادتوں اور حالات و واقعات سے واضح ہوگیا ہے کہ استغاثہ کے موقف کے مطابق عبدالرشید نے ارتکاب فعل کیا ہے۔ نیز اس کے اپنے بیانات اقراری ہیں۔ اس لیے سزائے موت کا فیصلہ صادر کیا جاتا ہے''۔

فیصلہ سنتا تھا کہ غازی صاحب کے لب پر مسکراہٹ کی چاندنی پھیل گئی اور انہوں نے جوش مسرت میں باآواز بلند ''اللہ اکبر'' کہا۔ آپ کے عظیم حوصلے اور نورانی چہرے کو سامنے پا کر وہ مسلمان جو کچہری کی حدود میں صبح ہی سے حاضر تھے نعرۂ تکبیر اور نعرہ رسالت لگاتے ہوئے ''غازی صاحب'' کی گاڑی کے آگے پیچھے دوڑنے لگے۔ ان کو پولیس اپنے ساتھ جیل لے جارہی تھی۔ غازی عبدالرشید کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ قلبی کیفیت چہرے سے عیاں ہوتی جاتی تھی۔ وہ قید خانے کی طرف جاتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا اور مسکرا مسکرا کر اپنے شیدائیوں کے سلام کا جواب دے اور خدا حافظ کہہ رہے تھے۔



سیشن کورٹ کے فیصلہ کے خلاف ''غازی عبدالرشید ڈیفینس کمیٹی'' نے ان کے ورثا کی اجازت سے چوہدری ظفر اللہ خاں بیرسٹر ایٹ لاء کی معرفت عدالت عالیہ میں اپیل دائر کی۔ مرافعہ کی سماعت لاہور ہائی کورٹ میں ہونا تھی۔ الغرض ۱۸۔ مئی ۱۹۲۷ء کوئی مرتبہ التوا کے بعد سماعت ہوئی۔ ڈویژنل بنچ مسٹر جسٹس براڈوے اور مسٹر جسٹس سکیمپ پر مشتمل تھا۔ حضرت قبلہ غازی صاحب کی طرف سے مسٹر ظفر اللہ خاں پیش ہوئے۔ دوسرے فریق کی جانب سے مسٹر کارڈن فورڈ کے علاوہ وکیل سرکار دیوان رام لال اور مسٹر راجکرٹس پیروکار تھے۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جو کہ ہندو تھا، نے امن عامہ قائم رکھنے کے لیے سخت انتظام کیے ہوئے تھے۔ ہائی کورٹ کے صحن میں پولیس اہلکاروں کی تعیناتی کے علاوہ عدالت کے کمرے اور بڑی سڑک پر بھی جا بجا پہرہ تھا۔

مسٹر آسیرن بطور وکیل اپیلانٹ نے آغاز گفتگو میں مختصراً مقدمے کا ذکر کیا اور کہا کہ سوامی شردھانند آریہ سماج کے ایک مشہور لیڈر تھے۔ استغاثہ کے مطابق وہ وقوعہ کی سہ پہر بیمار تھے۔ ان کا ایک نوکر دھرم سنگھ خدمت گزاری کے لیے موجود تھا۔ یہ اتفاقیہ طور پر باہر چلا گیا۔ کمرے کے تین

دروازے بند تھے اور صرف وہ دروازہ کھلا تھا جن سے دھرم سنگھ نکل کر گیا تھا۔ ملازم ابھی باہر تھا کہ ایک مسلمان آیا اور اس نے کہا کہ وہ سوامی کو ملنا چاہتا ہے۔ دھرم سنگھ نے کہا کہ وہ بیمار ہیں مگر سوامی جی نے آواز دی کہ اسے اندر آنے دو۔ چنانچہ ملازم مذکور عبدالرشید کو اندر لے گیا تو انہوں نے اسی سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ جب دھرم سنگھ پانی لینے گیا تو ملزم نے فائر کھول دیا۔ سیکرٹری جو کہ ساتھ والے کمرہ میں تھا، فوراً سوامی جی کے پاس آیا اور اپنا بازو قاضی عبدالرشید کے جسم کے گرد ڈال کے پیچھے سے پکڑ لیا۔ اسی حالت میں چند منٹ کشمکش جاری رہی۔ دریں اثنا دھرم سنگھ نے شور وغل کیا۔

ایف۔آئی۔آر پڑھنے کے بعد فاضل وکیل نے قانونی بحث شروع کی اور کہا کہ کسی گواہ نے یہ بیان نہیں کیا کہ کمرے میں خون بہہ رہا تھا اور نہ ہی پولیس نے یہ نوٹ کیا ہے کہ کمرہ میں کتنے افراد تھے۔ میرا موقف یہ ہے کہ مفروضہ قاتل بے گناہ ہے اور جب قاتل سوامی شردھانند کو ٹھکانے لگا کر راہِ فرار اختیار کر گیا تو ملازموں نے راہ چلتے ایک شخص کو پکڑا اور حوالہ پولیس کر دیا۔ وگرنہ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا تھا کہ وقوعہ کی صورت میں ملزم کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جاتا، جیسا کہ استغاثہ نے بھی تجویز کیا ہے کہ تقریباً بیس منٹ تک ہاتھا پائی رہی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کے عبدالرشید کہ خراش تک نہیں آئی ہے۔ مسٹر جسٹس براڈوے نے پوچھا: کیا پولیس نے ملزم کو اسی کمرے میں سے گرفتار نہیں کیا تھا؟

وکیل: جی ہاں! مگر استغاثے کی کہانی سے شک پیدا ہوتا ہے۔

جسٹس براڈوے: سیشن کورٹ میں تو اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عبدالرشید نے دھوکے میں آ کر یہ حرکت کی تھی اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کرنے پر اچھائی کا مرتکب ہو رہا ہے یا برائی کا؟

وکیل: اگر یہ ٹھیک بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی مجرم نہیں ٹھہرانا چاہیے۔

جسٹس براڈوے: کیا ملزم عبدالرشید نے سیشن کورٹ میں اپنے آپ کو پاگل تسلیم کیا تھا؟''

وکیل: نہیں بلکہ اس نے کہا تھا کہ میں قطعاً پاگل نہیں ہوں۔ پاگل تو وہ لوگ ہیں جو غیرت دینی اور جوش ایمانی کو میرا دیوانہ پن سمجھتے اور مجھے فاتر العقل کہہ رہے ہیں''

فاضل جج کے ایک اور سوال کے جواب میں مسٹر آسیرن نے کہا کہ اگر استغاثہ کی کہانی ٹھیک تصور کر لی جائے تو بھی قانونی معاملہ صاف نہیں،

کیونکہ تمام مقدمات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس مقدمے میں گواہان استغاثہ کی شہادتیں نا قابل اعتبار ہیں اور اکثر پہلو نامکمل۔

جسٹس براڈوے: یہ کیونکر ممکن ہے؟ سوامی جی کو روز روشن میں قتل کیا گیا تھا؟

وکیل:۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ جہاں تک پستول کا تعلق ہے، کسی گواہ نے یہ نہیں بتایا کہ جب عبدالرشید ارادہ قتل سے سوامی جی کے کمرے میں آئے تو ان کے ہاتھ میں پستول تھا۔''

جسٹس براڈوے: گواہان استغاثہ نے بیان کیا ہے کہ سوامی جی کو پستول کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

وکیل: دوسرا کمرہ جس میں کہ دھرم پال سیکرٹری سو رہا تھا، سوامی کے کمرہ کے بالکل نزدیک ہے۔ شہادت میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ ملزم مذکور دھرم پال کو کہاں تک لے گیا تھا۔ مزید برآں یہ کہ خون کے دھبوں کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی کشمکش میں گواہِ استغاثہ کے زخم کا کوئی ثبوت۔''

جسٹس براڈوے: گواہ استغاثہ کی شہادت میں کون سی خامی ہے؟

وکیل: دھرم سنگھ سوامی کا معتقد ملازم تھا اور بقول اس کے، وہ خود بھی زخمی ہو گیا۔ اس لیے اسے شک ہوا کہ پستول عبدالرشید نے چلایا ہے۔ خیال رہے کہ ملزم نے جب کہ اسے سوامی کے کمرے میں لے جایا گیا تھا، کیوں اسی وقت گولی نہ چلا دی۔''

جسٹس براڈوے: میں نہیں سمجھتا کہ ایک واقعہ میں خیال کو کہاں تک لایا جا سکتا ہے۔

وکیل: ''دھرم پال کے بیان سے شک اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے کہ پستول چھیننے میں اتنا زیادہ وقت لگا اور ملزم نے اس وقت تک کچھ نہیں کیا۔ گواہ کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ سوامی جی کے کمرہ میں جو آدمی جمع تھے وہ ہندو تھے یا مسلمان۔''

جسٹس براڈوے: کوئی بھی بات ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ واقعہ قتل روز روشن میں ہوا تھا۔ اس لیے اگر دھرم سنگھ کو بعض وجوہ کی بنا پر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ہم اس کی شہادت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

وکیل: گواہان استغاثہ کے بیانات مشکوک اور بالکل غیر فطری ہیں۔ پھر ان پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ اصل مجرم کو پکڑتے تو وہ اسے

مارتے گھسیٹتے۔ آخر بیس پچیس منٹ میں عبدالرشید سے پستول چھیننے کی کوئی کوشش کیوں نہ کی گئی؟ یہ ایک طویل دورانیہ ہے اور اس میں ملزم کو غیر مسلح کیا جا سکتا تھا۔ میں ذاتی طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے کسی اور آدمی کو پکڑ لیا اور اصلی مجرم ان کی زد سے بچ کر نکل گیا۔

جسٹس براڈوے: آپ یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ملزم کو زدوکوب نہیں کیا گیا اور وہ قتل نہیں ہوا۔

وکیل: میں شبہ ظاہر کر رہا ہوں۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ دھرم سنگھ کے بقول اس نے دو فائروں کی آواز سنی، حالانکہ وہ ساتھ والے کمرے میں تھا اور دوسرا گواہ چوتھا فائر ہونے پر کمرے میں پہنچتا ہے۔

جسٹس براڈوے: آپ اور کیا کہنا چاہتے ہیں؟

وکیل: بالفرض عبدالرشید اصل قاتل ہو تو بھی یہ بات فراموش نہ کی جانی چاہیے کہ ملزم شدید جذباتی کیفیت کا مالک ہے۔ بلکہ گواہان صفائی نے تو سیشن کورٹ میں کہا ہے کہ اس کا جذباتی پن جنون کے دورے کی وجہ سے تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ملزم کا مالک مکان سے بھی جھگڑا رہا اور اپنی بیوی کو اسی وجہ سے طلاق دے دی تھی۔ بنابریں اس مقدمے کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ ملزم نے سمجھا کہ سوامی شردھانند ان کے رسول پاکؐ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے اور یہ کہ وہ دین اسلام کا تمسخر اڑاتا ہے۔

چونکہ عدالت کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لیے مقدمہ کل پر ملتوی کر دیا گیا۔ ۱۹۔ جولائی ۱۹۲۷ء کو لاہور ہائی کورٹ میں سوامی شردھانند کے قتل سے متعلق غازی عبدالرشید کی اپیل کی مزید سماعت ہوئی۔

مسٹر آسیرن نے بحث جاری رکھتے ہوئے کہا کہ استغاثہ کا بیان ہے کہ ملزم نے سوامی جی کو اپنے مذہبی فرض کو پورا کرنے کے خیال سے قتل کیا تھا۔ عبدالرشید جیسے مزاج کا آدمی کبھی یہ خیال تک بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اس طرح کا جرم کرے۔ ملزم ایک معمولی آدمی کی حیثیت میں ہوتے ہوئے بھی اسلام کی حفاظت کا ذمہ اپنے اوپر لیتا ہے، یہ واقعہ بھی اس کے دل و دماغ کی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ بنابریں اس پہلو کے بھی واضح اشارے ملتے ہیں کہ عبدالرشید فی الواقع بے گناہ

ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ وہ چار یا پانچ فائر کرنے کے بعد وہیں کھڑا رہتا۔ اسے وہاں سے غائب ہونے کے لیے چند سیکنڈ درکار تھے، کیونکہ سیڑھیاں سوامی جی کے کمرے کے بالکل ساتھ تھیں۔ استغاثہ کی تمام کہانی مفروضہ معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں سوامی جی بوڑھے یعنی قریب المرگ تھے۔ ایسے آدمی کو قتل کرنے سے کیا فائدہ ہوا؟ جو رویہ سوامی جی کے معتقدین اور قریبی رفقاء نے ملزم کو گرفتار کرنے کے بعد روا رکھا وہ بھی ناممکنات میں سے ہے۔ اگر عبدالرشید اصل مجرم ہوتا تو وہ اس طرح پرامن نہ رہتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قاتل تو بھاگ گیا اور انہوں نے ملزم کو محض پولیس کے حوالے کرنے کے لیے پکڑ لیا۔

دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو ایک انتہائی اہم رولنگ موجود ہے جس میں قرار دیا جا چکا ہے کہ صرف وہ مجرم ارتکاب فعل کے لیے ذمہ دار ہوگا جو جرم کرتے وقت یہ محسوس کرے کہ وہ برا کر رہا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ جرم کا ارتکاب صحیح ہے تو بھی وہ اس کا ذمہ دار نہیں گردانا جا سکتا۔

ملزم کا ایک بیان ہے کہ مجھے خواب میں سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی زیارت ہوئی تھی اور انہوں نے اس ہندو کو فنا فی النار کرنے کے لیے کہا۔ یہ بھی عجیب خیال ہے جو کہ مادی حقائق اور نظام دنیا میں سند نہیں رکھتا۔ عبدالرشید کو سوامی سے کوئی ذاتی عناد، بغض یا کینہ نہیں تھا اور نہ ہی مقتول مذکور نے اس کا کچھ بگاڑا تھا۔ قتل اس وقت کیا گیا جب وہ مذہبی جوش و جنون سے مغلوب تھا اور اس پر شدید غم و غصے کی کیفیت طاری تھی۔ دینی جذبہ جسے آپ دیوانہ پن کہہ سکتے ہیں میں اس فعل کا ارتکاب ہوا جو کہ از روئے قانون، ملزم کے حق میں جاتا ہے۔

مسٹر آسیرن کے دلائل ختم ہوئے تو جسٹس براڈوے اور جسٹس سکیمپ نے سرکاری وکیل کو سنے بغیر اپیل خارج کر دی اور اپنے فیصلے میں لکھا کہ سیشن جج کی تجویز کردہ سزائے موت بحال رکھی جاتی ہے۔



لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف مشاہیر ملت اسلامیہ کے باہم مشورے پر ''غازی عبدالرشید ڈیفنس کمیٹی'' نے پریوی کونسل لندن میں اپیل گزاری۔ اس کی سماعت ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو ساڑھے بارہ بجے دوپہر ہوئی۔ ۲۶، ۲۷۔ اکتوبر کی درمیانی شب لندن سے وکیل صفائی نے ''عبدالرشید ڈیفنس کمیٹی'' کو ایک برقی پیغام بھیجا جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

''افسوس اپیل مسترد ہوگئی ہے اور اگر آپ چاہیں تو وائسرائے ہند کے روبرو رحم کی درخواست کی جاسکتی ہے''۔

بتایا جاتا ہے کہ جب غازی عبدالرشید کو اپیل کے مسترد ہونے کے بارے میں بتایا گیا تو ان کے چہرے سے کسی قسم کا اضطراب ظاہر نہیں ہوا بلکہ انہوں نے یہ اطلاع پائی تو دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ان کی آنکھوں میں دلفریب چمک عود کر آئی۔ ماتھے پر تکمیل آرزو کا دیباچہ بخوبی پڑھا جاسکتا تھا۔ واہ! کیا نوید وصل تھی کہ آپ ہر لحہ جھوم جھوم جاتے۔ رات بھر ان کے احساس کا آنگن مہکار ہا۔ یوں لگتا کہ جیسے ان کے دل و دماغ پر قوس قزح کے حوالے، یادوں کے اجالے اور شراب کرم کے پیالے اتر رہے ہیں۔

شہادت کی خوشبو

پریوی کونسل لندن سے اپیل مسترد ہونے کا فیصلہ ہرگز غیر متوقع نہیں تھا۔ ہم ''غازی عبدالرشید ڈیفینس کمیٹی'' کی طرف سے قانونی چارہ جوئی کو اتمام حجت اور اظہار عقیدت کہہ سکتے ہیں۔ مسلمانان ہند یہ کسی طور بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ہندو قوم انہیں اپنے جانباز مجاہد سے بے اعتنائی، لاتعلقی یا بے وفائی کا طعنہ دے۔

پروانہ چراغ مصطفوی... غازی عبدالرشید کے ذوق الفت اور شوق شہادت کا کیا کہنا، انہوں نے نہایت جوانمردی سے سوامی شردھانند کو موت کے گھاٹ اتارا۔ نہ صرف یہ بلکہ اگر وہ چاہتے تو بآسانی جائے واردات سے فرار ہو سکتے تھے۔ مگر آپ متاع زندگی بچانے نہیں لٹانے کا عزم رکھتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ فائر کی آوازیں سن کر مقتول کے چیلے بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جب دشمن رسولؐ اپنے انجام کو پہنچ چکا تو حضرت قبلہ غازی صاحب نے ادائے دلنوازی سے بآواز بلند پکار کر کہا:

''میں اپنا کام کر چکا ہوں اور اب تم اپنا کام کرو''۔

چند پولیس ملازم گشت پر تھے۔ شور وغوغا کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو وہ بھاگے آئے۔ اس وقت تک سوامی شردھانند کے مکان کے باہر بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے اور مقتول سوامی شردھانند کے ملازم چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ایک سر پھرے مسلمان نے سوامی جی کو مار دیا

ہے اور قاتل ابھی تک اندر موجود ہے۔ پولیس مین آگے بڑھے تو دیکھا کہ غازی عبدالرشید مسکرا رہے ہیں اور اپنے تئیں بخوشی گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

غازی عبدالرشید نے دوران تفتیش بتایا کہ شردھانند کا قتل کسی سازش کا شاخسانہ نہیں بلکہ میرا انفرادی فعل ہے۔ یہ گستاخ رسول تھا اور میرے آقا و مولا ﷺ کے خلاف اس نے ایک مذموم تحریک چلا رکھی تھی۔ مجھے سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی زیارت نصیب ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ عبدالرشید! تمہارے ہوتے ہوئے بھی یہ ناپاک وجود ابھی تک باقی ہے۔ سو میں نے اس کم بخت کمینے کو ٹھکانے لگا دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، دیگر مسلمان زعماء اور اپنے عزیز و اقارب کو اس واقعہ کی تفصیل مزے لے لے کر سناتے۔ غازی ممدوح نے سیشن کورٹ میں بھی برضا و رغبت اقرار فعل کیا اور جو کچھ فرمایا اس کا ملخص مندرجہ ذیل ہے۔

چکروں میں کیوں پڑتے ہو؟ بالکل مختصر سی داستان ہے۔ سوامی شردھانند نے میرے سرکار ﷺ کی شان اقدس کے خلاف اپنی زبان کھول کر پورے ملک کی فضا کو مسموم کر رکھا تھا۔ مجھے خداوند کریم نے توفیق بخشی تو اسے آتشیں گولیوں سے بھون ڈالا اور اب بارگاہ رسالتؐ میں حاضری کے لیے مضطرب ہوں۔

غازی عبدالرشید مرحوم و مغفور کو اپیلوں وغیرہ کا سلسلہ پسند نہیں تھا۔ لیکن فرزندان توحید کا جوش و خروش اپنی جگہ قائم رہا اور وہ بہرحال خاموش رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اس طرح آپ کا اضطراب بڑھتا اور وصل جاناں کا لمحہ دور تر ہوتا چلا گیا۔ الغرض پریوی کونسل سے اپیل کا مسترد ہونا گویا ان کی دعاؤں کا اثر ٹھہرا۔ اس کے بعد وہ اس طرح شاداں و فرحاں نظر آتے کہ جیسے بارش کے بعد جنگل میں خوشی سے مور ناچتا ہے۔

جوں جوں غیور مجاہد کا یوم شہادت قریب آ رہا تھا، توں توں ہندو جرائد و رسائل کا زہریلا پراپیگنڈہ شدید ہونے لگا۔ ان کے الفاظ ناپاک اور لہجہ انتہائی قابل اعتراض ہوا کرتا۔ مزید برآں ان کی ایک پاجیانہ خواہش تھی کہ فرزندان توحید بھی اپنے مرد غازی سے محبت و وفا کا رشتہ قائم نہ رکھیں۔ بہرکیف وہ اپنے زخموں پر خود ہی نمک پاشی کرتے جاتے تھے۔

۲۶۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو روزنامہ ''تیج'' دہلی میں ایک کارٹون کے ذریعے غازی عبدالرشید صاحب کی تصویر پھانسی کے تختے پر دکھائی گئی۔ چار دن بعد اسی پرچہ کی اشاعت میں ہندو تہذیب کی شائستگی کو چتا میں جلتے یوں دکھایا گیا:

"مسجدوں میں عبدالرشید کی رہائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی گئیں۔ جب ان کے خداوند کریم نے بھی ان کی امداد نہ کی حالانکہ انہوں نے مسجدوں میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر بہت کچھ کہا تو اب 'خداوند ہند' وائسرائے سے رحم کی درخواست کی جا رہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا، کیونکہ جب بڑے خدا نے ہی ان کی نہ سنی تو چھوٹے خداوند کب سننے والے ہیں۔"

ہندو اخبارات میں تو اور بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ اس کے حوالوں کی زیادہ گنجائش ہے اور نہ ہی کوئی ضرورت۔ تاہم رحم کی اپیل کے بارے میں حقائق واضح کر دینے چاہئیں۔ صورت حال یہ ہے کہ حضرت غازی عبدالرشید شہیدؒ نے رحم کی اپیل سے متعلق سختی کے ساتھ منع کر دیا اور فرمایا تھا کہ اگر کسی نے اس سلسلے میں ذرا سی بھی حرکت کی تو میں رسول پاکؐ کے حضور اس کی شکایت کروں گا اور میرا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ لہٰذا کسی شخص کو اس کی جرأت نہ ہوئی۔ مسلم پریس میں رحم کی اپیل سے متعلق برملا تردید شائع کی گئی کہ یہ سراسر بہتان ہے، بے سروپا افواہ اور مطلقاً افترا ہے۔ مسلمانان ہند کی تمنا صرف یہ ہے اور ورثا بھی محض یہی چاہتے ہیں کہ آپ کو دہلی میں پھانسی دیا جائے اور نعش ہمارے حوالے کر دیں تاکہ عاشقِ رسول کی بارات ذرا دھوم دھام سے نکلے اور انشاء اللہ غازی موصوف کا سفر آخرت ہمیشہ یادگار رہے گا۔



پروانۂ شمع رسالت غازی عبدالرشید صاحب کی جاں نثاری و فداکاری کے لیے ۱۴۔ نومبر ۱۹۲۷ء کا دن مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن یہ اطلاع عام نہ کی گئی۔ فرزندان توحید کی آرزو تھی کہ انہیں محافظ ناموس رسالت کی تاریخ شہادت سے آگاہ کیا جائے۔ مگر انتظامیہ کو اندیشہ نقص امن عامہ تھا اور وہ کوئی بھی یقین دہانی کرانے سے عذرخواہ رہے۔ ایسے میں ۱۳ نومبر کی صبح یکایک افواہ پھیل گئی کہ سنٹرل جیل میں اسی وقت غازی صاحب کو پھانسی دے رہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مسلمانانِ دہلی کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ حکام جیل نے انہیں منع کیا کہ ہمیں تاحال پھانسی دینے کے وقت کا کوئی حتمی حکم نامہ موصول نہیں ہوا۔ باوجود اس کے فدایان غازی ٹلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مجمع کو منتشر کرنے اور کسی متوقع خطرے کے پیش نظر پولیس کی کمک طلب کر لی گئی۔ قریب تھا کہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جاتا لیکن انتظامیہ کے ایک ذمہ دار اہلکار کی سوجھ بوجھ کام آئی۔ اس

نے غازی موصوف سے چند افراد کی ملاقات کا فی الفور اہتمام کروایا۔ حضرت قبلہ غازی صاحب ان کے ساتھ از حد گرمجوشی سے پیش آئے اور فرمایا کہ آپ لوگ پرامن رہیں اور اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

اسی روز سہ پہر کے وقت غازی صاحب کے لواحقین کو خصوصی طور پر آخری ملاقات کی غرض سے جیل لایا گیا۔ آٹھ عورتوں اور بیس مردوں پر مشتمل دو گروپ تشکیل دیئے گئے۔ مستورات کو ایک خاص پردے کی جگہ بٹھایا گیا۔ چنانچہ غازی صاحب اپنے عزیز و اقارب سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملے۔ انہوں نے مردوں سے کہا کہ آپ میری موت پر کسی قسم کا غم نہ کریں۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ یہ کس قدر خوشی کا مقام ہے۔ اتنی حسین موت تو بار بار آنی چاہیے۔ جو آدمی اپنے دین کے سامنے کسی قسم کی طاقت کی پروا کرتا ہو، بھلا وہ ایک سچا مسلمان کیسے ہو سکتا ہے۔ محبوب خدا ﷺ کی خاص رحمت و توجہ سے میں اس امتحان میں ثابت قدم رہا ہوں۔ آپ پر لازم ہے کہ کسی قسم کی تکلیف یا رکاوٹ کو کبھی خاطر میں نہ لائیں۔ آپ کافی دیر تک ان سے مصروف گفتگو رہے۔

اس کے بعد عورتوں کی باری آئی اور ان کو بھی شعائر اسلام کی پابندی کی تلقین فرمائی۔ دوران ملاقات ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ عورتوں کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ آپ نے ان کی بے قراری دیکھی تو ہنس دیئے اور فرمایا۔

> ”پریشانی ان کا نصیبہ ہے جو انجانے میں کوئی قدم اٹھا لیتے ہیں۔ میں تو خوب سوچ سمجھ کر اس راستے پر چلا ہوں۔ میرے سامنے کسی کو آنسو بہانا زیب نہیں دیتا۔ میری خوشی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ آپ کو بھی خوش رہنا چاہیے اور اگر یہ مشکل ہے تو کم از کم صبر سے کام لیجئے“۔

الغرض سب کو تشفی دیتے رہے۔ اس دوران تمام وقت اپنی لڑکیوں کو گود میں بٹھائے رکھا اور خوب پیار کیا۔ آپ نے لواحقین کے ذریعے جملہ فرزندان توحید کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اپنے دین اسلام پر ہمیشہ ثابت قدم رہیں اور مذہبی فرائض کی انجام دہی میں ذرہ بھر خوف نہ رکھیں۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ پر کسی قسم کا خوف و ہراس نہیں تھا بلکہ یوں ہلکے پھلکے دکھائی دے رہے تھے جیسے بہاروں نے گود میں اٹھا رکھا ہو اور چہرے پر ایک خاص قسم کی سرخی جھلک رہی تھی۔

داروغہ جیل کا کہنا ہے کہ غازی صاحب کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ آپ لوگوں کی یہ آخری

ملاقات ہے۔ ازاں بعد میں نے جیل میں گشت کے دوران آپ سے کہا کہ آج رات آپ کو تختہ دار پر لٹکایا جائے گا، تیار رہیے۔ قاضی صاحب نے یہ سن کر فرمایا:

''الحمدللہ! میری تمنا پوری ہوئی اور دعا رائیگاں نہیں گئی''۔

بخدا آپ کا چہرہ کسی خاص کیفیت سے تمتما رہا تھا۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی؟ اور زندگی کی آخری رات کس پر بھاری نہیں ہوتی؟ مگر یہاں معاملہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ عشق وہ جذبہ ہے کہ اس میں جان کا زیاں نہیں دیکھتے، جب کہ عاشقان رسول ﷺ کا تو مسلک ہی جدا ہے۔

غازی صاحب کے لیے یہ زندگی کی آخری رات نہیں بلکہ شب برات تھی۔ آپ نے صاف ستھرا لباس زیب تن کیا۔ کستوری لگائی اور جیل کی کوٹھڑی میں بھی خوشبو کا چھڑکاؤ ہوا۔ قفس کے گوشے میں بڑی سج دھج سے تیاری ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے گلستان کے دریچے کھل گئے ہوں۔ اسے موت کا سفر نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ موت تو خود اپنا دامن بچا اور نظریں چرا رہی تھی۔

بطل حریت، شہید محبت نے نماز عشاء ادا فرمائی اور فرشتوں کے ہم زبان ہو گئے... الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ... درود و سلام کا وظیفہ تو انہوں نے شروع سے ہی حرز جان بنا رکھا تھا، مگر آج اس کی کیفیت دو چند محسوس ہوئی۔ کنج اسارت گویا ایک میکدہ تھا۔ شراب نگاہ کے پیالے اچھلے۔ فضاؤں میں نور و نکہت کے قافلے اترے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی رقص کناں تھی اور آنکھوں میں جذب و مستی کی ایک دنیا آباد۔ واقعی! ایک یہ غم ہے کہ جس میں کوئی غم نہیں ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ جناب غازی عبدالرشیدؒ تمام شب قبلہ رو بیٹھے رہے۔ کبھی آنکھیں بند فرماتے اور جھوم جھوم جاتے تھے۔ نگاہ اٹھاتے تو گماں گزرتا کہ شاید کوئی تصویر دیکھ رہے ہیں۔ ایک وارڈن بتاتے تھے کہ آخری مرتبہ آپ کی کوٹھڑی پر مجھے متعین کیا گیا۔ میں نے عالم بیداری میں ایک خواب دیکھا۔ اس منظر کی تاثیر روح میں سما کر رہ گئی ہے۔ اگر میں چاہوں تو بھی مجھ سے یہ کیفیت بیان نہیں ہو پائے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ دل و نگاہ اور وجدان و عرفان کے باب میں خاموشی ہی گفتگو ہے۔ تاجدار مدینہ علیہ ﷺ سے نسبت غلامی کے وقار و آثار اور اس کی اثر انگیزیوں و عطر بیزیوں کو الفاظ کی لڑی میں پرویا اور نہ ہی تصویر کے دائرے میں سمویا جا سکتا ہے۔

۱۳، ۱۴۔ نومبر ۱۹۲۷ء کی درمیانی رات بجلی کی رو کی طرح یہ خبر پورے شہر میں پھیل چکی تھی کہ آئندہ صبح غازی صاحب کو پھانسی دے دی جائے گی۔ چنانچہ بہ تعداد کثیر مسلمانان دہلی نے اندھیرے میں ہی جیل کے بیرون ڈیرے ڈال دیئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جب نماز

فجر پڑھی جا چکی تھی تو یہ تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہوگئی۔ اس دوران مسلسل اللہ اکبر، یارسول اللہ اور غازی عبدالرشید زندہ باد کے فلک شگاف نعرے گونجتے رہے۔ لمحہ شہادت نزدیک آ رہا تھا۔ ذرا دیر گزری تو سپرنٹنڈنٹ جیل اور دیگر عملہ آپ کے پاس آیا اور کہا:

"آپ جس گھڑی کے مہینوں سے منتظر تھے وہ مبارک وقت زیادہ دور نہیں۔

ہمارے ساتھ تشریف لے چلئے"۔

آپ نے دھیرے سے سر اوپر اٹھایا اور متبسم انداز میں گویا ہوئے:

"بسم اللہ۔ سبحان اللہ، میں دل و جان سے حاضر ہوں"۔

جیل کے اندر کپتان پولیس مسٹر لوئس، سٹی مجسٹریٹ مخدوم غلام مصطفیٰ، مجسٹریٹ درجہ اول اور سول سرجن بھی موجود تھے۔ داروغہ جیل ایک نیک دل مسلمان تھا۔ اس کے دل میں محافظ ناموس رسالت کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ آپ کو حسب خواہش پھانسی گھر کی طرف لے جایا گیا۔ آپ نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے فرمایا کہ میری تجہیز و تکفین میں شریک رہئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ قید کی کوٹھڑی سے مقام شہادت تک مختصر راستے میں آپ کا وقار مزید بڑھ گیا تھا۔ نپے تلے قدم اور اوپر اٹھی ہوئی گردن۔ طمانیت کی بہار اور رحمت کی پھوار۔ روشن پیشانی، چمکتا دمکتا چہرہ اور دل کش زاویہ ہائے چشم!

بتاتے کہ آپ نے داروغہ جیل سے خصوصی اجازت لے رکھی تھی کہ انہیں پھانسی گھر میں دو رکعت نفل ادا کرنے دیئے جائیں۔ بہرحال یہ بات مسلمہ ہے کہ غازی عبدالرشید صاحب نے اس موقع پر وہاں نماز شکرانہ ادا کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے، دعا بالکل مختصر تھی۔ آخرش غازی صاحب کھڑے ہوگئے اور اپنا رخ دیار حبیب ﷺ کی طرف کیے رکھا۔ جانے زیر لب دو ایک بار کیا گنگنایا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ان کی زبان سے یہ الفاظ سنے گئے:

"یارسول اللہ ﷺ آپ کا ایک ادنیٰ غلام، دل و جان کا تحفہ لیے حاضر ہے۔ یارسول اللہ، میری لاج رکھنا۔ یارسول اللہ، میری قربانی قبول فرمالینا۔"

جب کنٹوپ اوڑھایا جا رہا تھا تو اسی دوران آپ نے باآواز بلند کلمہ طیبہ پڑھا اور دل نشین لہجے میں فرمایا:

''آپ لوگ شاہد رہیں کہ میں ایمان کے ساتھ اس دنیا سے جا رہا ہوں۔''

تین مرتبہ مزید دہرایا:۔

''الصلوۃ والسلام علیك یا رسول اللّٰہ...لا الہ الا اللہ محمد رسول اللّٰہ''

دن کے آٹھ بج چکے تھے۔ جلاد نے آپ کے گلے میں پھندا ڈالا۔ مقررہ وقت پر اشارہ پاتے ہی تختہ نیچے کھینچا اور اس کے ساتھ ہی آپ تختہ دار پر جھول گئے۔ مشہور ہے کہ ابھی آپ کے گلے میں پھانسی کا پھندا نہیں کھینچا گیا تھا کہ آپ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور روح اللہ اکبر کے ساتھ پرواز کر گئی اور موقع پر موجود سب اشخاص حیران رہ گئے۔

جیل کے اندرون و بیرون سے نعرہ تکبیر، نعرۂ رسالت اور غازی عبدالرشید شہید زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے۔ اس سے جیل کی دیواریں لرز اٹھیں اور ہر طرف رسول عربی ﷺ کی مہک نے دلوں کے غنچے کھلا دیئے۔

موقع پر موجود افراد کا کہنا ہے کہ آپ سے سختی یا نزع کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی بلکہ ایسا معلوم ہوا کہ رسہ ڈالتے ہی آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ بالکل یوں کہ جیسے آغوش گلاب سے خوشبو سفر کرتی ہے۔



سفرِ آخرت

غازی عبدالرشید کی غیرت وحمیت اور شوق شہادت اسلامیان ہند کی تاریخ کا ایک ایمان افروز باب ہے۔ عشق ووفا کی راحت انگیز داستان! آپ برصغیر پاک وہند میں محافظان ناموس رسالت کے سپہ سالار اول ہیں۔ انہوں نے فنا کو بھی زندگی عطا کی۔ ملک کے طول وعرض میں آباد کروڑوں کلمہ گو، ان پر جان چھڑکتے تھے۔ جب غازی عبدالرشیدؒ جیل کی کوٹھڑی سے سفر نصیب پر روانہ ہوئے اور اپنے آقا و مولا ﷺ کی آغوش رحمت سے لپٹ کر اماں پائی تو عین اس وقت بھی جیل سے باہر مسلمانوں کا مجمع کم از کم اسی ہزار پر مشتمل تھا۔

فدایان شہید ناز کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ فرزندان توحید کی یہ شدید آرزو تھی کہ وہ فی الفور اپنے محبوب وغیور مجاہد کی زیارت کریں اور یہ کہ شہید رسالت کی نعش ان کے سپرد کر دی جائے۔ ادھر انتظامیہ چاہتی تھی کہ مجمع منتشر ہو جائے۔ حکام بالا نے لوگوں سے کہا کہ لاش صرف اس شرط پر تمہارے حوالے کی جا سکتی ہے کہ کسی قسم کے شور شرابے کا اندیشہ نہ رہے اور کوئی ذمہ دار

شہری، سامنے والے قبرستان میں دفنانے کا یقین دلائے۔

الغرض اسی دوران شہید وفا غازی عبدالرشیدؒ کے جسد خاکی کو جیل کے اندر غسل دیا گیا۔ قریباً دس بجے کے قریب یکا یک شور بلند ہوا کہ لاش دوسرے دروازے سے دے دی گئی۔ یہ سنتے ہی مسلمانوں میں جذبات کی لہر دوڑ گئی اور پھاٹک کے نزدیک کھڑے ہوئے لاتعداد لوگ اس طرف دوڑے اور نعرہ ہائے تکبیر کی گونج میں ایک رقت انگیز اور روح پرور منظر دکھائی دیا۔

شہید ناموس رسالت کے شیدائیوں کا یہ جم غفیر جذبات سے مغلوب تھا۔ دیکھا گیا کہ ریلے میں جیل کے بیرونی احاطے کا پھاٹک بھی دھڑام سے نیچے آ گرا۔ انتظامی افسروں کے لیے یہ صورت حال حد درجہ نازک اور پریشان کن تھی۔ انہوں نے غازی عبدالرشید کے جسد ناز کو باہر آنے سے روک دیا۔ اس موقع پر بعض مسلم نمائندوں نے عوام کو سمجھایا اور مکمل طور پر پرسکون رہنے کی ہدایت کی۔ یوں ذرا دیر میں بدنظمی کی جگہ ٹھہراؤ آیا اور نوجوانان ملت ایک جگہ رک گئے۔ ازاں بعد نظم وضبط کا انداز دیکھتے ہوئے اور معزز شہریوں کی یقین دہانی پر بارہ بجے نعش ان کے حوالے کر دی گئی۔

جنازے کے جلوس میں شرکاء کی تعداد ایک لاکھ سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو، چہروں پر نور ایمان کی جھلک، دل میں جذبۂ عشق رسول کی دولت اور زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد تھا۔ فرد فرد حسن عقیدت کا مرقع دکھائی دے رہا تھا۔ جنازے کو کندھا دینے کے لیے پیروکاران اسلام کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دیا۔ ملی دولہا کی بارات بڑی دھوم دھام سے اٹھی اور غلامان مصطفیؐ یہ عظیم الشان جلوس لے کر جامع مسجد کی طرف چل پڑے جو کہ شہر میں ہے۔

راستے میں دہلی دروازے پر پہلے سے مشین گنیں نصب تھیں اور پولیس کا سخت انتظام تھا۔ نیز گورا فوج کے سپاہی بھی متعین تھے تا کہ نعش کو شہر میں نہ لے جایا جائے۔ چنانچہ شرکاء کو وہاں روکنے کی کوشش کی گئی۔ مگر کون سنتا تھا؟ آخر ان کو مشین گنیں ہٹا لینی پڑیں اور نعش کو مین بازار سے جامع مسجد کی طرف لے کر چلے۔

جس وقت نعش چوڑی بازار میں آئی تو مسلمانوں کی جمعیت کو دیکھ کر بعض شر پسند ہندوؤں نے حسب پروگرام اپنی اپنی دکانوں کا سامان ان پر پھینکنا شروع کر دیا اور شور مچایا۔ ''لوٹ لیا، لوٹ لیا''۔ لوٹ لیا، لوٹ لیا کا واویلا اس قدر تشویشناک تھا کہ دیگر ہندوؤں نے حمایت کے طور پر دفعتاً حملہ بول دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فساد برپا ہو گیا۔ ہنگامے میں چھ سات آدمی بری طرح مجروح

ہوئے۔ مسلمانوں کی دکانیں تو صبح سے ہی بند پڑی تھیں۔ لیکن اس اچانک فساد سے تمام ہندو بھی اپنے کاروباری مراکز کو مقفل کر گئے۔ گویا پورے شہر میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ چوڑی بازار، حوض قاضی، لال کنواں اور فیض بازار سے ہوتے ہوئے جنازہ نیا بانس میں پہنچا تو ایک بار پھر اینٹوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اس پر مسلمان بھی جوش میں آ گئے اور اینٹ کے جواب میں پتھر برسے۔ اب جنازے کا جلوس کھاری باؤلی میں نکل آیا تھا۔ یہاں بھی ہندوؤں کی شرارت جاری رہی۔ الغرض شرکائے جلوس قطب روڈ پہنچے۔ جب یہ کاروان عقیدت درگاہ حضرت باقی باللہ کی طرف مڑا تو یہاں گورا فوج کے علاوہ مشین گنوں سے مسلح پولیس بھی موجود تھی۔ ہنگامی حالات سے نپٹنے کے لیے دو گاڑیاں بھی سٹارٹ کھڑی رہیں۔ اس موڑ پر پولیس اہلکاروں اور گورے سپاہیوں نے غیر متوقع طور پر دھاوا بول دیا۔ اس کشمکش میں تابوت نیچے گر پڑا اور پولیس نے فوراً نعش پر قبضہ کر لیا۔ اس ٹوٹے ہوئے تابوت کو لاری میں رکھ کر اس طرح ساتھ لے چلے کہ مشین گن آگے آگے اور اس کے پیچھے پولیس ملازموں کی ایک گاڑی رواں تھی۔ پہاڑی گنج کے شاہ جی والے پل سے ہوتے ہوئے نعش کو جدید قبرستان میں لے آئے۔ جنازے کا تابوت زبردستی چھینا گیا اور مسلمان نہیں جانتے تھے کہ کہاں لے گئے ہیں۔ تاہم مذکورہ قبرستان میں غازی عبدالرشید شہیدؒ کے والد، بھائی اور دیگر عزیز و اقارب کو پہلے سے ہی بٹھایا ہوا تھا۔ لہٰذا ان سے کہا گیا کہ فوراً تدفین کی جائے۔ چونکہ عاشقان شہید کو صحیح صورتحال کا علم نہیں ہو رہا تھا اور وہ جا بجا احتجاج کر رہے تھے۔ اڑھائی بجے سہ پہر قبرستان ہی میں نماز جنازہ ادا ہوئی اور ٹھیک ساڑھے تین بجے تاجدار مدینہ کے عاشق صادق اور لاڈلے غلام کو درود و سلام کی گونج میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

لاش کی واپسی اور پولیس وغیرہ کی اس کارروائی کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ غازی صاحب کے عزیز و اقارب کو نعش اسی شرط سے دینی منظور کی گئی تھی کہ شہر کے اندر نہ لے جایا جائے بلکہ جلوس نکالے بغیر جدید قبرستان میں دفن کر دیں۔ قبر بھی یہیں تیار کروائی گئی تھی۔ مگر جوشیلے نوجوانان اسلام، شہید ناز کے پرشکوہ سفر آخرت کا منظر اہل شہر کو بھی دکھانا چاہتے تھے۔ اس طرح انہیں ہندو مسلم فساد کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ المختصر مسٹر مارگن سپرنٹنڈنٹ پولیس کی قیادت میں یہ کارروائی عمل میں آئی۔ تاہم پورے شہر میں سنسنی پھیل گئی اور جذبات بھڑک اُٹھے تھے۔ ہنگامے میں ۲۴۷ آدمی زخمی ہوئے اور ایک قتل۔ ان میں ماسوائے ایک باقی تمام ہندو تھے۔ پولیس نے ہر موڑ پر ناکہ لگا رکھا تھا۔ ملازمین گاڑیوں میں باقاعدہ گشت کرتے رہے۔ سرکاری ہینڈ آؤٹ کے

مطابق اس ہنگامے میں ایک زخمی ہندو نے ہسپتال میں دم توڑ دیا اور صرف چھیالیس مجروح ہوئے۔ دیگر زخمیوں کی چوٹیں بالکل معمولی نوعیت کی تھیں۔ اطلاع کے مطابق فساد میں ملوث پچاس افراد کو حراست میں بھی لیا گیا۔

دوسرے روز مسلمانان دہلی پر ابتلاء کا نیا دور شروع ہوا۔ ایک سو دس پیروکاران توحید کی بلاوارنٹ گرفتاری عمل میں آئی، حالانکہ مسلمانان دہلی کا موقف ہرگز ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اسلامی انبوہِ خلائق کی قلبی تمنا فقط یہ تھی کہ شہید کے جنازے کا پرشکوہ جلوس، حضرت خواجہ نظام الدین اور حضرت خواجہ باقی باللہ کی درگاہوں سے ہوکر مقام تدفین تک جائے۔ حکام بالا نے اس کی اجازت نہ دی، بلکہ غازی عبدالرشید شہیدؒ کے عزیز واقارب جن میں دس بچے، دس عورتیں اور دس مرد بھی شامل تھے، کو ایک طرح سے قید کر کے جدید قبرستان میں رکھا گیا تھا تاکہ ضابطے کی کارروائی پر اعتراض نہ ہو سکے۔

مسلمانان ہند کے دل غازی عبدالرشید شہیدؒ کی یاد سے سرشار تھے۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا ہر ایک شہید وفا کا دیوانہ و مستانہ نظر آتا۔ بلامبالغہ ایک لاکھ کے قریب آپ کی تصاویر فروخت ہوئیں۔ شہادت کے ایک روز بعد دہلی میں یہ بھی اعلان ہوا کہ عنقریب شہید ناموس نبی کی یاد میں ''اشاعت اسلام'' کے نام سے ایک رسالے کی اشاعت کا پروگرام ہے، جسے عموماً مفت تقسیم کیا کریں گے۔



غازی عبدالرشید شہیدؒ کی آخری خواب گاہ جیل خانہ دہلی کے مشرق جنوبی جانب جدید قبرستان میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں فیروز شاہ تغلق سے منسوب پرانا قلعہ اپنی زبان میں ماضی کی داستان سنائے جاتا ہے۔

(لوح مزار)

''سید غازی عبدالرشید شہید''

ہے شہید وفا لقب جس کا — جس کا شاہد ہے سارا ہندوستاں
وہ فدائی، رسول اکرمؐ کا — حبِّ احمدؐ میں جان کی قرباں
درجہ انصار اور شہادت کا — پایا از فضل ایزد مناں

چشمۂ فیض ہے مزار ان کا   واقف ان کے عمل سے ہے گیہاں
لوحِ مرقد پہ لکھ دو سائل تم   قبر عبدالرشیدؒ پاک نشاں

۱۴ نومبر ۱۹۲۷ء
۱۳۴۷ھ

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

غازی علم الدین شہیدؒ

گزشتہ چند صدیوں کے دوران بعض مسیحی مورخین، اہل ہنود اور یہودی مصنفین نے بار ہا اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ کوئی نہ کوئی بدزبان اور کج قلم مذہبی دل آزاری کا سامان کر کے مسلمانوں کے تاریخی ورثے اور جذبات واحساسات کا تمسخر اڑاتا رہا ہے۔ مشاہیر ملتِ اسلامیہ کو مطعون کرنے کی ناپاک جسارت ان کی دیرینہ فطرت ہے۔ بزرگان اسلام کی شان میں کذب و افترا اور دریدہ دہنی کا بھی ان کی طرف سے کئی بار اعادہ ہوا۔ مختلف ادوار میں رسول عربی ﷺ کی اہانت پر مبنی طبع ہونے والے رسائل کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان کی ایک تعداد نشترِ قلم سے تاریخی حقائق کا پیٹ چاک کر کے ہمیشہ فتنہ جگانے میں ہمہ تن مصروف رہی، جس سے قلوبِ مسلم میں غیظ وغضب کا لاوا ابلتا اور غم واضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ کئی بار شعائرِ اسلام کی صداقت و عظمت کو جھٹلانے کی ناپاک کوشش کی گئی اور افضل البشر ﷺ کی پاکیزہ سیرت پر سوقیانہ اور رکیک حملے کر کے اہل ایمان کی عقیدت کو امتحان میں ڈالا گیا۔

اس خطۂ ارض پر انیسویں صدی کے ربع اوّل میں ایک آریہ سماجی لیڈر نے ''ستیارتھ پرکاش'' جیسی بدنام کتاب لکھنے کا ارتکاب کیا تھا، جس کے چودھویں باب میں قرآنی آیات، نظریہ توحید، اکابرین ملت اسلامیہ اور محسن انسانیت ﷺ کی سیرت طیبہ کا مضحکہ اڑایا گیا مسلمانانِ ہند کے لیے تاریخ کا یہ دور نہایت پرآشوب تھا۔ ایک طرف کانگریس متحدہ ہندوستانی قومیت کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے سیاسی وقار کا خاتمہ چاہتی تھی اور دوسری جانب آریہ سماجی لیڈر شدھی اور سنگھٹن ایسی مذموم تحریکیں چلا کر مسلمانوں کے دلوں پر چرکے لگا رہے تھے۔ ہر طرف آگ کے لپکتے ہوئے شعلے دکھائی دیتے۔ تمام قابلِ ذکر شہر ہندو مسلم فساد کا اکھاڑا بن چکے تھے اور ان گنت مسلمان تہ تیغ کیے گئے۔

ہندوؤں کی بڑی کوشش تھی کہ مسلمان ایک فعال قوم کی حیثیت سے نہ ابھر سکیں۔ چاہتے تھے کہ وہ بلاشرکت غیرے برصغیر ہندو پاک کے سیاہ وسفید کے کلی مالک بن جائیں اور یہاں رام راج قائم ہو۔ چنانچہ ہندو رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندو مہاسبھا کو ازسرنو منظم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ سوامی شردھانند اور لالہ لاجپت رائے نے ہندوؤں کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں کیا کہ

بھارت کی حقیقی مالک آریہ جاتی ہے۔

حق دشمنی اور مسلم کشی کے منشور پر مختلف الخیال ہندوؤں میں اتحاد پیدا ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ شدھی تحریک کے اثرات صوبہ یو۔ پی سے نکل کر بڑی سرعت کے ساتھ پورے ملک میں پھیل گئے۔ ۱۹۲۳ء کے آخر میں ایک پاجیانہ کتاب طباعت کے مراحل سے گزر چکی تھی۔ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں راجپال نامی کتب فروش نے اسے ہسپتال روڈ لاہور سے شائع کیا۔ اس سوقیانہ کتاب کا نام ہی اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ تن بدن میں بجلیاں دوڑ جاتی ہیں اور غیرتِ ایمانی اسے سننا گوارا نہیں کر سکتی۔ نقل کفر کفر نباشد کے مصداق کذب و افترا سے بھرپور اس ناپاک دفتر کا نام ''رنگیلا رسول'' تھا۔

اس توہین آمیز کتاب کا مصنف کون تھا؟ اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور ہمیشہ دو تین نام لیے جاتے رہے ہیں۔ ایک ''پرتاپ'' اخبار کے مالک و مدیر مہاشہ کرشن کا، جس کے راجپال کے ساتھ کاروباری مراسم تھے اور دوسرا ڈی۔ اے۔ وی کالج کے پروفیسر پنڈت چموپتی لال، ایم۔ اے پر شبہ کیا جاتا ہے۔ اغلب قیاس بھی آخرالذکر کے متعلق ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء کو ماہنامہ ''حکایت'' لاہور میں ایم۔ ایس ناز کا ایک مضمون ''میانوالی جیل کا قیدی نمبر ۱۰۵'' شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے لکھا کہ فقیر سید وحیدالدین کے نزدیک اس بدنام زمانہ رسالے کا راقم راجپال خود ہے۔ ان کے خیال میں مہاشہ راجپال خود بھی تصنیف و تالیف کا مذاق رکھتا تھا اور اسے ہندی زبان کا ایک انشاء پرداز قرار دیا جاسکتا ہے۔

غازی علم الدین شہیدؒ کی حقیقی بھتیجی محترمہ انور سعید صاحبہ کا ایک آرٹیکل یکم نومبر ۱۹۶۴ء کو نسیم حجازی کے اخبار ''کوہستان'' میں چھپا۔ بقول ان کے، اس کتاب کا مصنف راجپال نہیں بلکہ چنتا منی ایک ہندو ہے، جو خاصا گم نام آدمی تھا۔ راقم کے نزدیک اس دلآزار رسالے کا محرک و موید پروفیسر چموپتی ہے اور اصل مصنف جانے کون تھا۔ اس لیے وہ ناقابلِ خواند تصنیف راجپال اور پروفیسر چموپتی کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے آپس میں دوستانہ تعلقات بھی اس موقف کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس نسبت سے یقین مزید پختہ ہو جاتا ہے کہ وہ دونوں آریہ سماج تنظیم کے متعصب کارکن تھے اور یہ کہ صرف موصوفہ کے بیان کو تاریخی و تحقیقی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

تاریخی حقائق میں تحریف و تغیر کر کے اس مجموعہ کی اشاعت کا وہی دیرینہ مقصد تھا کہ نیم پڑھا

لکھا طبقہ دین حق سے متنفر ہو جائے اور مسلمانوں کے دلوں سے خاکم بدہن، شفیع المذنبین ﷺ کی عظمت و تقدیس جاتی رہے۔

منصوبہ بندی کرنے والوں کی یہ انتہائی خام خیالی تھی کہ وہ مسلمانوں کے دلوں سے حرمتِ مصطفٰے محو کر دیں گے، کیونکہ ملتِ اسلامیہ کے تشخص کا معیار واضح طور پر حبِّ مصطفٰے ہے۔ ایسا غیر اخلاقی لٹریچر شائع کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس دوران سینکڑوں ستم رسیدہ افراد روزانہ حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے اور ہندو بوکھلا کر ایسے اشتہارات شائع کرنے لگ گئے۔

پروفیسر پنڈت چموپتی لال ایم۔ اے سے منسوب اس رسالے کو سوامی شردھانند کے ایک معروف چیلے راجپال نے شائع کیا۔ اس کتابچے میں سوقیانہ اندازِ بیان اور معاندانہ طرزِ تحریر کی کیفیت یہ تھی کہ اس کے پڑھنے اور سننے سے پیشتر ہر مسلمان مر جانے کی دعا کیا کرتا۔ مہاشہ راجپال ایک کتب فروش تھا۔ اس کی دکان پر بالخصوص آریہ سماجیوں کی مذہبی کتابوں کی خرید و فروخت ہوا کرتی۔ اس کی دکان انارکلی بازار میں میو ہسپتال روڈ پر پان گلی کے قریب واقع تھی، جس پر آریہ پستکالیہ لاہور اور ''راجپال پبلشر'' کا بورڈ آویزاں تھا۔ مسلم مسجد کے سامنے سے نئی انارکلی میں داخل ہوں اور چند قدم آگے جا کر بائیں جانب مڑ جائیں تو آج کل وہ دکان ہسپتال روڈ نمبر ۲ پر یونائیٹڈ پریس اور مغل آرٹ پریس کے عین مقابل واقع ہے۔ اس جگہ سگریٹ سپاریاں وغیرہ فروخت ہوتی ہیں۔

ناشر نے اس کتاب پر فرضی نام دے کر قانونی تقاضا پورا کر دیا، تاہم خود راجپال کا پتہ درست اور واضح لکھا ہوا تھا۔ مصنف کا نام لکھنے سے کیوں گریز کیا گیا؟ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اوّلاً، کوئی اخلاقی اور قانونی کارروائی نہ ہو سکے اور دوسرا سبب یہ کہ مصنف مسلمانوں کے ایمان کی پختگی اور فرزندانِ توحید کے غضب و غصہ سے بھی خائف تھا۔

خاصے عرصہ تک یہ کتاب صوبائی حکومت کی پریس برانچ کی نگاہ سے چھپی رہی یا پھر انہوں نے احتساب و مواخذے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ایک مدت بعد جب اس پر مسلمانوں کی نظر پڑی تو انہوں نے ازراہ اخلاق پبلشر پر زور دیا کہ ایسی مکروہ کتاب کو تلف کر دے۔ مگر آریہ سماج کی پشت پناہی کی وجہ سے اُسے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ راجپال کے قطعی انکار کی صورت میں شدید ردعمل کا مظاہرہ ایک قدرتی بات تھی۔ اس سے پورے پنجاب کے مسلمانوں میں اضطراب و ہیجان کی کیفیت پیدا ہو گئی، دلوں میں غیظ و غضب کا لاوا ابلنے لگا

اور ہر جانب غم وغصہ کی شدید لہر دوڑ گئی۔

جب اس کتاب کی ضبطی کے لیے اقدامات کا آغاز ہوا تو برطانوی حکومت نے جلسوں کے انعقاد پر پابندی عائد کر دی اور لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہوا۔ ان ہتھکنڈوں سے جب مسلمانوں کا جوش وخروش سرد نہ پڑا تو حکومت نے مجبوراً ناشر کے خلاف فرقہ ورانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں دفعہ ۱۵۳، الف کے تحت مقدمہ دائر کر دیا۔ ۲۴۔ مئی ۱۹۲۴ء کو یہ مرافعہ لاہور کے ایک مجسٹریٹ مسٹر سی۔ ایچ۔ ڈزنی کی عدالت میں پیش ہوا۔

دوران سماعت شاہی مسجد کے خطیب مولانا غلام مرشد صاحب بھی عدالت میں حاضر ہوئے۔ جرح کے دوران آپ نے مدلل تقریر فرمائی۔ آپ نے کہا:

> ''بلاشبہ اس ناخواندہ رسالے میں ہماری بعض مفروضہ کتب کے حوالہ جات منقول ہیں، لیکن ایک غور طلب امر یہ ہے کہ وہ کتابیں کیسی ہیں؟ اور ان کے متعلق مسلم رائے عامہ کیا ہے؟ ہمارا عقیدہ ہے، اگر دل کے کسی گوشے میں رسول اکرم ﷺ کی اہانت کا خیال بھی جاگزیں ہو تو آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کتابیں ہمارے نزدیک کیونکر معتبر ہوسکتی ہیں؟ صحاح ستہ ہمارا مقدس ورثہ ہے۔ ہم ان کو بھی مذہبی تاریخ سمجھتے ہیں، وگرنہ قرآن حکیم ہی ہمارے لئے حجت ہے۔ اس ہتک آمیز ناول میں جمع شدہ حوالہ جات ہمارے نزدیک غیر اہم اور فضول ہیں جبکہ ان کے لکھنے والے قابل گردن زدنی، کافر و مرتد اور منافق۔''

الغرض یہ کہ مسٹر سی۔ ایچ۔ ڈزنی مجسٹریٹ درجہ اوّل نے بڑی تیزی سے فریقین کے دلائل سنے اور طویل سماعت کے بعد ۱۹۲۴ء کے آواخر میں عدالت ہذا نے راجپال کو چھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانے کا حکم سنایا۔ راجپال نے اس فیصلے کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل دائر کر دی جس کی سماعت کرنل ایف۔ سی۔ نکولس نے کی۔ سیشن کورٹ میں اس کو مجرم تو قرار دیا گیا، تاہم مجسٹریٹ کے فیصلے میں تخفیف کر دی گئی اور ناشر مذکور کے لیے محض چھ ماہ سزائے قید بحال رکھی۔ طویل مدت کی اس عدالتی کارروائی کے بعد ۱۹۲۷ء میں ملزم کی جانب سے نگرانی کی درخواست ہائی کورٹ میں پیش ہوئی، جس کی سماعت کنور دلیپ سنگھ کی عدالت میں ہونا طے پائی۔ اس وقت پنجاب ہائی کورٹ کا چیف جسٹس سر شادی لال تھا، جس کی ذاتی سفارش پر راجپال کو رہا

کر دیا گیا۔ دلیپ سنگھ جج نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ کتاب کی عبارتیں ناخوشگوار ضرور ہیں، مگر ان سے کسی قانون کی خلاف ورزی ہرگز نہیں ہو رہی۔

اس فیصلے سے تمام مسلمان مشتعل ہو گئے۔ مختلف حلقوں نے تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی شدید مذمت کی۔ وہی دیرینہ جوش و خروش دلوں میں پھر عود کر آیا۔ پورے ملک پر اندوہ ناکیوں کی فضا چھا گئی اور اہل اسلام کی جانب سے جج مذکور کی برطرفی کا مطالبہ ہوا۔ ایک ممتاز مسلمان وکیل ڈاکٹر سید عبدالمجید ایم۔اے،ایل۔ایل۔ڈی بیرسٹرایٹ لاء نے جو ان دنوں انگلستان میں پریکٹس کرتے تھے، اپنے انٹرویو میں اسے خوب تنقید کا نشانہ بنایا اور انگریزی روزنامہ ''مسلم کرانیکل'' نے اس فیصلے کے خلاف ایک سخت تنقیدی مضمون بھی لکھا:

> ''جج کنور دلیپ سنگھ نے قانون کی غلط تشریح کی ہے، ورنہ قانون میں اس امر کی واضح اور کافی گنجائش ہے کہ وہ راجپال جیسے دریدہ دہن اور بے غیرت ملیچھ کا محاسبہ کرے۔ اس سے بڑھ کر مذہبی دلآزاری کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ دنیا کا ہر مسلمان بالخصوص کبیدہ خاطر ہے بلکہ حبیب کبریا ﷺ کی ناموس پر کٹ مرنے کو تیار۔ مسلمان ایک زندہ اور فعال قوم ہے۔ اگر عدالت نے اپنے فیصلے پر نظرثانی نہ کی تو کوئی مجاہد اس منہ زور کا سر قلم کر دے گا۔''

درج بالا نفس مضمون ایک انگریزی روزنامہ ''مسلم آؤٹ لک'' کے اداریے میں بھی بطور خاص شائع ہوا۔ اس وقت انگریزی میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کے ترجمان یہی اخبار تھے۔ تنقیدی اداریہ طبع کرنے کے جرم میں ''مسلم آؤٹ لک'' پر توہین عدالت کا مقدمہ دائر ہوا۔ چیف ایڈیٹر سید دلاور شاہ اور اخبار کے مالک مولوی نور الحق کو دو دو ماہ قید اور ایک ایک ہزار روپیہ جرمانے کی سزا صادر ہوئی۔ اس سلسلے میں متعدد جلسے ہوئے اور جلوس نکلے، حتیٰ کہ اس موقع پر مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیت بھی خاموش نہ رہ سکی۔ انہوں نے جو تقریر شاہی مسجد میں عوام کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمائی، وہ انسانی ذہن پر ہمیشہ مرتسم رہے گی۔ انہوں نے فرمایا:۔

> ''میں کوئی وکیل یا بیرسٹر نہیں۔ قانون میں جو کچھ سیکھا وہ بار بار ملزم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر سیکھا ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آئندہ فتنے کے سدباب کے لیے اس قانون کو ہی بدلوا

ڈالیے اور تعزیرات ہند میں ایک مستقل دفعہ بڑھوا کر توہین بانیانِ مذاہب کو جرم قرار دیجئے۔ اب تک ایسی کوئی مستقل دفعہ آپ کے ملکی قانون میں نہیں، جو رعایا کے فرقوں کی دل آزاری پر دی جا سکے۔

بعض عدالتیں جو سزا دیتی ہیں، وہ محض حاکم کی رائے کا درجہ رکھتی ہیں مستقل قانون کا نہیں۔ دفعہ کا مسودہ میں تیار کیے دیتا ہوں، اسمبلی کے کوئی ممبر اس میں مناسب لفظی ترمیم کر کے اسے ایوان میں پیش کریں اور منظور کرائیں۔

آقا و ہادی ﷺ اور ان کے ساتھ تمام دوسرے مذاہب کے محترم بانیوں کی شخصیتیں بھی بدزبان اور بے لگام لکھنے والوں کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں گی۔ علمی رنگ میں کسی مذہب پر یا تاریخی حیثیت سے مذہب کے بانی پر تنقید کرنا بالکل دوسری شے ہے، اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے، لیکن جو کھلی توہین کسی بھی مذہب کے بارے میں ہو، آج سے اسے ہندوستان کے قانون میں قطعی جرم قرار دے دیا جانا چاہیے۔''

ایک مدت سے مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی ہو رہی تھی۔ شاتم رسول کی یاوہ گوئیوں کی خبر دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔ معاندین کا گھٹیا انداز فکر، اس قدر اہمیت اختیار کر گیا کہ اسی دوران کابل کے مشہور اخبار ''امان افغان'' نے بھی اس موضوع پر ایک نہایت رقت آمیز، جگر گداز اور سبق آموز اداریہ لکھا۔ جس میں گستاخ رسالت کی سرزنش اور انگریز عملداری پر سخت تنقید کی گئی۔

یہ صورت حال بے چین و مضطرب کر دینے کے لیے کافی تھی۔ لٰہذا محمد شفیع کی قیادت میں مسلم اکابرین کا ایک وفد گورنر سے ملا۔ انہیں عدالت کے اس غیر منصفانہ فیصلے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس سے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ گورنر نے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ان کی ڈھارس بندھائی اور وعدہ کیا کہ وہ مزید چھان بین کرائیں گے۔ اگر کہیں سقم ہوا تو اسے حقائق کی روشنی میں ہر ممکن دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس واقعہ سے ہندو لیڈروں کی مسلم کشی کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ انہوں نے گورنر کے اس رویے کے خلاف وائسرائے ہند کو احتجاجی تار ارسال کیے اور مسلمانوں کے وفد سے گورنر کی بات چیت کو توہین عدالت قرار دیتے ہوئے عدالت عالیہ کے فیصلے کی حمایت کی۔

ہندو مت میں مہاتما گاندھی واحد فرد تھا جس نے آریہ سماج کی معاندانہ روش کی مذمت کی اور ۲۴۔دسمبر۱۹۲۷ء کو ''ینگ انڈیا'' میں ''رنگیلا رسول'' کے عنوان سے ایک مفصل مضمون شائع کیا۔اس سے قبل انہوں نے ۱۹۔جون ۱۹۲۴ء کو اسی اخبار میں ستیارتھ پرکاش،رشی دیانند اور سوامی شردھانند پر تنقید کی تھی۔اداریے کے قریب آخر میں انہوں نے لکھا:۔

''پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس ناخواندہ رسالہ اور توہین آمیزہ اخبار 'شیطان' پر میرے اعتراضات، میرے پاس آریہ سماجیوں کے خطوط کا ایک پلندہ لے آئے، حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ 'سماج' وقت اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلے اور اپنی جھگڑالو طبیعت کو خیر باد کہہ دے۔اپنے عقائد و خیالات کا پابند رہے۔لیکن دوسرے مذاہب کے ساتھ اسی رواداری کا سلوک کرے،جس کی وہ اپنے لیے طالب ہے''۔



جج کے اس فیصلے کے خلاف جابجا احتجاج شروع ہو گئے،جس کا اظہار جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے ہو رہا تھا۔علاوہ ازیں مسلم اخبار بھی اس معاملے میں پیش پیش تھے۔مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ''ہمدرد'' دہلی میں لکھا:

''حکومت نے آرڈی ننس کے بل بوتے پر قانون کی تشکیل کا جو اختیار لے رکھا ہے اس کا ناجائز استعمال تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔حکومت کو چاہیے کہ کم از کم اس کا ایک بار ہی جائز استعمال کر دکھائے اور حالات میں مزید خرابی پیدا ہونے سے پہلے فوری طور پر قانونی سقم کو دور کرے۔''

اس فیصلے سے مسلمانانِ ہند حصول انصاف سے مایوس ہو چکے تھے اور احتجاج کرنے کی خاطر سب سے معرکہ خیز جلسہ ۴۔جولائی ۱۹۲۷ء کو درگاہ حضرت شاہ محمد غوث بیرون دہلی دروازہ لاہور کے پاس ہوا۔جلسے کا انعقاد اور منادی کرنے کے سلسلے میں مہر علم الدین، محمد شفیع اور خواجہ غلام محمد کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔اس روز جلسے کو ناکام بنانے کی خاطر سر شام ہی متعدد ضلعی حکام بھی باغ میں پہنچ گئے، کیونکہ حکام اس سے قبل سہ پہر کے وقت لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کا اعلان کر چکے تھے۔ان حالات میں مسلمانوں میں ہیجان اور شدید اضطراب کے جذبات پیدا ہو گئے۔ہر طرف ہنگامہ خیزیاں ہو رہی تھیں۔

ادھر ضلعی خلافت کمیٹی فیصلہ کر چکی تھی کہ جلسہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ فرزندان توحید نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے کے لیے دھڑا دھڑ اپنے نام لکھوائے۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے دفتر میں طویل بحث وتمحیص کے بعد قرار پایا کہ شاہ محمد غوث کی درگاہ کے بالمقابل احاطہ شیخ عبدالرحیم میں جلسہ منعقد ہو۔ چنانچہ احاطہ، عاشقانِ رسولؐ سے بھر گیا۔ جلسے میں مفتی کفایت اللہ، مولانا ظفر علی خاں، غازی عبدالرحمٰن، مولانا سعید دہلوی، سر عبدالقادر اور ان کے علاوہ متعدد زعمائے کرام بھی شریک تھے۔

چوہدری افضل حق صاحب رکن کونسل لدھیانہ صدر جلسہ قرار پائے۔ چوہدری مذکور نے افتتاحی تقریر میں حکام کی اس شدید غلطی کا وضاحت کے ساتھ تذکرہ کیا کہ ایک جج نے قانون کو مذہب سے ٹکرا دیا تھا، لیکن مسٹر اوگلوی نے ناعاقبت اندیشی سے سیاست کا مذہب سے تصادم کر دیا ہے۔ یہ وہ شدید غلطی ہے جس پر حکام کو پریشان ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مختصراً جسٹس دلیپ سنگھ کے فیصلے پر نکتہ چینی کی اور پھر امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک رقت آمیز تقریر ارشاد فرمائی۔ آپ نے فرمایا:

> ”آج کوئی روحانیت کی آنکھ سے دیکھنے والا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور ان کی ازواج مطہرات ہم مسلمانوں کی مائیں لاہور کے مسلمانوں سے فریاد کر رہی ہیں کہ تمہارے شہر میں ہماری بے حرمتی کی جا رہی ہے، ہمیں کھلے بندوں گالیاں دی جاتی ہیں۔ اگر کچھ پاسِ رسالت ہے تو ناموس رسالت کی حفاظت کرو۔“

پہلے ہی ایک رقت کا عالم طاری تھا اور حاضرین جلسہ زار و قطار رو رہے تھے: بعض جوشیلے نوجوان زور شور سے یہ تقاضا کر رہے تھے کہ ہم ممنوعہ جلسہ گاہ میں ظالم حکومت کے بازوؤں کو آزمانا چاہتے ہیں۔ اسی دوران حکام کی مداخلت اور فدایانِ رسول کو زدوکوب کیے جانے کی وجہ سے تقریر روک دینا پڑی۔ اس وقت حاضرین کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق ۳۰ ہزار سے زائد ہو چکی تھی۔ رات نو بجے کے بعد باقاعدہ جلسے کا آغاز ہوا، جس کا افتتاح خواجہ عبدالرحیم عاجز امرتسری نے ایک ولولہ انگیز پنجابی نظم سے کیا۔ اس کے بعد اختر علی خاں نے ایک نظم پڑھی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے خطبہ مسنونہ کے بعد سورۃ لقمان کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرمائی۔ آپ کی تقریر کیا تھی الفاظ کے تیر تھے، جو دلوں میں ترازو ہوتے جا رہے تھے۔ وہ الفاظ کیا تھے، شعلہ نوائیوں کا

ایک سامان تھا جس سے مصلحت کوشیاں خاکستر ہو رہی تھیں۔آپ نے فرمایا:

''آج ہم سرورِ دو عالم ﷺ کی عزت کے لیے جمع ہوئے ہیں خدا وند کریم ہمیں توفیق دے''۔

اس کے بعد مولانا نے حضور سرور کائنات ﷺ کی شان میں ایک نعتیہ بند اس انداز سے پڑھا کہ حاضرین کے دل گداز ہو گئے اور مجمع پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔آپ نے کہا:۔

''آج مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مرتضیٰ حسن، مولانا احمد سعید دہلوی اور مفتی کفایت اللہ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ان کے دروازے پر حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ قرارداد لے کر گئیں اور فرمایا۔ ہم امہات المومنین ہیں۔تمہاری اور سب مسلمانوں کی مائیں ہیں۔آج ہمیں بازاروں میں گالیاں دی جاتی ہیں۔کیا تمہاری غیرت جوش میں نہیں آتی؟''

آپ نے مزید فرمایا:

''مسلمانو! تمہارے دروازے پر عائشہؓ دستک دے رہی ہیں۔ اٹھو! گناہ بخشوانے کا وقت آج ہی ہے (حاضرین زار و قطار رو رہے تھے) آج بڑے بڑے بیرسٹر کام نہیں آسکتے۔آج نامی گرامی لیڈر کام نہیں آسکتے۔آج یہی داڑھی منڈے کام آئیں گے جو یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ دوستوں کی محبت میں کٹ مرتے ہیں، آج سبز گنبد کے اندر رسول اللہ ﷺ تڑپ رہے ہیں۔ان کی ازواج مطہرات یعنی ہماری ماؤں کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔کیا ہمارا ایمان اس قدر کمزور ہے کہ بازاری عورتوں اور معشوقوں کے لیے تو مرمٹیں مگر عائشہ اور خدیجہؓ کی عزت پر حملہ ہو تو ہم یونہی خاموش بیٹھے رہیں۔اگر آج ہم ان کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے تو اس سے بہتر ہے کہ ہم پلیگ، ہیضہ یا کسی اور وبا کا شکار ہو جائیں''۔

آپ نے برطانوی حکومت پر برستے ہوئے فرمایا:۔

''آج گورنمنٹ نے ہمارا جلسہ روکنے کے لیے پامال زمین پر تو قبضہ کر لیا لیکن وہ دلیپ سنگھ کے قلم پر قابض نہ ہو سکی۔ہم نے تین سال

تک جبر سہا لیکن ہندو اسے نہ سمجھ سکے۔ وہ یاد رکھیں، جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے، ناموس رسول ﷺ پر حملہ کرنے والے چین سے نہیں رہ سکتے۔ پولیس جھوٹی ہے، حکومت کوڑھی ہے اور ڈپٹی کمشنر نا قابل ہے۔ وہ ہندو اخبارات کے سنڈے ایڈیشنوں کی ہرزہ سرائی کو تو نہیں روک سکتا، لیکن علمائے کرام کی تقریریں روک دیتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ دفعہ ۱۴۴ کے پرخچے اڑا دیئے جائیں۔ بیس بیس مسلمانوں کے دستے ممنوعہ جلسہ گاہ میں جائیں اور کالی کملیؐ والے کے نام پر جو بھی مصیبت آئے بطیب خاطر جھیلیں اور اپنی زندگیاں حرمت رسول ﷺ پر نثار کردیں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ نے لوگوں کو ہنٹر مارے ہیں۔ یہ کیسی بزدلی ہے، جو شخص اس قدر بزدل ہو وہ شہر کا انتظام کس طرح چلا سکتا ہے''؟

رات گئے جب اس جلسے کا اختتام ہوا تو سننے والوں نے سنا اور دیکھنے والوں نے دیکھا، دفعہ ۱۴۴ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھری نظر آتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی شاتم رسول کی زندگی کے دن پورے ہو رہے تھے۔

جلسے کے چند دن بعد شاہ صاحب، غازی عبدالرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر نقص امن عامہ کے تحت مقدمہ دائر ہوا۔ بعد ازاں امرتسر سے رضا کار ٹولیوں کی صورت میں لاہور آتے رہے اور گرفتاریاں ہوتی رہیں۔ الغرض جب تک وہ اشتعال انگیز کتاب موجود تھی، مسلمانوں کے انتقامی شعلوں کا فرو ہونا محال تھا۔

فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کی بنا پر ان دنوں ''ورتمان'' کے ایڈیٹر کے خلاف بھی دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ چل رہا تھا۔ حکومت کی دلچسپی پر اس مرتبہ یہ مقدمہ مجسٹریٹ کی عدالت سے منتقل ہو کر ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ کے سپرد ہوا جس کے صدر جسٹس براڈوے تھے۔ ڈویژن بنچ نے کنور دلیپ سنگھ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے متفقہ فیصلے لکھا:

''دفعہ ۱۵۳۔ الف ایسے لٹریچر پر حاوی ہے جو فرقہ وارانہ فساد پھیلائے یا مذہبی دلآزاری کا سبب بنے''۔

اس مقدمے کا مجرم تو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ بعد میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک اور مرکزی

اسمبلی کے مسلمان ارکان کی تائید سے گستاخ اہلِ قلم کی خاطر ضابطۂ تعزیرات ہند میں دفعہ ۲۹۵ الف کا اضافہ بھی ہوگیا، لیکن راجپال تو بری ہو چکا تھا اور قانون کی اس متلون مزاجی پر ہنس رہا تھا۔



راجپال کے گریبان تک پہلا ہاتھ

راجپال ایک زیرک ہندو تھا۔ اس نے ہائی کورٹ سے بری ہونے کے بعد نیا پینترا بدلا اور اعلان مشتہر کرایا کہ میں آئندہ اس رسالے کو شائع نہیں کروں گا۔ لیکن اسی دوران یہ بے ہودہ کتاب دوبارہ بنارس سے شائع ہوئی۔ اس ناپاک جسارت کا ارتکاب بھی درحقیقت راجپال نے ہی کیا تھا۔ اس کا نام ان دنوں مشاہیر اسلام سے متعلق عریاں تصویروں کے ایک پمفلٹ ''بلیدان چتر اولی'' کے سلسلے میں بھی سنا گیا، جو کلکتہ سے شائع ہوا۔ علاوہ ازیں کتاب ''چودھویں صدی کا چاند'' اس کے زیرِ طبع تھی، جس میں ملت اسلامیہ کی بزرگ شخصیتوں پر کیچڑ اچھالا گیا تھا۔

مسلمانوں کے جذبات ایک طویل مدت سے کھول رہے تھے۔ مگر غیظ و غضب کے طوفان کی سرکش موجیں ابھی ساحل کی پابند تھیں۔ جب رستے ہوئے زخموں کو کسی جراح سے کوئی مرہم نہ مل سکا تو یہ خود ہی درماں کی تلاش کرنے لگے۔ مرکزی ادارہ ''حزب الاحناف'' لاہور نے راجپال کے قتل کا فتویٰ دے دیا اور انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ نے اس کی تائید کی۔ جامع مسجد شاہ ابوالمعالی کے خطیب نے بھی اس بارے میں باطل شکن تقریر کرتے ہوئے اہلِ ایمان کی غیرت کو للکارا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک غیور مسلمان، خدا بخش کا نام قابلِ ذکر ہے، جس نے سب سے پہلے شاتم رسول پر قاتلانہ حملہ کیا۔

۲۶ ستمبر ۱۹۲۷ کی صبح راجپال حسب معمول اپنی دکان پر کاروبار میں مشغول تھا۔ خدا بخش نامی ایک شخص نے اپنے تیز دھار چاقو سے اس پر حملہ کر دیا، جس سے راجپال کو کل چار زخم آئے، جن میں ایک تو خاصا گہرا تھا، لیکن یہ زخم جان لیوا ثابت نہ ہوئے۔ شاید قدرت کو کسی اور کا امتحان بھی مقصود تھا۔

غازی خدا بخش اندرونی یکی گیٹ لاہور کے رہنے والے تھے۔ باپ کا نام محمد اکبر اور تعلق ایک معروف کشمیری خاندان سے تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ شیر فروش اور جلد سازی کا کام بھی کیا کرتے۔ اس جانباز کا سینہ نورِ ایمان سے منور اور آقائے دو جہاں ﷺ کی محبت واردات سے معمور تھا۔ اس نے جمعہ کے دن مسجد میں ناموس رسالت کے موضوع پر ایک تقریر سنی اور راجپال کا

کام تمام کرنے کے لیے بے قرار رہنے لگا۔ مگر جب موقع ملا تو اتفاق سے اس کا حملہ ناکام رہا اور راجپال کی جان بچ گئی۔

اس موقع پر پرتاپ اور بندے ماترم نے خاص ضمیمے شائع کئے اور بڑی بڑی سرخیاں جمائیں۔ ہندو سبھا کے اخبار ''ہندوستان ٹائمز'' نے اپنے اداریے میں لکھا:

''مولاناؤں اور مولویوں نے راجپال کو 'رنگیلا رسول' کی قیمت اپنے خون سے ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسلام کے اس قانون پر باقاعدہ عمل کیا گیا، جس کی تشریح مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کر رہے تھے۔''

ہندو اخبار 'ارجن' نے لکھا:

''اس حادثے سے گورنمنٹ کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور ایسے واقعات آریہ سماجیوں کو اپنے فرائض کی بجا آوری سے باز نہیں رکھ سکیں گے۔''

اس واردات کے فوراً بعد دفعہ ۱۴۴ کے تحت حصول اجازت خاص کے بغیر دو ماہ کے لیے عام اجتماع پر پابندی عائد کر دی گئی۔

غازی خدا بخش کا جسم فربہ، رنگ گورا، قد لمبا اور کاٹھی مضبوط تھی۔ گرفتاری کے وقت وہ ترکی ٹوپی، کھلا کوٹ، بنگالی قمیض اور علی گڑھ فیشن کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی، جبکہ مجروح راجپال چالیس کے قریب تھا۔

واردات کے دوسرے دن ہی سی۔ ایم۔ جی۔ اوگلوی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں زیر دفعہ ۳۰۷ تعزیرات ہند مقدمے کی سماعت شروع ہوگئی۔ رائے صاحب مہتہ ایشر داس کورٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ استغاثہ کی طرف سے پیروکار تھے، جبکہ غازی خدا بخش کی طرف سے کوئی وکیل حاضر عدالت نہ ہوا۔ ابتداً چشم دید اور رسمی گواہوں کی شہادتیں قلمبند ہوئیں، جس کے بعد مضروب راجپال ولد رام داس نے اپنے بیان میں کہا:

''سوموار ساڑھے آٹھ بجے صبح کا واقعہ ہے، میں دوکان کے اندر کام کر رہا تھا، باہر سے میرے ملازم نے آواز دی کہ سوامی جی بلا رہے ہیں۔ میں باہر نکل آیا اور اپنے دوست کے ساتھ گفتگو میں محو ہو گیا کہ ملزم

نے اچانک میرے قریب آ کر میری چھاتی پر چاقو سے حملہ کیا۔ جب اس نے چاقو مارا تو میں پیچھے تھا۔ مجھے چاقو لگا اور خون جاری ہو گیا۔ ملزم نے مجھے دھکیل کر اندر کر دیا۔ جس وقت میں دکان کے دوسرے حصہ میں پہنچا تو گر گیا اور ملزم میرے اوپر چڑھ گیا۔ میں اپنی چھاتی کو چاقو کے حملے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سوامی سونترانند کے پہنچنے سے پہلے ملزم نے مجھ پر چھ زخم لگائے۔

میری رائے میں مجھ پر حملہ کتاب 'رنگیلا رسول' کی اشاعت اور مسلمانوں کے ایجی ٹیشن کا نتیجہ ہے۔ میں نے کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب کے متعلق مجھے مقدمہ میں سزا ہوئی تھی اور بعد ازاں ہائی کورٹ سے بری کر دیا گیا۔ مجھے ملزم سے اب بھی خطرہ ہے کہ یہ مجھے مار دے گا۔ حملے کے وقت بھی ملزم کہے جاتا تھا کافر! آج تو میرے ہاتھ آیا ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

جب عدالت نے خدا بخش سے دریافت کیا کہ آیا وہ جرح کے طور پر کوئی سوال کرنا چاہتا ہے تو آپ نے بلند آواز میں کہا:

''میں مسلمان ہوں۔ ناموس رسالت کا تحفظ میرا فرض ہے۔ میں تاجدار مدینہ ﷺ کی توہین ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ (گواہ) 'رنگیلا رسول' کا لفظ منہ سے نکال رہا ہے، میں اس کی زبان بند کرنا چاہتا ہوں''

ایک دو دن کی اس مختصر کارروائی کے بعد عدالت نے ملزم کو سات سال قید سخت، جس میں تین ماہ کی قید تنہائی بھی شامل تھی، سزا کا حکم سنا دیا اور مجسٹریٹ نے اپنے فیصلے میں مزید لکھا کہ میعاد قید کے بعد ملزم کو پانچ ہزار روپے کی تین ضمانتیں حفظ امن زیر دفعہ ۱۰۶ ضابطہ فوجداری داخل کرنا ہوں گی۔ اگر مجرم ضمانت نہ دے سکا تو اسے ایک سال مزید قید محض بھگتنی پڑے گی۔

اس فیصلے سے ہندوؤں کے جذبات میں ایک ٹھہراؤ پیدا آ گیا۔ راجپال کے زخم مندمل ہونا شروع ہوئے اور چند روز میں بھر گئے۔ لیکن اہلِ اسلام کے جذبات میں نیا جوش اور نئی طغیانی عود کر آئی اور نیم مندمل زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔

راجپال کے گریبان تک دوسرا ہاتھ

غازی خدا بخش اکو جہا کو سات سال قید سخت کی سزا مل چکی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کی توہین نعوذ باللہ کوئی جرم نہیں، البتہ ناموسِ رسالت کا تحفظ قانون کی نگاہ میں ایک جرم ہے۔ چنانچہ چند روز بعد ۹۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء کی شام کو ہسپتال روڈ پر ایک بار پھر ہنگامہ ہوا۔ اس بار حملہ آور عبدالعزیز نامی ایک غیور مسلمان تھا، جو افغانستان سے بغرض تجارت ہندوستان آیا۔ ان دنوں ہر طرف یاس وحزن کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ راجپال کے لگائے ہوئے چرکے روز بروز دلوں کی دنیا میں گھاؤ کر رہے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کے سینوں میں نفرت وحقارت کا الاؤ دہک رہا تھا۔

عبدالعزیز کے دل میں بھی گستاخ رسول کے خلاف غضب وغصے کا ایک عظیم طوفان مقید تھا۔ لیکن وہ اجنبی تھے اور دیارِ غیر میں ان کا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ اسی دوران وہ عزیز واقارب کو ملنے کی خاطر اپنے وطن گئے تو وہاں بھی ایک عجیب قسم کا ہیجان پایا۔ ان کے وطن والے ان پے در پے ایمان سوز واقعات سے کبیدہ خاطر تھے۔ اس معاملے میں کابل کے اخبار ''امان افغان'' کا کردار نا قابل فراموش ہے۔ جس نے آریہ سماج اور انگریزی عملداری پر کڑی تنقید کی۔ بہر صورت عبدالعزیز جب اپنے وطن سے لوٹا تو اس کے دل میں ایک نئی دنیا آباد تھی۔ اب وہ فکر معاش کی بجائے اپنے شکار کی تلاش میں سیدھا لاہور پہنچا۔ لاہور میں اس کے چند دن حالات پڑھنے میں گزر گئے۔ پھر ایک روز اس نے انارکلی بازار سے راجپال کی دکان کے متعلق پوچھا اور ہسپتال روڈ پر واقع بدذات ناشر کی دکان پر پہنچ گیا۔

اس وقت مہاشہ راجپال کی دکان پر دو شخص بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کا موضوع مذہب اسلام اور بانی اسلام کی حیاتِ طیبہ تھی۔ عبدالعزیز نے ان سے کہا کہ میرے مذہب کی توہین نہ کرو، لیکن وہ باز نہ آئے، جس سے بات بڑھ گئی اور آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ اسی اثنا میں دس بارہ ہندو دکاندار بھی جمع ہو گئے اور مذہب اسلام کے متعلق توہین آمیز طعن وتشنیع کرنے لگے۔

اتفاق سے راجپال دکان پر موجود نہیں تھا اور کاروبار اس کا دوست سوامی ستیانند چلا رہا تھا۔ عبدالعزیز نے سمجھا کہ معروف شاتم رسول یہی ہے اور اپنا چاقو نکال کر اس پر برس پڑے۔ چنانچہ عبدالعزیز کے بھرپور وار سے ستیانند شدید زخمی ہوا اور چاقو اس کی تلی تک پہنچ گیا۔ البتہ نانک چند

بزاز اور چونی لال کے زخم معمولی تھے۔

اس حادثے سے پورے شہر میں سنسنی پھیل گئی اور حکومت کو اس قدر خطرہ لاحق ہوا کہ کنور دلیپ سنگھ کی کوٹھی پر فوراً پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ تھانے میں غازی عبدالعزیز نے پولیس کو بتایا:

''میں مقام روضہ، علاقہ غزنی، افغانستان کا رہنے والا ہوں۔ میرے باپ کا نام عبداللہ ہے۔ پانچ چھ سال ہوئے، میں تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا۔ میں چار سال اجمیر میں رہا۔ چار پانچ ماہ احمد آباد میں گزارے اور کچھ عرصہ سندھ میں بسر کیا۔ وہاں سے لاہور آ گیا اور لنڈا بازار کی سرائے میں ٹھہرا۔ میں سرائے میں رہتا تھا اور کبھی شاہ محمد غوث کی مسجد میں سویا کرتا۔ آج شام ساڑھے چار بجے کے قریب راجپال کی دکان پر دو ہندو بیٹھے مذہب اسلام کے متعلق توہین آمیز باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے مذہب کی توہین نہ کرو۔ اس پر وہ پہلے تو چپ ہو گئے لیکن ایک منٹ کے بعد ہی مجھے اور اسلام کو پھر برا بھلا کہنے لگے۔ میں نے انہیں ایسی باتوں سے باز رہنے کو کہا اور بات بڑھ گئی۔ پھر میں نے اپنا چاقو نکال لیا۔ میں لاہور کے اندرون تنہا ہوں۔ یہاں میرا کوئی واقف نہیں ہے، نہ ہی میں کسی کے وعظ یا درس میں شریک ہوا ہوں۔''

پولیس نے تفتیش کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے دہلی دروازہ کے باہر حضرت شاہ محمد غوث کی درگاہ کے قریب رہنے والے پٹھانوں سے بھی پوچھ گچھ کی۔ جب ان لوگوں سے کوئی مفید معلومات حاصل نہ ہو سکیں تو فی الفور چالان مکمل کر کے مسٹر اوگلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دیا۔

تاریخ کے ان دو واقعات میں حیرت انگیز طور پر مماثلت ہے کہ جب مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا تو سلطان محمود غزنوی (۴۱۵ھ) ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ صدیوں بعد جب بھارت ماتا کے ایک زبان دراز بیٹے نے امام الرسل ﷺ کی حرمت و تقدیس پر طعن و تشنیع کے تیر چلائے تو ان کی روح عالم برزخ میں بھی چین سے نہ رہ سکی اور اپنے بہادر سپوت کے پیکر خاکی کو مسکن بنایا، اس طرح ۱۳۴۶ھ میں عبدالعزیز غازی نے درویش غزنویؒ کی اس سنت کو زندہ کر دکھایا۔

غازی عبدالعزیز نے ملاقاتیوں کے ایک گروہ سے فرمایا:

''میرے مولد کو فخر ہے کہ اس نے محمود غزنوی ایسا مجاہد، مبلغ اور بت شکن پیدا کیا، جس نے برصغیر میں قریب قریب کفروالحاد کا خاتمہ کر دیا، یہی وہ مسلمان فاتح تھا، جس نے سنا کہ ملتان میں ایک قرامطی فرقہ ہے جو کہلواتا تو مسلمان لیکن اصل میں ہے بت پرست۔ اس قدر ناقص العقیدہ ہے، جو نماز بھی پڑھتا ہے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مورتیوں کی پوجا بھی کرتا ہے۔ غزنی کا وہ درویش صفت شہنشاہ اندوہناک خبر سنتے ہی بگولے کی طرح ملتان پہنچا اور قرامطی داؤد، حاکم ملتان کا احتساب کر کے اسلام کا پرچم لہرادیا۔''

عبدالعزیز غازی نے بتایا:۔

''مجھے خواب میں سلطان محمود غزنوی نے حکم دیا کہ جاؤ اور اس ملعون شاتم کے پرخچے اڑا کر ثواب دارین حاصل کرو۔ چنانچہ میں اسی جذبہ سے سرشار لاہور پہنچا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں راجپال کو واصل فی النار نہ کر سکا اور مجروح بھی موت وحیات کی کشمکش سے زندہ بچ نکلا ہے۔''

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مسٹر اوگلوی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں غازی عبدالعزیز کا چالان پیش ہوا۔ استغاثے کی طرف سے مہتہ ایشرداس کورٹ انسپکٹر پیروکار تھے، لیکن غریب الوطن ملزم کی طرف سے کوئی وکیل عدالت میں موجود نہیں تھا۔

۱۲۔ اکتوبر کو مقدمہ کی دوبارہ سماعت ہوئی اور سرسری کارروائی کے بعد عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ سوامی ستیانند پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں اسے سات سال قید سخت کی سزا دی گئی، جس میں تین ماہ قید تنہائی بھی شامل تھی۔ نانک چند اور چونی لال کو مجروح کرنے کے الزام میں بھی اسی قدر مزید سزا سنائی گئی۔ میعاد ختم ہونے پر پانچ پانچ ہزار کی تین ضمانتیں دینا لازمی تھیں۔

تحقیق کے اس دوراہے پر راقم چپ نہیں رہ سکتا کہ ہمارے اکثر لکھنے والوں نے گلی کوچوں میں گشت کرتی روایات کو مستند جانا ہے اور سنی سنائی باتوں کو تاریخ کا حصہ بنا دینا چاہا۔ غازی عبدالعزیز کا کوہاٹ سے کوئی تعلق تھا نہ کبھی وہ کوہاٹ گیا۔ جتندر داس ہندوؤں میں ایک سنجیدہ سیاسی شخصیت تھی جس کے مرنے پر غالباً مسلمان شاعروں نے بھی مرثیے کہے اور ان پر قتل کے

الزام میں نہیں بلکہ اقدام قتل کے سلسلے میں مقدمہ دائر ہوا تھا جبکہ بعض اہل قلم نے لکھا ہے کہ غازی عبدالعزیز کوہاٹ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے راجپال کے شبہ میں اس کے دوست جتندر داس پر حملہ کیا اور یہ کہ قتل کرنے کے جرم میں ان کو چودہ سال سزائے قید سنائی گئی۔

راجپال قتل ہوتا ہے

گستاخ رسول کا قصہ تمام کرنے کی خاطر مختلف اوقات میں خنجر بکف، تکبیر بلب متعدد جانباز قسمت آزمائی کرنے نکلے۔ اسی سلسلے میں خدا بخش اکوجہا اور غازی عبدالعزیز خان، دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اپنے حصے کا ثمر وصول کر کے زندان کی بظاہر پر آشوب زندگی کو محبوب سمجھ کر گلے لگا چکے تھے۔

محمد دین کلیم صاحب نے کہیں لکھا ہے کہ ان کے بعد امرتسر سے ایک طالب علم حافظ عبدالمصور خلف ڈاکٹر اشفاق نے بھی مقدر آزمایا مگر پکڑے گئے اور قید ہوئے۔ لیکن یہ کیسے ہوتا؟ سعادتِ عظمیٰ تو خدائے قدوس نے علم الدین کی قسمت میں لکھی تھی۔ غیظ وغضب اور نفرت و حقارت کا جوالا ایک مدت سے اہل اسلام کے سینوں میں ابل رہا تھا، بالآخر شعلہ جوالا بن کر پھوٹ پڑا۔ ایک مسلم نوجوان نے راجپال کا پیٹ چاک کر کے اسے ابدی نیند سلا دیا۔

برصغیر میں قطب الدین ایبک نے اسلامی حکومت کا ایک چراغ روشن کیا جو صدیوں تک آشیانۂ کفرزار میں اپنی ضیائیں بکھیرتا رہا۔ جب ہم باقاعدگی سے لہو کا تیل نہ ڈال سکے تو وہ چراغ بجھ گیا۔ فاتح مفتوح اور حاکم محکوم بن گئے۔ گردوں کی آنکھ نے یہ عبرتناک منظر بھی دیکھا کہ شاتم رسول، راجپال، قطب الدین ایبک کے پہلو میں بیٹھا، اس کی زخم زخم روح کا تماشا دیکھ رہا ہے اور سلطان الہند کی شکستہ قبر سے صبح وشام ایک چیخ بلند ہوتی ہے کہ شاید اس کا کوئی غیرت مند بیٹا تڑپ اٹھے اور غم نصیب باپ کے لیے سامان مسرت مہیا کرے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جوں جوں احتجاج بڑھتا جارہا تھا راجپال کی زندگی کی گھڑیاں کم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس پر دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ اب وہ کاروبار بھی آزادی سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے حکام سے درخواست گزاری کہ میری زندگی ہر وقت خطرہ موت سے دوچار رہتی ہے، لہٰذا میری جان کی حفاظت کا مناسب بندوبست کیا جائے۔

چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایت پر پولیس نے دو ہندو سپاہی اور ایک سکھ حوالدار اس کی نگہداشت پر مامور کر دیا۔ لیکن راجپال کی ذہنیت عجیب قسم کے نفسیاتی سانچے میں ڈھل چکی تھی۔

وہ پہرے کی زندگی کو حراست کی زندگی سمجھنے لگا۔ ایک رات خود ہی اس نے لاہور چھوڑ دیا۔ وہ چند روز کانسی ٹھہر کر متھرا جا پہنچا، جہاں اس نے سیر وسیاحت سے اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کی۔ ادھر اسے لاہور کی یاد نے ستایا اور کچھ ہندوؤں نے بزدلی کا طعنہ دیا تو وہ چند ماہ بعد واپس آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب معاملہ رفع دفع ہو چکا ہے اور مسلمانوں کے جذبات سرد پڑ چکے ہوں گے۔ آخر اس نے فضا بزعم خود کو خوشگوار پا کر کتب فروشی کا کاروبار دوبارہ شروع کر دیا اور اپنی حفاظت کے لیے پولیس کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اس کے چند دن بعد ہی وہ خاک وخون میں لت پت بڑے کرب سے تڑپ رہا تھا۔

۶۔ اپریل ۱۹۲۹ء ایک تاریخی دن تھا۔ اڑھائی بجے کے قریب غازی علم الدین اس بدذات ناشر کی دکان پر پہنچے۔ اس وقت راجپال دکان کے اندر چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ جب کہ استغاثے کے مطابق وہ ایک کارڈ لکھنے میں مصروف تھا۔ آپ نے اُسے للکارا اور کہا:

'اے کافر! تیری موت کا وقت آن پہنچا ہے۔ میں تجھے زندہ ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ بس! تو کتے کی موت مرنے کے لیے تیار ہو جا'

اس للکار سے نوعمر مجاہد کا ایسا رعب طاری ہوا کہ راجپال کے دو ملازم بھگت رام اور کدار ناتھ جو کتابوں کو ترتیب دے رہے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ بت بن کر کھڑے دیکھتے رہ گئے اور راجپال نے کبوتر کی طرح شکاری کو سامنے پا کر اپنی آنکھیں موندلیں۔ تکبیر بلب اس شیر دل حملہ آور نے اپنا خنجر نما چھرا بلا روک ٹوک اس کے سینے میں پیوست کر دیا جس کے بعد پے در پے وار کیے۔

جب مہاشہ راجپال کے ملازموں کو ہوش آیا تو انہوں نے آپ پر چند کتابیں پھینکیں جو ان کے قدموں کو چومتی ہوئی بازار میں جا گریں۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر غازی موصوف سیدھے ودیارتن کے ٹال پر پہنچے۔ وہیں نلکے پر اپنے ہاتھوں کو راجپال کے ناپاک لہو سے صاف کیا۔ ایک اور روایت کے مطابق بعد از قتل آپ باغ بیرون دروازہ نہر کے کنارے تشریف لے گئے۔ بہر حال پانی پی رہے تھے کہ دل میں خیال آیا کہیں موذی زندہ ہی نہ بچ رہے۔ آپ نے مٹی کا گھڑا زور سے زمین پر دے مارا، جو ٹوٹ گیا اور اس کی کرچیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ پھر وہ دوبارہ راجپال کی دکان کی طرف چل پڑے۔ اِتنے میں یہ شور بپا ہوا۔

"مہاشہ جی قتل ہو گئے۔ قاتل ایک مسلمان ہے، خون آلود چھرا اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دوڑو دوڑو، پکڑو،

ارے پکڑو، جانے نہ پائے۔''

یہ سن کر غیر مسلموں میں بھگدڑ مچ گئی اور دونوں نوکر ''فتو'' نامی ایک مسلمان کو پکڑ لائے۔ آپ نے یہ شوروغوغا سن کر بآواز بلند کہا:

''نابکار راجپال کا قاتل میں ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اپنے رسول کا بدلہ لیا ہے۔ محبوب خداؐ کی حرمت و تقدیس کی حفاظت میرا فرض تھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی جرم نہیں بلکہ کارِ خیر ہے۔''

چند ہندوؤں نے آگے بڑھ کر آپ کو پکڑ لیا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ جب پولیس نے آپ کو گرفتار کیا، اس وقت ان کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے:

''خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔''

آپ نے اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے راستے میں قدم قدم پر بصد عجز و نیاز یہ دعا مانگی تھی: ''اے خدا! یہ سعادت آج تو مجھے ہی بخش دے۔''

جب غازی موصوف کے والد کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے صبر و تحمل کے ساتھ اس خبر کو برداشت کیا اور کہا:

''مجھے اس سلسلے میں علم الدین کی گرفتاری کا کوئی رنج نہیں۔ البتہ اگر میرے بیٹے نے یہ فعل نہیں کیا اور ناحق گرفتار ہوا ہے تو مجھے دکھ ہوگا۔''

لاہور ریلوے اسٹیشن، لنڈا بازار کے راستے دہلی دروازے میں داخل ہو جائیں یا چوک رنگ محل کی طرف سے ایاز (محمود غزنوی کے گورنر) کے مقبرہ سے گزر کر کچھ آگے دائیں جانب کشمیری بازار سے ہوتے ہوئے دہلی گیٹ کو جانے والی سڑک پر پہنچ جائیں تو مسجد وزیر خاں پر نگاہ پڑتی ہے۔ اس تاریخی مسجد کی نکڑ سے اندر کی سمت داخل ہونے پر ذرا آگے بازار تیزابیاں اور اس سے انتہائی مختصر فاصلے پر بازار سریاں والا نظر آئے گا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہاں ذبیحہ بکروں کے سر اور پائے فروخت ہوتے رہے ہیں۔ اب اسے عام طور پر بازار علم الدین شہیدؒ بھی کہا جاتا ہے۔ صدیوں پہلے لاہور کی سرکاری زبان فارسی تھی تو یہ بازار سرفروشاں کے نام سے مشہور ہوا اب اس میں مناسبت کے کئی اور معنی بھی جھلکتے ہیں۔ المختصر اسی بازار کے مغربی کونے پر جنوب کی سمت میں ایک پرانی طرز کا مکان دکھائی دے گا، یہ غازی علم الدین شہیدؒ کا مولد و مسکن

ہے۔



غازی علم الدین ۸۔ ذی قعد ۱۳۲۶ھ مطابق ۴۔ دسمبر ۱۹۰۸ء بروز جمعرات سریانوالہ بازار میں زینت آرائے گیتی ہوئے۔ آپ کی ولادت پر بے حد خوشیاں منائی گئیں۔ دینی تعلیم کے لیے آپ کو چھ سال کی عمر میں تکیہ سادھواں کی مسجد میں بٹھایا گیا۔ دو تین سال تک باقاعدگی سے آپ کو مختلف مدرسوں میں بھیجا جاتا رہا مگر آپ زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بازار نونا ریاں اندرون اکبری دروازہ بابو کالو کے مکتب میں انہیں داخل کروایا گیا۔ اس مدرسے میں وہ حرف شناس ہوئے۔

چونکہ میلان طبع اس طرف مائل نہ تھا، اس لیے ان کو وہاں سے علیحدہ ہونا پڑا اور مستری نظام الدین صاحب سے جو بھاٹی دروازہ کے اندر رہا کرتے تھے آبائی پیشہ سیکھنا شروع کیا۔ چند ماہ وہ مستری صاحب کے شاگرد رہے اور پیشے میں مہارت حاصل کر لی۔ منظوم سوانح عمری ''عاشق رسولؐ'' میں چوہدری فضل کریم سندھو نے نقل کیا ہے کہ علم الدین نے کسب معاش کی خاطر اپنے باپ اور بڑے بھائی محمد دین سے ہی نجاری میں مہارت حاصل کی تھی، جس کے بعد وہ شیخ نیاز محمد کی کوٹھی پر کام کرنے لگے۔ دو تین سال یونہی گزر گئے۔ پھر وہ برادر اکبر اور والد معظم کے زیر سایہ اپنی دکان چلانے لگے۔

آپ فطرتاً شوخ اور چنچل تھے، لیکن اس کے ساتھ مذہبی رجحان بھی رکھتے تھے۔ آپ سیدھے سادے نوجوان تھے۔ صاف گوئی آپ کی نمایاں خوبی تھی۔ کذب و فریب سے وہ قطعاً ناآشنا تھے۔ موصوف کی عادات و خصائل بھی بڑی حد تک منفرد تھیں۔ اجنبی گھر سے وہ کچھ کھایا پیا کرتے تھے، نہ ہوٹل سے خورد و نوش کو پسند کرتے۔ اس کے برعکس روکھی سوکھی روٹی انہیں مرغوب تھی۔ مرچ اور پانی پر گزر اوقات کر لیا کرتے تھے۔

آپ کے والد کا نام میاں طالع مند ہے۔ جو ذات کے شیخ اور پیشے کے لحاظ سے بڑھئی تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب سات پشتوں سے بابا لہنا سنگھ سے جا ملتا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ شیخو جٹ ایک سکھ تھے جس کی نسبت سے ہی ان کی اولاد آج تک شیخ کہلاتی ہے۔

شیخو جٹ کے نو بیٹے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا لہنا سنگھ جہانگیری عہد میں حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ آپ کے دیگر آٹھ بھائی، سکھ مت کے پیرو تھے۔ انہوں نے قبول اسلام کی وجہ سے آپ کو کو

بڑی اذیتیں دیں اور بالآخر گھر بار چھوڑ نے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ آپ نے تمام زندگی تبلیغ اسلام میں گزار دی۔ حضرت باب لہنا سنگھ کا مزار موضع پڑھانہ شریف برکی روڈ پر واقع ہے جو آج تک مرجع خاص و عام ہے۔ بابا لہنا سنگھ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کی اولاد ابھی وہیں ہے اور برخوار دار کی نسل سے شہید موصوف کا تعلق ہے۔



مشیت ایزدی عظیم مقاصد کے لیے جن خاص بندوں کا انتخاب کرتی ہے، ان کی زندگی کے لمحے لمحے سے لاتعداد حقائق منسوب ہوتے ہیں۔ ان کے روز و شب سے انقلابی مدوجزر کی ہمیشہ ایک خاص نسبت ٹھہری ہے۔ غازی علم الدین شہیدؒ کا سن پیدائش بھی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سال مدینہ منورہ میں حجاز ریلوے کا اجرا ہوا۔ ایران میں احمد شاہ قاچار اور عوام کے مابین خانہ جنگی ہوئی۔ مراکش میں نہتے عربوں نے فرانسیسیوں کو شکست فاش دی۔ افغانستان میں امیر حبیب اللہ نے پہلی مرتبہ عوام کے لیے مدارس کھلوائے۔ سلطان عبدالحمید خاں نے ترکوں کو پارلیمینٹری حکومت عطا کی اور غیر مسلم احمدی فرقے کا سربراہ مرزا غلام احمد قادیانی ہیضے کے مرض میں مبتلا ہو کر مرا۔

میاں طالع مند ایک ماہر دست کار تھے۔ وہ کاروباری سلسلے میں مختلف شہروں میں آیا جایا کرتے تھے۔ آپ نے ۱۹۱۱ء میں میر عثمان خاں، نظام حیدر آباد دکن کی ایک کوٹھی بمقام دہلی میں لکڑی کا کام کیا اور خود نظام کی دستخطی سند حسن کارکردگی حاصل کی۔

میاں علم الدین جب سن بلوغت کو پہنچے تو اپنے والد کے ہمراہ پہلے پہل ملتان اور خانیوال کے سفر پر گئے۔ پیر دستگیر نامی صاحب نے انبالہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ لاہور کے نواح میں ایک قصبہ لکھن شریف واقع ہے۔ یہ جگہ خواجہ محمد بخشؒ ایک ولی کامل کا مسکن تھی۔ وہ جید عالم دین اور ایک بلند پایہ بزرگ تھے۔ میاں طالع مند کو ان سے انتہائی عقیدت تھی۔ ان کی مقناطیسی شخصیت اس خوش قسمت نوجوان کو بھی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

جن دنوں لاہور میں آریہ سماجیوں کی شرارتیں نقطۂ عروج پر تھیں۔ میاں طالع مند نے کوہاٹ ریلوے اسٹیشن پر کوئی ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ چنانچہ وہ کاروباری سلسلے میں یکم جنوری ۱۹۲۸ء کو اپنے نور نظر علم الدین کو بھی ساتھ لے گئے۔ اس دوران آپ ورزش بھی کرنے لگے تھے اور جسمانی نشو و نما روز افزوں تھی۔ چنانچہ آپ عمر سے کہیں زیادہ تنومند معلوم ہونے لگے۔

اٹھتی جوانی تھی۔ خدوخال کے لحاظ سے آپ خوبرو اور شکیل تھے۔ جسم سڈول، رنگ سرخ و سپید، پیشانی چوڑی، بال سیاہ اور گھنگھریالے تھے۔ آپ کی آنکھیں جھیل کی مانند گہری اور تخم انبہ سے مشابہ تھیں، جن میں اکثر اوقات سرخ ڈورے فروزاں رہتے۔ مردم سیاہ دراز، ہونٹ باریک اور گردن ایک پروقار انداز سے اٹھی ہوئی تھی۔ البتہ چہرے کی ساخت قدرے کتابی تھی۔ شکل و شباہت کے علاوہ بھی وہ خوبی وکمال کا مرقع تھے۔ لہجے میں ملائمت اور بلا کی مٹھاس ہوتی۔ دیکھنے والے کا جی چاہتا تھا ازسرتاپا بلاتوقف دیکھتا چلا جائے اور سننے والوں کی تمنا ہوتی کہ وہ ہمہ تن گوش سنتے رہیں۔ گویا آپ نقاشِ فطرت کا ایک حسین شاہکار تھے۔ اگر کوئی ظاہر پرست ہوتا تو وہ برملا کہہ اٹھتا کہ کسی سنگ تراش نے سنگ مرمر کو طویل مدت تک اپنی شبانہ روز محنت شاقہ سے تراشا تب یہ صورت بنی ہے۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں جب علم الدین کے بڑے بھائی محمد دین کے ہاں بچی پیدا ہوئی تو آپ نے نومولود بھتیجی کو دیکھنے کے لیے لاہور کا عزم سفر کیا۔ ۲۸۔ مارچ کو ان کی سگائی آپ کے ماموں سراج دین کی دختر نیک اختر، فاطمہ بی بی سے قرار پائی۔ اسی دوران ایک دن علم الدین نے اپنے بڑے بھائی سے پوچھا:

''جو راجپال کو واصل فی النار کر دے اسے کیا انعام ملے گا؟''

محمد دین نے بتایا: ''اس خوش قسمت کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا''۔ آپ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا: یہ تو بہت اچھا انعام ہوا۔

اس کے بعد ایک رات موصوف استراحت فرما رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا اور بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اس رات آپ سرتاپا پسینے میں شرابور کروٹیں بدلتے رہے، لیکن کسی صورت ان کو چین نہ آ رہا تھا۔ ایک روز آپ نے ڈراؤنا خواب دیکھا، دوسرے دن ہی آدھی رات کے وقت اس مکان میں ایک سفید پوش بزرگ کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے فرمایا:

''علم الدین! اٹھ اور جا کر اس بے غیرت کا کام تمام کر دے۔''

ایک روایت یہ بھی ہے کہ غازی صاحب اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ راجپال کی بدکلامی موضوع گفتگو تھی۔ تمام نہایت غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے مگر غازی علم الدین یہ سنتے ہی بالکل خاموش ہو گئے۔ رنگ اڑ گیا اور ان پر کپکپی طاری ہو گئی۔ بعض کے خیال میں غازی

موصوف کوہاٹ کی کسی مسجد میں نماز پڑھنے گئے۔ وہاں ایک بزرگ آدمی گریہ وزاری کررہا تھا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے:

''کاش! میں جوان ہوتا تو مردود کو جہنم رسید کر دیتا۔ ہائے افسوس! چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوں۔ یارسول اللہ ﷺ، میرے اس جرم ضعیفی کو معاف فرما دینا۔''

یہ سن کر غازی علم الدین نے جھٹ پوچھا:

''کون ہے وہ میرے رسول ﷺ کا گستاخ؟''

بزرگ نے بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے انہیں بتایا:

''لاہور میں ایک کھتری ذات، راجپال نامی کی شرارتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ ملعون ہمارے نبی پاک ﷺ کو برسرعام گالیاں دیتا ہے''۔

اس پر علم الدین بولے:

''میں نے اس خبیث کا نام پہلے بھی سن رکھا ہے۔ اب آپ کو جلد ہی کوئی خوش خبری مل جائے گی۔''

بظاہر یہ تمام روایات قرین قیاس ہیں اور کسی ایک کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آخر الذکر دونوں روایات ابتدائی وجوہ ہوں اور بعد ازاں خواب میں ارشاد فرمایا گیا ہو۔ بہر حال معتبر خواب کے واقعات ہی ہیں۔ رات کو خواب میں دیکھا اور صبح جب سورج نے مشرق کے افق سے ضوفشانی کے تیر چھوڑے تو آپ کے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ منگنی کو ابھی آٹھ روز ہی گزرے تھے اور ہنوز بتاشے بھی تقسیم نہ ہوئے تھے کہ آپ نے حقیقی عشاق کی فہرست میں اپنا نام جلی حروف سے لکھوا لیا۔

شہادت کی خواہش کے پس منظر میں ایک مقدس جذبہ کارفرما تھا۔ اوائل ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے۔ علم الدین کے کم عمر بھتیجے شوکت کا انتقال ہوا۔ آپ اسے دفنانے کے بعد واپس آ رہے تھے کہ راستے میں گڑھی شاہو کے مشہور عبادت گزار بزرگ مولوی تاج دین کا جنازہ ملا۔ جس میں لاتعداد لوگ شامل تھے۔ اس چھوٹی سی عمر میں جنازے کی اہمیت نے آپ کے دل میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ اس سے متاثر ہو کر وہ بار بار فرماتے تھے:

''زندگی ہو تو ایسی اور موت ہو تو ایسی کہ جس سے کچھ نصیحت و عبرت حاصل ہو سکے۔''

◉

جس عفت مآب شجر کی چھاؤں میں علم الدین کی زندگی پروان چڑھی، اسے چراغ بی بی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کے قلب و ذہن پر ایک نیک دل اور دیندار خاتون کی گہری چھاپ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب علم الدین غازی کی لافانی زندگی کا آغاز ہوا، اس دن انہوں نے والدہ محترمہ سے خلاف معمول دگنا جیب خرچ حاصل کیا اور ایک خنجر نما چھرا خریدا جس کی تشنہ نوک سے غیرت و حمیت کا ایک انوکھا باب لکھا جانا تھا۔

مکتبۂ عشق کے دستور نرالے ہیں۔ اس میں زندگی سے کہیں زیادہ موت کی اہمیت ہوتی ہے۔ مصلحتیں منشائے محبوب پر نچھاور کی جاتی ہیں۔ محبت میں فراق ہو یا وصال ہر ایک میں کمال لذت ہے۔ عشق کی شراب میں دھت رہنے والے ساجن کی بارگاہ میں باریابی کے لیے کئی بھیس بدل لیتے ہیں۔ ۵ اپریل کو علم الدین نے عشق والوں کی اس سنت کو پورا کر دکھایا اور شاہ عالمی لال مسجد کے غسل خانے میں کانوں میں سوراخ کر لیے تا کہ ہندوؤں کے روپ میں وہ راجپال تک آسانی سے پہنچ جائیں۔

فصلِ بہار کی رعنائیاں حس لطیف رکھنے والوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ علم الدین کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک عود کر آئی تھی اور صبح سے ان کے ہونٹوں پر تبسم کی مدھم لکیریں نمودار تھیں۔ فجر کی نماز بھی انہوں نے اسی جامع مسجد میں ادا کی اور بلند منصب پر تقرر کا پروانہ حاصل کیا۔ آج کے دن کا آغاز آپ نے حضرت داتا گنج بخشؒ کی آرام گاہ پر عقیدت کے پھول چڑھا کر کیا۔ اہل نظر کی کیمیا گری دلوں کی دنیا بدل دیتی ہے۔ دراصل آدمی کتابوں سے نہیں نظروں سے بنائے جاتے ہیں اور روحانی اعمال کے احکامات ہمیشہ روحانی مراکز سے جاری ہوتے ہیں۔

قبل از دوپہر انہوں نے اپنی بھاوج اقبال بی بی سے چاول کھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جب وہ دیگچی میں گھی ڈالنے لگیں تو آپ نے ازراہِ مذاق ان کے ہاتھ کو جنبش دے کر گھی کا برتن چاولوں میں انڈیل دیا۔ اس پر موصوفہ نے قدرے خفگی کا اظہار کیا تو آپ نے شگفتہ مزاجی سے فرمایا:

> ''بھابی! میں خوش ہوں، بہت ہی خوش۔ آج میری قسمت سنور جائے گی۔ مدینے والے آقا و مولا ﷺ نے مجھے اپنی حرمت و تقدیس کی خاطر چن لیا ہے۔ مجھے ایک عظیم سعادت نصیب ہونے والی ہے۔ میں

آج راجپال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔‘‘

عین دو پہر کے وقت آپ نے ایک دوست حاجی صدیق احمد کے ساتھ دین محمد المعروف دینا پان فروش کی دکان پر چاول تناول فرمائے۔ بعد ازاں ان میں تحائف تقسیم کئے۔ ٹارچ عطا فرمائی اور ایک دوست کو رومال کا تحفہ دیا اور انہیں اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا۔ سورج جب نصف النہار سے مغرب کی سمت سرکنے لگا تو غازی صاحب نے برتن اور اپنا کوٹ ایک دوست کے ہاتھ گھر بجھوائے اور خود دکان پر پہنچ کر چھرا راجپال کے پیٹ میں اتار دیا جس سے اس کی آنتیں بھی کٹ گئیں۔

آج سے چند برس قبل جب راقم الحروف کی گلزار محمد خواجہ صاحب (اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے سابق پرنسپل، خواجہ دل محمد مرحوم کے صاحبزادے ہیں) سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ بتایا کہ ٦۔ اپریل کو میاں طالع مند صاحب ہمارے ہی مکان، واقع گوالمنڈی (خواجہ دل محمد روڈ) میں کام پر تھے۔ تب میری عمر سترہ اٹھارہ سال کے قریب تھی اور ہم عمری کے سبب غازی علم الدین شہیدؒ سے جان پہچان ہوگئی تھی۔ اس روز انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ اگر ہو سکے تو از راہ مہربانی راجپال کی دکان دکھا دو۔ میں ان کے ارادہ قتل سے آگاہ نہیں تھا۔ ہم براستہ ہسپتال وہاں پہنچے اور اشارے سے جگہ بتا دی گئی میں نے کہا کہ آؤ سوڈے کی بوتل پیتے ہیں، مگر غازی صاحب نے کہا کہ نہیں، مجھے پیاس نہیں ہے۔ وہ چلے گئے لیکن میں بوتل کے لیے قطار میں لگ گیا۔ غالباً دو آنے کی ملا کرتی تھی۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ راجپال کے قتل کی خبر عام ہوگئی۔ ابھی تک مجھے یہ علم نہیں تھا کہ قاتل کون ہے۔ میں بھاگتے بھاگتے گھر پہنچا۔ ادھر میاں طالع مند مرحوم کو بھی اطلاع مل چکی تھی۔ انہوں نے جب صورت حال والد صاحب کو بتائی تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

’’میاں صاحب آپ کی تو سات نسلیں سنور گئی ہیں۔‘‘

قتل کے اس واقعہ کی رپورٹ کدارناتھ نے انارکلی تھانہ میں درج کروائی۔ علم الدین کو پولیس پہلے ہی حراست میں لے چکی تھی۔ متعلقہ حکام نے جائے واردات کا معائنہ کیا اور نعش کو اپنی تحویل میں لے کر متعلقہ کوائف کی خانہ پری کی۔ جامہ تلاشی کے دوران مردہ راجپال کی جیب سے ساڑھے تیس روپے، کچھ کاغذات اور ایک گھڑی برآمد ہوئی۔ متعدد ضلعی حکام موقع پر موجود تھے۔ پولیس نے لاش کی تصویر اتاری اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھجوا دیا۔

موت ایک مدت سے راجپال کے آگے پیچھے رہتی تھی۔ یوم مرگ صبح سے ہی اس کے معمولات میں فرق سا آ گیا تھا۔ راجپال کے آخری دن کی تفصیلات کے عنوان سے ''بندے ماترم'' کا بیان ہے:

''راجپال ہر روز صبح کے وقت لارنس گارڈن (جناح باغ) کی سیر کو اہل وعیال کے ہمراہ جایا کرتا تھا لیکن چھ اپریل کو وہ دریا کی طرف گیا۔ سیر سے واپس آ کر دوکان میں کام کیا۔ ایک بجے کھانا کھایا اور پھر دکان میں آ کر کام شروع کر دیا۔ اڑھائی بجے قاتل نے آ کر کام تمام کر دیا۔''

گرفتاری کے وقت غازی صاحب نے صاف ستھرا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان کے سر پر گلابی رنگ کا رومال تھا۔ انہوں نے دھاری والی قمیض اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ وہ پرسکون اور مطمئن نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے پر گھبراہٹ یا کسی پریشانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ البتہ ان کی آنکھوں میں بلا کا خمار تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ گرفتاری کے وقت علم الدین کا رنگ زرد تھا اور وہ اس اندیشہ سے کہ کہیں میں بھی پہلوں کی طرح ناکام نہ رہوں۔ مگر جب اپنی آنکھوں سے محنت ٹھکانے لگی دیکھی تو ہشاش بشاش ہو گئے۔

راجپال کے قتل کی خبر ایک مختصر وقت میں پورے شہر کے گلی کوچوں میں گشت کرنے لگی۔ لوگ جوق در جوق موقع واردات کی طرف امڈے چلے آ رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ہندو خاصے سہم گئے اور سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم کشیدگی پر قابو پانے کی خاطر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔

رات کو راجپال کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور علی الصبح ہندوؤں کا ایک جم غفیر ہسپتال کے اردگرد جمع ہو گیا۔ پورا مجمع ہندو دھرم کی جے اور ویدک دھرم کی جے کے نعرے لگا رہا تھا۔ عموماً لوگ برہنہ سر تھے اور بھجن گا کر جلوس شہر میں سے گزارنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن حکام کو ہندو مسلم فسادات کی بو سونگھائی دے رہی تھی۔ اس مطالبے کو مان کر وہ اپنے لیے نئے مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بالآخر لالہ ارجن دیو نے راجپال کی دھرم پتنی (بیوہ راجپال) سرسوتی دیوی کی طرف سے پرامن رہنے کی یقین دہانی کرائی اور ضلعی حکام نے نعش ورثاء کے حوالے کر دی۔

ہندوؤں کا جلوس میو ہسپتال سے نکل کر نیلا گنبد کے راستے انارکلی بازار سے ہوتا ہوا مہاشہ مقتول کی دکان پر گیا اور وہاں سے راوی روڈ پہنچا اور گورودت بھون کے آگے سے گزر کر بھومی (رام

باغ بیرون ٹیکسالی گیٹ) میں داخل ہوا۔ نعش کو سپرد آتش کرنے کی رسم مہاتما ہنس راج جی نے سرانجام دی۔ اِس کے بعد راکھ راوی کی تندو تیز موجوں کے حوالے کر دی گئی۔

پولیس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے تفتیش کا دائرہ وسیع کر رکھا تھا۔ غازی صاحب کے گھر کی تلاشی کے دوران ہر ادنیٰ اور اعلیٰ چیز توڑ پھوڑ دی گئی۔ پولیس میں اکثریت سکھ لوگوں کی تھی۔ انہوں نے ہر شے پامال کر دی۔ غازی علم الدین کے باپ کو ناجائز طور پر مشقتوں سے دو چار ہونا پڑا اور ان کے بڑے بھائی کو دہلی دروازے کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا۔ حالانکہ وہ اس معاملے سے بالکل لاعلم تھے۔

پولیس نے غازی علم الدین کو دو دن پولیس لائن کی حوالات میں بند رکھا اور ضروری پوچھ گچھ کے لیے آٹھ دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔ پولیس نے فتو نامی ایک اور مسلمان کو بھی تفتیش میں شامل رکھا۔ یہ شخص راجپال کا کرایہ دار تھا اور مقتول کے لواحقین اس کے بارے میں شک رکھتے تھے۔ چونکہ علم الدین اپنے فعل کا متواتر اقرار کیے جا رہے تھے، اس لیے مقدمے کی تفتیش اور چالان میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی اور چھرا معائنے کے لیے کلکتے بھیج دیا گیا۔

فتو نامی ملزم کا پولیس نے چودہ دن کا ریمانڈ حاصل کیا تھا، اس دوران مفروضہ ملزم پولیس کی حراست میں رہا۔ شک کی بنا پر دو اور آدمی بھی زیر تفتیش رکھے گئے، مگر ان سے کوئی بھی خاص معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ ریمانڈ کی مدت کے بعد، مسٹر فرخ حسین بیرسٹر کی دلچسپی سے فتو کو رہائی مل گئی اور دیگر دو اشخاص کو پولیس نے از خود چھوڑ دیا۔ راجپال کے قتل کے بعد ہندو جرائد کا رویہ انتہائی دلخراش ہو گیا تھا۔ غلط بیانیوں کا ایک انبار لگا دیا گیا۔ درجنوں دل آزار اداریے طبع ہوئے، جن میں ''راجپال نمبر'' اور غلط مضامین کی ایک خاص تعداد شامل تھی۔ کوئی کہتا ''ایک نہیں ہزاروں راجپال پیدا ہوں گے'' کہ ایک نہیں، ایسی ہزاروں کتابیں لکھی جائیں گی۔ کسی نے کہا، راجپال شہید ہے۔ اس معاملے میں 'ملاپ'، 'پرتاپ' اور 'بندے ماترم' پیش پیش تھے۔ ۱۳۔ اپریل کے ''پرتاپ'' میں ایک نظم کا عنوان ''امان اللہ اور راجپال'' دیا گیا اور ایک بے حقیقت و ناپاک ذرۂ خاک کو آفتاب سے تشبیہ دی گئی۔ ''پرتاپ'' کا مہاشہ کرشن بھی جگر گدازی، سینہ کاوی اور دلخراشی سے نڈھال آنسو بہائے جا رہا تھا۔ اس نے ۱۸ اپریل کو ''آل انڈیا راجپال ڈے'' منانے پر بڑا زور دیا اور لکھا:

''راجپال ہم سب کا تھا۔ ہم سب راجپال کے ہیں۔ اس لیے ہر

ہندو ماتر شہیدوں کی قدر کا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ اس دن اپنی اپنی شردھا کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور بھینٹ کریں۔ پیارے آریہ بھائیو! اپنے عمل سے ثابت کرو کہ راجپال تمہارے لیے مرا نہیں، زندہ ہے۔ آؤ! ہم دنیا کو دکھا دیں کہ ہمارے شہیدوں کے بلیدان سے ان کا کام بند نہیں ہوا کرتا۔ کیوں نہ اب مہاشہ کی وجہ شہرت منصۂ عام پر آئے!''

ہندو مختلف ہتھکنڈوں سے اپنی تنگ نظری اور فطری تعصب کا جگہ جگہ اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ راجپال خود بھی قاتل تھا۔ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کا قاتل۔ اس کی شائع کردہ کتاب کا ایک ایک حرف مثل نشتر تھا جن سے عقائد و جذبات کو قتل کیا گیا۔ ''راجپال کا اصلی قاتل'' کے عنوان سے ''سیاست'' اخبار نے کیا ہی حقیقت پسندانہ اداریہ قلمبند کیا تھا:

''راجپال کا قاتل، علم الدین ہی ہے لیکن اگر واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو برادرانِ وطن کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ راجپال کا اصلی قاتل اس کتاب کا مصنف ہے جس کی اشاعت سے کروڑوں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے حکومت سے درخواست کی کہ اس کتاب کے لکھنے اور شائع کرنے والے پر مقدمہ دائر کیا جائے۔ چنانچہ پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے راجپال پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ کا جو نتیجہ نکلا وہ مسلمانوں کے نزدیک کوئی زیادہ قابلِ اطمینان نہیں تھا۔

اگر کتاب مذکور کا مصنف اخلاقی جرأت سے کام لے کر اپنے جرم کو قبول کر لیتا اور اس کی پاداش میں اسے قید اور جرمانہ کی سزا ہو جاتی تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ راجپال کا قتل کبھی ظہور میں نہ آتا۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی جان بڑی قیمتی ہوتی ہے اور اس کے ضائع کرنے والے کو قانون کی انتہائی سزا برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جو شخص زبان یا قلم کی نوک سے اپنے لاکھوں ہم جنسوں کے جذبات کو مجروح یا قتل کرتا ہے

وہ بھی قاتل ہے۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ سوسائٹی نے ایسے قاتلوں کے لیے جو سزا تجویز کر رکھی ہے، وہ اس جرم کے سدباب کے لیے ناکافی ثابت ہوئی ہے۔ اگر سوسائٹی جذبات کے قتل کو ایک سنگین جرم قرار دے اور لوگ اپنی تحریر اور تقریر میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ اس سے دوسروں کی دلآزاری نہ ہو تو دنیا میں بہت سے فتنوں اور ہنگاموں کا خود بخود تدارک ہو جائے گا۔“

راجپال کا قاتل اس کتاب کا مصنف تھا اور راجپال خود اپنا قاتل آپ بھی ہے۔ وہ بار بار توہینِ رسول کا اعادہ کر کے کچو کے لگاتا رہا، جس سے اہل اسلام کے سینوں میں ایک جوش، ہیجان اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ مہاتما گاندھی کے علاوہ کوئی مہا سبھائی، آریہ سماجی، کوئی سنگھٹنی حتیٰ کہ کوئی کانگریسی ہندو بھی ایسا نہیں تھا جس نے راجپال کے اس فعل پر نفرت کا اظہار کیا ہو۔ وقت گزرتا گیا، زمانے نے کئی رنگ بدلے اور بالآخر علم الدین نے اس ملعون کا کام تمام کر دیا۔

اب شیر دل غازی کے متعلق ہندو اخبارات کے جھوٹے بیان شائع ہونا شروع ہو گئے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ اور کہا۔ ایک نے لکھا قاتل کے معشوق نے یہ شرط باندھی تھی۔ دوسرے نے طبع کیا، سنا جاتا ہے وہ شراب پیئے ہوئے تھے۔

مندرج الزامات حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ معشوق بھلا ایسی شرائط کہاں لگاتے ہیں، اور جن کی زندگیاں دنیوی محبوباؤں سے منسوب ہوتی ہیں وہ اپنے رقیبوں کو مارا کرتے ہیں، رسول خدا کے دشمن کو نہیں۔ دوسرا الزام کہ وہ بادہ آشام تھے۔ اس سے ہم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ شاتم رسول کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ان کا لہجہ اس کا اظہار کر رہا تھا اور آنکھوں کی مستی بھی کہہ رہی تھی کہ وہ یقیناً شراب پیئے ہوئے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے، جب وہ اپنے فرض سے سرخرو ہو کر بازار میں نکلے تو یوں جھوم رہے تھے، جیسے خم پہ خم چڑھا رکھے ہوں۔ گمان ہوتا تھا۔ وہ قتل گاہ سے نہیں، ابھی ابھی کسی میخانے سے آئے ہیں۔

اب ذرا حدیث بادہ وصہبا کو چھیڑنا چاہیے۔ ہوشربا مئے انبہ کے جوس سے بنتی ہے نہ وہ انگور کا رس ہوتی ہے بلکہ اس کا خمیر کربلا کی بھٹی میں کڑھتا ہے اور میخانہ یثرب سے درآمد ہوتی ہے۔ صراحی، نجف اشرف سے لی جاتی ہے۔ پیمانہ بغداد سے خریدا جاتا ہے۔ ساقیِ ازلی پیاسوں کو پلانے کے لیے ہمہ وقت مائل بہ کرم رہتے ہیں۔ اجمیر اور کلیر میں بھی یہی کاروبار ہوتا ہے۔ یہ

شراب پیالوں میں نہیں نظروں سے پلائی جاتی ہے۔ البتہ بادہ کش کو کیف و سرور بقدر ظرف عطا ہوتا ہے۔

اس میدان میں ساقی و پیمانہ کی باتیں بڑی روح افزا ہیں، لیکن ہندو تو ان باتوں سے دل کا غبار نکال رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مقدمے کو تقویت پہنچے اور مسلمان اس جانباز سے بدظن ہو جائیں۔ اس لئے میاں محمد الدین برادر علم الدین غازی نے ۱۲۔ اپریل کو روزنامہ ''انقلاب'' میں اپنا ایک مضمون شائع کروایا جس میں آپ نے لکھا:۔

> ''پرتاپ کی ۹ اپریل کی اشاعت میں ''علم الدین کے مزید حالات'' کے زیرِ عنوان جو خبر شائع ہوئی، اس میں لکھا گیا ہے کہ وہ قتل کی چار دن سے تیاریاں کر رہا تھا۔ کام پر نہیں جاتا تھا۔ جس چھرے سے مہاشہ راجپال کو قتل کیا وہ گھر میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے کئی دن قتل کی کوشش کی۔ ۴۔ اپریل کو وہ گھر سے نکلنے لگا تو ماں سے کہا کہ چاول پکا دو۔ سنا جاتا ہے کہ وہ شراب پیے ہوئے تھے۔ اس کے دو بھائی ہیں۔ جب گھر سے نکلا تو اس نے اپنا کوٹ اتار کر ایک شخص کے ہاتھ گھر بھجوا دیا۔ نیز والدہ سے کہلا بھیجا کہ سمجھ لینا میرا لڑکا پیدا ہی نہیں ہوا۔
>
> یہ حالات غلط ملط شائع ہوئے ہیں اور اکثر ہندو اخبارات کے من گھڑت افسانے ہیں۔ علم الدین نے آج تک شراب پی ہے نہ والدہ نے اس کو چاول پکا کر دیئے۔ علم الدین نے ایسی فرمائش کی نہ ہی اس کے دو بھائی ہیں بلکہ اس کا صرف ایک بھائی ہے (یعنی راقم الحروف) ۱۱۔ اپریل کے ''پرتاپ'' میں لکھا ہوا ہے کہ دس اپریل کو جب ملزم لاری میں بٹھا کر لے جایا گیا تو اس نے باپ سے کہا میرے لیے دعا کرنا، اگرچہ چلا بھی گیا تو کوئی بات نہیں۔ باپ نے جواب دیا کہ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ یہ بھی از سرتاپا غلط ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ علم الدین کا باپ آج تک ان سے مل بھی نہیں سکا۔ پھر گفتگو کے کیا معنی؟ ہندو اخبارات ایک پراپیگنڈے کے تحت اس قسم کے قصے دل سے گھڑ گھڑ کر شائع کر رہے ہیں''

مقدمۂ قتل کی تفصیلات

مہاشہ راجپال کے قتل کا مقدمہ ۱۰۔اپریل کو سنٹرل جیل میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ای۔ایس۔لوئیس کے سامنے پیش ہوا۔علم الدین غازی کو ہتھکڑیاں پہنا کر ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا۔ اس روز آپ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھے۔چہرے سے کسی قسم کی اداسی نہ ٹپکتی تھی۔شروع کارروائی میں اس مرد مجاہد کی طرف سے کوئی وکیل پیش نہیں ہوا۔سرکار کی طرف سے رائے صاحب ایشر داس، پیروی مقدمہ کر رہے تھے۔عدالت میں چند پریس رپورٹر موجود تھے، جو لمحہ بہ لمحہ کی کارروائی قلمبند کرنے میں مصروف تھے۔کمرہ سماعت سے باہر کافی تعداد میں سریانوالہ بازار کے مسلمان موجود تھے۔

استغاثے کی جانب سے پہلا گواہ راجپال کا ملازم کدارناتھ پیش ہوا جس نے بیان میں کہا کہ جب مہاشہ جی پر حملہ ہوا تو میں دکان میں موجود تھا۔ملزم نے جلدی سے چھرا گھونپ دیا اور پھر بڑی سرعت کے ساتھ باہر نکل گیا۔اس وقت میں کتابوں کو ترتیب دے رہا تھا۔اسے روکنے کے لیے میرے ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔میں نے دکان کی کتابیں اٹھا کر ملزم پر دے ماریں، جو باہر بازار میں جا گریں۔پھر میں نے چیخ پکار شروع کر دی جس پر اردگرد کے لوگ اس واقعہ پر متوجہ ہوئے۔ دوسرا چشم دید گواہ بھگت رام تھا۔اس نے عدالت میں اپنا جو بیان لکھوایا اس کا مافی الضمیر ، واقعات کی ترتیب اور الفاظ کا اتار چڑھاؤ بھی قریب قریب وہی تھا جو اس سے پہلے کدارناتھ نے بتایا۔

ودیارتن گواہ نے بیان کیا کہ ''پکڑو، پکڑو'' کی آواز سن کر میں ہوشیار ہوا۔ملزم میرے کوارٹر کی طرف آیا۔اس کے پیچھے لالہ ہرمانند اور لالہ نانک چند کپور اور کئی دوسرے اشخاص دوڑے چلے آرہے تھے۔جب میں نے ملزم کو اپنی گرفت میں لیا تو اس نے کہا:

''میں نے اپنے رسول ﷺ کا بدلہ لیا ہے''

میں نے دیکھا کہ مہاشہ راجپال کے کپڑے خون میں تر بتر تھے۔چھرے کا منہ دیوار کی طرف تھا اور وہ خون سے لت پت تھا۔چھرے کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی اور دستہ کالے رنگ کا تھا۔نیز وہ بھی خون میں لت پت تھا۔

استغاثے کے چوتھے گواہ لالہ نانک چند کپور نے اپنا تفصیلی بیان قلمبند کراتے ہوئے کہا کہ ملزم دوڑتا ہوا لالہ ستیارام لکڑی والے کے ٹال میں داخل ہوا۔وہاں لالہ ودیارتن نے اس کو پکڑ لیا اور ہم بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ملزم نے وہاں بلند آواز سے کہا:

''یہ میرا دشمن نہ تھا بلکہ میرے رسول ﷺ کا دشمن تھا۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔''

اس کے بعد ہم نے چھری دیکھی جو خون میں لت پت تھی۔ اتنے میں راجپال ٹھنڈا ہو گیا اور ہسپتال پہنچوایا گیا۔

اس پر عدالت نے غازی علم الدین سے پوچھا:

''تم گواہ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

آپ نے مسکراتے ہوئے نفی میں جواب دیا۔

ودیارتن کے بعد لالہ ہرمانند سوداگر کاغذ نے مذکورہ بالا بیان کی تائید کی۔ اس کے تمام بیان کا ملخص بھی یہی تھا جو اوپر رقم کیا جا چکا ہے۔

اس کارروائی کے بعد پولیس کے ملازموں کی شہادتیں ہوئیں۔ رحمت خاں کانسٹیبل تھانہ کچہری نے کہا:

''گشت کرتے ہوئے مجھے ایک لڑکے نے بتایا کہ راجپال مارا گیا ہے۔ برکت علی کانسٹیبل کے ہمراہ میں موقع پر گیا اور میں ہی ملزم کے لیے تھانہ سے ہتھکڑی لے کر آیا تھا''۔

پھر برکت علی، شیر محمد اور خوشحال نامی سپاہیوں نے اپنے رسمی بیان سے عدالت کو آگاہ کیا۔ تاراچند کانسٹیبل نے بیان دیا کہ میں شتیلا مندر سے آ رہا تھا۔ شور و غوغا سن کر موقع واردات پر پہنچ گیا۔ ہنس راج حوالدار کے بعد چوہدری جلال الدین وڑائچ سب انسپکٹر (چک دادن/ وزیر آباد کے رہنے والے تھے) نے بیان کیا کہ میں گھر پر تھا مجھے ٹیلی فون پر بلایا گیا۔ چوہدری رحمت علی سب انسپکٹر نے کہا کہ میں نے تفتیش کی۔ ملزم نے دورانِ تفتیش بتایا تھا کہ میں نے چھری ایک کباڑیے سے خریدی ہے۔ (چھریاں دکھانے پر کہا) یہ دو چھریاں آتمارام کباڑی کی دکان سے ہیں۔ آتمارام کباڑی ولد گوپی مل دکاندار کمیٹی باغ (ذات کمبوہ عمر ۷۸ سال) نے کہا یہ چھری مجھ سے خریدی گئی ہے۔ قتل کے روز ایک شخص ساڑھے نو بجے کے قریب میری دکان پر آیا۔ یہ ایک دن پہلے بھی آیا اور پوچھا:

کیا آپ کے پاس چھریاں ہیں؟

میں نے کہا: ہاں ہیں۔ اس کے کہنے پر میں نے پانچ چھ دیسی چھریاں، جیسی عدالت میں

پیش ہیں، ملزم کو دکھائیں۔ میں نے سوا روپیہ مانگا آخر کار ایک روپے پر سودا طے ہو گیا۔ وہ چھری رکھ گیا اور کہا میں روپیہ لے کر آتا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا اور روپیہ دے کر چھری لے گیا۔ یہ دو چھریاں بطور نمونہ ہیں۔ بعد از قتل پولیس نے مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ میں نے تھانے میں اس شخص کو پریڈ کے دوران دس بارہ اشخاص میں سے شناخت بھی کیا تھا۔

لالہ جواہر لال انسپکٹر سی۔ آئی۔ ڈی لاہور نے بیان کیا کہ میں نے اس مقدمہ کی تفتیش کی ہے۔ ملزم کے ہاتھ پر دو زخم بھی دیکھے تھے اور اس کا خون آلود کرتہ بھی اتروایا۔

سماعت کے دوران ایک نوجوان بیرسٹر فرخ حسین کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے، جن کا دفتر موچی دروازہ کے باہر تھا۔ آپ نے مجسٹریٹ سے مخاطب ہو کر کہا:

''ملزم کی طرف سے میں پیروی کروں گا۔''

عدالت سے اجازت لے کر انہوں نے چند منٹ علم الدین غازی سے بات چیت کی اور کہا کہ یہ ایک نہایت اہم مقدمہ ہے۔ یہ ایک ایسا مقدمہ ہے جس میں ملزم کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ملزم کی خواہش ہے کہ مقدمہ ملتوی کر دیا جائے تا کہ اسے صفائی پیش کرنے کا پورا موقع ملے۔ عدالت نے کہا کہ سماعت مقدمہ ملتوی نہیں کی جا سکتی۔ مسٹر فرخ حسین نے کہا کہ مقدمہ ملتوی کر دیا جائے۔ عدالت اس کے سوال پر کہ آپ کس بنا پر التوائے مقدمہ چاہتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہمیں فائل دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ کافی جرح کے بعد آخر زیر دفعہ ۵۲۶ ضابطہ فوجداری ایک ہفتے کی مہلت مل گئی۔

۱۶۔ اپریل کو مسٹر فرخ حسین کی درخواست انتقال مقدمہ مسترد ہونے کے بعد بقیہ سماعت ۱۹ اپریل کو ہوئی۔ اس دن غازی علم الدین دو سپاہیوں کی حراست میں ہتھکڑی پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوشی سے جھوم رہے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار بھی قریب ہی بیٹھتے تھے۔ استغاثے کی طرف سے مہتہ ایشر داس اور غازی مرد کی طرف سے خواجہ فیروز الدین پیروکار تھے۔ خواجہ صاحب نے عدالت سے کہا: ''مقدمہ کا چارج میں نے لے لیا ہے۔ پہلے روز جو صاحب پیش ہوئے تھے، وہ التوائے مقدمہ کے خواہش مند تھے۔ میرا موکل اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔''

اس باہم گفتگو کے بعد دیگر رسمی گواہوں کی شہادتیں قلمبند ہوئیں۔ نقشہ نویس سید محمد عثمان ساکن مزنگ نے بیان کیا کہ جائے واردات کا نقشہ میرا بنایا ہوا ہے جو کہ موقع کے مطابق درست ہے۔

اس نے نقشے میں ذیل کے مقامات کی نشاندہی کی۔

۱۔ وہ جگہ جہاں مقتول سویا ہوا تھا۔
۲۔ وہ راستہ جہاں سے قاتل بھاگ کر ودیارتن کے ٹال پر پہنچا۔
۳۔ ودیارتن کا ٹال اور وہ نلکا جہاں قاتل ہاتھ دھو رہا تھا۔

ڈاکٹر ورسی متعین میو ہسپتال نے بیان کیا کہ مہاشہ راجپال کی نعش کا پوسٹ مارٹم میں نے کیا۔ نعش کی شناخت ڈاکٹر گدھاری لال نے کی۔ جو مقتول کو جانتا تھا۔ اس کی انگلیوں، سر، چھاتی اور پٹھوں پر زخم تھے اور کلیجہ بھی مجروح تھا۔ کلیجہ کے قریب پسلی ٹوٹی ہوئی تھی۔ چھاتی کے بائیں طرف کا زخم ½۱ لمبا اور ¼۱ چوڑا تھا۔ اس کی گہرائی ½۷ تھی۔ چوتھی پسلی کٹ گئی تھی اور بائیں طرف پٹھے پر سخت زخم تھا۔ مقتول کو کل ایک درجن ضربات آئیں۔ میرے خیال میں موت اس ضرب کی وجہ سے ہوئی جو کلیجہ پر لگی۔ یہ کسی تیز نوک ہتھیار سے لگ سکتی ہے۔ اس زخم کی لمبائی ½۴ اور چوڑائی ¾۳ تھی۔ قتل کے دوسرے روز ایک چھرا میرے پاس لایا گیا۔ اس سے بھی ایسی ضربات لگ سکتی ہیں۔ اس کارروائی کے آخر پر غازی علم الدین نے کمرہ عدالت میں ہی دھلے ہوئے کپڑے زیب تن کئے۔

۲۴۔ اپریل کو اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت ہوئی۔ کمرہ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ غازی علم الدین کی طرف سے خواجہ فیروز الدین اور خواجہ نیاز احمد صاحبان پیروکار تھے۔ اس روز تارا چند اور کدارناتھ سے چھری شناخت کرائی گئی اور کورٹ ڈی۔ ایس۔ پی نے رپورٹیں پیش کیں۔ اس کے بعد عدالت نے غازی علم الدین پر زیر دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند لگا دی اور مقدمہ سیشن کے سپرد کرتے ہوئے ہدایت کی کہ کل صفائی کے گواہوں کی فہرست عدالت میں داخل کرا دی جائے۔

۲۵۔ اپریل کو اس سلسلے میں میاں علم الدین کو مسٹر لوئیس ایڈیشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا اور صفائی کے گواہوں کی فہرست داخل کرائی گئی جو درج ذیل ہیں:

معراج دین ولد میاں امام دین ٹھیکیدار لاہور۔ سید ظفر علی شاہ ولد اصغر علی شاہ لاہور۔ معراج دین ولد چراغ دین ٹھیکیدار لاہور۔ میاں طالع مند ولد عبدالرحیم سریانوالہ بازار لاہور۔ مستری رحیم بخش خرادی سبزی منڈی لاہور۔ چراغ دین ٹھیکیدار بیرون موچی دروازہ لاہور۔ چوہدری محمد گھسیٹا سابق میونسپل کمشنر لاہور۔ محمد دین ولد پیر بخش، چنگڑ محلّہ لاہور۔ نبی بخش سکنہ برج اٹاری ضلع لاہور۔ پیراں دتہ قوم جٹ لاہور۔ مسٹر ہیری پروپرائیٹر نائیڈ و ہوٹل لاہور۔ احمد دین ٹیلر ماسٹر ہسپتال روڈ لاہور۔ سراج دین ولد مولوی احمد دین ہسپتال روڈ لاہور۔ کریم بخش درزی ہسپتال روڈ لاہور۔ میاں عبدالرشید مالک لائن پریس لاہور۔ شیخ ولایت علی، آرمی پریس ہسپتال روڈ لاہور۔

اللہ بخش ولد مہتاب پہلوان بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ شیخ غلام غوث سوداگر چوب (لکڑی) بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ ملک محمد شریف سوداگر چوب (لکڑی)، بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ میاں میراں بخش سوداگر چوب فروش بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔



۱۵۔ مئی ۱۹۲۹ء کو غازی علم الدین کا مرافعہ مسٹر ٹیپ سیشن جج کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس روز کی کارروائی میں چار اسیسروں کا چناؤ کیا گیا، جن میں دو مسلمان، ایک ہندو اور چوتھا ایک سکھ تھا۔ ۱۶۔ مئی کو دوبارہ سماعت ہوئی۔ استغاثے کی طرف سے لالہ راج کشن اور غازی علم الدین کی طرف سے خواجہ فیروز الدین، مسٹر سلیم اور خواجہ نیاز احمد پیروکار تھے۔ عدالت کے باہر لاتعداد مسلمان جمع تھے اور کمرۂ عدالت معززین شہر سے بھرا پڑا تھا۔ صفائی کے جملہ گواہ پیش کرنے کی درخواست پہلے ہی مسترد ہو چکی تھی۔ مسٹر فیروز الدین ایڈووکیٹ نے ایک تحریری درخواست ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گزاری تھی کہ گواہوں کی فہرست کے ساتھ ڈاکٹر کا نام بھی سیشن کورٹ بھیجا جائے۔ اس لیے تمام مطلوبہ گواہ عدالت میں حاضر تھے۔ مسٹر ٹیپ، سیشن جج نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے گواہانِ استغاثہ کے بیانات لیے۔ اس روز غازی موصوف نے دوپہر کا کھانا اپنے رشتہ داروں کے ساتھ کھایا۔ شیخ حسن دین شروع سے آخر تک غازی علم الدین کے پاس کرسی پر بیٹھے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کے مابین جذبۂ عشق و محبت کی کوئی باتیں بھی ہوتی تھیں۔

بطل حریت کو ایک مدت سے قائل کیا جا رہا تھا کہ وہ اقبال قتل نہ کریں مگر غازی موصوف انکار کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ سیشن کورٹ میں غازی علم الدین کے عشق کا امتحان تھا۔ انکار کی صورت میں بچ جانے کا امکان، لیکن اقرار سے موت یقینی تھی، ایک پلڑے میں عشق کی سوغات اور دوسری طرف پوری دنیا کھڑی تھی۔ اس مرحلے پر آپ عجیب کشمکش کا شکار ہو گئے۔ انہیں ہر لحاظ سے مجبور کیا گیا کہ اپنے تئیں ایک بار ہی بے قصور ظاہر کرو۔ کتنا صبر آزما تھا اس دوراہے پر کوئی فیصلہ۔ اکلوتے بھائی کی پریشان نظروں کا سامنا تھا۔ بہن کی معصوم آرزوئیں دم توڑتی ہوئیں نظر آئیں۔ ممتا دامن پھیلائے بیٹھی تھی۔ شفقت پدری بھی بصورت مجسمۂ سوال کھڑی دیکھی۔ احباب نے رشتہ دوستی کا واسطہ دیا۔ وکلاء نے قانونی نکات پیش کیے۔ ان کا ایک ہی سوال اور سب کا یہی تقاضا تھا کہ اپنے لیے نہ سہی ہماری خاطر ہی اقبال قتل سے باز آجاؤ۔ پھر وہ لمحہ بھی

آ گیا جب سب پرُ اُمید نگاہیں آپ کی طرف اٹھ گئیں۔ جج نے پوچھا:

''کیا آپ نے قتل کا جرم کیا ہے؟''

آپ نے سوچا، سمجھا، سر اوپر اٹھایا اور فرمایا:

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔''

۲۲۔ مئی کو سیشن کورٹ میں سماعت کا آخری دن تھا۔ اسیسروں نے اپنا اپنا فیصلہ عدالت کے گوش گزار کیا۔ ہندو اور ایک سکھ اسیسر کی رائے کے مطابق علم الدین مجرم تھا، جب کہ مسلم اسیسروں کی رائے اس کے برعکس تھی۔ اس روز مسٹر ٹیپ کے روبرو وکلاء کے مابین قانونی بحث ہوئی۔ مسٹر سلیم ایڈووکیٹ نے غازی کے حق میں مدلل جرح کی اور معقول قانونی نکات پیش کیے۔ آپ نے کہا:

''استغاثے کے مطابق، قاتل جب دکان میں آیا تو دو آدمی موجود تھے (جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں)۔ ان کے سامنے اس نے حملہ کیا۔ مقتول نے حملہ روکا جس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں زخم بھی آئے۔ آخر کئی ضربوں کے بعد وہ اسے مار گرانے میں کامیاب ہوا اور کام کر کے بھاگ نکلا مگر تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اثنائے قتل میں کیوں نہ بولے اور کیوں نہ انہوں نے شور و غوغا بلند کیا تا کہ قاتل موقع پر پکڑا جاتا؟ پھر جو چھری پکڑی گئی ہے، اس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس سے آدمی قتل نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب قاتل آیا تو راجپال دکان میں بیٹھا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اس کا کام تمام کر کے ہوا ہو گیا۔ ملازموں نے آ کر دیکھا تو راجپال کو مردہ پایا۔ وہ چلاتے ہوئے دوڑے اور ایک مسلمان کو پکڑ کر قاتل بنا دیا۔ حالانکہ اگر یہ قاتل ہوتا تو بھاگ کر انارکلی کے پُر رونق بازار میں شامل انبوہ کثیر ہو کر بچ نکلتا نہ کہ غیر آباد طرف جا کر پکڑا جاتا۔

مزید برآں جس دکاندار سے چھری خریدنا بیان کیا جاتا ہے وہ کمزور نظر آدمی ہے۔ اسے کس طرح یاد رہ سکتا ہے کہ فلاں شکل و صورت کا ایک

آدمی آیا تھا، جو چھری خرید کر لے گیا؟ الزام بالکل ثابت نہیں ہوتا، لہٰذا
فاضل جج کو چاہیے کہ ملزم کو بری کر دیں۔"

کہتے ہیں جب مسٹر سلیم صاحب اپنے دلائل سے فارغ ہوئے تو اس کے تھوڑی دیر بعد مگر فیصلہ سنائے جانے سے کچھ وقت قبل حضرت قبلہ غازی صاحب کھڑے ہو گئے اور بآواز بلند کہا:

"جناب! گستاخ راجپال کو میں نے ہی قتل کیا ہے۔ میں پہلا بیان
دینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اب میں حقیقت حال واضح کر دینا چاہتا ہوں۔
کوئی بھی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے یہ پہلو ذہن نشین رکھیے!"

درمیانی وقفہ کے بعد عدالت نے غازی علم الدین کی سزائے موت کا حکم سنا دیا اور مجموعہ ضابطہ فوجداری ۳۷۴ کی رو سے اپنے فیصلے کی توثیق کرانے کے لیے مسل ہائی کورٹ میں بھیج دی۔ جب یہ فیصلہ سنایا گیا تو آپ نہایت پرسکون تھے اور زیر لب ایک نعت گنگنا رہے تھے۔ چہرے پر رونق و متانت برستی تھی۔ البتہ باہر عدالت میں جمع شدہ مسلمانوں میں کافی جوش و خروش تھا۔ انہوں نے جب عدالت کا فیصلہ سنا تو دیر تک اللہ اکبر اور غازی علم الدین زندہ باد کے نعرے لگاتے رہے۔



اب نوجوان عاشقِ رسول کا مقدمہ سب مسلمانوں کا مقدمہ بن گیا تھا۔ اس عدالتی فیصلہ سے برصغیر کے مسلمانوں میں کہرام مچ گیا۔ اس موقع پر حاجی نظام دین، فتح محمد کمبوہ شیر فروش اور ملک لال دین قیصر نے محلہ وار "علم الدین ڈیفنس کمیٹی" تشکیل دی، جو چند ہی روز میں اہل شہر کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ چنانچہ متعدد جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ "علم الدین ڈیفنس کمیٹی" کی اپیل پر عوام نے دل کھول کر چندہ جمع کرایا۔

اپیل کی غرض سے فیصلے کی نقول حاصل کر کے نامی وکلاء نے اس مسل کا بغور مطالعہ کیا۔ اس میں میاں تصدق حسین خالد، مسٹر فرخ حسین بارایٹ لاء، مسٹر محمد سلیم ایڈووکیٹ، میاں فیروز الدین اور خواجہ نیاز احمد کے نام شامل ہیں۔ ان ماہر قانون وکلاء نے شبانہ روز مطالعہ کے بعد آخر کار ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ عدالت عالیہ میں غازی علم الدین کا مرافعہ ۳۰۔ مئی کو منظور ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی روز مسٹر راج کشن بیرسٹر سپیشل پراسیکیوٹر کو لدھیانہ سے ۲۵۔ مئی کا لکھا ہوا۔ ایک سرخ مکتوب موصول ہوا۔ خط کا مزاج دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس کی تحریر یوں تھی:

''جناب والا! چونکہ آپ نے راجپال ایسے ذلیل کی پیروی کر کے ایک بے گناہ شخص کو پھنسایا ہے، لہٰذا آپ کو بذریعہ عریضہ ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر آپ نے آئندہ پیشی ہائی کورٹ میں اپنا رویہ نہ بدلا تو آپ کو اور مردود جہنم رسید کے ملازم کو بے رحمی سے قتل کر کے نرگ باشن کر دیا جائے گا۔ اس ضمن میں سپاہی نمبرے کو جس نے راجپال کو کیفر کردار تک پہنچا کر اپنی بہادری کا جیتا جاگتا ثبوت دیا ہے، اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ مقررہ وقت کے اندر تادیبی کارروائی کر کے دوبارہ اپنی بے باکی کا ثبوت دے۔''

خط کے نفس مضمون سے جو کچھ واضح ہوتا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ نامہ مجاہد ملت، بطل حریت، پروانہ شمع رسالت کے کسی پروانے نے تسکین دل کے لیے لکھ پھینکا ہوگا، جس کا مقصد راقم کے خیال میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عدالت عالیہ میں شاید اس دھمکی آمیز خط کی بنا پر استغاثے کی طرف سے کوئی وکیل پیش نہ ہو۔ مزید یہ کہ آریہ سماجیوں پر واضح ہو جائے کہ گستاخانِ رسالت کا خاتمہ کرنے کے لیے ایک فرد نہیں پوری تنظیم کام کر رہی ہے۔

ہائی کورٹ میں مرافعہ منظور ہونے کے بعد غازی علم الدین کے رشتہ داروں کی بڑی خواہش تھی کہ اس مقدمے میں کسی ماہر قانون دان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس زمانے میں سر تیج بہادر سپرو ایک شہرت یافتہ وکیل تھے۔ بعض اہل الرائے نے اس کا نام بھی تجویز کیا۔ ڈاکٹر اقبال کا مکان ان دنوں علمی وادبی اور دینی وسیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا، جہاں قوم کی قسمت کے فیصلے کئے جاتے۔ اقبال خود علم الدین غازی کے بڑے قدردان تھے اور اس مقدمے سے ان کو ایک خاص لگاؤ تھا۔ وہاں رات کو اکثر سر محمد شفیع، میاں محمد دین، سر مراتب علی، ملک لال دین قیصر، میاں عبدالعزیز وغیرہم اکٹھے ہوا کرتے تھے اور دیر تک اس موضوع پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا۔

علامہ اقبال کی خدمت میں جب یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے کہا: بلاشبہ تیج بہادر سپرو ایک شہرہ آفاق وکیل ہیں اور عربی کے بہت بڑے سکالر بھی۔ لیکن میرا خیال ہے اس کے لیے مسٹر جناح بہتر ثابت ہوں گے کیونکہ اس مقدمے میں حق و باطل کا ٹکراؤ ہے اور سر تیج بہادر اس معاملے میں انصاف نہ کر سکیں گے۔ گویا مسٹر جناح کی لاہور میں آمد کے محرک و موید ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ہیں: محمد علی جناح ان دنوں بمبئی میں پریکٹس کرتے تھے۔ نیلگوں سائبان کے نیچے ان کی قانون

ذانی کا بڑا شہرہ تھا۔ مسٹر جناح اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کے ممبر تھے۔ وہ افق سیاست پر آفتاب شہرت بن کر طلوع ہوئے تھے اور نہ ہی وہ قائداعظم بنے تھے۔ اس وقت تک مسلم لیگ بھی اُن کی اعلیٰ اور بے لوث قیادت سے محروم تھی۔

چنانچہ ڈاکٹر اقبال کے مشورے سے ''علم الدین ڈیفینس کمیٹی'' کے چوہدری فتح محمد کمبوہ اور دیگر مسلم معززین نے بمبئی میں ایم۔اے جناح سے رابطہ قائم کیا۔ اس سلسلے میں چند روز خط و کتابت ہوتی رہی اور پھر کمبوہ صاحب حاجی نظام الدین کے ہمراہ ان سے بمبئی جا کر دفتر میں بھی ملے۔ بعدازاں جناح صاحب کے استفسار پر مسٹر فرخ حسین بیرسٹر نے آپ کو مقدمے کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایم۔اے جناح نے ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد ۲۷۔ جون کو بنام عدالت عالیہ ایک برقی پیغام بھیجا کہ اپیل کنندہ کی پیروی کے لیے مجھے اجازت دی جائے۔ اس وقت کے قانون کے مطابق ایک ہائی کورٹ کا وکیل دوسرے ہائی کورٹ میں پریکٹس نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے محمد علی جناح نے جب پنجاب ہائی کورٹ سے مقدمے میں پیش ہونے کی اجازت مانگی تو عدالت مذکور کے ایک جسٹس مسٹر براڈوے نے اختلاف کیا، لیکن چیف جسٹس سر شادی لال نے بعض مصلحتوں کی بنا پر ان کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔

قائداعظم لاہور ہائی کورٹ میں

ایم۔اے جناح ایڈووکیٹ ۱۴ جولائی کو غالباً دوسری مرتبہ لاہور تشریف لائے اور فلیٹیز ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے روز غازی علم الدین کا مقدمہ مسٹر جسٹس براڈوے اور مسٹر جسٹس جانسٹن پر مشتمل ڈویژنل بنچ میں پیش ہوا۔ لوگوں کا اجتماع صبح نو بجے ہی شروع ہوگیا تھا۔ پریس رپورٹر بھی سات سات مقامات پر رک کر بہ ہزار دقت گیلری تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مقدمے کی کارروائی سننے کے لیے درج ذیل اہم شخصیتیں بھی کمرہ عدالت میں موجود تھیں۔ سید حبیب شاہ مالک اخبار 'سیاست' مولوی غلام محی الدین، مسٹر محمد طفیل بیرسٹر، خلیفہ شجاع الدین، مدن کمند لال پوری، چوہدری گھسیٹا، چوہدری محمد حسین ایڈووکیٹ لدھیانہ، ملک محمد امین، مسٹر محمد شریف ایڈووکیٹ، مسٹر بدرالدین بیرسٹر، مدیر اخبار 'ہنٹر'، دیوان چمن لال، سردار امر سنگھ، لالہ گوکل چند نارنگ، خواجہ فیروز الدین بیرسٹر، مہتہ امین چند ایڈووکیٹ وغیرہم۔

مقدمے میں مسٹر فرخ حسین نے قائداعظمؒ کی معاونت کی۔ استغاثے کی طرف سے دیوان رام لال اور مسٹر جیون لال کھنہ پیش ہوئے۔ گیارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے، جب میاں

طالع مند ایک اور شخص کی معیت میں مسٹر جناح کی قانونی کتب کی ایک بھاری گٹھڑی اٹھا کر لائے۔ دیگر مقدمات کی سماعت کے بعد پونے گیارہ بجے جج صاحبان اٹھ گئے۔ بارہ بجنے میں بارہ منٹ باقی تھے کہ مسٹر ایم۔اے جناح بمراہ مسٹر فرخ حسین عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے اور بارہ بج کر پانچ منٹ پر جناح صاحب نے اپنے دلائل کا آغاز کیا۔آپ نے فرمایا:

○......میں سب سے پہلے اس پولیس افسر کی شہادت کی طرف عدالت عالیہ کی توجہ مبذول کرواتا ہوں جس نے بیان کیا کہ ہم ملزم سے یہ اطلاع پاتے ہی کہ میں نے آتمارام کباڑی سے ایک چھری خریدی ہے فوراً اس کی دکان پر پہنچے۔ پولیس نے بذات خود کوئی تفتیش نہیں کی اور صرف ملزم کے بیان پر اکتفا کیا۔لیکن قانونِ شہادت دفعہ ۲۷ کی رو سے ملزم کا بیان بطور شہادت نہیں پیش ہوسکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ جج صاحبان اس کا فیصلہ صادر کریں (مسٹر جسٹس براڈوے نے کہا کہ شہادت کے قابل قبول یا نا قابل قبول ہونے کے سوال کا فیصلہ عدالت ماتحت کا کام ہے) مسٹر جناح نے کہا: آپ اس نکتہ کا اب نہیں تو آخر میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔

○......(سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا) اب غور طلب امر یہ ہے کہ ملزم کو اس مقدمے میں ماخوذ کرنے کی کافی وجوہ ہیں یا نہیں۔ ۶ اپریل کو راجپال ہلاک کیا گیا۔لیکن سوال یہ ہے کہ جس نے راجپال کو قتل کیا وہ کون ہے؟ استغاثے کی شہادت میں دو عینی گواہوں کی شہادت کے قابل اعتماد ہونے کو پرکھنے کے لیے فاضل ججوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ یہ دونوں گواہ راجپال کے ملازم تھے۔ان شہادتوں کو پرکھنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کے بیانات کے اختلافات دیکھے جائیں۔آپ نے کدار ناتھ کا بیان پڑھ کر سنایا اور کہا کہ سخت تعجب کی بات ہے کہ اس بیان میں بھگت رام کا کہیں نام تک نہیں آیا، حالانکہ وہ اس وقت دکان پر موجود تھا۔ برخلاف اس کے گواہ بھگت رام کا بیان ہے کہ اس نے ملزم کا تعاقب کیا اور کدار ناتھ نے بھگت رام کا نام نہیں لیا، حالانکہ ایک عینی شاہد کی حیثیت سے کدار ناتھ کو بھگت رام کا نام سب سے پہلے لینا چاہیے تھا۔ یہ ایک نہایت ہی اہم نکتہ ہے اور عینی شاہد کا جزو اعظم ہے۔

○......کدار ناتھ گواہ نے ارتکاب جرم کا جس قدر وقت بتاتا ہے، طبّی شہادت سے اس کی تردید ہوتی ہے۔طبّی شہادت سے ظاہر ہے کہ گواہ کے بیان کردہ وقت سے دو چند وقت صرف ہوا ہے۔

○......گواہ کا بیان ہے کہ جب ملزم کو پکڑا گیا تو اس نے کہا: ''میں نے کوئی چوری نہیں کی، ڈاکہ نہیں ڈالا، میں نے صرف اپنے پیغمبر کا بدلہ لیا ہے۔'' ایک لمحہ کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ملزم بھاگتا جاتا تھا، اس کا تعاقب بھی کیا گیا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بھاگنے کی کوشش کرنے والا کوئی شخص گرفتار ہوتے ہی فوراً اس طرح اقبالِ جرم کر لے؟ یہ شہادت بھی پیش کی گئی ہے کہ وہ متواتر اقبال جرم کرتا رہا۔ پولیس کا ایسے موقع پر فرض تھا کہ وہ مجسٹریٹ کے روبرو ملزم کے بیانات قلم بند کراتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ملزم نے راجپال کی دکان پر آ کر بھی اقبال جرم کیا۔ ایسا ناممکن ہے۔ وہاں پولیس موجود تھی جس کے سامنے ایک نوعمر لڑکا ایسی جرأت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ یہ سب کہانی ایسی غیر قدرتی ہے کہ اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

○......فی الحقیقت یہ سب کہانی غلط ہے۔ گواہ نے نہ صرف بھگت رام کا نام ترک کر دیا بلکہ وزیر چند کا نام بھی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ وزیر چند نے ملزم کا تعاقب کیا تھا۔ جرح پر گواہ نے کہا ہے کہ میں وزیر چند کے نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ میں اس شہادت پر صرف یہی کہوں گا کہ اگر گواہ سچ بولتا تو وہ بھگت رام کا نام ضرور لیتا۔

○......دیوان وزیر چند کی شہادت پڑھ کر سناتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا کہ کیا فاضل جج صاحبان اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ کدار ناتھ وزیر چند کو نہیں جانتا تھا۔ اگر اسے نام نہیں آتا تو وہ کہہ سکتا تھا کہ کوئی آدمی وہاں موجود تھا اس کے بعد گواہ بھگت سنگھ بھی تقریباً ایسی ہی کہانی سناتا ہے اس کا بیان ہے کہ ملزم کی پیٹھ اس کی طرف تھی، ظاہر ہے کہ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ چنانچہ بھگت کے بقول ملزم نے کہا تھا: ''ہتھکڑیاں سونے کے کڑے ہیں'' نانک چند گواہ کا بیان ہے کہ ملزم کہتا تھا: ''راجپال میرا دشمن نہیں، بلکہ میرے رسول ﷺ کا دشمن ہے''۔

○......سب انسپکٹر کی شہادت ہے کہ ملزم کی شلوار اور قمیض پر خون کے نشانات تھے۔ ملزم کا بیان ہے کہ میرے ساتھ تشدد کیا گیا۔ استغاثہ نے کہیں بھی یقینی طور پر بیان نہیں کیا کہ ملزم کے کپڑوں پر خون کے جو نشانات تھے، وہ اسی قتل کی وجہ سے تھے۔ طبی شہادت ہے کہ یہ نشانات شاید مقتول کے قریب آنے سے لگ گئے ہوں۔ یہ امر واضح ہے کہ ملزم مقتول کے نزدیک نہیں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ خون کے نشانات کسی انسان کے خون سے ہیں لیکن

یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ یہ مقتول کے ہی خون کے نشانات ہیں۔ اگر میری انگلی زخمی ہو جائے تو اس کے اندر سے بھی کافی خون نکل آئے گا جس سے میرے کپڑوں پر بڑے نشانات لگ سکتے ہیں۔

- ......میں کہہ سکتا ہوں کہ فاضل جج نے فیصلے میں غلطی کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ دو ہندو اسیسر ملزم کو مجرم بتاتے ہیں، لیکن دو مسلمان اسیسر اسے بے قصور ٹھہراتے ہیں۔ اگر اس وقت ہندو مسلم فرقوں میں کشیدگی تھی تو فاضل جج کا فرض تھا کہ وہ اپنی رائے سے فیصلہ کرتا۔
- ......آخر میں مسٹر جناح نے کہا کہ ملزم نوجوان ہے۔ راجپال نے بدنام زمانہ کتاب شائع کر کے مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کیا تھا۔ سزائے موت سخت سزا ہے۔ اشتعال کے تحت جرم اور کم عمر کے لیے قانون میں سزا کی واضح رعایت ہے۔ اس لیے ملزم پر رحم کیا جائے۔

اس مدلل اور معقول تقریر کے جواب میں استغاثہ کے وکیل مسٹر جے لال کپور نے کہا:

- ......ملزم واردات کے فوراً بعد خون آلود چھرے اور خون آلود کپڑوں کے ساتھ گرفتار ہوا ہے، اس لیے یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ موقع پر ہی گرفتار ہوا ہے۔ قتل کے بعد ملزم کا فرار ہونا لازمی تھا۔ ودیارتن کا ٹال مہاشہ راجپال کی دکان سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔
- ......مقتول راجپال کے دو ملازم کدارناتھ اور بھگت رام موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے راجپال کو قتل ہوتے خود دیکھا مگر انہوں نے ملزم کو پکڑنے کی اس لیے کوشش نہ کی کہ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ملازم ہونے کی وجہ سے ان کے بیانات پر شک کرنا معقولیت نہیں ہے۔
- ......یہ درست ہے کہ ابتدائی رپورٹ میں کدارناتھ نے بھگت رام کا نام نہیں لکھوایا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
- ......یہ درست ہے کہ کتاب ''رنگیلا رسول'' میں بعض باتیں اسلامی عقائد کے خلاف ہیں مگر مقتول اس کا صرف ناشر تھا مصنف نہیں۔ اس غرض سے ناشر کے خلاف زیر دفعہ ۱۵۳ الف مقدمہ چلایا گیا تھا مگر ہائی کورٹ نے اس فعل کو کوئی جرم نہیں سمجھا ہے اور ملزم بری ہو گیا۔
- ......مزید برآں اشتعال کے تحت سزا میں رعایت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملزم کا اقدام فوری ہو نہ کہ سالوں کے بعد۔
- ......چھری نئی یا پرانی کا کوئی سوال نہیں۔ ہر نئی چیز استعمال کے فوراً بعد پرانی ہوسکتی ہے۔ چھری کو جس دن قتل کے لیے استعمال کیا گیا، اس دن یقیناً وہ نئی اور تیز تھی۔ مال خانے میں اٹنے

پلٹنے کی وجہ سے نوک بھی شکستہ ہو سکتی ہے۔

O......شناخت پریڈ کے دوران نہ صرف آتمارام کباڑی نے بلکہ کدار ناتھ، نانک چند اور پرمانند نے بھی ملزم کو شناخت کیا تھا۔

عدالت نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد حاضرین کو باہر نکال دیا۔ دیوان رام لال، ایڈووکیٹ جنرل کے دلائل سنے بغیر غازی علم الدین کی اپیل خارج کردی گئی اور عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔ ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ جب غازی علم الدین کو اسی شام جیل میں سنایا گیا تو ان کے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ چہرہ تمتما اٹھا۔

بے تاب ہو رہا ہوں فراق رسول میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

اگرچہ مسلمان انگریز کے رویے سے دل برداشتہ تھے مگر پریوی کونسل کے دروازے پر دستک دینے میں ایک خاص مصلحت کارفرما تھی۔ سید عطاء اللہ بخاری ابتدا ہی سے مقدمہ بازی کے خلاف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ علم الدین اور عدالت کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، کیونکہ اس معاملے میں رحم کی اپیل گناہ ہے۔ اقبال فعل سے انحراف ایک عظیم جرم ہے اور علم الدین کو ایسی حسین موت کی آغوش سے چھین لینا ان کی ذات پر ایک عظیم ظلم۔ لیکن سید حبیب شاہ اور علامہ اقبال کی رائے اس کے برخلاف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم خاموش بیٹھ کر حالات کے جائزے میں گم ہو جائیں تو غیر مسلم اس کا مطلب یہ اخذ کریں گے کہ علم الدین کا کوئی والی وارث نہیں ہے اور مسلمان اس سے کوئی خاص انس نہیں رکھتے۔ اس لیے حجت پوری کرنے کے لیے ہمیں ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی کرنا چاہیے۔ چنانچہ پریوی کونسل لندن میں دائر کردہ اپیل کا مسودہ ایم۔ اے جناح کی نگرانی میں تیار ہوا، جس میں غلط قانونی ضابطوں کی نشاندہی کی گئی اور قانونی سقم کا بوضاحت تذکرہ کیا گیا۔ اواخر جولائی میں نامور وکلاء کی سعی جمیلہ اور مسٹر فرخ حسین کی وساطت سے علم الدین کا مرافعہ پریوی کونسل لندن میں دائر کر دیا گیا۔

میاں طالع مند برطانیہ کے سابق وزیراعظم لارڈ آکسفورڈ کے فرزند آسٹر آرل ایسکوئتھ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایف۔ ایل ولسن اینڈ کمپنی کو ان کے تقرر کے لیے لکھا اور پوچھا کہ وہ پیش ہونے کے لیے کتنی فیس لیں گے۔ لیکن پریوی کونسل نے کسی وکیل کو پیروی کرنے کی اجازت نہ دی اور صرف مسودے کے مطالعہ پر اکتفا کیا۔

فرنگی دور میں عدالتی نظام کا سب سے بڑا اور قانون کا شارح یہی ادارہ تھا۔ اس عدالت نے اپیل کنندگان کے موقف کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ غازی علم الدین کی اپیل نامنظور کر دی اور دفعہ ۱۵۳ الف کی وضاحت اور دفعہ ۳۰۴ کے جز واشتعال انگیز قتل کے معاملے کو بھی گول کر گئی۔



غازی علم الدین کے مقدمے میں پریوی کونسل تک جو اخراجات آئے ان کا کل تخمینہ اٹھارہ ہزار روپے ہے۔ وہ نہایت مہنگائی کا دور تھا۔ ابتدا میں آپ کے والد میاں طالع مند نے تمام مصارف خود برداشت کیے۔ ساڑھے تین ہزار اپنی گرہ سے اور کچھ رقم قرض لے کر خرچ کی۔ خواجہ دل محمد مرحوم، ملک لال دین قیصر اور حاجی علی محمد کمبوہ نے بھی مقدور بھر دست تعاون بڑھایا۔ تاہم جب اس مقدمے نے شہرت پکڑی تو اسیر عشق سے وابستگی قومی وقار کا سوال ٹھہرا اور غازی علم الدین عوام الناس کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

وہ نوعمر لڑکا جو کل تک گمنام تھا، چند دنوں میں اخبارات کے اولین صفحات کی سرخیوں کی زینت بن گیا۔ اب قید خانہ اور مقدمے کی پیشیوں میں ایک بے پناہ ہجوم ہوتا تھا، جس میں ہر طبقہ اور ہر عمر کے لوگ شامل ہوا کرتے۔ قصہ مختصر اب یہ مقدمہ ایک فرد کا نہیں پوری قوم کا تھا۔ چنانچہ علم الدین ڈیفینس کمیٹی عمل میں آئی جس کی تحریک پر قوم نے ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ مسٹر جناح نے بڑے بھاری دلائل عدالت کے گوش گزار کیے، جن کی قدر و قیمت کوئی ماہر قانون دان ہی جان سکتا ہے۔ تاہم پیر غلام دستگیر نامی نے رقم کیا ہے:

> ”وکیل دوستوں کا کام اخلاص پر مبنی نہ تھا۔ سیشن کورٹ میں پیروی کے لیے مسٹر سلیم ایڈووکیٹ نے چھ سو روپیہ فیس وصول کی۔“

اس روایت کی تردید کرنا بھی آسان نہیں۔ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اٹھارہ ہزار روپیہ آخر کہاں گیا؟ فیس وصول کرنے کے سلسلے میں مسٹر محمد علی جناح ایڈووکیٹ (قائداعظم) کا نام بھی بطور خاص لیا جاتا رہا ہے۔

ایم۔ایس۔ناز نے بحوالہ پروفیسر احمد سعید نقل کیا ہے کہ موصوف نے روزنامہ ”انقلاب“ ۲۰۔جولائی ۱۹۲۹ء صفحہ ۳ کے حوالے سے بہت سے گوشے اجاگر کیے ہیں اور لکھا ہے:

> ”پنجاب کے مشہور سیاسی رہنما اور وکیل سر محمد شفیع نے اس مقدمے کی پیروی کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ ہندو اسے برا سمجھیں

گے۔''

حالانکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ پروفیسر صاحب کو اس سلسلے میں غلطی ہوئی ہے جس کی تردید کرتے ہوئے ''انقلاب'' نے ''علم الدین، جناح اور پرتاپ'' کے عنوان سے اداریے میں لکھا:

''اگر سر شفیع کے پاس کوئی اور وجہ نہ تھی تو ہمارے خیال میں انہوں نے سخت غلطی کی ہے اور مسٹر جناح کی جرأت قابلِ قدر ہے۔''

اس میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ درج بالا نفس مضمون ''پرتاپ'' کے جواب میں لکھا گیا کیونکہ ہائی کورٹ میں پیشی کے بعد ہندو ذرائع ابلاغ نے قائداعظمؒ اور مسلمانوں سے متعلق ہرزہ سرائی شروع کر دی تھی۔ ہندو اخبارات نے اس موضوع پر کئی قابلِ اعتراض اداریے لکھے۔ ''پرتاپ'' میں ان دنوں ''چلنت'' اور ''گپ شپ'' کے عنوان سے دو کالم چھپا کرتے تھے جن کا حقائق سے دور کا تعلق بھی نہ ہوتا۔ اسی ایک کالم میں شائع ہوا تھا کہ سر شفیع ایک سنجیدہ شخصیت ہیں۔ انہوں نے علم الدین کا مقدمہ اس لیے نہیں لیا تھا کہ ہندو اسے برا سمجھیں گے۔ ان حاشیہ آرائیوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ باہمی آویزش اور تلخیاں جنم لیتی رہیں۔ اس اخبار نے یہاں تک لکھا:

''مسٹر جناح کی قابلیت علم الدین کو موت کے منہ سے نہ بچا سکی لہٰذا مسٹر جناح کو ایسا کمزور مقدمہ مطلقاً لینا ہی نہ چاہیے تھا، کیونکہ ہندوؤں کو ان کے خلاف ناواجب شکایات پیدا ہو گئی ہیں۔''

حالانکہ ہائی کورٹ میں مسٹر محمد علی جناحؒ کی تقریر اس قدر مدلل اور موثر تھی کہ اسے خصوصاً مسلم اور عموماً غیر جانبدار اخبارات نے ''جناح کی باطل شکن تقریر'' کے عنوان سے درج کیا۔ اب یہ کہنا ناگزیر ہے کہ سر میاں محمد شفیع پر یہ الزام نہیں بلکہ ایک عظیم بہتان ہے اور پروفیسر احمد سعید صاحب ''انقلاب'' کی اس عبارت کا صحیح مطلب اخذ نہیں کر سکے۔ سر شفیع کی کوشش پر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

جناح صاحب کی تقریر اس قدر وزنی تھی کہ روزنامہ ''الجمعیۃ'' نے ۲۰۔ جولائی ۱۹۲۹ء کے پرچے میں صفحہ ۴ پر لکھا:

''لاہور ہائی کورٹ سے بھی علم الدین کی اپیل کا فیصلہ صادر ہو گیا اور پھانسی کا جو حکم سیشن عدالت سے ہوا تھا وہی بحال رہا۔ قائداعظم کی

مدلل اور موثر تقریر کو پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دلائل کس قدر وزنی تھے اور انہوں نے ماتحت عدالت کی شہادتوں میں جن نقائص کا ذکر کیا، ان سے مقدمہ کس درجہ کمزور ہو گیا تھا مگر ہائی کورٹ کے ججوں نے خدا معلوم کن وجوہ کی بنا پر ان دلائل کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ مسٹر جناح کی تقریر کے بعد پھانسی کی سزا کس طرح بحال رہ سکتی تھی۔''

حیران کن پہلو یہ ہے کہ ہندو جرائد و رسائل نے علم الدین غازی کے متعلق کئی افسانہ طرازیاں شروع کر دیں۔ ''علم الدین کئی دنوں سے پریشان خاطر ہے'' اور بعض اپنے خاص صفحات ان لطیفوں کے حوالے کر دیتے کہ اب وہ اپنے فعل پر پچھتا رہا ہے اور ہر وقت کفِ افسوس ملتا رہتا ہے۔ جناب وقار اللہ عثمانی پانی پتی ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور غازی علم الدین سے والہانہ عقیدت رکھتے۔ انہی دنوں آپ نے غازی صاحب سے کنج اسارت میں ملاقات کی اور دوسرے روز ۴۔ ستمبر کو اپنا ایک مضمون انقلاب کے حوالے کیا، جس میں لکھا:

''کل تین بجے شام لاہور سنٹرل جیل میں غازی علم الدین صاحب سے ان کے والد کی معیت میں ملا۔ ماشاء اللہ خوش وخرم ہیں اور نہایت اچھی صحت ہے۔ ہم نے بیس پچیس منٹ تک ملاقات کی۔ انہوں نے اتنی دیر جو بات کی ہنس کر کی۔ آزاد آدمیوں میں اتنا اطمینان قلب نہیں دیکھا، جتنا ان میں پایا گیا۔ ان کے والد نے کہا کہ اخبار ''پرتاپ'' میں تمہارے متعلق لکھا ہے کہ بہت ہی کمزور ہو گئے ہو اور ہر وقت مغموم و متفکر بھی۔ یہ سن کر خوب ہنسے اور فرمایا کہ یہ ان لوگوں کے خبثِ باطن کی علامت ہے۔ وہ اپنی آگ میں خود جل رہے ہیں، وگرنہ جس کو یہ یقین ہو کہ موت کا مقررہ وقت اٹل ہے، وہ اب آ جائے یا بیس برس بعد، تو اس کو کیا غم؟ کیسی فکر؟ ایڈیٹر اخبار خود آ کر مجھے دیکھ جائے اور اپنے خشک شدہ زخموں کو تازہ کر جائے۔

یہ بھی فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کل چوہدری افضل حق صاحب اور مولانا ظفر علی خاں صاحب جیل میں آئے تھے۔ افسوس مجھ سے ملے بغیر

چلے گئے۔ ہم نے کہہ دیا کہ اخباروں سے ہمیں مولانا کا جیل میں آنا تو معلوم نہیں ہوا اور اگر تشریف لائے ہوں تو علم نہیں۔ غازی صاحب کو کھانے پینے، نہانے دھونے اور وضو نماز کی کوئی تکلیف نہیں۔ معلوم ہوا کہ جمعہ کے جمعہ روزہ رکھتے ہیں اور دیگر نوافل کا بھی معمول ہے اور ہر وقت درود شریف کا ورد رکھتے ہیں۔''

مافوق الفطرت مصدقہ واقعات

غازی علم الدین کی فضیلت رسمی براہین و دلائل کی محتاج نہیں۔ وہ اسلام کے ایک قابلِ فخر سپاہی ہیں۔ شہادت کا اعلیٰ مقام، خود ان کی شان و عظمت پر گواہ ہے مگر بعض لوگ ان کی شہرت و بلند پروازی کا سبب کچھ اور ٹھہراتے ہیں۔ اُن کی نظر میں علم الدین خصوصاً اس لیے خوش قسمت ہیں کہ قائداعظم ان کے وکیل تھے، قاری شمس الدین نے جنازہ پڑھایا مولانا ظفر علی خاں نے اپنی نگرانی میں قبر بنوائی اور حضرت علامہ اقبال مرحومؒ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے نعش کو لحد میں اتارا۔

میرا عقیدہ و خیال اس سے بالکل مختلف ہے۔ اہلِ دل جانتے ہیں، غازی علم الدین شہید کے شرف و وقار کو مرقومہ اسباب سے ذرا بھی نسبت نہیں ہے۔ بلکہ قائداعظم کے مقدر کا ستارہ چمکا کہ وہ قلب و نظر کے اس افسانے میں شریک ہوئے اور ان کی زندگی زیب داستاں بن گئی۔ حضرت علم الدین شہیدؒ کا نام تا قیامت زندہ رہے گا اور قائداعظم کے لیے بھی تحسین و آفرین کی فروانی ہوگی۔ ان کے نامہ اعمال کے سرورق پر بابائے قوم کے ساتھ ''وکیل علم الدین شہید'' کے الفاظ بھی درج ہوں گے اور صرف اسی لیے قیامت کے دن وہ بلا حساب کتاب جنت کے سزاوار ٹھہریں گے۔ قاری شمس الدین بخاری قاضی ازل کے سامنے کہہ سکیں گے کہ میں نے جنازہ کی نماز پڑھائی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں بھی شوخی قسمت سے چہک رہے ہوں گے کہ میں شہید رسالت ﷺ کی قبر میں لیٹا تھا اور اقبال مرحوم کے لیے یہ کافی ہوگا کہ وہ شہید کا مدح خواں ہے اور اس نے کشتۂ خنجر تسلیم و رضا کے منور جسم کو چھوا ہے۔

گنبد خضرا تصورات کا مرکز بن جائے اور نجف کی خاک جس آنکھ کا سرمہ ہو، اس کے عظمت و کردار کی تصویر الفاظ کے آئینے میں کبھی بھی اتر نہیں سکتی۔ غازی علم الدین شہید کو جو مقام عطا ہوا بلاشبہ وہ عقل و شعور سے ماورا ہے۔ زبان و کلام کی شوخیاں نیاز مندی کا درس دیتی ہیں اور علم و فن

قوتیں یہاں جبہ سائی کرتی ہیں۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے جس کا ہم شعور نہیں رکھتے۔ غازی علم الدین شہید کی حیات جاوید کا لمحہ لمحہ یادگار ہے۔ حاجی میاں نیاز احمد ایم۔ اے کا کہنا ہے کہ عرصہ اسیری میں غازی ممدوح کا حسن مزید نکھر گیا تھا اور وہ داغ چھالے جو پیشے کے کام سے ہتھیلیوں پر ابھر آئے تھے یکسر مٹ گئے اور ہاتھ مرمر کی طرح ملائم و شفاف ہو گئے۔

اس مقام پر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ غازی علم الدین لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اس وقت جیلوں میں بھی ان مشاغل پر ایک طرح کی پابندی ہوا کرتی تھی، لیکن وہ ملاقاتیوں کو قرآنی آیات پڑھ کر سناتے اور بڑے بڑے مشکل نکات فلسفیانہ انداز میں بڑی آسانی سے سلجھا دیا کرتے تھے۔ انہیں پورا قرآن حفظ ہو گیا تھا۔ خدا جانے، انہیں یہ علم کون سکھا گیا۔

غازی علم الدین نے لاہور کی جیل میں لواحقین کو بتایا کہ مجھے ایک سفید پوش بزرگ کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ انہوں نے میرے سر پر دست شفقت پھیرا اور فرمایا: ''بیٹا! مطمئن رہو، تجھے جلد ہی بلا لیا جائے گا۔ اس دن سے مجھے کمال درجہ سکون قلب میسر ہے۔

سید احمد شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور شیخ خورشید جوان دنوں میانوالی جیل میں بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ متعین تھے۔ ان کا بیان ہے ایک رات ہم سپرنٹنڈنٹ کے ہمراہ جیل میں گشت کر رہے تھے کہ غازی علم الدین شہید کی کوٹھڑی سے ایک خاص قسم کی روشنی نظر آئی، جس سے ہم بہت متاثر ہوئے اور خدا کے حضور سر بسجود ہو گئے۔ سید افتخار احمد شاہ کا اپنے والد سید احمد شاہ کے حوالے سے کہنا ہے۔ اس قسم کے خارق العادات سینکڑوں واقعات کا ظہور ہوا۔ انہوں نے ہزاروں قیدی دیکھے مگر اس قسم کا باعظمت، پروقار اور عجیب و غریب شخص زندگی بھر نہیں دیکھا۔

شہادت سے قریباً ایک ہفتہ پہلے کا ذکر ہے۔ میاں طالع مند کی میانوالی اسٹیشن پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے فرمایا:

> ''میاں صاحب! شہادت کے روز خدا جانے کتنے غوث، قطب ابدال اور شیوخ عظام تشریف لائیں گے۔ اس لیے رونے پیٹنے سے گریز کرنا۔''

غازی علم الدین سے آخری ملاقات کا حال نہایت پرسوز ہے۔ لواحقین رو رہے تھے مگر آپ مسکرا کر ان کی تسلی دیتے۔ آپ نے میاں محمد دین کی اہلیہ سے فرمایا:

> ''بھابی! تو کہتی تھی میں اپنے لخت جگر کو تیرا ہم زیب (شہ بالا)

بتاؤں گی اب وہ تیرا وعدہ کیا ہوا؟''

بے اختیار موصوفہ کی زبان سے نکل گیا:

''میں اپنا وعدہ ضرور نبھاؤں گی۔''

آپ کی شہادت کے تھوڑی مدت بعد نور احمد کا انتقال ہو گیا اور وہ سر کی طرف مدفون ہے۔ اس طرح وہ آج بھی ہم زیب بنا ہوا ہے اور حور و ملائک دولہا کے گلے میں ہار ڈال رہے ہیں۔ غازی علم الدین کی روحانی طاقت کے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی قائل تھے۔ جو شخص ذرا بیمار ہوتا آپ اسے دو گھونٹ پانی اپنے ہاتھ سے پلا دیتے اور وہ خدائے کریم کی مہربانی سے فوراً شفایاب ہو جاتا۔ آپ کے کمرے کے باہر پانی کا ایک گھڑا پڑا رہتا۔ کہتے ہیں اس پانی کو پی کر سینکڑوں لوگ ہر روز سرمدی لطف حاصل کرتے۔

۲۲۔ مئی ۱۹۲۹ء کو غازی موصوف کا وزن ۱۲۸ پونڈ تھا اور شہادت کے وقت ان کا وزن بڑھ کر ۱۴۰ پونڈ کے قریب ہو گیا۔ اس قیدی اور دیگر مجرموں میں ازحد تضاد واقع ہوا ہے۔ عام طور پر موت کی سزا سن کر لوگ حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور غم و اندوہ کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا، مگر غازی موصوف کی کیفیت کچھ اور تھی۔ کمال صبر و استقلال، چہرے پر رونق اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی اور شب و روز ان کے جسمانی وزن میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

میاں مہر دین، غازی علم الدین شہیدؒ کے قریبی رشتہ دار تھے مگر نابینا ہونے کے سبب وہ آپ سے کہیں ملاقات نہ کر سکے۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ میرے اقربا میں جو شخص سب سے پہلے داعی اجل کو لبیک کہے اسے میرے دائیں جانب دفن کیا جائے۔ لہٰذا سب سے پہلے میاں مہر دین کا انتقال ہوا اور حسب وصیت سپرد خاک کر دیئے گئے۔ خوش قسمتی کا کیا کہنا۔ ایک ملاقات کی حسرت جس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔ وہی سب سے پہلے ہم مدفن ٹھہرا۔

۳۰۔ اکتوبر کو جب غازی صاحبؒ سے عزیز و احباب ملنے گئے تو انہیں جیل والوں سے معلوم ہوا کہ آج جناب غازی صاحب بہت خوش ہیں۔ عزیزوں نے جا کر سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا:

''مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیدار نصیب ہوا ہے جو کہ خواب میں ملے اور خوشخبری سنائی، اے علم الدین! تجھے مبارک ہو۔ رب غفور نے تیری قربانی قبول فرما لی ہے اور نبی آخر الزماں ﷺ کے دربار میں تیرا

تذکرہ کثرت سے ہوا کرتا ہے۔ اس پر خوش ہوں کہ میں جلد ہی دربار رسالت ﷺ میں پہنچ جاؤں گا''

غازی علم الدین شہید کی اپیل جب پریوی کونسل سے خارج ہوئی تو جیل کا ایک ملازم اس کی خبر پہنچانے کے لیے آپ کے پاس آیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ غازی موصوف بول پڑے اور فرمایا:

''مجھے یہ خبر دینے آئے ہو کہ اپیل خارج ہوگئی ہے۔ پرسوں جب یہ فیصلہ ہوا مجھ کو اس وقت کا معلوم ہو چکا ہے۔''

وہ ملازم دوڑا ہوا اپنے دفتر گیا اور حیرت و استعجاب سے کہنے لگا: ''علم الدین غازی کوئی عام قیدی نہیں ہے۔'' یہ سن کر جیل کے اعلیٰ ارکان اس کا منہ تکنے لگے اور پھر کسی گہری سوچ میں کھو گئے۔

غازی علم الدین کو میانوالی جیل میں پھانسی دینے کے چند روز بعد ان کے جسم خاکی کو مسلمانانِ لاہور کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جنازے کا یہ روح پرور منظر برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ نماز جنازہ لاکھوں فرزندان توحید نے چوبرجی گراؤنڈ میں ادا کی اور قبرستان میانی صاحب میں دفن کر دیا گیا۔

دوسرے روز ایک بہت بڑا تعزیتی جلسہ عام چوک رنگ محل میں منعقد ہوا۔ جیل کے ایک ملازم نواب دین نے اشک بار آنکھوں اور گھبرائی ہوئی آواز میں جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ جب غازی علم الدین شہید کو سزائے موت کے حکم کے بعد میانوالی جیل کی کوٹھڑی میں رکھا گیا تو میں پہرے دار کے طور پر وہاں متعین تھا۔ وہاں آخری رات جس کی صبح علم الدین کو پھانسی پر لٹکایا جانا تھا، رات گئے کئی آوازیں آتی تھیں، جیسے بہت سے لوگ باتیں کرتے ہیں۔ میں بوکھلا سا گیا اور غازی صاحب سے دریافت کیا کہ تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟ جواب ملا، کوئی نہیں تھا۔ میں غصے میں (میرے منہ میں خاک) نجانے کیا کیا کہتا رہا۔

صبح چھ بجے غازی علم الدین کو پھانسی دی جانی تھی۔ دو اور تین بجے کے درمیان کیا دیکھتا ہوں کہ ایک روشنی کی لہر آئی جس نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا، بلکہ میری آنکھیں روشنی کے سامنے نہ ٹھہر سکیں اور بند ہوگئیں۔ پھر وہ روشنی اچانک غائب ہوگئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب کوٹھڑی سے غازی علم الدین بھی غائب تھے۔ میں غم سے نڈھال ہوگیا اور رونے لگا کہ اب تو انگریز حکومت غازی کی بجائے مجھے پھانسی پر لٹکا دے گی۔ صبح چار بجے پھر وہی روشنی نمودار

ہوئی اور جب میں نے کوٹھڑی کی طرف دیکھا تو غازی علم الدین موجود تھے۔ میں روتے روتے ان کے پاؤں پر گر پڑا اور میری ہچکی بندھ ہوگئی۔ مجھے خدا کے لیے معاف کر دو۔ میں نجانے تمہیں کیا کیا کہتا رہا۔ غازی علم الدین نے کہا: "بزرگو! میں نے آپ کی باتوں کا بالکل برا نہیں مانا اللہ تمہیں سلامت اور خوش رکھے۔"

نواب دین وارڈن نے ان سے کہا: "بیٹا! آپ نے وہ کام کیا جو کوئی نہیں کر سکتا۔ تم پر اللہ و رسول کا سایہ ہے، بیٹا! میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ مجھے بتاؤ، تم کہاں گئے تھے؟" غازی علم الدین نے کہا: میں تو یہیں پر تھا۔ میں نے پھر کہا: تمہیں حضور اکرم ﷺ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، مجھے بتا دو۔ غازی علم الدین آخر کار بتا دینے پر مجبور ہو گئے اور کہنے لگے، بزرگو سنو! حضرت علی المرتضیٰ آئے اور مجھے اپنے ہمراہ لے گئے، ایسے مقام پر جہاں میں کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں گیا اور میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو میں بیان کر سکوں۔ وہاں مجھے رسول عربی کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا۔ حضور ﷺ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا اب تم آزادی چاہتے ہو تو اپنے آپ کو آزاد سمجھو۔ اگر تا قیامت عزت بھی چاہتے ہو تو پھر وہاں پہنچا دیا جائے۔ لہٰذا میری خواہش پر حضرت علیؓ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔

جن دنوں غازی صاحب میانوالی جیل میں پھانسی کے منتظر تھے، اس دوران میانوالی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس سید نور حسین شاہ تھے۔ اس وقت کے ڈپٹی کمشنر راجہ زمان مہدی خاں نے اسی کے مشورے سے شہید کو لاوارثوں کے قبرستان میں دفن کیا، پرامن ہجوم پر سنگ باری کرائی۔ جہلم شہر کے باشندے جانتے ہیں کہ اس کا انجام بڑا عبرتناک ہوا۔ اس کی اہلیہ پر بلیاں پالنے کا جنون سوار ہو گیا اور وہ روز و شب اسی کھیل میں مستغرق رہتی۔ اس کا بیٹا بھی جو پولیس میں ایک اعلیٰ افسر تھا، مخبوط الحواس ہو کر مرا اور خود ایس پی مذکور نے موت کے ظالم پنجوں میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔ لوگوں نے غازی علم الدین کی یہ پیشگوئی بھی پوری ہوتی دیکھی کہ میت کے حصول میں دشواری پیش آئے گی اور جب مجھے لحد میں اتارا جائے گا تو رم جھم ہو رہی ہوگی۔

اللہ کے بندوں کی زندگی ایک نمونہ ہوتی ہے اور ان کی موت ایک درس، لوگ ان سے ہر حالت میں اکتساب فیض کر سکتے ہیں۔ تیرہ دن گزرنے کے باوجود جب شہید علم الدین کی نعش گڑھے سے نکالی گئی تو تعفن پیدا ہوا تھا نہ کوئی گزند پہنچی۔ اس سے متاثر ہو کر بہت سے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے، جن میں میانوالی ہسپتال کا ایک سکھ سول سرجن بھی شامل تھا جو بعد ازاں لندن

میں مقیم ہو گیا۔

یوں تو درجنوں ایسے واقعات ہیں جنہیں قلمبند کرنے کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے، مگر بعض نہایت ضروری ہیں۔ میاں علم الدین کی جدائی کے غم میں ان کی والدہ اکثر پریشان حال رہا کرتی تھیں۔ ایک رات شہید موصوف اپنی پڑوسن چراغ بی بی کو خواب میں ملے اور فرمایا:۔

''میری والدہ ماجدہ سے کہہ دینا وہ رویا نہ کرے۔ میں جلد ہی گھر آجاؤں گا۔''

اس کے دو تین دن بعد آپ کے حقیقی بھتیجے شیخ رشید احمد صاحب کی ولادت ہوئی۔ اس واقعہ کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ولادت ہفتے کے روز اڑھائی بجے ہوئی۔ مکان بھی وہی تھا جس میں غازی صاحب نے خواب دیکھا۔ اور یہ تمام علامات اس دن سے مطابقت رکھتی ہیں جس روز آپ راجپال کو قتل کر کے گرفتار ہوئے تھے۔

خدا جانے کیا بات تھی، شہید مرحوم نے ایک موقع پر فرمایا:

''میرے سابقہ دوستوں دینا پان فروش اور حاجی صدیق کا انجام اچھا نہ ہوگا۔''

اس دن سے ''دینا'' تو ایسے غائب ہوا کہ کوئی خبر نہیں۔ جانے وہ کس دیس جا بسا اور کہاں روپوش ہو گیا ہے۔ حاجی صدیق ابتدائی چند برس تو غائب رہا، پھر آبائی محلے سریانوالہ میں واپس آ گیا۔ ایک مدت بعد وہ بیمار ہوا اور بستر مرگ پر سسک سسک کر جان دے دی۔ کئی گھنٹوں تک تو اس کے مرنے کی کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔ بعد ازاں اس کی میت میں تعفن کے آثار پیدا ہوئے اور محلے والوں نے اسے سپرد خاک کر دیا۔

غازی علم الدین نے آخری ملاقات کے دوران اپنی والدہ محترمہ سے گزارش کی:

''ماں! میرے بعد مت رونا دھونا۔ اگر آپ یا مزمل کا ورد کیا کریں گی تو ہماری ہر ہفتے ملاقات ہوا کرے گی۔''

پھر جب تک موصوفہ بقید حیات رہیں، بذریعہ خواب باقاعدہ سلسلہ ملاقات جاری رہا۔

جیل کی وہ کوٹھڑی جس میں غازی موصوف کو بند رکھا گیا، اس کے ساتھ بھی چند نہایت دلچسپ اور ایمان پرور حکایات وابستہ ہیں۔ غازی علم الدین کی شہادت کے بعد ایک عرصہ تک اس میں کوئی مستقل قیدی نہیں رکھا جا سکا۔ جانے کیوں اس میں بلا کی تپش ہوتی، جس سے انسان کا دم

گھٹنے لگتا۔ایک مدت تک جمعہ کی شب، سنگ باری کی آوازیں بھی سنائی دیا کرتی تھیں۔ڈر کے مارے قیدی زور زور سے چیخنے لگتا۔مگر ظاہراً سنگ پارے دکھائی نہیں دیتے تھے۔اسی وجہ سے اب جیل کے حکام اسے عموماً گودام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔سینکڑوں قیدیوں نے اس روایت کو بیان کیا اور جیل کے وارڈن بھی مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔



قید میں آزاد

پریوی کونسل لندن کا فیصلہ ایک بجلی تھا، جس کی آمد سے امیدوں کے خرمن سے دھواں اٹھنے لگا۔فصل امید کو یوں جلتا دیکھ کر مسلمان سخت جوش میں آ گئے۔چونکہ پریوی کونسل آخری عدالت تھی، اس کے فیصلے کا مطلب یہ ہوا کہ غیر مسلم جو چاہیں کرتے رہیں۔اس سلسلے میں ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوسکتی اور مسلمان اپنے نبی ﷺ کی عزت و ناموس کا تمسخر خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں۔

اس لیے لاہور میں کہرام مچا ہوا تھا۔فرزندان اسلام سخت اشتعال میں تھے اور ہر مسلمان کے دل میں یہی آرزو مچل رہی تھی کہ کسی طرح وہ بھی علم الدین بن جائے۔اس فضا سے حکومت کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ کسی وقت بھی غضب وطیش کی یہ چنگاری شعلے میں بدل کر سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔غازی علم الدین کو لاہور میں پھانسی دینے کی راہ میں مسلمانوں کے غیظ و غضب کی کیفیت ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔انگریز کو ڈر تھا کہ مسلمان لاہور میں ہرگز پھانسی نہ دینے دیں گے اور یہ قوم اپنے اس جانباز کے خون کے ایک ایک قطرے پر اپنی لاشوں سے جرأت وجوانمردی کے پرشکوہ محل بنائے گی۔

چنانچہ حکومت نے اس خدشہ کے پیش نظر علم الدین کو مرکز سے دور میانوالی جیل میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔انگریز کے بعض زرخرید غلام بھی اس معاملے میں ملوث ہیں۔میانوالی کے اکثر رئیسوں نے حکومت کو یقین دلایا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔

۳۔اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ساڑھے نو بجے شب سنٹرل جیل لاہور سے آپ کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو سارجنٹوں اور چار سپاہیوں کی حراست میں بذریعہ موٹر کار پہلے گوجرانوالہ بھیجا گیا اور وہاں سے ساڑھے بارہ بجے رات کی گاڑی میں میانوالی روانہ کر دیا۔آپ ۴۔اکتوبر کو صبح سویرے فسٹ کلاس کے ڈبے سے اترے اور پولیس کی حراست میں میانوالی جیل میں بے داخل ہوئے۔

ادھر لواحقین میں سب سے پہلے آپ کے والد محترم میاں طالع مند نے علی الصبح میانوالی شہر میں قدم رکھا اور ایک مسجد میں نماز ادا کی۔ وہاں امام مسجد نمازیوں سے خطاب کر رہے تھے:

''رات کو یہاں ایک مسافر پہنچا ہے۔ خدا جانے وہ کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ دعا کریں کہ خداوند قدوس، اس کی پریشانیاں دور فرمائے۔''

میاں طالع مند کے بعد دیگر لواحقین، اکثر رشتہ دار اور دوست بھی وہاں پہنچ گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ میانوالی شہر میں مدت سے ایک مجذوب رہتا تھا جو کسی سے کبھی کوئی بات نہ کرتا تھا مگر جب غازی علم الدین میانوالی جیل میں منتقل ہوئے تو اس رات مجذوب گلی کوچوں میں دوڑتا پھر رہا تھا اور بلند آواز سے نعرے لگاتا ہوا اعلان کرتا:

''میانوالی کے لوگو! تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے پاس ایک عاشق رسول آ رہا ہے''

پھر وہ تالیاں پیٹتا، قہقہے لگاتا اور دوسرے بازار میں چلا جاتا۔ وہ رات اس نے یوں ہی گزار دی اور سپیدہ سحر طلوع ہونے سے پہلے ایسا روپوش ہوا کہ آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

یوں تو ہر مسلمان غازی علم الدین پر جان چھڑکتا تھا، خصوصاً میاں نیاز احمد کمبوہ ایم۔اے، گرین ہوٹل کراچی کے مالک منظور الٰہی ملک اور سریانوالہ محلّہ کے تاج دین بٹ جو آپ کے خاندان کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک تھے۔ ان کے آپ سے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ یہ چاروں اصحاب زیادہ دن میانوالی میں ہی ٹھہرے رہے اور صبح و شام غازی صاحب کی ملاقاتوں سے مستفیض ہوا کرتے۔

غازی موصوف کے ہمسائے مہر دین کی صاحبزادی زینب بی بی (مرحومہ) نے مسرت کے وہ ایام آپ کے گھر والوں کے ساتھ میانوالی میں ہی گزارے۔ پنجابی کے مشہور شاعر نیاز بھکھی صاحب نے بھی چند دن میانوالی میں ہی ڈیرہ جمائے رکھا۔ ان کے علاوہ بھی ہزاروں ملاقاتیوں نے محسن انسانیت ﷺ کے اس فدا کار کا نظارہ کیا۔ ہر روز سینکڑوں افراد دیدار کے لیے جیل پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان دنوں راجہ زمان مہدی خان میانوالی کے ڈپٹی کمشنر تھے، جو انتظامات کا جائزہ لینے جیل میں آئے اور اسلام کے اس غیور فرزند سے ملاقات کی۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ راجہ

صاحب نے آپ کو اس جرأت مندانہ اقدام اور سزائے موت کے حکم کو سن کر صبر واستقلال کا ثبوت دینے پر مبارکباد پیش کی۔ اس پر غازی علم الدین نے مسکراتے ہوئے کہا:

''قتل کے ملزم عموماً کئی کئی سال حوالاتوں اور جیلوں میں پڑے سسکتے رہتے ہیں۔ لحہ لحہ کی موت مر کر تب کہیں وہ قید حیات سے آزاد ہوتے ہیں۔ خدا کا خاص کرم شامل حاصل ہے کہ صرف چھ ماہ اور نو دن کے اندر اندر میرے مقدمے کے تمام مراحل طے ہو گئے ہیں اور اب مجھے واصل بحق ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں جلد سے جلد بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضری دوں۔''

جیل کے ایک افسر کا بیان ہے:

''آپ کی زیارت کر کے دل پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ رحمت العالمین ﷺ کے اس لاڈلے کی طرف دیکھتے اور کالی کملیؐ والے پر درود وسلام پڑھتے رہیں''

غازی علم الدین کے مقدر کا ستارہ افق پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ بڑے بڑے صاحب کمال اور عارف آپ کا نظارہ کرنے کے لیے کھنچے چلے آرہے تھے۔ سیال شریف کے سجادہ نشین صاحبزادہ حضرت محمد ضیاء الدین بھی وفور شوق سے مغلوب زیارت کے لیے میانوالی پہنچے۔ پیر صاحب، غازی علم الدین کے جلال و جمال سے اتنے مرعوب ہوئے کہ آپ سے کوئی بات کرنے کا یارا نہ پا سکے اور سورہ یوسف کی تلاوت کرنے لگے۔ آپ حالانکہ اچھے قاری اور حافظ قرآن تھے مگر اس دن جانے کیوں زبان میں لکنت آرہی تھی اور وفور جذبات کی وجہ سے بار بار رک جاتے۔ اس پر غازی علم الدین نے کہا:

''آپ بسم اللہ پڑھ کر ایک مرتبہ پھر سے شروع کریں۔''

چنانچہ آپ دوبارہ پڑھنے لگ گئے، مگر روانی اب کے بھی نہیں تھی۔ اکثر گلوگیر ہو کر رک جاتے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ وہ ہر لحہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے تھے۔ غازی صاحب جو قاری یا حافظ قرآن نہ تھے اور قرآن ناظرہ بھی آسانی سے نہیں پڑھ سکتے تھے اور انہیں سورہ یوسف بھی پہلے ہرگز زبانی یاد نہ تھی، پیر صاحب کو صحیح لقمے دیتے رہے۔ پیر صاحب جب ملاقات کر کے باہر آئے تو فرطِ حیرت واستعجاب کی وجہ سے بول نہیں سکتے تھے۔ صرف اتنا ہی فرمایا:

''میں علم الدین کے لبادے میں کوئی اور ہستی پاتا ہوں۔ وہ لوگ نورِ بصیرت سے محروم ہیں جو آپ کو ان پڑھ اور جاہل کہتے ہیں۔''

پنجابی ادب کے حلقے میں اُستاد شاعر حضرت عشق لہر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ مسلم لیگ کے ایک سرگرم رکن اور انقلاب کے مشاق شاعر تھے۔ آپ کے غازی موصوف کے خاندان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ ان کی غازی علم الدین سے آخری ملاقات ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو جیل میں ہوئی، جو تاریخی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کا بیان ہے:

''غازی کی شہادت میں صرف ایک دن باقی تھا۔ موت لمحہ بہ لمحہ دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے نبی آخرالزماں ﷺ کے فدا کار کو بے حد مسرور اور مطمئن پایا۔ ہاں! وہ واصل بحق ہونے کے لیے بے قرار بھی تھے۔''

غازی علم الدین نے استاد عشق لہر سے فرمائش کی کہ آپ میرے حسب حال کچھ اشعار ارشاد فرمائیں۔ استاد سخن نے بڑی گرم جوشی کا مظاہر کرتے ہوئے کہا:

''سناؤں گا اور ضرور سناؤں گا۔ مگر میں آج کے دن پہلے آپ سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔''

اس پر غازی علم الدین نے فارسی کے چند اشعار مستانہ لہجے میں پڑھ کر سنائے۔ ان کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''میں عاشق سرمست ہوں مجھے تختۂ دار کا کیا غم؟ ایک جانباز پروانہ ہوں اور آگ سے ہرگز نہیں ڈرتا۔ میں طالب دیدار ہوں۔ مجھے کسی طرح کا اندیشہ نہیں۔ بھلا پھولوں کے ایک شیدائی کو کانٹوں سے کیا خوف ہوسکتا ہے؟ میں تو یادِ محبوب کے نشہ سے چُور چُور ہوں۔ دشمن کی کوئی پروا نہیں۔ جسے خزانہ مل جائے وہ سانپ سے کیا ڈرے گا؟ پھانسی کا منظر میرے لیے تخت شاہی سے کہیں زیادہ محترم ہے۔ ہاں! میں عشق میں حلاج ہوں اور تختہ سے قطعاً نہیں گھبراتا۔''

غازی علم الدین گو ناخواندہ تھے، لیکن انہیں اس طرح کے بہت سے شعر یاد ہو گئے تھے۔ آپ سے ایسا سحر انگیز کلام سن کر استاد عشق لہر پر کافی دیر جذب و مستی کی کیفیت طاری رہی۔ آخر

آپ نے سر اٹھا کر آہستہ سے پوچھا:

''اے فخر دین وملت! اے پروانہ شمع رسالت! آپ کی آخری خواہش کیا ہے؟''

اس پر غازی صاحب نے جھٹ فرمایا:

''میرے دل میں یہی ایک تمنا ہے۔ ناپائیدار رشتۂ حیات جلد از جلد ٹوٹ جائے تا کہ روح مضطرب کی درِ جاناں تک رسائی ہو۔''

واقعی! انتظار کی گھڑیاں بڑی صبر آزما ہوتی ہیں۔ ان کی طوالت کو تو علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر ضیاء الدین ایسے ماہر ریاضیات بھی نہیں ماپ سکے۔ عشق کے روگ بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ دیکھیے بن مریض عشق کو لقمان زمانہ کی چارہ گری سے بھی کچھ افاقہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد غازی علم الدین کی فرمائش پر استاد عشق لہر نے ذیل کے پنجابی اشعار اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر سنائے جو کہ غازی صاحب کے حال کے عین مطابق تھے۔

وچ چودھویں صدی دے ہویا روشن تیرا عشق عاشق حضور دیا
جھوٹا دار دی پینگھ نے جھوٹیا ای شوق نال ساتھی منصور دیا
سب دیاں اکھیاں وچ سما گیا ایں علم الدین توں ذریا طور دیا
عشق لہر دی عرض دربار رسول اندر پہلے کریں مسافرا دُور دیا

ابوالافضل پیر غلام دستگیر نامی نے اپنے پمفلٹ میں غازی علم الدین شہید اور استاد عشق لہر کی تاریخی ملاقات پر بڑی روشنی ڈالی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ عشق لہر کا حقائق پر مبنی کلام سن کر غازی موصوف بڑے خوش ہوئے۔ ان کا چہرہ اور بھی دمک اٹھا اور طبیعت بے حد ہشاش بشاش ہوگئی۔ استاد عشق لہر کے کلام سے متاثر ہو کر آپ نے فرمایا کہ اے استاد عشق لہر! آپ کے ذوق سے مجھ میں مزید کیف، جذب اور مستی پیدا ہوگئی ہے اور کچھ خیالات، کلام موزوں بن کر میرے ہونٹوں پر آرہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو سنا دوں؟ استاد عشق لہر کے اشتیاق پر غازی ممدوح نے مستانہ لہجے میں اپنے تاریخی اشعار پڑھ کر سنائے جن کا ایک ایک حرف تاریخ اسلام میں جلی حروف سے لکھا جائے گا۔

اس کے بعد عشق لہر کافی دیر تک غازی صاحب کے ساتھ مصروف گفتگو رہے اور اس موقع پر غازی صاحب سے ان کا جو منظوم کلام سنا وہ مندرجہ ذیل ہے:

ستا پیاساں کسے خیال اندر جاگے بھاگ وصال دی رات آئی

طاقت نئیں ہن کراں بیان موہوں جو جو نظر مینوں کرامات آئی
کسے پاسیوں نور دے چڑھے بدل ہندی رحمتاں دی برسات آئی
ودھ کے کسے بزرگ نے کہیا مینوں، تیرے پاس محمدؐ دی ذات آئی



پیسے خرچن نوں ملے تے چھری لےلئی وچ لگی اوہدی گھات میاں
دن ہفتے دا دشمن نوں ماریا جد میرے نال سی رب دی ذات میاں
وبلا ہویا حضورؐ دا لے بدلہ مینوں ملی پھر میری برات میاں
علم الدین محبت دی ملی دولت دتی جان میں سمجھ زکات میاں



اُستاد عشق لہر ملاقات کا حال یوں بیان فرماتے ہیں کہ جب میں ملاقات کے لیے گیا تو عاشق رسولؐ نے کہا:

''اُستاد! میرا دل آپ سے ملنےکو چاہتا تھا۔ الحمدللہ کہ آپ گئے۔''

اُستاد نے جواب دیا کہ یہ آپ کی کشش ہی کا اثر ہے کہ بیٹھے بیٹھے دل میں خیال آیا کہ چلو علم الدین کا دیدار کر آئیں۔ چنانچہ فوراً ٹکٹ لے کر ریل گاڑی پر سوار ہوا اور آپ کے پاس پہنچ گیا ہوں۔

علم الدین کہا:

''میرے حسب حال کوئی شعر کہے ہوں تو سناؤ۔''

اُستاد نے جواب دیا: علم الدین اگلے روز آپ کی والدہ تم سے ملنے کے لیے آئیں۔ مامتا کی ماری کے بے اختیار آنسو نکل آئے تو آپ نے کہا کہ خبردار! جس کو مجھ سے رو کر ملنا ہو، وہ نہ ملے۔ علم الدین! تم جانتے ہو، شاعر کس قدر رقیق القلب ہوتے ہیں۔ اگر شعر سناتے ہوئے میرا دل بے قابو ہو گیا تو کیا مجھ سے بھی ناراض ہو جاؤ گے؟

وہ شیر دل نوجوان بولا:

''اُستاد! دل کو خوب قابو میں رکھ کر سناؤ۔ اگر آپ بھی رونے لگے تو میں آپ سے بھی منہ پھیر لوں گا۔ میں نے تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنی والدہ محترمہ سے احوال واقعی عرض کیا تھا۔ اگر یہ حال دوسرے لوگ بھی دیکھ لیں تو بخدا کبھی غم نہ کریں۔''



تختۂ دار پر کیا ہوا؟

پریوی کونسل سے اپیل خارج ہونے کے بعد سزا پر عمل درآمد یقینی ہوگیا تھا۔اس لیے میاں طالع مند نے حکومت سے درخواست گزاری کہ علم الدین کو میانوالی کی بجائے لاہور میں پھانسی دی جائے ،لیکن گورنمنٹ نے ناعاقبت اندیشی کا دامن تھام رکھا تھا۔لہٰذا یہ استدعا توجہ کے قابل نہ سمجھی گئی اور ۲۳۔اکتوبر کو برطانوی حکومت نے یہ درخواست مسترد کر دی،جس کے بعد صرف شہادت کے دن کا انتظار تھا۔

۲۷۔اکتوبر کو جب غازی علم الدین سے رشتہ دار ملے تو انہوں نے فرمایا کہ تم لوگوں میں سے کوئی بھی رو کر مجھے نہ ملے ،ورنہ اس سے منہ موڑ لیا جائے گا۔میرا بھائی اب اکیلا رہ جائے گا،تم سب اس کو اپنا بھائی سمجھنا۔مجھ کو وفات کے بعد یہاں غسل دینا اور جنازہ بھی یہاں پڑھنا تا کہ میانوالی کے مسلمانوں کی دعاؤں سے بھی فائدہ اٹھالوں۔پھر مجھے لاہور لے جانا۔راستے میں جو اسٹیشن آئے اور گاڑی ٹھہرے، باآواز بلند کلمہ شریف کا ذکر کرنا۔اس سے میری روح خوش ہوگی۔

لاہور لے جا کر مجھے دوبارہ غسل دینا اور اگر ہو سکے تو وہ چارپائی جس پر مولوی تاج دین کی نعش لے جائی گئی تھی ،ضرور مہیا کر لینا۔پھر میرا جنازہ چوبرجی والی گراؤنڈ میں لاہور کے مسلمانوں کی دُعائے خیر کے لیے پڑھیں۔

قبر کے متعلق آپ نے فرمایا: میری قبر پختہ نہیں بلکہ کچی تیار کرانا۔ہاں!اس کی حفاظت کے لیے ایک تھڑا بنا دینا اور قبر کے گرد میرے والد کٹہرا خود اپنے ہاتھ سے تیار کریں اور گلاب کے چار گملے میری قبر کے چاروں کونوں پر ضرور رکھنا۔قبر کے قریب درخت لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری قبر ننگی ہوتا کہ باران رحمت کی بوندیں اس پر آنے سے نہ رکیں۔صندوق میں رکھ کر پختہ قبر نہ بنانا۔میں سنت کے طریقہ پر دفن ہونا چاہتا ہوں۔میں آقائے دو جہاں ﷺ کا کمترین غلام ہوں۔سوائے اس کے مجھ میں اور کوئی وصف نہیں۔جب تم میں سے کسی کو مجھ سے ملنے کی خواہش ہو تو درود شریف اور آیت کریمہ پڑھنا اور خدائے کریم سے میرے ملنے کی دعا کر کے سو جانا۔میں انشاءاللہ ضرور ملوں گا۔پھر والدہ محترمہ سے مخاطب ہو کر کہا

''اماں! تو اپنا دودھ بخش دے اور تو خوش ہو کہ مجھے ایسی موت نصیب ہوئی ہے،جس کی بڑے بڑے غازی آرزو رکھتے تھے۔یہ حق کی دین ہے کہ آگ لینے جائے اور پیغمبری لے کر آئے۔میرے جیسا حقیر

گناہ گار اور یہ احسان ربی! میں خوش ہوں اور آپ کے لیے بھی یہ بڑی خوشی کا مقام ہے۔''

۲۸۔ اکتوبر کو عزیز و اقارب کا جب پہلا دستہ ملاقات کے لیے کال کوٹھڑی کے قریب پہنچا تو غازی موصوف کھڑے ہو گئے۔ دوسرے اور تیسرے دستے میں صرف عورتیں تھیں۔ غازی علم الدین نے اپنی والدہ محترمہ سے کہا:

''اماں! خدا کا شکر کرو، میں ایسی موت مر رہا ہوں جو درحقیقت موت نہیں ہے۔ لوگ تو سانپ ڈسنے سے بھی مر جاتے ہیں مگر میری موت تو مثالی ہے۔ رونے دھونے کی ضرورت نہیں، ہماری انشاء اللہ ہر آٹھویں دن ملاقات ہوا کرے گی۔''

آپ نے مزید فرمایا:

''میرے جنازے کو لاہور لے جائیں۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہہ دیا ہے کہ وقت مقررہ پر میرے ہاتھ نہ باندھے جائیں۔ میں خود بہادروں کی طرح جان دینا چاہتا ہوں اور رسے کو بوسہ دے کر پھانسی کے تختے پر چڑھوں گا''۔

آپ نے اپنے بھائی سے کہا: ''میرے بعد آپ اکیلے نہیں بلکہ سب مسلمان تمہارے حقیقی بھائی ہیں۔'' اس کے بعد آپ نے فرمایا:

''مجھے ہندوؤں کے ساتھ کوئی عداوت نہیں۔ جب میں لاہور جیل میں سردار بھگت سنگھ سے ملا تو میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ راجپال مفسد پرداز تھا، جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد برپا کر رکھا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کا کام تمام کر دیا تا کہ میرے ملک کے لوگ امن سے زندگی بسر کر سکیں۔ کیونکہ جس ملک میں میرے آقا و مولاؐ کے خلاف زہر اگلا جائے، اس میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔''

پھر آپ نے فرمایا: ''اور میں کچھ شعر لکھ رہا ہوں جو آخری ملاقات میں دوں گا۔ ۲۹۔ اکتوبر کو غازی علم الدین شہید کے ایک دوست میانوالی جیل میں ملاقات کے لیے تشریف لائے تو آپ نے ان سے فرمایا:

''بھائی! اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھ کر جو کچھ تمہارے سامنے بیان کروں، اسے اہل علم کے گوش گزار کر دینا کہ میرے متعلق اگر کسی کو کوئی غلط فہمی ہو تو دور ہو جائے۔ راجپال کا قاتل میں ہوں اور یقیناً میں نے ہی حضور علیہ السلام کی محبت کے والہانہ جذبے سے بے اختیار ہو کر اس فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ میں نے موت کے ڈر سے عدالت میں ارتکاب فعل سے انکار کر دیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ حیات دنیا مستعار ہے اور سب کو ایک دن اس دار فنا سے گزرنا ہے، پھر میں کیونکر موت سے ڈر سکتا تھا؟ سیشن عدالت میں، میں نے ایک مرتبہ بزرگوں کے مجبور کرنے پر بادل نخواستہ بیان دیا۔ وہ ایک فقرہ جو میں نے جج کے سامنے گوش گزار کیا، اس سے بھی انکار ثابت نہیں ہوتا۔ دراصل اس فقرے میں رشتہ فرزندی کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے ذو معنی انداز اپنایا تھا۔

میرے نزدیک عشقِ رسول میں کٹ مرنا وہ بلند ترین مرتبہ ہے، جو کسی کسی کو ہی مل سکتا ہے۔ اس لیے موت پر غمگین ہونا تو درکنار میرے لیے تو یہ خبر کہ پریوی کونسل سے میری اپیل نامنظور ہوگئی ہے، انتہائی مسرت کا موجب ہے اور میں خوش ہوں کہ مشیت ایزدی نے اس زمانے میں چالیس کروڑ مسلمانوں میں سے مجھے اس سعادت کے لیے منتخب کیا۔

تمام مسلمانوں کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ وہ میرے جنازے پر آنسو نہ بہائیں۔ اس موقع پر اپنی قوم کی آنکھوں میں اشک نہیں ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں''

۳۰۔ اکتوبر کو آخری ملاقات کے لیے غازی علم الدین کے ورثا کو جیل میں بلایا اور انہیں پانچ دستوں میں تشکیل دیا گیا۔ ہر دستہ چودہ افراد پر مشتمل تھا۔ پہلا دستہ غازی موصوف کے والد میاں طالع مند کے ہمراہ دس بجے ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ غازی صاحب ملاقاتیوں سے مسکرا کر ملے، باری باری ان کی خیریت دریافت فرمائی۔ آپ نے والد محترم سے عرض کیا:

''میری قبر اپنے ہاتھوں سے تیار کرنا اور میرے حق میں دعائے خیر

فرماتے رہنا''

غازی صاحب نے خود روزہ رکھا ہوا تھا مگر مہمانوں کو گھڑے سے اپنے پیالے میں دو دو گھونٹ پانی پلا رہے تھے۔ یہ گھڑا، ان کے پاس برآمدے میں پڑا رہتا تھا۔ دوسرے دستے کی قیادت غازی کی والدہ محترمہ کر رہی تھیں۔ اس دستے میں صرف عورتیں تھیں۔ آپ نے والدہ محترمہ سے درخواست کی:

''آپ افسوس کرنے کی بجائے اس بات پر فخر کیا کریں کہ اس نے ایک ایسا مایہ ناز فرزند جنا جس کو شہادت کا اعلیٰ درجہ نصیب ہوا ہے۔ یہ صرف اچھی تربیت اور آپ کی نیک دعاؤں کا ثمر ہے، وگرنہ مجھ ایسے گناہ گار اور غافل انسان کو یہ بلند مقام کیونکر حاصل ہو سکتا تھا!''

تیسرا دستہ شہید موصوف کے برادرِ اکبر میاں محمد دین کے ساتھ آپ کے پاس پہنچا تو آپ پہلے کی طرح کھڑے ہو گئے۔ سب عزیزوں سے ان کی خیریت پوچھی اور بڑے بھائی سے میٹھی میٹھی باتیں ہوئیں۔ شمع رسالت کے پروانے نے بھائی کو اپنی منگیتر فاطمہ بی بی کے متعلق وصیت فرمائی کہ اسے ہر ممکن خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہنا اور اس کی شادی میں بھائی کی حیثیت سے شامل ہو کر تمام حقوق ادا کرنا۔

چوتھے دستے میں غازی موصوف کی ہمشیرہ معراج بیگم کے ساتھ صرف عورتیں تھیں۔ آپ انہیں پرتپاک طریقے سے ملے۔ سب کے ساتھ فرداً فرداً مخاطب ہوئے۔ بہن کے ساتھ محبت بھری باتیں کیں اور فرمایا:

''میری بہن! تو بہت خوش نصیب ہے۔ آج کے بعد تو ہمشیرہ شہید رسالتؐ کے نام سے پہچانی جائے گی۔''

کسی بہن کے ارمانوں کی دنیا قید حروف میں نہیں آ سکتی۔ لہٰذا یہاں خاموشی ہی مناسب ہے۔ وہ حسرت انگیز منظر لکھنے سے نہیں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور دیکھنے کے لیے بھی چشم تصور کی ضرورت ہوتی ہے۔

بالآخر پانچواں دستہ شرفِ ملاقات کے لیے جیل میں حاضر خدمت ہوا۔ اس میں حضرت علم الدین غازی کے قریبی دوست اور بعض دور و نزدیک کے رشتے دار تھے۔ آپ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ دوستی کے لہجے میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ماضی کی یادیں تازہ کی گئیں اور

یوں دو بجے آخری دستے کا وقت ملاقات ختم ہوگیا، حالانکہ غازی علم الدین سے ہزاروں لوگ ملاقات کرنے کے خواہش مند تھے۔



غازی علم الدین راہِ حق میں جام شہادت نوش کرنے کے بڑے متمنی تھے۔ ۲۳۔ اکتوبر کے بعد آپ کی بیتاب نگاہیں دروازے پر لگی رہتیں۔ کسی مبارک آہٹ کے انتظار میں وہ ہمہ تن گوش رہتے اوران کی نرگسی آنکھیں بار بار سوئے بام اٹھ جاتیں۔ اس واقعہ سے بھی آپ کی آرزو کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ایک بار التوائے شہادت کے باعث انہوں نے جیلر کا گریبان پکڑ کر کہا:

"مجھے پھانسی کیوں نہیں دیتے؟ میرے لواحقین پریشان ہورہے ہیں اور میں جدائی کی آگ میں سلگ رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ جلد از جلد اس مرحلے سے گزر کر دربار رسالت ﷺ میں باریابی حاصل کروں۔"

ادھر وصال محبوب کے لیے شوق کا یہ عالم تھا، لیکن ادھر رشتہ داروں کے گھر سے الفراق، الفراق کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہاں شہید موصوف کے ماموں سراج دین کا یہ واقعہ قلمبند کرنا نہایت موزوں رہے گا کہ پریوی کونسل سے اپیل خارج ہونے کے بعد انہوں نے مزنگ میں پھانسی دینے والے جلاد کے گھر کے بالکل قریب ایک مکان کرائے پر لیا اور اس میں رہنے لگے تھے تاکہ جب یہ پھانسی دینے کے لیے باہر نکلے تو مجھے خبر ہوجائے۔

۳۰۔ اکتوبر کی شام جب حضرت غازی صاحب کو بتایا گیا کہ کل علی الصبح آپ کو پھانسی دی جارہی ہے تو ان پر نشہ سا طاری ہوگیا۔ خوشی سے رگوں میں خون کی لہریں گردش کرنے لگیں اور وہ اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے۔ آپ کے چہرے پر کسی قسم کے تاسف یا پریشانی کے آثار بالکل نہ تھے۔ خوشیاں ان کا طواف کرکے وجد میں محو رقص تھیں اور ان کا رنگ کندن کی طرح چمک رہا تھا۔

۳۰، ۳۱۔ اکتوبر کی درمیانی شب گویا کہ شب برات تھی، جو اپنے دامن میں بے پناہ مسرتیں سمیٹ کر لائی۔ وہ سوز و گداز کے ماحول میں ڈوبی ہوئی غازی علم الدین کی ظاہری زندگی کی آخری رات تھی۔ نواب دین وارڈن جیل (ساکن پھگواڑہ) کا بیان ہے کہ غازی علم الدین کو ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو تختہ دار پر چڑھایا جانا تھا اور میں ان کے کمرے کا نگران تھا۔ جیل کے اندر اور باہر سخت پہرہ تھا۔ شب دیجور میں مضافات کی کوئی شے نظر نہ آتی تھی لیکن اس فداکار کا پرنور چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ غازی علم الدین رات بھر خدا تعالیٰ کے حضور میں سربسجود رہے۔ اس اثناء میں کئی بار

درود وسلام کا ورد کیا اور رات کے پچھلے پہر وہ مترنم آواز میں جھوم جھوم کر دل گداز نعتیہ کلام کے گلدستے دربار رسالت مآبؐ میں پیش کرنے لگے۔ آپ کی مناجات نسیمِ شمالی اور معطر ہواؤں کے دامن میں طیبہ کا سفر طے کرتی رہیں۔ اس دوران لمحہ بہ لمحہ ان کی بے قرار آنکھیں آسمان کی جانب اٹھتیں۔ اسی عرصہ میں ایک لمحے کے لیے مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا مگر میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں ،لیکن اب کے علم الدین غائب تھے۔ میں گھبرا گیا اور وسوسے ذہن پر مسلط ہونے لگے۔ میری حیران و پریشان نظریں چارسو کا جائزہ لینے لگیں اور پھر میں نے اسی بدحواسی کے عالم میں کال کوٹھڑی کا مشاہدہ کیا۔ آہنی سلاخیں جوں کی توں موجود تھیں دروازہ بدستور مقفل تھا اور کسی دیوار میں بھی کوئی شگاف نہیں تھا۔ میں پریشانی کے عالم میں دیگر ملازموں کو آوازیں دینے لگا کہ دفعتاً کنج اسارت بقعہ نور بن گیا۔ اب تاریکی کی جگہ نور ونکہت کا ایک سیل رواں تھا۔ میں نے دیکھا غازی علم الدین خشوع وخضوع سے ایک مصلے پر بیٹھے نظریں اوپر اٹھائے خاموشی کی زبان میں کسی سے محو گفتگو ہیں۔ اس وقت ایک نورانی بزرگ کا دست شفقت آپ کے سر پر تھا۔ جب میں زیارت کے لیے سلاخوں کے قریب گیا تو وہ مہمان بزرگ روپوش ہو گئے اور ناموس رسالت ﷺ کا محافظ جوں کا توں تسبیح وتہلیل میں مستغرق تھا۔



۳۰۔ اکتوبر کو یہ خبر کہ کل غازی علم الدین کو شہید کر دیا جائے گا، آناً فاناً سارے شہر اور مضافات میں پھیل گئی۔ چنانچہ بدھ کی رات کو نو بجے کے قریب موسیٰ خیل، عیسیٰ خیل، داؤد خیل سے اور مقامی مسلمان جوق در جوق آنا شروع ہو گئے۔ جیل سے شہر تک دو میل کے فاصلے پر انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا تھا۔ وہ لوگ اپنے ساتھ ڈھول لائے تھے اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں اس زور سے ڈھول بجاتے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ وہ لوگ ریتلے میدان میں رات بھر درود شریف کا ورد کرتے رہے۔ ان کی یہ بڑی تمنا تھی کہ وہ صبح اول ہی اول شہید کا چہرہ مبارک دیکھیں گے۔ آدھی رات کے وقت لاہور سے تاج دین بٹ، میاں نیاز احمد، نیاز محمد کمبوہ، ملک منظور الٰہی اور دیگر اہم افراد بھی میانوالی پہنچ گئے، جنہوں نے غازی علم الدین کے نعروں کا جواب دینے کا پورا پورا انتظام کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈھول بجانے کا اہتمام حضرت قبلہ غازی صاحب کے حکم کی تعمیل میں ہی ہوا تھا۔



۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء مطابق ۲۶ جمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ صبح صادق بطل حریت، محافظ دین و ملت، پروانۂ شمع رسالت کے لیے وصال کی خوشیوں کا پیغام لے کر آئی۔ ڈپٹی کمشنر پھانسی گھر میں پہنچ چکا تھا۔ داروغہ جیل، سول سرجن اور دوسرے متعلقہ حکام بھی موقع پر موجود تھے۔ غازی علم الدین، نماز پڑھنے کے بعد قبلہ رو ہو کر درود وظائف میں مصروف تھے کہ ساڑھے چھ بجے ڈاکٹر اور داروغہ جیل نے آ کر یہ خوشخبری سنائی، اے غازی! جس کا آپ کو انتظار تھا، وہ مبارک ساعت آن پہنچی ہے۔ آپ نے کہا: ''بسم اللہ میں حاضر ہوں چلئے!''

جیل کے قواعد کے مطابق آپ کو سیاہ لباس پہنا دیا گیا۔ اس وقت ان کے چہرے پر بشاشت، طمانیت اور تسکین خاطر کا نور چمک رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے پوچھا:

''آپ کی کوئی آخری خواہش؟'' اس پر غازی علم الدین مسکرائے اور فرمایا:

''صرف دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے کی اجازت۔''

چنانچہ آپ نے دو رکعت نفل پڑھے اور منزل شوق کی طرف جادہ پیما ہوئے۔ غور طلب پہلو یہ ہے کہ ایک شخص سوئے دار چلا جا رہا ہے۔ ہونٹوں پر تبسم کی کرنیں رقصاں ہیں۔ خوش چال ہرن اس کی گام زنی کی ادائیں چراتا ہے۔ قلبی طمانیت پر باد صبا قربان ہوا چاہتی ہے۔ استقامت دامن پھیلائے بیٹھی ہے۔ چہرے پر ایسی شگفتگی کہ پھول رشک کے نشہ میں چور چور۔ مستقل مزاجی کے سامنے پہاڑوں کے دل پگھل رہے ہیں اور کائنات کی رعنائیاں ان کے پاؤں تلے بچھی جاتی ہیں۔

ایمان پرور نظارہ دید کے قابل تھا۔ اسلام کا فرزند موت کا جشن مناتا ہے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ فرش خاک کا ذرہ ذرہ مرحبا غازی! مرحبا غازی! پکار رہا ہے۔ موت کا سن کر بڑے بڑے بہادر کانپ جاتے ہیں۔ ان کے چہرے پژمردہ، حواس مختل، آنکھیں مبہوت اور زبانیں گنگ ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر اس ''فدائی'' میں جانے وہ کون سی بات تھی کہ اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا تو جیل سے باہر عظیم مجمع کے ایک ایک فرد کو سنائی دیتا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب واصل بحق ہونے میں صرف ایک گھڑی باقی تھی۔ تختہ دار پر کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا:

''حاضرین! بلاشبہ شاتم رسول کا قاتل میں ہوں۔ میں نے اسے
جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر قتل کیا۔ آپ سب میرے کلمہ کے گواہ رہو۔''

چنانچہ آپ نے باآواز بلند کلمہ شہادت پڑھا۔ دار و رسن کو چوما اور درود سلام کا ورد کرتے

ہوئے پھندے کو گلے میں ڈال لیا۔اس پر مجسٹریٹ نے کہا:

"اے غازی! یہ تو خودکشی کے مترادف ہے، جو جرم ہے اور گناہ بھی۔"

آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ تمہارا علم کا مذہب اور میرا عشق کا، پھندا گردن سے نکال دیا۔ آپ نے رسی کو بوسہ اس لیے دیا تھا کہ وہ ہر اس شے کو متبرک ومقدس سمجھ کر اس کی عزت وتکریم کیا کرتے تھے جوان کو بارگاہ رسالت ﷺ میں پہنچانے کا ذریعہ ہو۔ جام شہادت نوش کرتے وقت آپ کے چہرے سے مسرت ٹپکتی تھی۔ وہ بڑے جوش سے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے کہ باہر تک آواز سنائی دیتی۔ باہر سے بھی غازی صاحب کے ارشاد کے مطابق متواتر اللہ اکبر کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جیل کے قواعد کے مطابق آپ کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے باندھ دیئے گئے۔ سیاہ ٹوپی پہننے سے پہلے آپ جیل کے مسلمان ارکان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔

آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور سات بجے جلاد نے تختہ کھینچ دیا۔ دل کہتا ہے کہ اتنے میں ساقیٔ کوثر اپنے مے خوار کے لیے مقتل میں تشریف لے آئے ہوں گے اور غازی علم الدین کی بے قرار روح آشیانہ خاکی سے اڑ کر اپنے آقا ومولاؐ کے قدوم میمنت لزوم سے لپٹ گئی ہوگی۔ اگر اسی کا نام موت ہے تو اے کاش! یہ بار بار آئے۔



غازی علم الدین شہید کو آٹھ بجے تختہ دار سے اتارا گیا۔ جیل کے باہر پر امن ہجوم شہید کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھا۔ ان کی نگاہیں جیل کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ دس بجے شہید ناز کی لاش کو ایک چارپائی پر ڈال کر باہر لایا گیا۔ گروہ کے گروہ اس میدان کی طرف بڑھے، جہاں آپ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی کا نام غالباً 'بی۔ ٹی' تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ چارپائی کو اٹھا کر لے چلو۔ لوگ بھی کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے جنازے کے پیچھے ہو لیے۔ جب شہید کے جنازے کو لاوارثوں کے قبرستان میں لے جا کر رکھ دیا گیا تو اس وقت تمام ہجوم قبرستان سے متصل سڑک پر اپنے عاشق رسول کے چہرہ انور کو دیکھنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ حکام نے جب دیکھا کہ لوگ کسی طرح گھروں کو نہیں جا رہے تو سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سپاہیوں کو پر امن ہجوم پر سنگ باری کا حکم دیا، جس پر لوگ پتھر کھاتے رہے۔ ادھر ڈپٹی کمشنر نے فرزند توحید کو بغیر کفن کے گڑھے

میں ڈال دیا اور نمازہ جنازہ کی اجازت تک نہ دی۔ اس دوران بعض جوشیلے مسلمانوں نے بھی پولیس پر پتھر پھینکے، جس سے ڈی۔ ایس۔ پی شدید زخمی ہوگیا۔ جب آپ کو دفن کیا جارہا تھا تو ایک مسلمان نمبردار قیدی نے اپنا کمبل درود وسلام پڑھ کر آپ کے جسم پر ڈال دیا۔ اس شخص کو جس کے وارث کروڑوں مسلمان تھے، جابر اور ظالم برطانوی حکومت نے لاوارثوں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔

حصول میت کی جدوجہد

غازی علم الدین شہیدؒ کے ورثاء نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ پھانسی میانوالی کے بجائے، لاہور میں دی جائے، لیکن حکومت نے اس درخواست کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ ۳۰ اکتوبر کو میاں طالع مند نے انارکلی کے منشی طاہر الدین کے نام ایک تار بھیجا جس کا مضمون یہ تھا:

''جیل کے حکام سے کوئی اطلاع نہ ملنے پر ہم ڈی۔سی کے پاس چلے گئے جس نے بتایا کہ کل علم الدین کو پھانسی دی جائے گی، لیکن میت لاہور لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

درج بالا خبر کہ کل صبح علم الدین کو جام شہادت پلا دیا جائے گا اور ورثا کو ان کی میت لاہور لانے کی اجازت نہیں ہے، پورے لاہور میں برق رفتاری سے پھیل گئی اور مضطرب لوگ جوق در جوق شہر میں گشت کرنے لگے اور گروہ کے گروہ صورت حال معلوم کرنے کے لیے اخباروں کے دفتر میں پہنچے۔ ہر طرف اللہ اکبر اور غازی علم الدین زندہ باد کے نعرے سنائی دینے لگے۔ مسلمان اس خبر سے خاصے مشتعل تھے کہ میت کو لاہور لانے سے روکنے کے بہانے تراشے جارہے ہیں جو مسلمان قوم کی سخت توہین ہے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور مسلمانوں میں جابر حکومت کے خلاف ایک زبردست اضطراب و ہیجان پیدا ہوگیا۔ دوسرے دن مسلمانوں نے عام ہڑتال کی، روزے رکھے اور جگہ جگہ ننگے سر جلوس نکالے۔ ۳۱۔ اکتوبر کو صبح دس بجے دن، ایک بہت بڑا جلسہ دہلی دروازہ کے باغ میں چوہدری محمد گھسیٹا کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ تلاوت و نعت کے بعد مولانا سید امام علی شاہ نازش رضوی مدیر معاون ''سیاست'' نے ایک نظم پڑھی۔ پھر مولانا سید حبیب شاہ صاحب کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا:

''کل عصر کے وقت لاہور میں میانوالی سے کئی تار وصول ہوئے،

جن سے معلوم ہوا ہے کہ آج صبح صادق کے وقت غازی علم الدین کو شہید کر دیا جائے گا۔ یہ خبر بجلی کے ذریعے آئی اور بجلی کی تیزی سے تمام شہر میں پھیل گئی۔ صدہا مسلمان رات کے دس بجے تک دفتر ''سیاست'' میں آئے، اس لیے کہ اس خبر کے ساتھ یہ اطلاع بھی درج تھی کہ حکومت نے شہید کی لاش کو لاہور لانے کی اجازت نہیں دی۔

میاں علم الدین نے جو کام کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ آپ نے صفحہ دہر پر انمٹ الفاظ میں اپنے خون سے یہ حقیقت منقش کر دی ہے کہ میاں صاحب شہید ہیں۔ ہم ان کا لاشہ حکومت سے طلب کرتے ہیں، اس لیے کہ ہر بت پرست، ہر خدا پرست، ہر عیسائی اور موسائی، غرض ہر مذہب کے لوگ مرنے والے کی وصیت کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور شہید مرحوم نے یہ وصیت کی ہے کہ ان کو لاہور میں دفن کیا جائے۔ اس فرض کو پورا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

شہید مرحوم اب اپنے والد یا رشتہ داروں کا مال نہیں رہے۔ وہ خدا اور اس کے رسول پاک کا مال ہیں۔ وہ ہم مسلمانوں کا ورثہ ہیں۔ ان کی عزت ہماری عزت ہے۔ نیز مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے مرنے والے بھی ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ ان کا فیض مرنے سے ختم نہیں ہوتا اور شہید تو زندہ جاوید ہیں۔ ہر شہید گناہ سے پاک ہوتا ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ نماز جنازہ مرحوم اور زندہ دونوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔ مرحوم نیک ہو تو نماز ادا کرنے والے بخشے جاتے ہیں اور اگر نمازیوں میں ایک بھی مرد مقدس موجود ہو تو مرنے والے اور نماز پڑھنے والوں کے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔''

اس تقریر کے بعد سید حبیب شاہ صاحب اور ملک فتح شیر خاں گورنر کو تار دینے چلے گئے۔ ان کے چلے جانے پر مولوی مظہر علی اظہر، علامہ تاج دین احمد تاج اور جناب ظہور احمد شوخ صاحب نے نظم و نثر میں اظہار خیال کیا اور جلسہ منتشر ہو گیا۔ اس روز ننگے سر درجنوں چھوٹے چھوٹے جلوس نکالے گئے، جو مختلف اہم راستوں سے گزر کر بھاٹی دروازہ پہنچے اور وہاں سے

موچی دروازہ میں آئے۔

اسلامی جمعیت کا ایک بے پایاں سمندر تھا جو لاہور کے بازاروں میں اُمڈا چلا آرہا تھا۔ پر جوش ہجوم نہایت مشتعل تھا اور گورنمنٹ ہاؤس تک جانا چاہتا تھا، مگر سنجیدہ اصحاب نے اس پر قابو پائے رکھا۔ بعد میں موچی دروازہ باغ میں جلسہ ہوا۔ مجمع پچیس تیس ہزار کے لگ بھگ تھا۔ میاں محمد بخش مسلم صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔ ڈاکٹر سلطان احمد سیکرٹری مجلس خلافت پنجاب اور دیگر اشخاص نے اس امر کی قراردادیں منظور کیں، حکومت کو چاہیے کہ علم الدین کی نعش بلاشرط مسلمانوں کے حوالے کر دے تاکہ وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین لاہور میں کی جاسکے۔ شیخ غلام مصطفیٰ حیرت معتمد انجمن احرار اسلام نے مذکورہ قرارداد کی پرزور الفاظ میں تائید کی اور کہا:

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ حکومت نے راجپال کی لاش تو ہندوؤں کے حوالے کر دی، مگر مسلمانوں کے لیے یہ بہانہ بنایا جا رہا ہے کہ لاش کے لاہور پہنچنے پر ہندو مسلم فساد کا خدشہ ہے۔"

مولانا محمد بخش مسلم صاحب نے اس قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے اپنی تقریر میں حکومت پر واضح کیا:

"اگر مسلمان مطالبہ نہ کرتے تو اور بات تھی۔ اب جبکہ انہوں نے مطالبہ شروع کر دیا ہے تو یہ کبھی بھی اپنے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ حکومت میت کو جلد از جلد بلا حیل و حجت مسلمانوں کے حوالے کر دے تاکہ تصادم کی نوبت نہ آئے۔"

اس کے بعد یہ قرارداد بذریعہ تار حکومت تک پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا، جس کے لیے سٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے حاضرین نے ایک پیسہ فی کس کے حساب سے چندہ دیا جو بائیس روپے چودہ آنے ہوا۔

لاہور میں ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا۔ ادھر خان محمد اکبر خاں رئیس اعظم میانوالی کی مساعی جمیلہ بھی قابل ذکر ہے۔ ۳۰۔ اکتوبر کی شام کو ایک وفد آپ کے زیر سرکردگی ڈپٹی کمشنر میانوالی سے ملا اور اس سے کہا: ہمیں حکام جیل سے معلوم ہوا ہے کہ میاں علم الدین کی لاش کو لاہور لے جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔

ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا:

> ''شہید کا جنازہ جیل کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔آپ ورثا کو لے کر پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں،صفوں کو درست کر رکھیں۔وہاں نماز جنازہ ادا کریں اور پھر ان کو جیل کے قریب لاوارثوں والے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا جائے گا''۔

اس پر خان محمد اکبر خاں صاحب نے ہر ممکن یقین دلایا کہ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ غازی کی نعش کو ان کے ورثا کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ لاش کو وصیت کے مطابق لاہور لے جائیں،لیکن ان کی ہر ایک آرزو ٹھکرا دی گئی۔آخر میں خان صاحب نے کہا کہ اچھا شہید کو شہر کے قبرستان میں دفنانے کی اجازت دی جائے۔لیکن اس بات کی بھی پروانہ کی گئی اور وفد ناکام و نامراد لوٹ آیا۔اس سلسلے میں میانوالی،موسیٰ خیل،عیسیٰ خیل اور قرب و جوار کے باشندوں کی جرأت بھی قابل داد ہے۔جب انتظامیہ نے میت کو ورثا کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور شہید کی لاش کو لاوارثوں کے قبرستان میں لے جایا جا رہا تھا تو مقامی باشندے اس وقت سخت اشتعال میں تھے۔انہوں نے میاں طالع منداور لاہور کے دیگر معززین سے کہا کہ اگر اجازت دی جائے تو ہم صرف پندرہ منٹ کے اندر لاش انتظامیہ سے چھین دیتے ہیں۔یکم نومبر کو صبح میاں طالع مند کا ایک تار ''انقلاب'' میں پہنچا،جس کا مضمون یہ تھا:

> ''شہید مرحوم کی میت کو بطور امانت چھوڑ کر آ رہا ہوں۔انہیں بری طرح دفن کیا گیا ہے،نماز جنازہ کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔حکام کو لاش چھن جانے کا اندیشہ تھا،اس لیے جلدی سے آپ کو دفن کر کے گڑھا پر کر دیا گیا۔مرحوم اور مٹی کے درمیان صرف ایک کمبل کا پردہ ہے''

اسی روز بعد از دوپہر غازی و شہید کے والد میانوالی سے لاہور تشریف لائے۔مسلمانوں کے جم غفیر نے اسٹیشن پر آپ کا استقبال کیا اور بڑے جوش وخروش سے ''غازی علم الدین شہید زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔۳۔نومبر کو مسلمانان لاہور کا ایک جلوس شہید کے مکان پر پہنچا۔آپ کے بھائی،والد،چچا اور باپ کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور ہدیہ مبارک باد پیش کیا۔اس موقع پر علم الدین شہید کی والدہ نے فرمایا:

> ''اگر میرے سات لڑکے ہوتے اور وہ اسی طرح تحفظ ناموس رسالت کے لیے قربان ہو جاتے تو میں زیادہ خوش ہوتی۔''

جلوس شہید کے لواحقین کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد بیرون باغ دہلی دروازہ میں پہنچا۔ جوشیلے حاضرین نے شہید کی تصویریں اٹھا رکھی تھیں۔ باغ میں وہ جلوس عظیم الشان جلسے کی صورت میں مرتب ہو گیا۔ منشی غلام مصطفیٰ حیرت مدیر ''فردوس'' صدر جلسہ قرار پائے۔ انہوں نے افتتاحی تقریر میں کہا:

''میں نے اپنے خدا سے عہد کیا ہے کہ یا تو اپنے بھائی غازی و شہید کی لاش کو لاہور لاؤں گا یا اپنی قبر بھی وہیں بنواؤں گا جہاں اس شہید کی نعش دفن کی گئی ہے۔''

پھر بشیر احمد رفیقی کے ساتھ وہ تمام رضا کار کھڑے ہو گئے جنہوں نے حلف اٹھا رکھے تھے کہ ہم لاش لائیں گے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کھڑے ہونے والوں میں حکیم احمد حسن، ملک لال دین قیصر اور مولانا ظفر علی خان بھی شامل تھے۔ رضا کاروں نے ایک زبان ہو کر بآواز بلند اس شعر کو بار بار پڑھا:

غازی کی نعش لینے ہم گھر سے جا رہے ہیں
ناموس مصطفیٰؐ پہ جانیں لڑا رہے ہیں

اس روز بعد از دوپہر سر میاں محمد شفیع کی کوٹھی پر مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ غازی علم الدین شہید کے لاشہ کی واپسی پر غور وخوض کیا گیا۔ مولانا غلام محی الدین صاحب نے پرزور الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا کہ علم الدین کی لاش کی عدم حوالگی پر مسلمانوں میں بڑا ہیجان پایا جاتا ہے۔ ہمیں ان کی پوری نمائندگی کرنا چاہیے۔ میں اس کی یقین دہانی کرانے کو تیار ہوں کہ کسی قسم کے فساد کا خطرہ نہیں۔

اس کے بعد حصول نعش کی خاطر مزید صلاح ومشورے کے لیے مسلم معززین کا میاں عبدالعزیز بیرسٹر کے مکان پر اجتماع ہوا، جس میں سید حبیب شاہ، سلطان احمد، حسن دین وکیل اور ملک لال دین قیصر وغیرہم شامل تھے۔ وہاں پر قرارداد پیش ہوئی کہ گورنر کے پاس ایک وفد بھیجا جائے جو گفت وشنید کے ذریعے اپنے مطالبات تسلیم کروائے۔

بنا بریں شیخ حسن دین ایڈووکیٹ اور میاں عبدالعزیز صاحب کی تحریک سے اکابرین لاہور کا ایک جلسہ برکت علی محمڈن ہال (برکت علی اسلامیہ ہال) میں بلایا گیا، جس میں مسلم اخباروں کے ایڈیٹر، اسلامی انجمنوں کی مجلس عاملہ کے ارکان، بعض میونسپل کمشنر اور دیگر بااثر معززین بھی

موجود تھے۔ علامہ اقبال صدر جلسہ قرار پائے۔

گورنر سر جیفری ڈی مونٹ مورنسی متوقع خطرات کے پیش نظر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود اس کے بارے میں کوئی علم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے، اس لیے جلسے کی قرارداد کے مطابق علامہ اقبال نے مسٹر سٹو، وزیر مالیات سے ٹیلی فون پر وقت مقرر کر کے ان سے ملاقات کی۔ اس موقع پر چیف سیکرٹری مسٹر ایمرسن بھی موجود رہا۔ یہ ملاقات تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی، جس میں ڈاکٹر اقبال نے مسلمانان پنجاب کے جذبات واحساسات کا نقشہ کھینچا اور قیام امن کی ذمہ داری خود اٹھائی۔ لیکن حکومت پنجاب بضد تھی کہ شہید کی میت کو میانوالی جیل میں دفن کیا جا چکا ہے اور اب اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں۔

اس بارے میں میاں محمد شفیع (م ش) اپنی یادداشتوں پر مشتمل روداد ''پدرم کسان بوذ'' میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں۔ جس کے مطابق غازی علم الدین شہید کی میانوالی سے نعش لانے کا سہرا بھی محمد شفیع کے سر ہے۔ ہوا یوں کہ لاہور کے منچلے نوجوانوں نے سرکوبی کرتے ہوئے میاں محمد شفیع کا جنازہ نکالا اور جب یہ ماتم کرتے ہوئے نوجوان، اقبال منزل کے سامنے سے گزرے تو سر شفیع نے پوچھ بھجوایا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس پر نوجوانوں نے دھاڑ دھاڑ کر کہا کہ ہم شفیع کا ماتم کر رہے ہیں۔ پوچھا کس شفیع کا؟ مجمع نے بیک آواز جواب دیا کہ سر میاں محمد شفیع کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔ اس پر میاں صاحب نے فرمایا ''وہ کیوں؟'' ماتم گساروں نے کہا کہ اگر میاں شفیع زندہ ہوتے تو علم الدین شہید کی نعش لاہور کے مسلمانوں کو کیوں نہ ملتی! میاں صاحب ساری رمز سمجھ گئے اور انہوں نے فوری طور پر گورنر پنجاب سے ملاقات کی اور انہیں امن عامہ کی ضمانت دی کہ وہ غازی علم الدین شہید کے جنازے پر فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہونے دیں گے۔

حصول نعش کی خاطر مسلمانوں کی طرف سے جلسے جلوسوں کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ ۵۔ نومبر کو ایک زبردست جلوس امیر بخش پہلوان کی قیادت میں نکلا۔ طلبائے کالج اور رضا کاروں نے اپنے اپنے بستر کندھوں پر اٹھا رکھے تھے۔ جب جلوس بھاٹی دروازہ پہنچا تو ایک عظیم الشان جلسہ شروع ہوا۔ یہاں مولانا ظفر علی خان نے ایک زوردار تقریر کی۔ آپ نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا:

''اسلام کے سپاہیو اور لاہور کے مسلمانو! ہم نے دیکھ لیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی غیرت پر مر مٹنے کا نتیجہ کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مردہ قوم زندہ

ہو جائے۔ آج ہماری قوم از سر تا پا عزت وحمیت کا نمونہ ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جس کے مقابلے میں کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔ رضا کاروں کو دیکھو کہ ہر ایک نوجوان صبر وحوصلہ کی بولتی چالتی تصویر ہے۔ ان کے جسموں پر لاٹھیاں پڑیں، انہیں ریزہ ریزہ کر دیا جائے، مگر اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹیں گے۔''

غلام مصطفیٰ حیرت کے بھائی الطاف حسین نے کہا:

''اگر عورتوں کا کوئی دستہ سول نافرمانی کے لیے تیار ہو تو میری والدہ سب سے پہلے اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار ہے۔''

اسی روز ایک لڑکا محمد حسین نامی پیش کیا گیا، جس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال تھی۔ وہ چند معزز اشخاص کی سفارشی چھٹیاں بھی ساتھ لایا تھا کہ اسے سول نافرمانی کرنے والے پہلے جتھے میں شامل کیا جائے۔ وہ گھر سے میانوالی کا کرایہ دو روپے اور اپنا بستر بھی ہمراہ لایا۔ باپ نے اسے بہت روکا اور زدوکوب بھی کیا مگر اس کا جذبۂ جہاد سرد نہ پڑا اور وہ بھاگ کر یہاں پہنچ گیا۔

احتجاجی سلسلے میں سریانوالہ بازار کے ڈاکٹر نثار علی حیرت نے بھی ''علم الدین ڈیفینس کمیٹی'' سے درخواست گزاری کہ مجھے رضا کار بھرتی کیا جائے۔ مگر ضعیف العمری کے سبب انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب احتجاج کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے مطالبے میں روز بروز شدت آ رہی تھی۔ بڑی بڑی شاہراہوں اور ہر کوچے کے در و دیوار پر جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آتا: ''غازی علم الدین شہید کی میت ملت اسلامیہ کے حوالے کرو'' اور ''ہم شہید کی نعش لے کر رہیں گے۔''

اس حادثے سے پورے پنجاب میں بلکہ برصغیر کی فضائے بسیط پر غم وغصے کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ۵۔ نومبر کو ایک عظیم الشان احتجاجی جلسہ منعقد ہوا، جس کا تذکرہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے اختتام پر مسلمان معززین کا ایک وفد ساڑھے چار بجے گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر پنجاب سر جیفری ڈی مونٹ مورنسی سے ملا۔ ارکان وفد میں سترہ میونسپل کمشنر، ڈاکٹر اقبال، میاں محمد شفیع کے علاوہ دیگر حضرات بھی شامل تھے۔ گورنر کی ہدایت پر ایک اور وفد ٦۔ نومبر کو اڑھائی بجے کے قریب دوبارہ گورنر پنجاب سے ملا۔ اس روز مذکورہ ارکان کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، سر فضل حسین، خلیفہ شجاع الدین اور سید حبیب شاہ وفد میں بالخصوص شامل تھے۔ گورنر نے سب سے پہلے

یہ سوال کیا:

''اگر نعش کے آنے پر لاہور میں فساد ہو گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا؟''

اس پر ڈاکٹر اقبال جھٹ بول اٹھے:

''یور ایکسی لنسی! اگر کوئی ایسی بات ہو گئی تو میری گردن اڑا دینا۔''

اس کے بعد آپ کے چہرے سے جلال برسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اور فرمایا: ''ہم عاشقِ رسول کی محبت میں اپنے مطالبے سے کسی صورت بھی دستبردار نہیں ہو سکتے۔''

جوش وجذبات کی یہ کیفیت دیکھ کر گورنر کو کہنا پڑا:

''اچھا آپ کو نعش مل جائے گی۔ مگر اس کے لیے چند شرائط ہیں: (۱) جنازہ شہر کے اندر سے نہ گزرے (۲) مسلمان اپنے جذبات و احساس کو قید ضبط میں رکھیں (۳) امن کے لیے اخبارات ہیجان انگیز اداریے اور اشتعال انگیز خبروں کی اشاعت بند کر دیں (۴) مسلمان جلوس نکالنے اور احتجاجی جلسے منعقد کرنا چھوڑ دیں۔''

۷۔ نومبر کی شام گورنر نے میت کی واپسی کی باقاعدہ اجازت دے دی اور ۸۔ نومبر کو ایمرسن چیف سیکرٹری حکومت نے درج ذیل سرکاری اعلان شائع کرایا:۔

''میاں علم الدین کو لاہور میں دفن کرنے کے لیے مسلمانوں کا جو وفد حکومت پنجاب کی خدمت میں پیش ہوا، اس کے متعلق حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے وہ عوام کی اطلاع کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔ ابتدا سے ہی حکومت پنجاب کی یہ خواہش رہی ہے کہ فرقہ وارانہ امن کی بحالی کے لیے جملہ ذرائع واختیارات کو بروئے کار لا کر مذہبی منافرت کو ہوا نہ دینے کے لیے انتظامات کیے جائیں۔''



جس قوم کی آنکھ میں بجلیاں پوشیدہ ہوں، اس کے اشارۂ ابرو سے تاریخ مرتب ہوتی ہے اور وقت کا دھارا ہمہ وقت اس کے حضور دست بستہ حاضر رہا کرتا ہے۔ جن کے دامن میں چنگاریاں پنہاں ہوتی ہیں، شاہی تخت کی تعمیر وتخریب ان کے ایما پر ہوتی ہے۔

غازی علم الدین شہید کی نعش کے حصول میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔مختلف جگہوں پر گرفتاریاں ہوتی رہیں۔اس سلسلے میں سب سے پہلے شہادت کے روز چند غیور مسلمان میانوالی سے گرفتار ہوئے۔واقعہ یوں ہے کہ جب شہید مرحوم کی میت جیل سے باہر لائی گئی تو مسلمانوں نے چہرہ مبارک دیکھنے کے لیے چارپائی کے گرد گھیرا ڈال لیا،مگر پولیس نے پرامن ہجوم کو منتشر کر دیا اور جنازے کو لاوارثوں کے قبرستان کی طرف لے کر چل پڑے۔اس وقت مسلمان زور شور کے ساتھ حکام سے مطالبہ کرنے لگے کہ میت ہمارے حوالے کرو۔اس پر پولیس نے پتھر برسانا شروع کر دیئے اور ان کو لاٹھیاں بھی ماریں۔اس موقع پر چند سرفروش مسلمانوں نے جوابی کارروائی کی جس سے ایک انگریز افسر کے دانت ٹوٹ گئے اور وہ شدید زخمی ہوا۔

روزنامہ ''انقلاب'' کے مطابق اس سلسلے میں پندرہ افراد گرفتار ہوئے تھے،جب کہ اس کی تصدیق نہیں ہوسکی اور صرف درج ذیل غازیوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں۔غازی فتح شیر نیاریہ، غازی نور محمد نائی،غازی ابراہیم غریب،غازی مستری غلام رسول،غازی اللہ جوایا درزی،غازی دوست محمد خاں،غازی ملک دوست محمد موندے والا اور غلام حسن خاں صاحب (انہیں چند گھنٹوں بعد رہائی مل گئی تھی)۔

میانوالی کے کلیم اللہ ملک صاحب اور خان محمد اصغر خان سے روایت ہے کہ گرفتار ہونے والوں میں سے دو ایک بری ہوگئے۔بقیہ کو چھ ماہ،ایک سال اور بعض کو ڈیڑھ سال قید کی سزائیں سنائی گئیں۔اس واقعہ کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ عدالت میں غازی ابراہیم غریب نے اپنا بیان پنجابی اشعار میں قلم بند کرایا تھا۔جس کا ایک ایک شعر دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کر دیتا ہے۔

لاہور میں حصول میت کی تحریک کے دوران وزیر مالیات نے مسلمانوں کے ایک وفد سے جب سرد مہری کا مظاہرہ کیا تو ٦۔نومبر کو مسجد وزیر خاں میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔امیر بخش پہلوان اور مولانا ظفر علی خان کی شعلہ بیانیوں سے ایوان حکومت میں زلزلے بپا ہوگئے۔اس روز سترہ آدمیوں پر مشتمل پہلا دستہ میانوالی روانہ ہوا۔ان رضا کاروں نے حلف اٹھا رکھا تھا کہ ہم لاش لے کر رہیں گے۔بصورت دیگر اپنی قبر بھی وہیں بنوائیں گے جہاں شہید علم الدین آرام فرما رہے ہیں۔حصول نعش کے لیے گورنر کی کوٹھی پر دھاوے کا پروگرام بھی بن چکا تھا۔

٦ نومبر کو پہلے جتھے میں شامل مجاہدین نے اعلان کر دیا تھا کہ فلاں فلاں گورنر کی کوٹھی پر مورچہ بندی کریں گے۔اس سلسلے میں کشمیری بازار کے تاجروں نے سول نافرمانی کرنے والے

وفود کے تمام اخراجات اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ مگر خوش قسمتی سے حکومت نے دور اندیشی کا ثبوت دیا جس سے گورنمنٹ کے ساتھ تصفیہ ہوگیا اور بعدازاں یہ پروگرام معرض التوا میں پڑ گیا۔

غازی علم الدین کا مقدمہ کسی فردِ واحد سے منسلک نہ تھا بلکہ پوری قوم شمع رسالتؐ کے پروانے کو بچانے کے لیے سرتوڑ کوششیں کرتی رہی۔ جب اس جانباز عاشق نے جام شہادت نوش فرمایا تو حصول نعش کی خاطر سینکڑوں سرفروش کفن بدوش میدان عمل میں آ گئے۔ ان میں کالجوں کے مسلمان طالب علم سرفہرست تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ابتدا میں حصول میت کی مخالفت کی تھی، مگر جلد ہی وہ رضا کاروں کی ٹولی میں آ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب سے آگے نکل گئے۔ اس مقصد کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی میں میوزک ڈائریکٹر خورشید انور اور رشید عطرے بھی پیش پیش تھے۔

نعش کو میانوالی سے لاہور لانے کی خاطر ایک وفد تشکیل دیا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے سید مراتب علی حسنی اور مرزا مہدی حسین مجسٹریٹ مقرر ہوئے، جبکہ حکومت کی طرف سے پولیس انسپکٹر مرزا غلام حسین نگران تھے۔ تینوں حضرات کی موجودگی میں راجہ زمان مہدی خان کے سامنے ۱۳۔ نومبر کو نعش قبر سے نکالی گئی۔ اس سلسلے میں تمام آداب ملحوظ خاطر رکھے گئے۔ کسی اور کھرپے کا مطلقاً استعمال نہ ہوا بلکہ علامہ محمد اقبال کی ہدایت کے مطابق میانوالی کے مستری نور دین اور اس کے دو تین ساتھیوں نے گڑھے کی معطر خاک خود ہاتھوں سے ہٹائی۔

وہ منظر ایمان افزا تھا اور عجیب بھی۔ میت بالکل صحیح سلامت تھی۔ تیرہ دن گزر جانے کے باوجود اس میں تعفن یا بو پیدا نہ ہوئی۔ ارکان وفد کا بیان ہے کہ شہید کا چہرہ جلال و جمال کا امتزاج اور نور و نکہت کی آماجگاہ تھا۔ ان کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک واضح لکیر نظر آتی تھی۔ اس گڑھے سے ایسی مسحور کن خوشبو اٹھی کہ احساس ہوتا تھا جیسے بہشت نعیم کے دریچے وا ہیں، یا کوئی کافور و گلاب چھڑکتا رہا ہے۔ لاش کے لیے جست کا بنا ہوا ایک صندوق موجود تھا جو اسلامیہ کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی نگرانی میں ''نیشنل کالج آف آرٹس'' سے تیار ہوا۔ اس میں روئی بچھا کر تکیے لگا دیئے گئے اور کافور چھڑک دیا گیا۔

نعش سید مراتب علی حسنی نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر ہزار احترام کے ساتھ تابوت میں رکھی۔ وہ شوخی نظارہ بھلا الفاظ کے آئینے میں کیسے اتر سکتی ہے، جہاں رنگ و بو کا ذرہ ذرہ سرتاپا چشم بن گیا۔ آفتاب کی پیاسی شعاعیں بوسے ثبت کرتی تھیں۔ چشم فلک کو یک لحہ محرومی بھی ناگوار خاطر تھی۔ حوریں شراب دید کی خاطر جنت سے نکل آئیں۔ فرشتوں نے شہید ناز کے نورانی چہرے

سے نقاب اٹھایا۔ کائنات کی رعنائیاں خود فراموشی کے عالم میں جھوم اٹھیں اور گڑھا بھی اس فداکار کی جدائی کے غم میں ماتم کناں تھا۔

نور و نکہت کا ایک سیل رواں لحہ بہ لحہ چار سو پھیلتا جا رہا تھا۔ بوڑھے سرتا پا شوق تھے، معصوم مچل اٹھے، مستورات میں سرگوشیاں ہوئیں اور جوان تصویر حیرت بن گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر اکٹھا ہو گیا۔ آج اُن کا مہمان الوداع ہو رہا تھا، مہمان جس کی آمد پر انہوں نے دل کا فرش بچھایا تھا۔ آنکھوں میں جذب اور دل میں برداشت کی سکت نہ رہی۔ دل کے آئینے اس جانگداز منظر سے دھندلا گئے۔ شوق و غم کی جانے وہ کیا کیفیت تھی، ان کا جی چاہتا تھا کہ اپنے مہمان کو جانے نہ دیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ روک نہ سکے۔

راہ حق کا شیدائی ایک صندوق میں محوخواب تھا جو موٹر میں رکھ کر میانوالی ریلوے اسٹیشن پر پہنچایا گیا، جہاں پہلے ہی ایک خاص گاڑی اسے لاہور لانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میانوالی میں جب صندوق موٹر میں رکھا جانے لگا تو سب سے پہلے غلام محمد عرف گاما نائی نے کندھا دیا۔ اسپیشل ٹرین ساڑھے چار بجے میانوالی ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ کتاب ضبط کا ایک ایک ورق بکھر گیا۔ دل کے بحر ناپیدا کنار میں مدوجزر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ گوہر ہائے اشک آئینہ بینائی کے ساحل پر آ گئے۔ فضا چیخوں سے معمور تھی۔

بہر صورت ۱۴۔ نومبر کو پانچ بج کر پینتیس منٹ پر گاڑی راستے میں کسی اسٹیشن پر ٹھہرے بغیر لاہور پہنچی اور چھاؤنی کے اسٹیشن سے دور نہر کے پل پر کھڑی ہوگئی۔ یہاں جیل کی دولاریاں پہلے سے موجود تھیں۔ اس مقام پر نعش کو سنٹرل جیل کے حکام نے سنبھال لیا، جنھوں نے پونے سات بجے پونچھ ہاؤس کے سامنے وہ صندوق مسلمان معززین کے حوالے کر دیا۔ سر محمد شفیع، علامہ اقبال اور چند میونسپل کمشنروں نے وصولی کی رسید پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس موقع پر خواجہ دل محمد، خواجہ نذر محمد اور خواجہ گلزار محمد بھی موجود تھے۔ وہاں سے میت سات بجے کے قریب چوبرجی کے میدان (جنازگاہ) میں لائی گئی۔ اس سے پہلے ۱۳۔ نومبر کو منادی کے ذریعے پورے شہر میں اعلان کرایا جا چکا تھا کہ شہید علم الدین کی نعش ۱۴۔ نومبر کو ساڑھے آٹھ بجے صبح چاند ماری گراؤنڈ میں مسلمانوں کے حوالے کی جائے گی۔ اس لیے خلیفہ شجاع الدین، میاں مبارک دین، شیخ جان محمد، مہر خدا بخش، چوہدری اللہ دتہ اور مسٹر رچرڈز واٹر وائس انجینئر نے وہاں جا کر پانی کا انتظام کیا اور نماز جنازہ کے لیے صفیں کھڑی کرنے کی جگہ پر لکیریں لگا دیں۔

ملی دولہا کی پرشکوہ بارات

میانوالی سے لاہور کا سفر بڑی شان وشوکت سے طے ہوا۔ ہر اسٹیشن پر ہزاروں مسلمان صرف گاڑی کی زیارت کے لیے دور دور سے آئے ہوئے تھے۔ عوام نے اپنے شہید پر جگہ جگہ عقیدت کے پھول نچھاور کیے اور دعائیں مانگیں۔ شہید ناز کا استقبال کرنے اور نماز جنازہ پڑھنے کی خاطر لاکھوں مسلمان بلا امتیاز عقیدہ وفرقہ موجود تھے۔ جنازے میں پورے برصغیر سے ہر طبقہ اور پیشے کے لوگ شریک ہوئے۔ لاہور کے دیہاتی باشندوں کے علاوہ امرتسر، گورداسپور، پشاور، عیسیٰ خیل، موسیٰ خیل، لدھیانہ، انبالہ، میانوالی، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی اور دیگر علاقوں کے مسلمان کثیر تعداد میں شامل ہوئے۔

اس روز مسلمانوں کا ضبط ونظم بھی حیرت انگیز تھا۔ جنازہ گاہ میں جوں جوں ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، لوگ خود بخود قطاروں میں بیٹھ جاتے۔ شہید کے جنازے میں خصوصاً لاہور اور عموماً برصغیر پاک وہند کے مسلم معززین اور اخبارات کے ایڈیٹر موجود تھے۔ مقامی دفاتر کے مسلمان ملازمین اور کارخانوں کے مزدور، بغیر چھٹی لیے چلے آئے تھے۔

اس زمانے میں پرانی انارکلی اور چوبرجی کے درمیان آبادی نہ تھی بلکہ اس جگہ میدان اور کھیت تھے۔ کسانوں نے پانی کی قلت کے پیش نظر رہٹ چلا رکھے تھے۔ ماشکی بڑی تندہی سے وضو کرانے میں مصروف تھے۔ برطانوی فوج کے دستے اہم چوراہوں اور راستوں پر چوکس و تیار کھڑے تھے۔ حفظ امن کی خاطر لوہاری دروازہ سے مٹھا بازار تک، چوک رنگ محل، چوک متی، کشمیری بازار، پاپڑ منڈی، پرانی کوتوالی اور بڑی کوتوالی تک ذمہ دار افسر متعین تھے۔

وہ نہایت ایمان پرور نظارہ تھا۔ جن خوش نصیبوں نے خواجۂ کائنات کے شیدائی کی بارگاہ میں آخری عقیدت و نیازمندی کے پھول پیش کیے ہیں اور جن ارادت کیش نگاہوں نے فدا کارِ رسالت کی رعنائیوں کے بوسے لیے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ الفاظ کا کوئی ذخیرہ، ادب کا ہر خزانہ، قوت بیاں کی وسعت اور استعداد اظہار حقائق کی تمام پہنائیاں اس کا نقشہ نہیں اتار سکتیں۔ آخری وقت تک آمد کا تانتا بندھا رہا۔ ہزاروں خواتین جنازے میں شامل ہوئیں اور سینکڑوں زیارت کے لیے ابھی چلی آ رہی تھیں۔

میت کے لیے چارپائی ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے ازراہ عقیدت پیش کی تھی اور تابوت نیشنل کالج آف آرٹس میں سرکاری طور پر تیار ہوا۔ جنازے کی کیفیت دیدنی تھی۔ تابوت پر ایک سیاہ

چادر تھی، جس کے بالائی حصوں پر سادہ نمونے کندہ تھے اور حاشیوں پر یہ شعر کڑھا ہوا تھا:

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

(سنا ہے کہ قیامت کے دن جب نفسانفسی کا عالم ہوگا تو خدائے کریم برے لوگوں کو بھی محض نیک خصلت افراد کی وجہ سے بخش دے گا)۔



شیخ عبدالرحمٰن سیالکوٹی، ان ایام میں میانوالی پولیس میں ملازم تھے۔ ان کا ایک مضمون روز نامہ نوائے وقت راولپنڈی میں ۲۴۔ اگست ۱۹۷۱ء کو شائع ہوا ''جنازہ کی روداد۔ غازی علم الدین شہیدؒ'' زندگی کیا ہے محمدؐ پہ فدا ہو جانا۔ وہ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔

''۳۱۔ اکتوبر جیل میانوالی میں غازی علم الدین کو پھانسی دینے کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ انتظام کے سلسلہ میں، میں اور چوہدری عنایت محمد سب انسپکٹر سکنہ موضع ترکھا گجرات بکار خاص ڈیوٹی پر موجود تھے۔ ۳۰۔ اکتوبر کو صدیق حکیم صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس، ایک انسپکٹر، ایک سب انسپکٹر، چار ہیڈ کانسٹیلان اور پچاس سپاہیوں کی لاٹھیوں سے مسلح گارد، دو ہیڈ کانسٹیلان، سوار پولیس کی گارد، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور آٹھ کانسٹیلان کی رائفل ۳۰۳ سے مسلح گارد تیار کر کے ان کو ہر وقت تیار رہنے کا حکم دیا گیا۔

ہم دونوں کو حکم ملا کہ ہم متذکرہ گارد میں ۳۰۔ اکتوبر سات بجے صبح تک جیل میانوالی پہنچ جاویں۔ تعمیل حکم کی گئی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی آ گئے اور جیل کے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد باہر آئے اور کہا: غازی کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ ان کی آمد کے فوراً بعد ملازمان جیل شہید کا جنازہ چارپائی پر باہر لائے، جو صاحب ممدوح نے جیل کی مشرقی دیوار کے شمالی کونہ میں رکھا دی اور ۲۵ کانسٹیبل چار چار قدم کے فاصلے پر چارپائی جنازہ کے جنوبی طرف اور ۲۰ شمالی طرف کھڑے کر دیے جو لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ سب کو حکم دیا کہ وہ مشرق کی طرف منہ رکھیں۔

احاطہ جیل کی ساڑھے بیس فٹ اونچی پختہ دیوار جو چارپائی جنازہ سے تقریباً ۳۰ فٹ کے فاصلہ پر مشرقی طرف تھی کے مشرقی طرف عوام سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اعلان کرایا کہ جو نماز جنازہ پڑھنا چاہے آ جائے۔ عوام دیوار پھاند کر اندر آ گئے اور نماز جنازہ کے لیے پہلی صف بن رہی تھی کہ عوام نے لاش اٹھانے کے لیے حملہ کر دیا۔ گارد پولیس نے

لاٹھی چارج کر کے سب کو دیوار احاطہ جیل سے مشرق کی طرف بھگا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے تدبر اور دوراندیشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاش شہید کو عوام نہ اٹھا سکے، ورنہ جو کشت وخون ہوتا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

ازاں بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حکم دیا کہ لاش قبرستان جیل پر جو جیل مشرقی دیوار کے جانب جنوب ہے، پہنچائی جاوے جو بحفاظت رائفل سے مسلح گارد پہنچائی گئی۔ مشرقی طرف سے عوام نے اینٹیں روڑے برسانے شروع کر دیے۔ سوار پولیس کو حکم ملا کہ عوام کو دور بھگا دیا جائے۔ قبرستان جیل پر شیخ مرید اکبر، سپرنٹنڈنٹ جیل چند ملازمان جیل کے ہمراہ موجود تھے۔ قبر تیار تھی۔ سردار احمد نواز خان مجسٹریٹ آن ڈیوٹی بھی لاش کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے حاضرین کو شامل کر کے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس میں راقم بھی شامل تھا۔

گورنر پنجاب نے بذریعہ ٹیلیگرام ڈپٹی کمشنر میانوالی کو لاہور طلب فرمایا، جہاں سے صاحب ممدوح، سرسید مراتب علی شاہ اور ایک مجسٹریٹ مہدی حسین ۲۰۔ نومبر ۱۹۲۹ء کو واپس میانوالی آئے۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھے اندر بلا کر فرمایا: گورنر صاحب نے لاشۂ شہید مسلمانوں کو واپس دینے کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ کل نو بجے دن لاش قبر سے نکالی جاوے گی۔ گورنر صاحب کے حکم پر کہ لاش قبر سے بذریعہ ملازمان پولیس نکلوائی جائے، میں اپنی ذمہ داری کو ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبلان متذکرہ ڈیوٹی کے لیے منتخب کروں جو لاش کی بو وغیرہ سے نہ گھبرائیں اور ان کو بمعہ بیلچہ و کسی ہمراہ لے کر کل قبرستان پہنچ جاؤں۔ تعمیل حکم کی گئی۔ نو بجے یورپین سول سرجن بھی آ گئے جو لاش کی بو ضائع کرنے کے لیے ایک چھوٹے صندوق میں دوائیاں بھی لائے تھے۔

جب سب مٹی نکالی گئی اور آسامی قبر پر سے کئی دن بعد کمبل اٹھایا گیا، لاش ننگی ہوئی تو اس وقت مولا کریم کی قدرت کا نظارہ قابل دید تھا۔ نہ تو کسی قسم کی بو تھی بلکہ لاش کے جملہ اعضاء بالکل اسی حالت میں تھے جس حالت میں دفن کی گئی تھی۔

نماز شام کے وقت صندوق ریلوے اسٹیشن میانوالی کے مشرقی طرف پہنچایا گیا۔ ریلوے پولیس سارجنٹ اور ۴ ماتحتان اور ٹریفک انسپکٹر گاڑی کے ہمراہ تھے۔ صندوق ٹرین میں رکھا کر سپرنٹنڈنٹ نے دونوں طرف تالے لگائے اور چابیاں ملک محمد خاں انسپکٹر پولیس میانوالی کو جو معہ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبلان بطور گارڈ ساتھ جانے کے لیے تعینات ہوئے تھے، کے حوالے کیں۔

دوسرے روز گاڑی لاہور ریلوے اسٹیشن پر کہیں ٹھہرے بغیر چھاؤنی میں ایک ریلوے پھاٹک پر جا کر رکی۔ وہاں ایک ٹریفک انسپکٹر پولیس، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور آٹھ کانسٹیبلان ایک گارد پولیس کی گاڑیاں منتظر کھڑی تھیں۔ صندوق لاش ٹرین سے نکال کر پولیس کی گاڑیوں میں سوار ہو کر وہاں سے سیدھے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی کوٹھی پر پہنچے۔ پونچھ ہاؤس پہنچنے کے فوراً بعد سر محمد شفیع، علامہ اقبال صاحبان اور ایک تیسرے صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا، تشریف لائے۔ انسپکٹر پولیس نے انسپکٹر پولیس میانوالی کو کہا ان صاحبان سے رسید لی جاوے۔ ڈاکٹر صاحب نے رسید لکھی۔ باقی صاحبان نے دستخط کئے۔ رسید حاصل کر کے ہم بری الذمہ ہو گئے۔''



سیاست اخبار کے مدیر و مالک مولانا سید حبیب شاہ مقبول رہنما اور حضور ﷺ کے عاشق صادق تھے۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے آپ سے پوچھا کہ وہ خوش نصیب کون ہے، جسے شہید کی نماز جنازہ پڑھانے کا شرف حاصل ہوگا؟ مولانا صاحب نے کہا: یہ تو شہید کے والد میاں طالع مند کا حق ہے۔ جانے ان کی نگاہ کس مہ جبیں پر اٹھتی ہے۔ میاں طالع مند پاس ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا: اگر یہ حق مجھے حاصل ہے تو میں اسے ڈاکٹر اقبال کو تفویض کرتا ہوں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اور شاہ صاحب نے باہمی مشورے سے سن رسیدہ عالم دین مولانا سید دیدار علی شاہ الوریؒ کا انتخاب کیا۔ مگر مولانا موصوف ملت اسلامیہ کے جم غفیر میں اس قدر گھر چکے تھے کہ بروقت مقررہ جگہ پر نہ پہنچ پائے۔ اس لیے مسجد وزیر خاں کے خطیب قاری شمس الدین بخاری کا نام تجویز ہوا۔ اتنے میں مولانا دیدار علی شاہ بھی تشریف لے آئے۔ ان کو اس قرعہ کا ماجرا سنایا گیا۔ آپ نے فرمایا:

''جو ہوا خوب ہوا۔''

اس ایثار سے اہل نظر تصویر حیرت بن گئے۔ اہل دل نے ہاتھوں کو اپنے اپنے دل پر رکھ لیا۔ انہی کیفیات میں پہلا جنازہ پڑھانے کا شرف قاری شمس الدین صاحب کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد دوسری نماز جنازہ سید دیدار علی شاہ صاحب نے پڑھائی۔

جب جنازے کی نمازیں ختم ہوئیں تو حاضرین کی بے قرار نگاہیں تابوت کا طواف کرنے لگیں۔ سر محمد شفیع وفور جذبات سے بے قابو تھے۔ وہ مسہری کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت ان کے حلقۂ چشم سے موتی اچھل رہے تھے۔ آپ نے آقائے نامدارؐ کے حضور میں درود و سلام کے گلدستے پیش کئے۔



اتنا بڑا، عظیم الشان، پرشوکت اور منتعین و منظم اجتماع پنجاب کی آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ایسا روح پرور منظر کہ چشم فلک کو جنبش مژگاں بھی بار تھا۔ ساڑھے دس بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ ہزاروں لوگ کندھا دینے کے اشتیاق میں آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ بڑے بڑے زعمائے کرام کندھا دینے والوں کے قدموں میں گرگر کر اٹھ اور اٹھ اٹھ کر گر رہے تھے۔ اسی شوق وجستجو میں مولانا ظفر علی خاں اور میاں محمد شفیع بھی زائرین کی زد میں آ گئے، جنہیں بمشکل وہاں سے نکالا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں برقعہ پوش خواتین بھی جمع تھیں جو ایک نظارہ کرنے کی خاطر اونچے ٹیلوں اور چھتوں پر بیٹھی درود وسلام پڑھ رہی تھیں۔

راستے میں جگہ جگہ میت پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ ہزاروں عقیدت مند جھولیوں، ٹوکریوں اور ٹوپیوں میں تر و تازہ پھول بھر کر لا رہے تھے۔ ہر شخص وفور جذبات کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کئی من پھول اور عطر و عرق کی سینکڑوں بوتلیں آپ کے جسد منور پر چھڑکی گئیں۔ زائرین کا محتاط اندازہ چھ لاکھ کیا جاتا ہے۔ بحوالہ روزنامہ انقلاب، جنازے کا جلوس ساڑھے پانچ میل سے زیادہ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ قصہ مختصر جلوس نے چوبرجی سے قبرستان تک صرف آدھے میل کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ قبر مولانا ظفر علی خاں نے خاص اپنی نگرانی میں بنوائی۔ جب لحد میں اتر کر آپ جسامت کا جائزہ لینے لگے تو ایک چیخ بلند ہوئی۔ مولانا کی چیخ اس فریاد وارمان کا امتزاج تھی:

''کاش یہ مقام آج مجھے نصیب ہوتا!''

اس کے بعد مولانا موصوف ناکام ارمانوں اور اپنی حسرتوں کا جنازہ اٹھائے لحد سے باہر آ گئے۔ ہر آنکھ پرنم تھی۔ چشم فلک کو ذوق گریاں نے ستایا اور رم جھم ہونے لگی۔ اسی سماں میں مولانا سید دیدار علی شاہ الوری اور سر علامہ محمد اقبال نے میت کو اپنے دست پائے، مبارک سے قبر میں اتارا جس کے بعد قلندر لاہوری نے سرتاپا نیاز عرض کیا:۔

''غازی علم الدین شہید'' تو خوش راہ! ہم نے تیری وصیت کو پورا کر دکھایا۔ نماز جنازہ میں ہر شخص نے کلمہ شہادت پڑھا اور دعائے مغفرت مانگی ہے۔ دربار رسالت میں پہنچ کر آقا ومولاؐ کی بارگاہ میں میرا سلام پیش کرنا، اچھا خدا حافظ۔''

یہ بھی علیحدہ پیرا کے طور پر شامل کرنا ہے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ شہید رسالت کی تدفین کے موقع پر علامہ اقبال ایک طرف گم سم کھڑے

تھے، کسی نے پوچھا کہ آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں۔ فرمایا: اسیں گلاں ای کردے رہ تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔

لوگوں نے قبر کے اندر اتنے پھول پھینکے کہ تربت بھر گئی۔ اس کے بعد کچی اینٹوں سے تعویذ بند کیا گیا۔ جب مٹی ڈالنے کی رسم ادا ہونے لگی تو فضا چیخوں اور فریادوں سے معمور تھی۔ جب نعش قبر میں اتاری گئی تو گویا، اس وقت ہوائے یثرب، خاک لحد کو سرکار مدینہ کا یہ حکم سنا رہی تھی ''خبردار! میرے شہید کا کفن بھی میلا نہ ہونے پائے۔'' میت کی واپسی اور اس کے بخیر و خوبی دفن ہو جانے پر علم الدین کمیٹی کے سربراہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو حسب ذیل بیان دیا:

> ''ہم مسلمانان لاہور، حکومت پنجاب بالخصوص مونٹ مورنسی گورنر کے ممنون ہیں کہ انہوں نے غور و تدبر سے کام لیتے ہوئے غازی علم الدین شہید کی میت ہمارے حوالے کی اور ہم اپنی قوم کے غیور شہزادے کو حسب وصیت دفن کرنے میں کامیاب ہوئے۔''

حضرت غازی علم الدین شہید کے جنازے کا اجتماع تاریخی اعتبار سے بھی بڑا اہم ہے۔ غلامانِ مصطفیٰ کے جو جنازے بڑی دھوم دھام سے نکلے اور تاریخ نے جنہیں اپنے صفحات میں محفوظ کیا، ان میں سب سے پہلا بڑا جنازہ ابوحنیفہ امام اعظمؒ کا ہوا۔ آپ کا جنازہ چھ مرتبہ پڑھایا گیا۔ ایک روایت کے مطابق ہر دفعہ کم و بیش نوے ہزار انسان جنازے میں شریک تھے اور چودھویں صدی میں ایک بہت بڑا جنازہ غازی علم الدین شہید کا ہے، جس میں قریباً چھ لاکھ افراد شامل تھے۔

بکھری یادیں

غازی علم الدین شہید ایک فرد نہیں پوری قوم کا نام ہے۔ ناموس رسالت کی محافظ قوم! علم الدین نے جان پر کھیل کر اسلام کی عزت بچائی اور خود اسلام کی عزت بن گیا۔ اب اس کے ہزاروں پروانے ہیں۔ اس نے حرمت رسول کی خاطر زندگی کو قربان کیا۔ آج اس کی عزت کے لیے سینکڑوں محافظ جانیں لڑانے کے لیے ہمہ تن سینہ سپر ہیں۔

علم الدین ہم سب کا تھا۔ ہم سب اس کے ہیں۔ وہ عشق رسالت کی ایک لافانی حقیقت ہیں، جس کی روشنی میں راہ حق کے مسافر اپنے عملی حقائق کا تعین کرتے ہیں۔ غازی علم الدین شہید اس مقام پر متمکن ہیں جہاں آنکھ کو دید کی تاب ہے نہ زبان کو طاقت گویائی۔ یہ قلب و روح کا

معاملہ ہے۔ دیکھنے والے آنکھیں بند کر کے دیکھ لیتے ہیں اور سننے والے غیر مرئی طور پر سماعت کر سکتے ہیں۔

شمع رسالتؐ کے پروانے کی زندگی بھی ایک کھلی کتاب ہے، جس کا ورق ورق غیرت و حمیت کا درس دے رہا ہے۔ ان کو وہ مقام و مرتبہ ملا، جس کی بڑے بڑے غازی آرزو اور کفن بدوش مجاہد ہمیشہ جستجو کرتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آن واحد میں وقت کا تیر کمان سے ایسا نکلا کہ نامی گرامی سیاستدان ہاتھ ملتے رہ گئے۔ بڑے بڑے عالم دین مبہوت ہو گئے۔ لیلیٰ شب نے چاندی کے زیورا تار دیے اور راہِ حق کے متلاشی، رشک کی شدت سے گھائل ہو گئے۔

شب گزار زاہد سالہا سال مالا کے منکے گھماتے ہیں، پریم نگر سے شناسائی نہیں ہو پاتی۔ عابد طویل مدت تک عبادت کرتے رہتے ہیں مگر معبود کی ذات کے عارف نہیں ٹھہرتے۔ لیکن جب خدائے ذوالجلال کی مشیت کسی انسان کا شکار کرتی ہے تو وہ سلوک کی تمام منزلیں چشم زدن میں طے کر جاتا ہے اور اس کی نسبت سے ہر شے متبرک و یادگار بن جاتی ہے۔ علم الدین کے مقدر کا ستارا چمکا تو وہ غازی بن گئے اور پھر شہادت کا ارفع رتبہ عطا ہوا۔ اس لیے راہ حق کے مسافر کا قدم قدم یادگار رہے۔

غازی و شہیدؒ کی سرکاری وصیت جو انہوں نے مورخہ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو بوقت نو بجے صبح یعنی تختہ دار پر کھڑے ہونے سے بیس گھنٹے پہلے سپرنٹنڈنٹ جیل کو مجسٹریٹ کی نگرانی میں لکھوائی اور کمشنر لاہور کے ذریعے میاں طالع مند کو پہنچائی گئی، تاریخ کا ایک حصہ ہے اور اس کے بغیر یہ داستان نامکمل رہے گی۔ چونکہ وصیت نامہ بعد از شہادت غازی علم الدین کے ورثا کو موصول ہوا، اسی مناسبت سے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وصیت میں آپ نے لکھوایا:

> گزارش ہے میرے سب رشتے داروں کو تاکید کر دی جائے کہ میرے پھانسی مل جانے سے ان کے سب گناہ بخشے نہیں جائیں گے بلکہ ہر ایک کے اپنے اپنے عمل ہی اس کو دوزخ سے بچا سکتے ہیں۔ پس، ان کے لیے عمل نماز قائم رکھنا اور جملہ احکام شرعی کی پابندی لازمی ہے۔
>
> بھائی محمد دین اور بھائی غلام محمد! تم پر کسی نہ کسی وقت مصیبت ضرور نازل ہوگی۔ اس واسطے تم ہر نماز کے بعد یا مزمل کا ورد کرنا۔ میری قبر کا فرش دو فٹ اونچا اور ۳۰ فٹ مربع ہو۔ میری قبر کا کٹہرہ جو سب تھڑے

کے اردگرد ہو ۱ ۱/۴ فٹ اونچا ہو۔ تمام سنگ مرمر کا بنایا جائے۔ ایک جانب سے ۲ ۱/۲ فٹ یا ۳ ۱/۲ فٹ کی جگہ کچی رکھی جائے، جس کے اردگرد جنگلہ لکڑی کا میرے والد بزرگوار کے اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا لگایا جائے۔ قبر اندر سے کچی رکھی جائے۔ صندوق میں دفن کرنے کی ضرورت نہیں۔ نیچے صرف ریت بچھائی جائے۔ جو آدمی میرے بعد میرے خاندان سے وفات پائے، اس کی قبر میرے دائیں بنائیں۔

تھڑے کے چاروں کونوں پر گلاب کے پودے لگائے جائیں۔ باہر کی طرف دو کھڑکیاں بنائی جائیں اور کنواں بھی تعمیر کیا جائے اور وہاں پر مسجد بنائی جائے۔ اس کا فرش میری قبر کے فرش سے کسی حالت میں کم نہ ہو اور مجھے ملنے کے واسطے جو وظیفہ آپ کو بتایا گیا ہے، وہ ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب کو پڑھنا چاہیے۔ جب دفن کر چکو تو دو نفل نماز شکرانہ اور نفل مغفرت کے واسطے ادا کرنا۔ میری لاش کے ساتھ ذکر اللہ ہُو ضرور ہو مگر سر سے پگڑی کوئی نہ اتارے۔ جو میری قمیض عدالت میں پڑی ہے، وہ میرے ماموں سراج دین کو دی جائے اور میری شلوار میرے بھائی محمد دین کو دی جائے اور یہاں میرے چار کپڑے ہیں، ان میں سے میری پگڑی میرے تایا صاحب (مہر دین) کو دی جائے اور قمیض ململ کی چھوٹے تایا نور دین اور کرتی جھنڈو برادر پھجے کو دی جائے اور سلیپر میرے بھائی غلام محمد کو دیئے جائیں اور سب بھائیوں کو السلام علیکم۔ میرا سارا حال اخبار میں ضرور نکلوایا جائے اور نماز کی سب مسلمانوں کو تلقین کی جائے۔ میں نے یہ قتل اس واسطے کیا تھا کہ اس نے میرے آقا ﷺ کی (نعوذ باللہ) بے عزتی کی تھی۔

اشعار

(ا) ہتھ یار دا نظر قرآن آیا تاں پھر چمیاں ادب آداب کر کے
شالا ہتھ سڑے، ملے سزا مینوں ہتھ لایا جے بھیڑ نگاہ کر کے
قسم ہے رب دی دوستا آکھدا واں قدمیں ساں میں دلربا کر کے

علم الدین جناب نے زبردستی دتا رتبہ تے اپنی شفا کر کے



(۲) دن ہفتے دا میں قربان جاواں اللہ بخشی سی ایہہ مراد مینوں
قسم رب دی بندہ نہ نال کوئی مدد دتی سی اللہ ذوالجلال مینوں
خنجر ماریا سی حکم رب دے نال ایہو دل دے وچ مراد مینوں
علم الدین میاں ڈرنا موت تھیں نئیں جھنڈے نبی دے نال پیار مینوں

میانوالی میں جو تمہاری مدد ہوئی ہے اور جیل کے اندر ۳۵ قرآن شریف، ۲۱ ہزار درود شریف قیدیوں نے ختم کیے ہیں۔ ان کا حوالہ اخبار میں دیا جائے"



میاں علم الدین غازی کا ایک رومال جو آپ سر پر ایک خاص ادا سے سجایا کرتے تھے اور میانوالی جیل میں ان کے پاس تھا، تاحال ان کے گھر والوں کے پاس محفوظ ہے۔ مٹی کا ایک پیالہ جس سے غازی صاحب جیل میں پانی پیا اور پلایا کرتے تھے، وہ ان کی حقیقی بھتیجی محترمہ انور سعید صاحبہ کے گھر موجود ہے۔ شہید رسالت کی تربت پر پہلی چادر ان کی ہمشیرہ معراج بیگم صاحبہ نے چڑھائی۔ یہ چادر اوپر سے سبز اور نیچے سے سیاہ رنگ کی ہے۔ اس پر ایک نظم بھی کندہ تھی، جو اس نیک خاتون نے اپنے ہاتھوں سے کاڑھی۔



پورے برصغیر میں اور خصوصاً پنجاب میں غازی علم الدین شہید کو جو شہرت دوام ملی ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ اگر وہ تختہ دار کی زینت نہ بنتے تو انہیں یہ بلند رتبہ ہرگز نہ مل سکتا تھا۔ شہادت کے دن سے آج تک وہ ہمارے دل کی دھڑکنوں میں مکین ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی اہل دل مدہوش سے ہو جاتے ہیں۔ غازی علم الدین کا نام شہروں کی نسبت، دیہات میں زیادہ سنا جاتا ہے۔ وہ اپنے خاص انداز میں شہید کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ دیہات کا بچہ بچہ شہید کے نام سے مانوس ہے۔ نوری کموکا اور دیگر سینکڑوں دیہاتی شعرا کے نام دیہاتیوں کے دل پر آج بھی نقش ہیں۔ گوڈھولے کی صنف تاریخی حقائق سے مکمل تفاوق نہیں رکھتی مگر عقیدت میں ڈوبی ہوئی اس آواز کا انداز ایسا پیارا ہوتا ہے کہ تصور کی آنکھیں سرتاپا وہ سب کچھ ظاہر میں دیکھ لیتی ہیں۔

پنجابی ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے اس کتاب میں محض حوالہ جات ہی پیش کیے

جا سکتے ہیں۔ پنجابی میں ایک قصہ نما رسالہ فیروز نامی شاعر نے لکھا جو صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی اشاعت امرتسر میں اُردو بازار سے ہوئی۔ یہ فن پارہ پنجاب پبلک لائبریری کے شعبہ اُردو میں آج بھی موجود ہے۔ واقعہ شہادت کے چند ماہ بعد ہی چوہدری فضل کریم سندھو نے بھی منظوم سوانح عمری ''غازی علم الدین شہید'' پرزور قلم صرف کیا۔

جن خوش قلم شعراء نے غازی علم الدین شہید کے حضور وقتاً فوقتاً نذرانہ عقیدت پیش کیا، اُن میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا ابوظفر نازش رضوی۔ منشی حفیظ اللہ۔ خان اصغر حسن خاں لدھیانوی۔ پیر غلام دستگیر نامی۔ سید ذوالفقار علی نسیم۔ حضرت فوق دہلوی۔ عبدالرحمٰن خاں لدھیانوی۔ سید امام علی شاہ۔ منشی محمد صدیق۔ استاد عشق لہر۔ ابوالاقبال علامہ عیش فیروز پوری۔ زبیر خان صابر خلیل امرتسری۔ محمد افضل ہاشمی۔ مصور۔ حسرت۔ جسٹس محمد الیاس۔ ڈاکٹر قمر آرا۔ علیم ناصری۔ راجا رشید محمود۔ عزیز لدھیانوی۔ پروفیسر محمد اکرم رضا۔ حزیں کاشمیری۔ مجید تمنا اور پیرزادہ محمد زبیر عاقل شاہی درگاہ شریف چنپٹن بنگلور ریاست میسور۔



کرچیاں

زندگی اور موت کے درمیان ذرا سی مسافت ہے۔ گویا یہ رشتہ صرف اشارہ پلک سے قائم ہے۔آنکھوں کے دریچے وا ہوتے ہیں تو اذان دیتے ہیں۔ جب وہ آخری معانقہ میں محو ہو جائیں تو نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔ جب تک آنکھوں کے چراغ جلتے رہیں، صبح ہے اور اگر بجھ جائیں تو زندگی کی شام۔ انسان اس غم کدے میں پہنچ کر روتا ہے اور لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔ زندگی کا حاصل یہ ہے کہ جب وہ سفر آخرت کے لیے کپڑے پہنے تو دنیا ماتم کرنے لگے، مگر اس کے ہونٹ تبسم کی آماجگاہ ہوں۔

موت تو ایک اٹل حقیقت ہے۔ بڑے بڑے نامور پنجہ قضا کی گرفت میں آئے۔ اس کی کمند ہر ایک کو بلا روک ٹوک دبوچ لیتی ہے۔ ناوک اجل کے نشانے ہمیشہ بے خطا ہوتے ہیں۔ اس کے آگے آج تک کوئی ڈھال کارآمد ثابت نہیں ہوئی۔



چشم فلک نے ہزار بار نظارہ کیا ہے کہ سرور کونین ﷺ کا عشق، انسان کو معراج کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ حبش سے اٹھا کر حجاز میں لاتا ہے اور کبھی ایک ذرہ حقیر کو زریں خلعت پہنا دیتا ہے۔ علم الدین نے اتنی شہرت کیوں پائی؟ علم الدین نے اتنا نام کیوں کمایا؟ علم الدین ایسا محبوب صرف کیوں بنا؟، جذبہ عشق صادق۔ خواجہ ہر دوسرا ﷺ کے عشق سے ہی اس کی زندگی فسانہ بنی۔

میرا عقیدہ ہے کہ علم الدین نے نجاری کا پیشہ سیکھا نہیں، اسے سکھایا گیا۔ اس لیے کہ ہاتھ نظر ٹکنے کے مقام پر ضرب لگانے میں مشاق ہو جائیں۔ دراصل یہ ذریعہ معاش نہیں، راجپال کی موت کا سامان تھا۔ بعض بد بخت کہتے تھے، علم الدین نے اوچھے طریقے سے اپنا غصہ فرو کیا۔ شاید وہ نہیں جانتے کہ جس مسلمان کو حضورؐ کی ذات کے ساتھ والہانہ لگاؤ نہ ہو، اس کا دعویٰ اسلام و ایمان قابل قبول نہیں۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ میدان جنگ میں اس کا حریف اگر منہ پر تھوک دے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے۔ دعوت مبارزت دیتے ہوئے کوئی کافر گالیاں بکے تو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ حالت نماز میں اگر کوئی دشمن اس کے جگر میں اپنا خنجر اتار دے تو جیتے جی یہ وصیت ہو سکتی ہے کہ جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے، اس کے ساتھ ایسا کوئی سلوک نہ کیا جائے جو انتقام پر محمول ہو اور جب میری روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے تو میرے وارث قصاص لینے میں مجاز ہیں۔ لیکن عشق رسول اس کے قلب کا نازک ترین گوشہ ہے۔ اس پر کوئی چرکا لگائے تو عفو و درگزر سے رشتہ چھوٹ جاتا ہے۔

علم الدین مرحوم و مغفورؒ نے جو کچھ کیا، عشق رسول ﷺ کے جذبہ بے پناہ کے تحت کیا۔ آزاد خیال طبقہ اسے دیوانہ یا مجنوں کہتا ہے، کہا کرے۔ عشق جنون ہی تو ہے اور یہی جنون ہر سچے مسلمان کا سرمایہ حیات ہے۔ اسے جنون کہتے ہیں تو میری دعا ہے کہ ساری قوم مجنوں ہو جائے۔

لوگ کہتے ہیں علم الدین ان پڑھ تھا۔ بعض کا خیال ہے وہ داڑھی منڈواتا تھا۔ اس میں کلام نہیں۔ بلاشبہ علم الدین ناخواندہ اور آزاد منش تھا۔ لیکن قدرت نے جس ذوق بصیرت سے اسے نواز اس پر ہزارہا ماہران علم نثار کیے جا سکتے ہیں۔ معترضین بے چارے کیا جانیں کہ عشق میں سندوں کو نہیں دیکھا جاتا۔ ذات پات کی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ حضرت بلال کے پاس بھلا کونسی ڈگری تھی۔ اویس قرنیؓ نے کہاں سے ڈپلومہ حاصل کیا؟ عشق ڈگریوں کا نام نہیں، یہ ایک جذبہ ہے جو غازی علم الدین کے سینے میں موجزن تھا۔ اسی جذبے کے طفیل، آج ہم ان سے نسبت غلامی رکھتے ہیں۔ اقبال مرحوم نے بالکل سچ کہا ہے:

''خداوند قدوس، کچھ کام داڑھی والوں سے لیتا ہے اور کچھ کام داڑھی منڈوانے والوں سے، اس لیے کہ جب بخاری صاحب نے تقریر ارشاد فرمائی تو جلسے میں ہزاروں افراد شریک تھے۔ ان میں بڑے بڑے عالم تھے، حتیٰ کہ سینکڑوں باریش بھی موجود تھے۔ مگر جو کام علم الدین نے کیا وہ کوئی اور نہیں کر سکا۔''

ہم نے اکابر صوفیا واتقیا کے سفر آخرت کی کیفیات دیکھی اور سنی ہیں۔ ان لوگوں کے جنازوں میں شامل ہوئے ہیں، جن کی عمریں علوم دین کی خدمت میں صرف ہوئیں۔ ہماری آنکھیں ان کی تجہیز وتکفین کا نظارہ بھی کر چکی ہیں۔ علم الدین شہید عالم دین تھا نہ واعظ۔ کوئی مشہور یا غیر مشہور صوفی و متقی نہ تھا۔ گروہ یا کسی جماعت کا قائد نہ تھا مگر حرمتِ رسولؐ پر اس کی زندہ گواہی نے اسے وہ بلند مقام عطا کیا، جو بالعموم سینکڑوں سلاطین، ہزاروں اتقیا اور لاکھوں علماء کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ یہ مقام شہادت کی بلندی ہے اور بلند منصبی اسے کہتے ہیں۔

اب بھی آئے روز سینکڑوں جنازے اٹھتے ہیں۔ جدائی کے غم میں لواحقین صف ماتم بھی بچھاتے ہیں۔ مگر اب کے وہ عرفان اور شوق وغم کا عالم کہاں! بزم نشاط کے دور بھی آتے رہتے ہیں لیکن حاضرین چلتی پھرتی لاشیں معلوم ہوتی ہیں۔ ناموس رسالتؐ کی حفاظت فرض کفایہ ہے۔ غازی علم الدین نے یہ فریضہ چکا دیا۔ وہ قوم کے محسن اور فرزندان توحید ان کے قدر دان ہیں۔ اگر غازی علم الدین کفن بدوش جہاد نہ کرتے تو آج پستی کی عمیق کھائیاں ہمارا مقدر ٹھہرتیں اور کل دربار رسالتؐ کے کٹہرے میں ہم سب مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہوتے۔



ایک روز میں آئینہ ماضی میں منعکس کوئی تصویر دیکھ رہا تھا کہ میرا طائر فکر پرفشاں ہو کر صاحب تصویر کی تلاش میں اڑا اور اڑتے اڑتے کہیں دور نکل گیا۔ جنگل جنگل گھوما۔ شہر شہر ڈھونڈا مگر اسے کہیں نشان منزل نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر عالمگیری مسجد کے مشرقی جنوبی مینار پر جا بیٹھا۔ یہاں سے وہ آہستہ آہستہ اڑا اور اقبال مرحوم کی قبر پر چادر کے نیچے چھپ گیا۔ پھر ''سوئے قطاری کشم ناقۂ بے زمام را'' کا ورد کرتے ہوئے بولا: مرشد من! سائل بے نوا منزل کی تلاش میں پریشاں خاطر ہے۔ اے آسودۂ خاک! مجھے اس کی خبر دینا۔ تھوڑی دیر بعد درمیان میں جو پردہ حائل تھا، وہ اٹھ گیا اور روح اقبال نے غیر مرئی طور پر اپنے مرید کو یہ نکتہ سمجھا دیا کہ شہید رسالت کے دو ہی ٹھکانے ہیں۔ مومن کا دل اور ایک

بارگاہ رسالت!

مومن کا دل آئینہ ہے، جس میں ایک شہر آباد ہے۔ وہی شہر در حقیقت مدینہ ہے اور مدینہ میں رسول عربی ﷺ کا بسیرا ہے۔ یقیناً علم الدین بھی وہیں موجود ہوں گے اور جس کی نگاہیں نظارے کی تاب رکھتی ہیں، وہ نور بصارت کے جوہر سے دربار رسول کا طواف کریں۔ پروانے، شمع رسالت کے گرد حلقہ باندھے ہوں گے۔ جبریل امین پوچھ رہے ہوں گے کہ محمدؐ کے قدموں میں یہ کس کا سر ہے؟ بلال حبشیؓ وہاں رونق افروز ہوں گے اور اویس قرنی بھی میر مجلس کے قدوم میمنت لزوم کو چوم کر دیوانہ وار اپنے ہونٹوں کی پیاس بجھا رہے ہوں گے۔ غازی علم الدین شہید کا منصب بھی یہی ہے۔

میں کچھ دیر کے لیے قارئین کے دماغ میں اپنے فکر کا گھروندا بنانا چاہتا ہوں تا کہ وہ بھی میرے تخیل کے ساتھ پرواز کر سکیں۔ دنیا جانتی ہے، اقبال مرحوم کے مضراب فکر پر عشق رسول کے نغمے ناچتے تھے کہ اس نے خاک مدینہ و نجف کو اپنی آنکھ کا سرمہ بنایا ہوا ہے۔ غازی علم الدین شہید عاشق تھے اور اقبال بھی۔ تڑپ اور شدت کی چنگاریاں دونوں کے دل میں فروزاں تھیں۔ جنس جنوں کو خرد کے ترازو سے تولا نہیں جاتا۔ یوں بھی اہل عشق کا تقابلی جائزہ لینا کم فکری کی ایک علامت ہے، مگر بازار میں قائم رہنے والی شے سے اس کی قیمت کہیں زیادہ لگتی ہے جو ٹوٹ جائے۔ کیونکہ عشق عقل کے تابع رہے تو خوب اور عقل، عشق سے مغلوب ہو تو خوب تر ہے۔ شہید موصوف دستِ جنوں سے عقل کا دامن پھاڑ کر اپنے رقیب اقبال سے بہت آگے نکل گئے۔ خدا جانے اقبال پر کبھی کشف کے دروازے کھلے بھی کہ نہیں، مگر شہید علم الدین نے تو ہر حال اور ہر رنگ میں شربت وصل کے پیالے پیئے ہوئے ہیں۔

شہر خموشاں

اس جہان رنگ و بو میں مہ وشوں کی کمی نہیں۔ حسینوں کے غمزہ وعشوہ و ادا کے افسانہ سے کہیں آہوئے چشم قتالہ کی ہنگامہ پروری ہے۔ کسی کو صحرا کے سناٹے گیت معلوم ہوتے ہیں اور کوئی شہر کی رعنائیوں میں دلجمعی کا سامان ڈھونڈ رہا ہے۔ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ دلکش نظاروں کا سارا راز آئینہ دید میں مضمر ہے۔ حسن، حسن نظر ہوتا ہے۔ جہاں آنکھ کھل جائے وہاں حسن کا گنج گراں مایہ نظر آ جاتا ہے۔ جوہر کی خاک میں آمیزش، اس کی جواہرانہ تاب پر اثر انداز نہیں ہوا کرتی۔ جانے کیوں میری نظر کسی عام دلکش نظارے میں نہیں ٹھہرتی مگر میانی کا شہر خموشاں گویا مہ جبینوں کا مسکن

ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نقشِ حیرت بن جاتا ہوں اور میری آنکھیں پہروں حسن و جمال کا نظارہ کرتی رہتی ہیں۔

یہ تاریخی قبرستان، سمن آباد اور اسلامیہ پارک کے شمال لٹن روڈ (غازی علم الدین شہید روڈ) اور شارع مولانا روم کے مغرب، لیک روڈ کے جنوب اور چوبرجی ملتان روڈ کے مشرق میں خاصے وسیع عریض رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس تاریخی قبرستان کو عموماً میانی صاحب بولتے ہیں، جبکہ پورا نام میانی پنج ڈھیر تھا۔ چونکہ عالم یا امام کو پنجابی میں میاں کہتے ہیں، شاید اس لیے اس بستی کا ناں میاں پڑ گیا، جو بعد میں بصورت غلط العام میانی ہو گیا۔ بموجب ''تحقیقات چشتی''، مغل اعظم کے زمانے میں یہ جگہ علمائے کرام کے وعظ و تدریس کا تکیہ تھی۔ اس لیے یہ بستی ''میاں صاحب'' کے نام سے مشہور ہوگئی۔

یہ شہرِ خموشاں، جس میں ان گنت لعل و گوہر پوشیدہ ہیں اور لاکھوں پیکرِ حسن و ناز محوِ خواب ہیں، کسی زمانے میں ایک بہت بڑی پر رونق بستی تھی۔ اس پر علم و عرفان کی بارشیں ہوا کرتیں۔ یہ خطہ علمائے حق کا مسکن تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں یہاں کے نگران قطب العالم عبدالجلیل چوہڑ بندگیؒ تھے، جو سلوک کی منزلوں سے باخبر اور دریائے تصوف کے غواص تھے۔ آپ کی زندگی زہد و تقویٰ کی ایک کھلی کتاب اور شریعت کا عملی نمونہ تھی۔ طالبانِ حقیقت کتابِ فیض کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے۔ شیخ ابوبکر (آپ کا مزار آگرہ کے محلّہ جوگی پورہ میں ہے) جو حضور قطب عالم کے برادرِ حقیقی اور ایک معتمد مورخ ہیں، وہ اپنی کتاب ''تذکرہ قطبیہ'' میں رقمطراز ہیں کہ جب سلطان السلاطین شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تو فوج کے علاوہ علمائے کرام، فقہا اور شب گزار زاہدوں کی جماعت بھی اس کے ساتھ تھی۔

چنانچہ ان میں سید السادات سید علی غازی جو شیخ زین الدین غازی کے حقیقی بھائی اور اکابرینِ ولایت میں سے تھے، بھی ادھر تشریف لائے۔ سید علی غازی حضرت بندگیؒ کی زیارت کرنے کی نیت سے لاہور پہنچے۔ اس زمانے میں قطب العالم وفات پا چکے تھے۔ چنانچہ آپ نے ان کے مقبرے کا کئی روز مراقبہ کیا اور نیت کی کہ سلطان العاشقین حضرت قبلہ قطب العالم کے کسی طالب سے مل کر اشکال طریقت حل کریں۔ آخر ایک رات حضرت بندگی کا آپ کو خواب میں ارشاد ہوا کہ میرے بھائی شیخ ابوبکرؒ سے مل کر مرادِ طریقت حاصل کرو۔ یہی بات آپ نے ٹھیک اسی

رات اور اسی وقت شیخ ابوبکر کو فرمائی۔ ابوبکر کے الفاظ یوں ہیں:

''قطب العالم حضرت شیخ عبدالجلیلؒ کا مجھے باطنی ارشاد ہوا کہ سید علی غازی کو طریقت کے اشکال سمجھا دے اور اپنا محرم اسرار بنا لے اور آپ کا ہاتھ بھی میرے ہاتھ میں دے دیا''۔

فیضیاب ہونے کے بعد سید علی غازی نے واپس کابل، دہلی یا ترکستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور میانی صاحب کے ہو رہے۔ یہیں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر کے آسودہ خاک ہوئے۔

''تحقیقات چشتی'' میں مولوی نور احمد صاحب نے سید شاہسوار (سجادہ نشین حضرت طاہر بندگیؒ) کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک زمانے میں حافظ جان محمدؒ اس مکتب کے صدر معلم تھے۔ اُن کے انتقال پر آپ کے فرزند ابو محمد قادری رئیس علما مقرر ہوئے مگر بہت سے ملّا ان سے اختلاف کر کے رخصت ہو گئے اور صرف چند اشخاص ابو محمد صاحب کے متعلقین میں سے باقی رہ گئے تھے، جس کی وجہ سے علم و عرفان کا یہ خطہ زوال پذیر ہو گیا۔ اسی اثنا میں مکھڈ شریف سے ایک خاندانی عالم دین، حضرت میر علی نے یہاں قدم رنجہ فرمایا ان دونوں کے اتفاق سے یہ موضع پھر آباد ہو گیا اور درس و تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ میر علی صاحب جب مستقل طور پر یہاں مقیم ہوئے تو وہ مکھڈ شریف سے اپنے پانچ بزرگوں کی نعشوں کے صندوق یہاں لے آئے اور انہیں میانی شریف میں دفن کر دیا۔ ان خانقاہوں کی وجہ سے میاں صاحب پنج ڈھیر بھی کہلانے لگا، جس کا مطلب یہ تھا کہ میانی میں پنج ڈھیریاں یعنی پانچ قبریں ہیں۔

مگر پیر غلام دستگیر نامی اس وجہ تسمیہ سے مطمئن نہیں ہوئے ہوتے، کیوں کہ پنجابی میں قبر کو ڈھیرا نہیں ڈھیری کہتے ہیں۔ شیخ ابوبکر کی ایک کتاب ''تذکرہ قطبیہ'' کے حوالے سے نامی صاحب رقمطراز ہیں کہ ہماری خاندانی کتاب جو فارسی میں ہے، اس میں میانی پنج وہڑہ لکھا ہے۔

وہڑہ پنجابی میں صحن کو کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ موضع اپنے پانچ صحنوں کی وجہ سے مشہور ہوا ہو۔ اس سلسلے میں ان کی دو دلیلیں نہایت معقول اور وزنی ہیں۔ اوّل یہ کہ کتاب ''تذکرہ قطبیہ'' ظہیر الدین بابر کے انتقال سے کئی برس پہلے لکھی گئی، جس میں اس کا نام پنج وہڑہ لکھا ہے۔ مزید یہ کہ پیر محمد علی مکھڈی کے بزرگوں کا مدفون ہونا تو کافی مدت بعد کا واقعہ ہے۔ دوئم فارسی میں ''ڈ ہے نہ ڑ'' اس لیے کتاب میں غلطی کا امکان بھی نہیں۔ المختصر یہ نام پنجابی کے ڈیرہ یا ویڑہ سے منسوب ہے۔

تحقیقات چشتی میں مذکور ہے کہ ابو محمد بن جان محمد موصوف، حضرت شیخ طاہر بندگی کے فدائی اور راسخ العقیدہ مرید تھے۔ شیخ صاحب نقشبندی، حضرت مجدد الف ثانی کے فیض یافتہ ہیں۔ حصار لاہور کے محلہ شیخ اسحاق میں ان کی رہائش تھی، جہاں اب حویلی جمعدار خوشحال سنگھ متصل چونا منڈی ہے۔ ہزاروں طالبان حق نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی تحقیق کے مطابق آپ قریشی فاروقی ہیں۔ آپ براہ ستیاں لاہور آئے۔

اس زمانے میں یہاں مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی حکومت تھی۔ حضرت شیخ طاہر بندگیؒ صاحب ۸ محرم الحرام ۱۰۴۰ھ، بعمر ۵۴ سال واصل بحق ہو کر میانی صاحب میں دفن ہوئے۔ چونکہ ایک مرتبہ شیخ صاحب نے فرمایا تھا کہ جو کوئی میرے احاطہ مزار میں دفن ہوگا۔ اس کے لیے میں خدائے ایزدی سے دعا کروں گا کہ وہ جنت میں جائے۔ لہٰذا لوگ از راہ عقیدت میتوں کو یہاں دفنانے لگے۔ جب عہد محمد شاہ میں موضع میانی بالکل اجڑ گیا تو یہ جگہ عام قبرستان بن گئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی کو عام قبرستان کی شکل اختیار کیے دو تین سو سال ہو گئے ہیں اور خواص کا تو یہ تقریباً ساڑھے چار سو برس سے مدفن ہے۔

غازی علم الدین شہیدؒ (لٹن روڈ) پر واقع مزنگ چونگی کی جانب سے اگر اس شہر خموشاں میں داخل ہوں تو سنگ تراشوں کی تیشہ زنی غفلت کے پردے چاک کر دیتی ہے اور مادی دماغ سے دبیز پردوں کی تہیں ہولے ہولے ہٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس سے آگے دو تین سیڑھیاں نظر آئیں گی، جن کے پاس ایک مسجد خدائے ذوالجلال کی حمد و ثنا کر رہی ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک پختہ سڑک آجاتی ہے۔ سڑک پر دائیں طرف ایک حجرہ نما مقبرہ ہے جو شیخ غلام محی الدین چشتی صابری کی آخری آرام گاہ ہے۔ چند قدم آگے اسی طرف ایک قبر موجود ہے: جس پر جلی حروف میں لکھا ہے:

> ”گمنام ورق، ایک بلند کردار انقلابی، ایک قناعت پسند انسان، ”احسان الٰہی“ جس نے آزادئ وطن کے لیے غیر ملکی حکومت کے جیل خانوں میں اپنی نو جوانی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء کے سات سال گزار دیئے۔ ایک غیور انسان جس نے گمنامی میں اپنے کردار کی عظمت کو ثابت کیا اور ۸ مارچ ۱۹۶۲ء بروز جمعرات کو اپنے ان انقلابی ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا، جنہیں انگریز نے انقلابی جدوجہد کے جرم میں تختہ دار پر چڑھا دیا تھا۔“

اسی روڈ پر بائیں جانب پیر بودیاں والی سرکار کا دربار عالیہ ہے۔گنبد میں پیر جانن امام بھی مدفون ہیں۔احاطے میں میراں پیر گیلانی صاحب راحت فرما ہیں اور آس پاس عقیدت مندوں کی قبریں ہیں۔مزار کے بالمقابل سیدہ سعیدہ والدہ چن پیر ابدی نیند سو رہی ہیں۔اس مزار میں مردوں کا داخلہ ممنوع ہے۔خانقاہ میں ملحقہ پیر بودیاں والی سرکار کے خلیفہ مجاز، مجنوں سائیں کا مزار ہے۔اس خطہ سے باہر نکل کر دوبارہ سڑک پر آ جائیں تو چند قدم آگے لوہے کی ایک پلیٹ نظر آتی ہے، جس پر لکھا ہے کہ مرحوم شاعر ساغر صدیقی کے مزار کا پتہ اس شعر سے حاصل کریں:

یہاں سے آگے جا کے اونچی جگہ کے پار
کوئی فاتحہ کہے ساغر کے جا مزار

غازی علم الدین شہید کے مزار کے نزدیک ہی پنجابی کے شاعر سراج دین مرحوم عرف استاد اللہ لوک کی قبر ہے، لوحِ مزار پر جن کی تاریخ وفات ۲۶۔ستمبر ۱۹۷۱ء کندہ ہے۔اس سے تھوڑا سا آگے غازی علم الدین شہید کی مرقد منور ہے۔اہل عشق اس جگہ فکر سخن کو بھی کمال بے ادبی سمجھتے ہیں۔یہ پلک بسیرا ہے۔یہاں نظریں سجدہ کرتی ہیں۔شہید عشق رسول کی تربت کا ایک ایک ذرہ قرآن حکیم کی زبان میں اپنی حیات جاوداں کی شہادت پیش کر رہا ہے۔

غازی علم الدین شہید کے مقبرہ کی تعمیر کے لیے امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب نے بصورت نقدی عطیہ دیا۔نقشہ مزار منشی واجد علی صاحب نے تیار کیا۔شہید مرحوم کی قبر ۱۹۲۹ء میں تعمیر ہو گئی تھی، جب کہ مزار چند سال بعد تعمیر ہوا۔مقبرے کا پہلا مجاور نواب دین تھا۔اس کی رحلت کے بعد اب اس کی اولاد نگران ہے۔غازی و شہید کے مزار پر انوار پر ایک شمع دان موجود ہے، جو ایک نو مسلمہ خاتون حسن آرا بیگم عرف مسز بیگ کا عطیہ ہے۔غازی علم الدین شہید کی اصل تصویریں دو ہیں۔ایک شالا مار باغ میں انہوں نے میلے کے دوران بنوائی تھی، جبکہ دوسری گرفتاری سے چند دن پہلے کی ہے۔اس کے علاوہ ان کی ان گنت فرضی تصاویر بھی بنائی گئی ہیں۔مزار کا دروازہ جنوب کی طرف ہے۔اس دروازے کے مشرقی حصے کی دیوار میں چار جالیاں ہیں۔ایک میں مندرج ہے:

''عاشق رسول غازی علم الدین شہید! آقائے دو جہاں ﷺ کی شان اقدس سے گریز کرنے والو! کیا حضورؐ کے نام پر شہید ہونے کی عزت کا نظارہ اس کے جنازے سے نہیں ہوا؟ اگر دین و دنیا میں بھلائی

چاہتے ہو تو محبوب خدا پر جان قربان کر دو اور عاشقان مصطفیٰ کی چوکھٹ
پکڑو۔ جو منکر ہے وہ کافر ہے''۔

علم الدین شہید کی قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے۔ شہید موصوف کے چاروں طرف آیت الکرسی اور اس کے مشرق و مغرب میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام کندہ ہیں۔ مرقد کے اندر چاروں طرف ایک مسقّف نما مسجد ہے لیکن مزار بغیر چھت کے ہے۔ احاطہ میں آپ کے عزیز و اقارب کی قبور بھی ہیں۔

چوبرجی کی سمت ایک ویران حال لحد جس کے اوپر سبزہ خودرو اگا ہے، یہ مرحوم ساغر صدیقی کا مدفن ہے۔ لوح مزار پر ایسی عبارت کندہ ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں:

''ساغر صدیقی مر گیا، ایک شاعر مر گیا، ایک فقیر مر گیا۔ ایک انسان مر گیا، سب مر جاتے ہیں۔ مرنا سب کو ہے لیکن کچھ زندہ رہ کر بھی مردوں میں ہوتے ہیں، کچھ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ ساغر بھی اُنہی میں سے ایک ہے۔ اس۔ لیے کہ اسے اپنے عہد کے معاشرے نے قتل کیا اور معاشرہ ساغر کا قاتل ہے۔ روشنی، سچائی اور نیکی کا قاتل! اس لیے کہ ساغر روشنی، سچائی اور نیکی کا پیامبر تھا''۔

اگر ہم قبرستان کے وسط میں پہنچ جائیں یا چوبرجی کی طرف سے شہر خموشاں میں داخل ہوں تو قصور روڈ پر حافظ محمد شفیق احمد پیر چہار سلسلہ کا آستانہ ہے۔ سڑک کے بالکل ساتھ مرقد حمید نظامی، بانی و مدیر ''نوائے وقت'' واقع ہے۔ اس سے چند قدم آگے ایک لوح مزار کے عقب پر ''حسرت'' کھدا ہوا نظر آئے گا۔ یہ مولانا چراغ حسن حسرت کی آرام گاہ ہے۔ حسرت کدہ کے اوپر ایک عرصے سے کوڑا کرکٹ کی چادر پڑی اور لحد سے واقعی حسرت ٹپک رہی ہے۔ تختی پر حفیظ ہوشیار پوری کا یہ قطعہ کندہ ہے، جس سے تاریخ وفات بھی نکالی گئی ہے۔

آج حسرت داغ حسرت دے کے رخصت ہو گیا
دل میں اب روشن رہے گا رخصتِ حسرت کا داغ
بجھ گئی بزم صحافت میں صف ماتم حفیظ
گل ہوا ہے آج اک بزم صحافت کا چراغ

اس سے متصل مرد غیور، ادیب و شاعر اور بے مثال خطیب آغا شورش کاشمیری کا مدفن ہے،

جو شخص ہنگامہ پرور تھا۔ فضائے سیاست کی خاموشی جس کو پسند نہ تھی۔ جس شورش کی شورش سے شاہی ایوانوں میں شورش بپا رہتی تھی، آج وہ قبر کی کالی کوٹھڑی میں از سرتا پا مجبور و نیاز ہے۔

اس سے نزدیک ہی شارع طاہر بندگیؒ واقع ہے۔ ساتھ مولانا سید محی الدین قادری سجادہ نشین ہشتم دربار قادریہ بٹالہ شریف کا مزار ہے۔ تھوڑی آگے قادری مسجد ہے۔ ذرا ایک طرف قطب جہاں، غوث زماں، برہان شریعت حضرت شیخ محمد طاہر بندگی چشتی صابری، مجددی محو خواب ہیں۔ اس مزار کے شمال میں ایک گول سا چبوترہ ہے، جو پنج ڈھیرہ کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت طاہر بندگیؒ کے جنوب مشرق میں محلّہ گل بیگم ہے۔ یہاں کا قطعہ زمین ''باغیچہ رانی گل بیگم'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زوجہ مہارانی گل بیگم کا مقبرہ ہے۔

باب طاہر کے راستے حضرت شیخ طاہر بندگیؒ کی درگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے ایک الیکٹرک پول سر اٹھائے کھڑا ہے۔ ذرا قریب مزدور شاعر احسان دانش کی لحد ہے۔ ان کے متعلق ایک روسی مصنف نے اپنی کتاب میں لکھا تھا:

''دنیا بھر میں واحد مزدور شاعر جو خدا کو مانتا ہے۔ اسے کسی معاشی نظام نے کچھ نہیں دیا۔ یہ سب اس کی اپنی محنت کا پھل ہے''۔

احسان دانش کی متجسس نگاہوں میں عشق رسول کی عظیم جھلک بھی دکھائی دیا کرتی۔ دانش کدہ چھوڑنے سے چند دن قبل مرحوم نے اپنے حال مطابق روح کو گھائل کر دینے والا کیا خوب صورت شعر کہا تھا:

مجھے عادت ہے اپنے گھر نماز شام پڑھنے کی
میری میت کو دفنانا غروبِ شام سے پہلے

یہاں پردہ خاک میں ایسے مہ جبیں بھی پنہاں ہیں، جن کے چرچے سن کر لیلیٰ شب نے اپنے زیور اتار پھینکے۔ درجنوں نامور شعرا اس جگہ مدفون ہیں۔ اس بستی میں شاہ و گدا کا کوئی امتیاز نہیں۔ اس میں نامور عالم دین حضرت مولانا غلام محمد ترنم کی خواب گاہ کے علاوہ مولانا احمد علی لاہوری بھی دفن ہیں۔ علم و ادب کے نایاب گوہر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا تنِ خاکی بھی اسی خاک میں چھپا ہوا ہے۔ بعض افراد نے اپنی جستجو سے دلہ بھٹی کی تربت کا نشان بھی کھڑا کر دیا ہوا ہے۔ میاں عبدالرشید مرحوم و مغفور (کالم نگار ''نور بصیرت'') بھی دنیا کے سفر سے تھک کر بغرض آرام یہیں آگئے ہیں۔ گریہ صراحی پر کائنات کو لٹانے والا شاعر عبدالحمید عدم بھی اپنی نارسائی پر سینہ فگار

ہے۔ مجلس احرار کا ایک روشن ستارہ، جہانِ خطابت کا ناقابلِ فراموش حوالہ، صاحبِ طرازادیب، چوہدری افضل حق، جن کا انتقال ۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو ہوا تھا، بھی یہیں مدفون ہیں۔

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

غازی عبدالقیوم شہیدؒ

چاند کے سر دا جالوں میں جوار بھاٹا کچھ اس طرح رقص کرتا ہے کہ جیسے مے خانہ میں ساقی کے اردگرد بدمست شرابی منڈلا رہے ہوں۔ بیتاب لہریں اچھلتی، مچلتی، لچکتی اور سنبھلتی ہوئی جبیں سائی کو ساحل سمندر پر آنکلتی ہیں تو اسی لمحے ہجولیوں کو پازیب پہناتی، قدم قدم پر آئینہ دکھلاتی، اٹھلاتی اور مدھم سروں میں کوئی شرمیلا گیت گاتی بےنقش پالوٹ بھی جاتی ہیں۔

کراچی، تا حد نگاہ پھیلے ہوئے پانی کے کنارے پر واقع دائیں بائیں سے قدرے گریزاں اپنے عقب میں وسعت پکڑے چلا گیا ہے۔ محیط بیکراں کے اس خشک ہمسائے کے نام سے بادی النظر میں ذہن کے پردے پر تانیث کا تاثر ابھرتا ہے۔ روشنیوں کا یہ شہر بلحاظ عزم بالکل جوان جبکہ آبادی کے تناسب سے لوگ اسے سن رسیدگی کی یادگار سمجھتے ہیں۔

سمندر، زندوں کو نگلتا اور مردوں کو اگلتا ہے۔ جس کے پہلو میں زندگی کی للک ہو، اسے مردہ شے سے کیا علاقہ؟ شاید اسے بے جان جسم سے بیزاری ہے اور سنگ پاروں سے اکتاہٹ۔ جب کبھی ترنگ میں آجائے تو اپنے سینے کے ایک ایک راز کو اگل کر باہر رکھ دیتا ہے۔ غالباً تاریخ کا بھی یہی حال ہے۔

کراچی دیبل کے کھنڈرات پر آباد ہوا تھا۔ قدیم ہندوستان سے عربوں کے تعلقات اور ایک دوسرے پر اس کے اثرات علیحدہ موضوع ہے۔ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت بھی خارج از بحث ٹھہری۔ سندھ کو باب الاسلام کہا گیا، اس رعایت سے کراچی کو باب سندھ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ پاکبازان نفس کا ورود اوران کی خدامستی کا معاملہ بھی جدا ہے۔ الغرض ہندو سورماؤں اور غازیان اسلام کو تلواریں لہراتے ہوئے بھی بارہا دیکھا گیا۔ لیکن اس کی درمیانی مسافت صدیوں پر محیط ہے۔ کراچی قدامت کے لحاظ سے تاریخ کا کوئی قابلِ ذکر فرزند ہرگز نہیں۔

گزشتہ عیسوی صدی کے آغاز تک کراچی، ایک انتہائی مختصر اور غیر معروف قصبہ تھا۔ انگریز کی عملداری میں اس نے شہر کی قبا پہنی اور اپنی سج دھج دکھلانے لگا۔ زندہ دلوں اور جفاکشوں کو جانے کیا ادا پسند آئی کہ دور دراز کے علاقوں سے آکر یہاں آباد ہوئے اور پھر یکا یک اس پر ایک انبوہ خلائق ٹوٹ پڑا۔ اب یہ انسانی اژدہام کا ایک ایسا مرکز یعنی آبادی کا وہ سیلاب ہے کہ پوری

دنیا کو آنکھیں دکھاتا پھرتا ہے۔ چودھویں صدی کے ربع اوّل اور اس کے کئی برس بعد تک سندھ، صوبہ بمبئی میں شامل رہا۔ گو صوبے میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی، لیکن سندھ کے تمام اضلاع میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ باوجود اس اکثریت کے یہ ملازمت، تجارت، تعلیم اور اقتصادی شعبوں میں ہندوؤں سے کہیں زیادہ پسماندہ رہے۔ ہاں ان کے پاس ایک شے کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ ہے سرمایۂ عشق رسولؐ۔ اس کا ایک عظیم مظاہرہ ۱۹۳۴ء میں کراچی میں بھی ہوا۔



یہ ان تلخ ایام کا تذکرہ ہے جب شدھی و سنگھٹن ایسی شرانگیز تحریکیں اپنے نقطۂ عروج پر تھیں۔ ۱۹۳۳ء کے اوائل میں آریہ سماج حیدرآباد، سندھ کے جنرل سیکرٹری نتھومل عرف نتھورام نے ایک زہرآلود کتابچہ ''تاریخ اسلام'' شائع کیا۔ یہ پمفلٹ ''رنگیلا رسول'' اور اس جیسے دیگر پاجیانہ رسائل سے ماخوذ مواد پر مشتمل تھا۔

نتھورام ایک اخبار ''سندھ سماچار'' کا ایڈیٹر تھا۔ اسلام دشمنی اس کے رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ محسن انسانیت ﷺ کی شان اقدس میں زبان درازی اس کا معمول بن چکا تھا۔ ''تاریخ اسلام'' کے نام سے یہ پمفلٹ اور ''علمائے اسلام سے سوالات'' کے زیرِ عنوان ایک پمفلٹ اس کے کمینہ پن کا برملا اظہار تھا۔ ان میں ہر طرح کی اشتعال انگیزی سے کام لیا گیا اور مولائے کائنات ﷺ کی ذات بابرکات کے مقام رفیع میں ناقابل برداشت گستاخیاں کی گئی تھیں۔ المختصر یہ کہ اس شرانگیز کتابچے میں ناموسِ رسالت پر اسی انداز میں حملہ کیا گیا جو ایک عرصہ سے آریہ سماجیوں کا وطیرہ بن چکا تھا۔

تاریخ اسلام اور علمائے اسلام سے سوالات دونوں سندھی زبان میں تھے۔ یہ ویسنی مل اور گبیامل کی گہری دلچسپی کے ساتھ شری سرتھ پرنٹنگ پریس حیدرآباد سے طبع ہوئے اور نتھیری مل کیماتری ملکانی نے ان کو شائع کیا۔

چنانچہ جوں ہی نتھورام کا یہ ناپاک کتابچہ بازار میں آیا، مسلمانان ہند اس کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے۔ عبدالمجید سندھی، حاتم علوی اور دوسرے مسلمان لیڈر بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ قانونی چارہ جوئی کے طور پر نتھورام کے خلاف استغاثہ دائر کیا گیا۔

ایڈیشنل سیشن جج حیدرآباد نے ۱۹۳۴ء کی پہلی ششماہی میں تعزیرات ہند دفعہ ۲۵۹ الف کے تحت نتھورام کو آٹھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ عدالت نے قرار

دیا کہ مجرم گستاخیٔ رسول کا واقعی مرتکب پایا گیا ہے، جس سے مسلمانوں کے جذبات شدید مجروح ہوئے ہیں۔ نتھو رام نے سیشن جج کے اس فیصلہ کے خلاف اعلیٰ عدالت (ان دنوں جوڈیشل کمشنری کہلاتی تھی) میں اپیل دائر کر دی۔ اسکے ساتھ ہی وہ ضمانت پر رہا بھی ہو گیا۔

مقدمے کی سماعت مارچ ۱۹۳۴ء میں شروع ہوئی۔ ۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کے روز مسٹر ڈی این او سلیوان ایڈیشنل جوڈیشنل کمشنر پر مشتمل بنچ فوجداری کی اپیلیں سماعت کر رہا تھا۔ نتھو رام کو بھی آج اپنے رسوائے زمانہ پمفلٹ ''تاریخ اسلام'' کی پیشی بھگتنا تھی۔ ہندو اور مسلمان بھاری تعداد میں مقدمے کی کارروائی سننے آئے ہوئے تھے۔ اسی دوران مذکورہ شاتم رسول ساتھیوں کے ہمراہ گپیں ہانکتا ہوا آیا اور عدالت میں ڈائس کے قریب پڑے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ شمع رسالت کا ایک غیور پروانہ نعرہ تکبیر بلند کرتا ہوا آگے بڑھا اور مولائے کائنات ﷺ کی ذات اقدس کو نشانۂ سب وشتم بنانے اور آپؐ کے حضور میں سوقیانہ انداز اختیار کرنے والے گستاخ رسول کو برسرعام واصل فی النار کر دیا۔ وفا کے چراغ جلانے والا یہ خوش قسمت نوجوان ''غازی عبدالقیوم شہید'' تھا۔



چند برس پہلے کی بات ہے، راقم الحروف بارش رحمت میں نہاتا، راولپنڈی سے گزرتا، ٹیکسلا کینٹ کو پیچھے چھوڑتا اور تربیلا روڈ پھلانگتا ہوا ایک قصبے ''غازی''، تحصیل ہری پور، ضلع ایبٹ آباد میں جا پہنچا۔ یہ بستی بطل حریت، فدا کار رسالت، غازی عبدالقیوم شہید کا مسکن و مولد ہے۔ جوش وولولہ، کیف وسرور، سوز وساز، راز و نیاز اور جذبۂ سرفروشی کا امین۔ میں نے حافظ آباد سے یہ جست ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہری پور کی طرف لگائی، لیکن محبوب خدا ﷺ کی عزت وناموس کے اس لاڈلے محافظ کا سفر عقیدت ۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کو کراچی میں شروع ہوا تھا۔

غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی تاریخ وسن ولادت کے بارے میں اعتماد سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اس روایت میں شک وشبے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ آپ کی پیدائش ۱۲۔ ۱۹۱۱ء کے دوران میں ہوئی۔ والد کا نام عبداللہ خان تھا اور قوم پٹھان۔ خاندان کا تعلق تو دریا پار کے علاقہ سے تھا مگر بوجوہ آپ کے دادا عنایت اللہ خان کسی وجہ سے ''غازی'' میں منتقل ہو گئے۔

عنایت اللہ خان کے تین بیٹے ہوئے۔ فیض اللہ خان اور رحمت اللہ خان چھوٹے تھے اور غازی صاحب کے والد محترم، عبداللہ خان سب سے بڑے۔ غازی عبدالقیوم شہید کے برادر اکبر

ہمایوں خان نے محکمہ کوآپریٹو میں ملازمت اختیار کیے رکھی۔ ان کو علاقے میں عام طور پر خان لالہ کہا جاتا ہے۔ شہید موصوف کے بھتیجے منظور احمد، سعید احمد اور توصیف احمد بقید حیات ہیں۔ ان کے چچاؤں کے بھی تین تین بیٹے تھے۔ فیض اللہ خان کے حجو بہ خان، منور خان اور گلزار خان۔ دوسرے چچا رحمت اللہ خان کے، جمعہ خان، فضل رحمان اور محمد عرفان ہیں۔

غازی عبدالقیوم شہیدؒ سے چھوٹی بڑی چھ بہنیں تھیں۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا نام جنت بی بی ہے۔ انہوں نے اپنے فرزند ارجمند کو شان جمال مصطفیٰ پر جان قربان کر کے سزاوار صلۂ شہادت، تب وتاب جاودانہ بچشم خود دیکھا۔ عبداللہ خان، ڈاک بنگلے میں ملازم تھے اور قصبے میں ان کی کچھ اراضی بھی تھی۔ ان دنوں 'غازی' میں صرف پرائمری سکول ہوا کرتا تھا۔ عبدالقیوم نے جب سن شعور میں قدم رکھا تو مدرسہ میں داخل کروا دیئے گئے۔ مگر ابھی آپ چوتھی جماعت ہی پاس کر پائے تھے کہ سلسلہ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ اس کا سبب تلاش روزگار بتایا جاتا ہے۔

غازی موصوف کی عمر پندرہ سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی جب انہیں کراچی جانا پڑا۔ گویا آپ کا لڑکپن بھی فکر معاش کی دستبرد سے آزاد نہیں تھا۔ تب موضع ''غازی'' کے مردوں کی تقریباً نصف تعداد کراچی میں بسلسلہ حصول روزگار قیام پذیر تھی۔ اکثر مزدور پیشہ تھے اور بعض کوئی دوسرا دھندا بھی کرتے۔ الغرض عبدالقیوم بھی اپنے چچا رحمت اللہ خان کے پاس چلے گئے۔

غازی عبدالقیوم شہیدؒ کے بچپن اور عہد جوانی کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ چونکہ ان کا عرصہ شباب کراچی میں گزرا اور وہ بھی معاشی تلخیوں کے سائے میں، اس لیے یادداشتیں محدود ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ابتداً آپ ایک آزاد منش نوجوان تھے۔ اس دوران طبیعت میں سوز و گداز کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ یہ بالکل سچ ہے کہ ان کی صبح و شام دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں گزرتی اور قیمتی وقت اچھل کود کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ ازاں بعد اچانک انقلاب رونما ہوا۔

میں حضرت قبلہ غازی صاحب کے عہد رفتہ کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک موڑ پر آپ کے عزیز ترین دوست اور چچا زاد بھائی، محمد عرفان خان صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ داستان انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا ہے انہی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

''میں غازی عبدالقیوم شہیدؒ سے پانچ سال چھوٹا ہوں۔ شہید موصوف تلاش معاش کیلئے نکلے تو میرے اباجی کے پاس کراچی تشریف لے گئے۔ میں پہلے سے وہیں تھا۔ سن بلوغت میں قدم رکھتے ہی انہوں

نے گھوڑا گاڑی چلانا شروع کی۔ ان پر ایک دور آوارہ مزاجی اور بے راہ روی کا بھی گزرا۔ اس دوران وہ صدر میں واقع ایمپرس مارکیٹ کے بالمقابل جہانگیر پارک میں جوا بھی کرواتے رہے۔ خوبرو، صحت مند، بیباک اور نڈر تھے۔ کئی بار یوں ہوا کہ پولیس کے سپاہیوں سے بگڑتے تو انہیں پیٹ ڈالتے۔ بدمعاشوں کی انہیں کوئی پروا نہ تھی بلکہ ایک طرح سے خود بگڑے ہوئے نوجوان تھے۔ مزید برآں یہ کہ آپ کو مذہبی امور سے بھی کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ پھر یوں ہوا کہ رسول پاک ﷺ کی نگاہ کرم سے ان کی زندگی افسانہ بنی اور شہید رسالت کہلوائے۔

غازی ممدوح کی شادی، کارنامۂ جہاد سرانجام دینے سے صرف تین چار ماہ پہلے ''دریائی خانم'' نامی ایک بلند نصیب اور سعادت مند خاتون سے ہوئی۔ آپ کے سسرال کا تعلق نزدیکی گاؤں ''میاں ڈھیری'' سے تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ رشتہ مناکحت میں بندھ جانے سے چند ہفتے قبل گاؤں آئے تو رنگ و روپ بدلا ہوا تھا۔ داڑھی رکھی ہوئی تھی اور صوم و صلوٰۃ کے پابند۔ وہ لاابالی نوجوان جسے دین سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، ہوا کرتا اب ایک باعمل مسلمان کی صورت میں دیکھا گیا۔ تبدیلی کا اصل راز بہت کم لوگ جانتے ہیں''۔

محمد عرفان خان مزید بتاتے ہیں:

کینٹ اسٹیشن کراچی میں ''بابا جی زندہ پیر'' کی درگاہ بہت مشہور ہے۔ آپ کا تعلق ''دھمن شریف'' سے تھا، جو مانسہرہ ضلع ہزارہ سے کچھ آگے واقع ہے لیکن بحکم شیخ ہمیشہ کراچی میں تبلیغ و تربیت فرماتے رہے۔ ایک روز عبدالقیوم کسی سلسلہ میں ان کے تکیہ گئے اور چند ثانیے بیٹھ رہے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے نظر اٹھائی اور عبدالقیوم کو دیکھ کر وجد میں آگئے۔ فرمایا:

''اوئے لڑکے! تو کن چکروں میں پڑا ہوا ہے؟ اپنی پیشانی کیوں نہیں دیکھتا کہ اس میں کیا نور چمک رہا ہے؟''

بابا جی کے دیکھنے میں کچھ ایسا جادو تھا اور لہجے میں وہ مٹھاس کہ عبدالقیوم بے اختیار رو دیے۔ ایک ہی لحظہ میں تمام دنیوی کثافتیں دھل گئیں۔

ایک اور بزرگ نے ان سے فرمایا تھا:

''عبدالقیوم تو شہباز عشق ہے۔ میں نے تجھے بندۂ وفا کے روپ میں سرکار مدینہ ﷺ کے قدوم میمنت لزوم سے لپٹے ہوئے دیکھا ہے۔ غازی عبدالقیوم شہید، بابا جی زندہ پیر سے باقاعدہ بیعت ہوئے اور آپ کے ارشاد پر ہی نکاح کیا۔ تقریب شادی کے بعد کئی ہفتے گاؤں میں ہی ٹھہرے رہے اور پھر آخری مرتبہ کراچی کے لیے رخت سفر باندھا۔''

الختصر درویش خدامست کی محبت اپنا اثر دکھا چکی تھی اور فطرت عبدالقیوم کو کسی عظیم قربانی کے لیے سنوار سنگھار رہی تھی۔



عام طور پر مشہور ہے کہ آپ نے نتھورام کی حرام زدگیوں سے متعلق جمعہ کے روز ''جونا مارکیٹ'' کی مسجد میں سنا جہاں کے ایک امام مسجد ایک حافظ صاحب تھے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ انہوں نے صدر کی مسجد میں چسپاں ایک اشتہار دیکھا اور واقعات کو پڑھ سن کر جوش میں آ گئے۔ غازی عبدالقیوم شہیدؒ کے حقیقی بھانجے لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر حق نواز خان نے اس بارے میں لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں یہ قطعاً معلوم نہیں ہے کہ انہیں کیسے خبر چلی۔ اخبار میں پڑھا تھا یا کسی دوست نے بتائی۔ تاہم جب شادی کے بعد گاؤں سے جانے لگے تو اس طرح کے کسی پروگرام کے بارے میں اہل خانہ یا احباب کو کوئی اشارہ نہیں دیا۔ تاہم شہید موصوف کے ایک مخلص ساتھی یادوں کا سلسلہ جوڑتے اور انتہائی وثوق سے بتاتے ہیں:

> ''حضرت قبلہ غازی صاحب کے ایک دیرینہ آشنا غنی خان مرحوم تھے۔ انہوں نے کہیں سے اخبار میں پڑھا کہ کسی آریہ سماجی ہندو نے ایک زہر آلود کتابچہ بعنوان ''تاریخ اسلام'' لکھا ہے، جس میں سرکار مدینہ ﷺ کا خاص طور پر تمسخر اڑایا گیا ہے۔ اس کے خلاف حیدرآباد میں کیس چلتا رہا۔ وہاں سے سزا ہوئی اور اب فیصلہ کے خلاف اس نے سیشن کورٹ کراچی میں اپیل دائر کر رکھی ہے اور پیشیاں شروع ہو چکی ہیں۔
>
> غازی موصوف نے تفصیل واقعہ سنی تو اپنے رفیق کار سے کہا:
>
> ''سندھ میں اس قدر مسلمان ہیں لیکن اس بدزبان سے کسی نے نہیں پوچھا کہ سرور دو عالم کی شان میں گستاخی کرنے کی تجھے کیسے جرأت ہوئی؟ اور

کیا ہم پر بھی یہ فرض عائد نہیں ہوتا؟'' مذکورہ بالا گفتگو کے بعد آپ نے کافی دیر توقف کیا اور پھر انتہائی دلنشیں انداز میں گویا ہوئے:

''میرے پاس ایک چھوٹا چاقو ہے۔ اسے توڑتا ہوں اور اس مردار کے لیے ایک بڑا چاقو خرید کرتا ہوں۔ میں نے طاقت کے بل بوتے پر ہمیشہ برائی کو فروغ دیا۔ اب دنیا کی سب سے بڑی برائی کو صفحہ ہستی سے مٹا کر ہی دم لوں گا''۔

غازی صاحب بوری بازار میں گئے اور خوب دیکھ بھال کر ایک بڑا چاقو خریدا۔ واپسی پر اپنے ساتھی غنی خان سے کہا:

''میں نے یہ چاقو خاص نتھورام کے لیے حاصل کیا ہے۔ دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے عدالت میں ملوائے تاکہ میں اسے اور اس کے کارندوں سے پوچھوں کہ میرے رسول کی شان میں گستاخی کا فیصلہ انگریز کی عدالت میں نہیں کسی غیرت مند مسلمان کے خنجر کی نوک سے ہوتا ہے اور یہ کہ میرے پیارے رسول ﷺ کی عدالت ہی سچی ہے''۔

ادھر یہ تاریخ ساز پروگرام تشکیل پایا جبکہ جہانگیر پارک میں آپ پہلے ہی اعلان فرما چکے تھے کہ آج کے بعد جوئے کی کمائی میرے لیے سور کا گوشت ہے۔ آئندہ نہ تو میں، جواریوں سے راہ و رسم رکھوں گا اور نہ ہی مجھ پر ان کی چائے حلال ہے۔ ان دنوں کراچی صدر میں جوبلی سینما سے متصل وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ المعروف ''سعید منزل'' ایک پارسی کا بہت بڑا بنگلہ تھا۔ غازی صاحب اور ان کے اقارب کی گھوڑا گاڑیاں، اسی طویلے پر بندھی رہتیں اور رہائش بھی یہیں تھی۔ ایک روز غازی عبدالقیوم خان اقامت گاہ پر آئے۔ اپنے کپڑوں اور ہر قسم کے دیگر ساز و سامان کا بڑا سا ڈھیر لگایا اور اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ یہ سب جوئے کا مال تھا۔ اب میں نے راستہ بدل لیا ہے۔ اس لیے اس سامان سے بھی نجات چاہتا ہوں۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ جمعے کا دن تھا۔ آپ نے گھوڑا گاڑی میں اٹھارہ سیر کا ایک کنستر رکھا، اس میں مٹی کا تیل تھا اور کھڈا مارکیٹ (کھارادر) کے بالمقابل میمن مسجد میں پہنچ گئے۔ یہاں کے مولانا صاحب ایک دردمند مسلمان اور سچے عاشق رسول تھے۔ پورے کراچی میں ان کا فتویٰ معتبر خیال کیا جاتا تھا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو مولانا موصوف سے عرض کیا:

"اگر کوئی مسلمان کسی گستاخ رسول کو واصل جہنم کردے تو اس کے لیے کیا انعام ہے؟ اور یہ کہ میں نے زندگی بھر جو کچھ کمایا، وہ جوئے سے تھا اور ہمیشہ حرام کی کمائی دکھائی۔ دیگر تمام اشیاء جلا چکا ہوں۔ فقط یہ گھوڑا گاڑی باقی ہے۔ اسے بھی نذر آتش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں"۔

"مولانا محترم نے فرمایا:

"رسول اکرم ﷺ کی حرمت وناموس پر جان وار دینے کا صلہ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ توبہ سے گناہوں کے داغ دھل جاتے ہیں اور ایسی توبہ پر تو رسول پاک ﷺ اپنے غلاموں کو سینہ مبارک سے لگا لیتے ہیں۔ باقی ماندہ چیزوں کو جلایئے نہیں، بلکہ جیسا کہ آپ بتا رہے ہیں مناسب یہ ہے کہ اپنی بڑی بہن جو کہ بیوہ ہے کو دے دو۔ اگر یہ نہ کرنا چاہو تو بھی بہتر یہی ہے کہ بیچ کر اس کی رقم ہمشیرہ کو دے دیجیے"۔

کراچی میں اب انہیں فقط نماز، درود وسلام اور قرآن پاک سے تعلق تھا اور دوسری طرف نھورام کی تلاش!



نھورام قتل ہوتا ہے

۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کی اجلی صبح کا ذکر ہے۔ محمد عرفان خان اپنی گاڑی لے کر آ رہے تھے کہ غازی عبدالقیوم کو میمن مسجد سے باہر نکلتے دیکھا۔ انہوں نے گاڑی روک لی اور غازی صاحب بھی ساتھ بیٹھ گئے۔ جانے کیوں آج زمین پر ان کے پاؤں نہیں ٹکتے تھے اور وہ مسلسل چہک رہے تھے۔ غازی عبدالقیوم نے ایک ادائے دلبرانہ سے کہا:

"فانی! کیا تم بدمعاش بنو گے؟ جیل میں جاؤ گے؟ چچا رحمت اللہ خان کو رلاؤ گے؟ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔ علاقہ وبرادری کے بعض دیگر لوگوں کی طرح بدمعاشی مت کرنا"۔

اتنے میں سعید منزل قریب آ گئی۔ غازی صاحب چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دیتے اور کہتے ہیں:

"لالہ! گھر چلے جاؤ۔ سامنے وہ ایک ایرانی ہوٹل ہے نا، میرا وہاں

بہت ہی ضروری کام ہے۔ (یہاں قصبہ غازی کے گھوڑا گاڑیوں والے بالعموم کھڑے ہوتے تھے) اس کے بعد میرا ایک اور جگہ جانا بہت ضروری ہے''۔

اس ''بہت ہی ضروری کام'' کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا پختہ عزم کئے ہزارہ کا یہ خوش قسمت ترین نوجوان کچہری پہنچ جاتا ہے۔ نتھورام، ڈائس کے نزدیک ایک بنچ پر بیٹھا ہوا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔

بطل حریت، مجاہد ملت، غازی عبدالقیوم خان بھی عدالت کے کمرہ میں آتے اور برابر والی نشست پر مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک شخص سے نہایت راز داری کے ساتھ پوچھا کہ نتھورام کہاں بیٹھا ہوا ہے؟ اس نے اشارے سے بتلا دیا۔ آپ وہاں سے اٹھے اور گستاخ رسول کے بالکل ساتھ آ بیٹھے۔

عین دوپہر کا وقت تھا اور نتھورام کے مقدمے کی سماعت شروع ہونے والی تھی۔ پروانۂ شمع رسالت از حد محتاط انداز میں بائیں ٹانگ ذرا سی اوپر اٹھا کر چادر کی اوٹ میں اوزار کھولتے اور دستے پر اپنی مضبوط گرفت جما لیتے ہیں۔ کوئی ساڑھے بارہ بجے کا عمل ہوگا کہ دونوں انگریز جج، مسٹر ڈی ایم فیرس اور مسٹر ڈی این اوسلیوان جوڈیشل کمشنران اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نتھورام کے کیس کی فائل ان کے سامنے پڑی تھی۔ اس عدالت میں ایک ملازم کا تعلق ضلع ہزارہ سے تھا۔ اس نے ایک موقع پر غازی صاحب کے عزیز واقارب سے اپنے تاثرات و مشاہدات مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کئے:

''کورٹ میں، میرا کام جج صاحبان کے پیچھے پیچھے جھنڈا لے کر چلنا تھا۔ اس روز میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان عدالت کے کٹھرے میں بالکل نزدیک بنچ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کہوں، عدالت میں یوں بیٹھنے کا حکم نہیں۔ اس کی وضع قطع اور رنگ ڈھنگ سے میرا اندازہ یہی تھا کہ ہو نہ ہو یہ شخص بھی میرے علاقے کا ہے۔ اتنے میں جج صاحبان پہلا کیس ختم کر چکے تو گھنٹی دے کر مجھے کہا کہ نتھورام کو آواز دو۔ اسی دوران وہی آلتی پالتی مارے بیٹھا نوجوان اٹھا اور مذکور کا دایاں بازو پکڑ کر اس کے سینے میں چھری گھونپ دی۔ دوسرا اور دل

پر لگا۔ وہ بہت بھاری تھا، زخموں کی تاب نہ لا کر گر پڑا۔ آپ کے نعرہ ہائے تکبیر اور نتھو رام کی خوفناک چیخوں سے ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ لوگ مارے خوف کے ادھر ادھر دوڑنے لگ پڑے۔"

احوال واقعی یہ ہے کہ پہلا کاری زخم، گستاخ رسول ﷺ کی پشت پر لگا۔ وہ ہائے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہندو اسے سنبھال ہی رہا تھا کہ اتنے میں مرد مجاہد نے دوسرا وار اس کے پیٹ میں کیا۔ وہ گر پڑا لیکن غازی صاحب کا غصہ فرو نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے چار اور بھی شدید زخم لگائے کہ تھانہ صدر میں ایک ملازم، فقیر محمد (یہ غازی صاحب کو جہانگیر پارک کے حوالے سے جانتا تھا) آگے بڑھا اور آپ کا ہاتھ روکتے ہوئے مخاطب ہوا:

"تم نے عدالت میں یہ کیا ستم ڈھا دیا ہے؟"

غازی صاحب نے حالت طیش میں کہا:

"مجھے مت روکو، پیچھے ہٹو، ورنہ تمہیں بھی اڑا دوں گا۔"

اس کشمکش میں اس کے بھی معمولی سا زخم آیا۔ شمع رسالت کا پروانہ جب اپنا کام نپٹا چکا تو چاقو ایک طرف پھینکا اور کہا کہ آؤ، اب جس کا جی چاہے مجھے گرفتار کر لے۔ ایک سب انسپکٹر ریوالور تانے کمرہ عدالت میں داخل ہوا۔ غازی عبدالقیوم خان جوشیلی آواز میں کہتے ہیں:

"اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا الحمدللہ کر چکا ہوں۔"

سب انسپکٹر پولیس ریوالور والا ہاتھ نیچے کر لیتا اور آگے بڑھ کر غازی صاحب کے پاس پہنچتا ہے۔ آپ نے دونوں ہاتھ نہایت اطمینان سے گرفتاری کے لیے بڑھا دیے۔ ساتھ والے کانسٹیبل نے فوراً ہتھکڑی لگا لی۔ اس واقعہ سے عدالت کے کمرہ میں سخت سنسنی پھیل گئی تھی اور لوگ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ججوں نے اسی وقت عدالت برخاست کی اور نتھو رام کو فوراً ہسپتال بھجوایا گیا، جس نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔

سید محمد اسلم بار ایٹ لا جنہوں نے غازی عبدالقیوم کا قانونی مقدمہ لڑا، انہوں نے ایک انٹرویو میں اپنے چشم دید حالات یوں بتائے تھے:

"نتھو رام کی اپیل کی سماعت شروع ہونے والی تھی۔ میں پہنچا تو بارہ بجنے میں پانچ سات منٹ باقی تھے۔ میں عدالت کے برآمدے میں ایک دوست سے باتیں کرنے لگا۔ اچانک کمرہ عدالت سے تیز تیز

آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی نعرے لگا رہا ہو۔ ساتھ ہی بہت سے آدمی باہر کو بھاگے۔ میں لپک کر اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ نتھورام کی آنتیں نکلی پڑی ہیں اور وہ زمین پر پڑا موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کی گدی سے خون کا فوارہ ابل رہا ہے۔ قریب ہی ایک مسلمان نوجوان ہاتھ میں ایک بڑا سا خون آلود خنجر نما چھرا لیے کھڑا نظر آیا۔''

غازی عبدالقیوم کے چچازاد بھائی جسے آپ ضروری کام کا کہہ کر گئے تھے نے اپنا کانوں سنا اور آنکھوں دیکھا حال مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا:

''میں دوپہر کے کھانے کے بعد سیشن کورٹ سواریاں لینے کو پہنچا اور گھوڑے کو گھاس کھلا رہا تھا۔ مجھے انتظار تھا کہ دوپہر کا وقفہ ہو اور لوگ باہر آئیں۔ عدالت سنگ سرخ سے تعمیر کی گئی تھی۔ رتن تلاؤ سے ملحق اس جگہ اب سندھ اسمبلی ہال کی بلڈنگ واقع ہے۔ یکا یک ''اللہ اکبر'' کی آواز آئی۔ نعرہ اس قدر زوردار تھا کہ زمین کانپتی محسوس ہوئی۔ یہ واقعہ اتنا غیر متوقع اور سراسیمگی پھیلا دینے والا تھا کہ وکلاء اور دیگر اشخاص سرپٹ بھاگنے لگے۔ مجھے حقیقت حال کی خبر نہ ہو سکی۔ خیر ڈرتے ڈرتے ایک سواری بولٹن مارکیٹ چھوڑ آیا۔ دوبارہ پہنچا تو عبدالقیوم کے ہتھکڑیاں لگی دیکھیں اور یہ کہ وہ نعرہ تکبیر لگا کر پولیس کی لاری میں بیٹھ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنا تانگہ سرپٹ دوڑا رکھا اور ''ٹرام گودی'' میں آکر تمام صورتحال اپنے والد محترم کو بتلائی۔ شام کو ہم دونوں باپ بیٹا پولیس اسٹیشن گئے۔ غازی صاحب حوالات میں بند تھے۔ ہمیں دیکھا تو مسکرا کر ملے۔

والد بزرگوار نے کہا:

''عبدالقیوم، تم نے یہ کیا کیا ہے؟''

غازی صاحب نے فرمایا:

''کاکا! اس بے غیرت کا یہی علاج تھا جو میں نے کر دیا ہے۔''

والد صاحب نے کہا:

''میرا خیال ہے یہ حکومت تمہیں چھوڑے گی نہیں!''

مرد غازی نے چہک کر جواب دیا:

''کا کا! یہ بات میں پہلے ہی جانتا تھا۔ اس راہ میں پھانسی لگ جانا ایک انعام ہے، کوئی سزا ہرگز نہیں ہے۔ ہاں! اگر میں مرتبۂ شہادت سے محروم رہ گیا تو یہ بہت بدقسمتی ہوگی''۔

وہ عبدالقیوم...... جو مدرسہ میں چار جماعتیں اور صرف ناظرہ قرآن پڑھا ہوا تھا، بحر عشق کا شناور، وفا کا مرقع اور میدان عمل کا غازی نکلا۔ ضعیف ماں اور ایک بیوہ بہن کا کفیل تھا۔ نئی نویلی دلہن کی آرزوؤں اور تمناؤں کا امین بھی۔ تنگدستی سے اکثر پیٹ خالی رہتا۔ لیکن دل، درد کی دولت سے مالا مال تھا اور سینے میں غیرت ایمانی کروٹیں لیا کرتی تھی۔ انہوں نے خلوص نیت کے ساتھ یہ عہد کیا تھا کہ گستاخ ناہنجار کو موت کے گھاٹ اتار کر رہیں گے اور ایک ہی جست میں عرفان و وجدان کی منزلیں طے کر لیں گے۔ کراچی کا یہ گمنام مزدور اس مرتبے کا سزاوار ٹھہرا کہ جہاں موت کبھی بھی نہیں آتی اور اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے ملک الموت کے بھی پر جلتے ہیں بلکہ بدن کو چھونے سے پہلے موت خود مر جاتی ہے۔



کمرۂ عدالت میں موجود افراد کا کہنا ہے کہ دونوں جج اس واقعہ سے حواس باختہ کانپ رہے تھے۔ مگر باوجود اس کے انہوں نے اپنی نشستیں نہ چھوڑیں، بلکہ ایک طرح سے نہایت تجسس اور دلچسپی سے نظارہ کرتے رہے۔ دراصل کمرۂ عدالت میں جرأت و بیباکی کا یہ منظر ان کے لیے عجوبہ تھا۔ جب غازی عبدالقیوم خان کی گرفتاری عمل میں آ چکی تو مسٹر ڈی این اوسلیوان ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر ڈائس سے نیچے اترا، آپ پر قہر آلود نگاہ ڈالی اور تحکمانہ انداز میں بڑبڑایا:

''تو نے اس کو مار ڈالا؟''

شیر دل مجاہد نے غضبناک لہجے میں جواب دیا:

''اور کیا کرتا؟''

''آخر کیوں؟''

جج نے استفسار کیا۔

''اگر کوئی اس (جارج پنجم کے فوٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کی قولاً یا فعلاً توہین کرے تو تم سخت سزا دیتے اور برسوں جیلوں میں

ٹھونسے رکھتے ہو۔ لیکن میرے آقا و مولا ﷺ جو دو جہانوں کے بادشاہ اور محبوب خدا ہیں کی گستاخی ہو تو محض دو چار سو روپے جرمانہ۔ لہٰذا میں نے خود اسے بالکل قرار واقعی سزا دے ڈالی ہے"

انگریز جج اور غازی موصوف میں جو مکالمہ ہوا وہ تاریخ کا ایک انوکھا اور ناقابل فراموش باب ہے۔ جج مذکور پوچھ رہا تھا:

"صرف اس وجہ سے نتھورام کو قتل کیا ہے؟"

جانباز مجاہد نے طمطراق سے فرمایا:

"اور کیا؟ اگر یہ شخص تمہارے اس بادشاہ (جارج پنجم) کو گالی دیتا تو تم لوگ کیا کرتے؟ کیا سخت سزا نہ دیتے؟ خنزیر کے اس بچے نے رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کی تھی اور اس کی کم از کم یہی سزا ہو سکتی ہے"

انگریز جج نے آخر میں پوچھا:

"اس کام کے لیے کیا تم ایک ہی مسلمان باقی تھے؟ یا کوئی اور مسلمان بھی ہیں؟"

آپ نے جواب دیا:

"میرے مسلمان بھائی ایک سے ایک بڑھ کر بہادر ہیں۔ لیکن اس مردار کے لیے میں اکیلا ہی کافی تھا۔ اگر کوئی اور بے غیرت ملیچھ پیدا ہوا تو ہزاروں مجاہد اس کو کیفر کردار تک پہنچانے کے جذبہ سے سرشار ہاتھوں پر اپنے سر لیے آگے بڑھیں گے۔"

گرما گرم سوال و جواب ختم ہوئے تو پولیس آپ کو تھانے کی طرف لے کر چل پڑی۔

سماعت مقدمہ

غازی عبدالقیوم خان نے پولیس کی گرفت سے بچنے اور جائے واردات سے فرار ہونے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے اپنے تئیں بخوشی حوالہ پولیس کیا۔ آپ کو برائے تفتیش صدر تھانہ میں رکھا گیا۔ مرد غازی نے پولیس کے روبرو واضح طور پر کہا کہ میں نے بقائمی ہوش و حواس، نتھورام کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور پیغمبر خدا ﷺ کی توہین کرنے والوں کا یہی انجام ہونا

چاہیے۔

ہندو لیڈروں کی خاص دلچسپی اور ہندو مت سے وابستہ سرکاری اہل کاروں کی کوشش سے اینگلو انڈین قانون کا ضابطہ اپنی مخصوص اور روایتی چال کے بجائے اس تیزی سے حرکت میں آیا کہ مہینوں کا کام گھنٹوں میں طے ہونے لگا اور برسوں کا دنوں میں۔ ابتدائی اطلاعی تفتیش، چالان وغیرہ سب کچھ دو دن میں ہو گیا اور مقدمہ قتل عمد سماعت کے لیے ابتدائی عدالت کے سپرد ہوا۔

غازی عبدالقیوم خان کی جرأت مومنانہ سے مسلمان ہند کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔ اسلام کا ہر سچا پیروکار ان کا متوالا تھا۔ غازی صاحب کی داستان محبت و وفا سے کسی طرف سے بھی نسبت ہو جانا، بلند بختی کی دلیل ٹھہر چکی تھی۔ ایسے ہی خوش نصیبوں میں ایک روشن نام سید محمد اسلم ایڈووکیٹ، ایم۔اے، بار ایٹ لا کا ہے۔ ان کا دل نتھو رام کی گندی کتاب سے مجروح ہوا اور مردود رسالت پناہ کو خون میں لت پت دیکھ کر باغ باغ۔ غازی صاحب نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب یہ اپنا فرض ادا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے از خود غازی صاحب کے چچا رحمت اللہ خان کو تلاش کیا اور پیش کش کی کہ میں اس مقدمے کی مفت پیروی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی احسان ہرگز نہیں ہو گا بلکہ میرے ایمان کی حرارت کا راز ہے۔ غازی موصوف کے لواحقین نے تشکر آمیزی کے ساتھ یہ بے لوث پیشکش قبول کر لی اور یوں شاہ صاحب دوسرے روز شہباز عشق کے قانونی مشیر کی حیثیت سے بغرض ملاقات جیل گئے۔ فدا کار رسالت سے کیا گفتگو ہوئی؟ اور وہ کیا خوشگوار لمحات تھے، یہ کہانی خود ان کی زبانی سنئے:

> ''اس سے پہلے بھی میں نے قتل کے ملزموں سے ضابطے کی ملاقاتیں کی تھی اور ان کی صورتیں مجھے یاد ہیں، مگر جو اطمینان اور سکون غازی عبدالقیوم کے چہرے سے ہویدا تھا وہ آج تک کسی اور جگہ پر نظر نہ آیا۔ جب میں نے بتایا کہ میں آپ کا مقدمہ لڑوں گا تو مرد مجاہد پکار اٹھا:
>
> ''آپ جو چاہیں کر لیں مگر مجھ سے انکار قتل نہ کروائیں۔ اس سے میرے جذبۂ جہاد کو ٹھیس پہنچے گی۔''
>
> میں نے غازی صاحب کو تشفی دی اور کہا: ''بے شک آپ اقرار کریں اور میں اس اقبال کے ذریعے انشاء اللہ آپ کو پھانسی سے اتار لوں گا''۔

مگر میری اس تشفی پر انہوں نے خوشی کا اظہار نہ کیا۔ میں نے دو چار باتیں اور کیں اور وکالت نامہ و دیگر کاغذات پر دستخط کروا کے لوٹ آیا"

غازی صاحب بتاریخ ۲۱۔ ستمبر ۱۹۳۴ء ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ کراچی کے روبرو پیش کیے گئے۔ آپ کا اقبالی بیان قلمبند ہوا۔ آپ نے فرمایا:

"میں ضلع ہزارہ کا رہنے والا ہوں اور سندھی زبان نہیں جانتا۔ میری عمر بارہ تیرہ سال تھی جب میں کراچی آیا۔ کراچی میں عرصہ قیام تقریباً دس سال ہے۔ اس دوران میں گاہے گاہے آبائی وطن بھی جایا کرتا۔ میں کراچی میں گھوڑا گاڑی چلاتا رہا ہوں۔ رنچھوڑ لائن میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ اس شہر میں میرے کئی رشتہ دار اور ہم قوم رہتے ہیں، لیکن کسی مولانا صاحب یا بارسوخ سیاسی و سماجی شخصیت سے میرا کبھی رابطہ نہیں رہا۔

اندازاً چھ ماہ قبل گاؤں گیا تھا اور تقریباً چھ ماہ ہی وہاں رہا۔ وہاں ہماری مزروعہ زمین ہے اور وہ بھی کاشت کرتا رہا ہوں۔ میری شادی کو فقط دو تین مہینے ہوئے ہیں۔ اب کے میں بارہ ستمبر کو کراچی آیا۔ میں نے گاؤں جانے سے پہلے سنا تھا کہ ایک بدزبان بنیے جو اخبار "سندھ سماچار" حیدرآباد میں ایڈیٹر ہے، نے ایک پمفلٹ شائع کیا اور اس میں رسول کریم ﷺ کی برگزیدہ ذات پر کیچڑ اچھالا ہے۔

میں اس بدنام زمانہ بنیے کو جانتا تھا اور نہ ہی میں نے اسے کبھی دیکھا۔ توہین رسالت کا تذکرہ سنتے ہی میرا خون کھول اُٹھا مگر تب میں کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ نابکار تک پہنچنے کا کوئی طریقہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ گاؤں سے لوٹا تو مجھے خبر ملی کہ دشمن نبی کو جرم گستاخی کی پاداش میں دو سال قید کچھ اور جرمانے کی سزا دی جا چکی ہے۔

پھر میں نے یہ بھی سنا کہ اس نے فیصلے کے خلاف مرافعہ دائر کر رکھا ہے اور عدالت میں ۱۹۔ ستمبر کو سماعت ہونے والی ہے۔ میں نے یہ بات میمن مسجد میں سنی جو چھاؤنی میں واقع ہے اور جہاں میں اکثر و بیشتر

فریضہ نماز ادا کیا کرتا تھا۔ میں خصوصیت کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتا کہ فلاں شخص نے مجھے یہ واقعات سنائے۔ میں ۱۹۔ستمبر کو عدالت میں مقدمہ سننے کے لیے گیا۔ لیکن وہاں سے معلوم ہوا کہ اس کی سماعت آئندہ روز ہوگی، چنانچہ واپس آیا۔

۲۰۔ستمبر، ۱۰ بجے صبح میں نے جونا مارکیٹ میں ایک ہندو کی دکان سے چاقو خریدا اور وہیں بخارا کے ایک حاجی صاحب سے دھار رکھوائی۔ اب آلہ میری آرزو کے عین مطابق تیز تھا۔ میں نے چاقو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں چھپالیا اور ساڑھے دس بجے عدالت کی طرف چل دیا۔ میں وہاں یکہ وتنہا گیا، میرے ساتھ کوئی اور شخص نہیں تھا۔

عدالت کے باہر مجھے اس کی مکروہ صورت نظر نہیں آئی تو ساڑھے گیارہ بجے عدالت کے کمرے میں جا پہنچا۔ میں نے اپنے اندازہ اور اس کی منحوس شکل سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میرا ''شکار'' کون سا ہے۔ میں ہر طرح سے یقین کر لینا چاہتا تھا۔ ایک آدمی سے بھی پوچھا۔ کئی افراد جو وہاں آتے، اس کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ میں نے ایسی جگہ منتخب کی جو اس کے نزدیک ترین تھی۔ میرے اور نتھو رام کے درمیان ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ جب مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہی وہ سگ بدکار ہے جس نے میرے رسولؐ پر نازیبا کلمات کسے اور پلید فقرات کہے ہیں تو مارے جوش کے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور خون کھولنے لگا۔

میں نے چپ چاپ اپنی جیب سے چاقو نکالا اور گھٹنا اٹھا کر اس کی اوٹ میں کھولا تا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ پھر میں فرط غضب سے کھڑا ہوا اور چاقو شاتم رسول کے پیٹ میں اتار دیا۔ پہلے وار کے ساتھ ہی خبیث بنیا اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے اس کی پشت پر ایک اور وار کیا۔ یہ بھی بہت کاری تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اسے کل کتنے زخم لگائے۔ میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے بھاگنے کی مطلقاً کوشش نہ کی۔ فرار ہو جانا، میرے صادق جذبوں کو گوارا نہیں تھا۔ میں نے اپنے اس ارادے کا کسی

سے ذکر نہیں کیا تھا اور شاید یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ نہ تو کسی نے ترغیب دی اور نہ ہی میں نے یہ عظیم فریضہ کسی کے ایما پر نبھایا۔

ہر وہ شخص جو میرے کریم آقا ﷺ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہو اسے مٹانے کے لیے گنہگار سے گنہگار مسلمان بھی جذبۂ محبت سرکار ﷺ سے سرشار ہو کر اپنی زندگی پر کھیل جاتا ہے۔ میں نے نور ایمانی کے ساتھ گستاخ رسول کو ٹھکانے لگایا ہے۔ ناموس رسالت پر یاوہ گوئی کا تصور کرنے والے کو کبھی زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اگر میری زندگی آقائے کونین ﷺ کی ناموس و حرمت پر قربان ہو جائے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی انعام خداوندی کیا ہو سکتا ہے!''

ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ درجہ اوّل، ضلع کراچی نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

''عبدالقیوم خان ولد عبداللہ خان کو سب انسپکٹر پولیس نے اس کا بیان قلمبند کرنے کے لیے دس بجے صبح میرے بنگلہ پر پیش کیا۔ میں نے امر وقوعہ کی تصدیق کی اور سب انسپکٹر پولیس کو بنگلے کی حدود سے باہر بھیج دیا۔ مزید برآں خوب اطمینان کر لیا کہ آس پاس کوئی پولیس ملازم نہیں، جو اس کارروائی کو دیکھ یا سن سکے۔ البتہ سادہ لباس میں بطور نگران چند ایک سپاہی موجود رہے۔ میں نے ملزم سے پوچھا کہ آیا وہ برضا و رغبت اقرار فعل کے لیے تیار ہے یا نہیں؟ اس نے حسب ذیل جواب دیئے۔

''اس شخص (نتھو رام) نے نبی آخر الزماں ﷺ کے بارے میں واہیات بکی تھیں اور میں نے اپنا فرض نبھایا ہے۔ میں اپنی مرضی سے بلا جبر و اکراہ اقبال فعل کر رہا ہوں۔ کسی نے دھمکی نہیں دی اور نہ ہی مجھ پر کوئی دباؤ ہے۔ میرے ہوش و حواس بالکل بجا ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ میرے خلاف بطور ذاتی شہادت سمجھا جائے گا اور یہ کہ میں، اپنے فعل پر کوئی پچھتاوا نہیں رکھتا بلکہ مجھے دوگونہ شادمانی ہے۔''

۲۳۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کو یعنی اندر دو یوم پولیس کی کارروائی و چالان وغیرہ مکمل ہو چکا تھا۔ ویسے

بھی تفتیش میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔عدالت کے کٹہرے میں دو ججوں اور سینکڑوں افراد کے روبرو، عین دوپہر کے وقت ایک پراگندہ طبع ہندو کو انجام تک پہنچایا، ازخود گرفتاری پیش کی اور پولیس کے سامنے بھی اعتراف فعل کیا۔لہٰذا کسی قسم کے روایتی دفاع کی ہرگز گنجائش نہیں تھی۔

جی ایم مرتضٰی، سب انسپکٹر پولیس، ایس سیکشن، کینٹ کراچی نے اپنا ایک دستخط شدہ تحریری بیان عدالت میں پیش کیا جو کہ درج ذیل ہے:

''سب انسپکٹر امتیاز علی اور میں مع چند سپاہیوں کے عدالت مذکور (مقامِ وقوعہ) میں ڈیوٹی پر حاضر تھے۔ بنچ میں کسی اور مرافعہ کی سماعت بھی ہو رہی تھی کہ یکایک کمرۂ عدالت کے عین وسط میں چیخ سنائی دی۔ چیخ سن کر سب کھڑے ہو گئے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ملزم کے پاس پہنچا۔ عبدالقیوم کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھرا تھا۔اسے فقیر محمد ہیڈ کانسٹیبل، پیر خان اور دیگر کانسٹیبلوں نے پکڑ رکھا تھا۔نتھورام کے پیٹ سے خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا اور اس کی آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔عبدالقیوم اور مقتول کے درمیان ایک اور آدمی مسمی حاجی غلام حسین بیٹھا تھا۔ملزم کو گرفتار کر کے اس سے چاقو چھین لیا گیا۔

نتھورام کو سول ہسپتال بھیج دیا گیا لیکن وہاں پہنچنے سے قبل ہی اس کی موت واقع ہو گئی۔دوران گرفتاری کانسٹیبل فقیر محمد کو بھی ایک معمولی زخم آیا۔

وقوعہ کے وقت عدالت میں مندرجہ ذیل اہم اشخاص بھی موجود تھے:

- ......مسٹر فیرس، جوڈیشل کمشنر سندھ
- ......مسٹر اوسلیوان، اسسٹنٹ جوڈیشل کمشنر، سندھ
- ......آتمارام، شارٹ ہینڈ ٹائپسٹ
- ......علی احمد اور عبدالعزیز چپڑاسی
- ......اللہ داد ہیڈ کانسٹیبل
- ......دھرم داس ایڈووکیٹ
- ......مدن موہن لال (ملتانی وکیل)
- ......ایل این فقیر داد

o...... ہیڈ کانسٹیبل فقیر خان

o...... پولیس کانسٹیبل نور عالم



جب مقدمہ سماعت کے لیے ابتدائی عدالت میں تھا تو سید محمد اسلم شاہ صاحب بیرسٹر نے گواہان کی ایک فہرست اس غرض سے پیش کی کہ ان کا موقف سنا جائے۔ یہ فہرست پاک و ہند کے قدآور زعماء پر مشتمل تھی۔ ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا ابوالکلام آزاد، کلکتہ۔ مولانا کفایت اللہ، صدر جمعیت العلماء ہند، دہلی۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا احمد سعید، ناظم جمعیت العلماء ہند، دہلی۔ مولانا ظفر علی خان، ایڈیٹر روزنامہ ''زمیندار'' لاہور۔ مولوی محمد صادق صاحب، کراچی۔ پیر سید غلام مجدد سرہندی، سندھ۔ مولوی محمد عثمان، سندھ۔ شیخ محمد عبداللہ ایڈیٹر ''نومسلم'' حیدرآباد۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، لاہور۔ ایم فتح علی، سندھ۔ میر آغا حسن خان سرہندی۔ مولانا محمد نعیم لدھیانوی۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، امرتسر۔ مولانا عبدالمجید سالک، ایڈیٹر اخبار ''انقلاب'' لاہور۔ مولانا شوکت علی۔

بنابریں فرنگی محل کے بعض مقتدر علمائے کرام کے نام بھی اس میں خاص طور پر درج تھے۔ عدالت کے استفسار پر بیرسٹر سید محمد اسلم نے اپنا موقف بیان کیا کہ مذکورہ بالا شخصیتوں کو طلب کیا جائے، تاکہ وہ تحریک شاتت رسول کا پس منظر، اہل ایمان کے عقیدہ اور از روئے شرع اسلامی، گستاخ نبیؐ کے لیے سزا کے بارے میں فاضل جج صاحبان کے روبرو اپنا نقطہ نگاہ بیان کر سکیں۔ انہوں نے موقف اختیار کیا کہ ان مشاہیر کی آراء سے واضح ہو جائے گا کہ امت مسلمہ کے دل میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کس درجہ احترام ہے اور آپ کی عزت و ناموس کے متعلق پیروکاران اسلام کے جذبات و عقائد کیا ہیں۔ یہ معزز حضرات بتائیں گے کہ جب رسول مکرم شفیع معظم ﷺ کی ذات پر حملہ کیا جائے تو فرزندان توحید کا لہو کس طرح اور کیوں کھول اٹھتا ہے، اور وہ کس پاکیزہ جذبے کے تحت انتقام پر اتر آتے ہیں۔

ہندو جج دادیہ مہتا نے اعتراض اٹھایا کہ یہ افراد مقدمے سے غیر متعلق ہیں۔ ان کو طلب کرنے کا آپ مزید کیا جواز پیش کرتے ہیں؟ فاضل قانون دان سید محمد اسلم بیرسٹر نے کہا:

> ''استغاثہ نے ایک شخص کو قاتل قرار دیا ہے۔ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں، مگر دیکھنا چاہیے کہ وجہ قتل کیا ٹھہری۔ اس جذبے کی نفسیاتی توجیہات اور دینی جذبات کی صریح ترجمانی یہی حضرات کر سکتے ہیں''۔

نوٹ: استغاثے کی طرف سے رپورٹ بھی میں نے ہی قلمبند کی تھی''

ظاہر ہے کہ محض قانونی موشگافیوں اور واقعاتی حوالوں میں مقید ایک جج نازکی جذبات کو کیونکر سمجھ سکتا تھا۔ لہٰذا درخواست خارج کر دی گئی۔ اس کے خلاف جوڈیشل کمشنری کراچی میں اپیل دائر ہوئی جس میں وہ جج ایک لحاظ سے چشم دید گواہ بھی تھے۔ درخواست داخل کروانے کے بعد فاضل وکیل نے ان کے اختیار سماعت پر قانونی اعتراض بھی دائر کر دیا۔ کراچی جوڈیشل میں اس وقت چار جج تھے۔ دو چھوٹے اور دو بڑے۔ ان میں سے تین جج، اس درخواست کی سماعت کے اہل نہ تھے اور چوتھے سیشن جج تھے۔ چنانچہ ایک جج مسٹر لوبو کو طلب کر کے پنچ تشکیل دیا گیا۔

اپیل کی سماعت ہوئی اور فیصلہ بحال رہا کہ مقدمہ سے غیر متعلق گواہوں کو بلانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی گنجائش۔ دو تین روز بعد مرافعہ عدالت مجاز میں آ گیا۔ اس کی سماعت مسٹر دادیبہ مہتا کو کرنا تھی۔ لیکن مقدمے کی اہمیت کے پیش نظر یہ ''جیوری ٹرائل'' قرار پایا۔ جیوری ۹۔ ارکان پر مشتمل تھی۔ اس میں دادیبہ مہتا کے علاوہ چھ انگریز اور دو دیگر ارکان شامل ہوئے۔

غازی عبدالقیوم خان کا مقدمہ ملک بھر میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اخبارات کے صفحے ہر روز اس سے مزین ہوتے۔ اس مقدمے کا کام بالکل سیدھا سادا اور بہت مختصر تھا۔ ثبوت واقعہ میں دو انگریز جج بھی تھے اور اس پر مستزاد غازی صاحب کا کھرا کھرا بیان۔ ضابطے کے بیان قلمبند ہوئے۔

واقعاتی پہلوؤں کو مدِ نگاہ کھا جاتا تو مدافعت کی کوئی شکل نہیں تھی۔ غازی صاحب کے اقراری بیان سے صاف ظاہر تھا کہ قتل کی واردات میں فوری اشتعال کا ہاتھ نہیں، بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اور جذبۂ عشق رسولؐ سے مخمور ارادے کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ بایں سبب سید محمد اسلم ایڈووکیٹ نے کیس کو بالکل نئے خطوط پر تیار کیا۔ یہ ایک طرح سے نفسیات انسانی کی تاریخ سے متعلق بحث تھی۔ شاہ جی نے روشن دماغی کے علاوہ دل بیدار کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا۔ احاطۂ عدالت میں ایک بلند پایہ وکیل کے ساتھ ساتھ غیرت ایمانی کی للکار بھی گونج رہی تھی۔ قانونی نکات میں صادق جذبوں کی گھن گرج بھی شامل ہو جائے تو حسن سماعت کا کیا کہنا! بس سنتے ہی رہ جایئے۔ الغرض سید محمد اسلم شاہ صاحب بار ایٹ لاء کی جرح برطانوی ہند میں اپنی نوعیت کی واحد اور منفرد مثال ہے۔

قانونی بحث کے مقررہ دن شاہ صاحب کے ہاتھوں میں قانونی پلندوں کی بجائے قرآن مجید کا ایک نسخہ تھا۔ کمرۂ عدالت میں موجود تمام لوگ اس پر متحیر رہ گئے۔ شاہ جی نے دلکش لہجے میں

اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور فرمایا:

''مجھے مقدمہ کے واقعہ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا کیونکہ جہاں تک وقوعے کا تعلق ہے وہ ثابت ہو چکا ہے۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ عبدالقیوم خان کا یہ اقدام اس قانون پر مبنی تھا جو چین کی سرحد سے لے کر مراکش تک جاری وساری ہے۔ جسے کئی حکومتیں اپنے پینل کوڈ کے طور استعمال کر رہی ہیں۔ جو ہماری تہذیب اور کلچر کی بنیاد ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ عدالت اس کوڈ سے انکار کر کے اس کے تقدس کو ٹھیس پہنچائے گی۔ لہٰذا میں کھول کر نہیں دکھاؤں گا۔ تاہم مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کے سہارے کہوں گا۔ یہ وہ مقدس کتاب ہے جس میں بار بار مذہبی پیشواؤں کی عزت واحترام کا حکم ہوا اور بدالفاظ کہنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ نہیں ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں ایسی متعدد وارداتیں ہو چکی ہیں۔ خصوصاً دہلی اور لاہور میں بالکل اسی نوعیت کے دو قتل بہت مشہور ہوئے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ فطرت انسانی دوسرے کی بدزبانی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس سے نفسیاتی طور پر کوئی جواب دینے اور انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان اپنی استطاعت کے مطابق زبان، قلم، ڈنڈے، تلوار یا گولی سے کام چلا لیتا اور تسکین حاصل کرتا ہے۔

اگر گزشتہ واقعات کے فوراً بعد قانون اس قسم کی حرکتوں کے انسداد کے لیے کوئی موثر کارروائی کرتا تو نتھو رام کے قتل کی واردات ہرگز نہ ہونے پاتی۔ مسلمان ایک عرصے سے ہندو اکثریت اور برطانوی حکومت کو سمجھا رہے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ان کے جذبات وحسیات اور حیات کی شہ رگ ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے بارے میں ہر ایک کلمہ گو اتنا ذکی الحس واقع ہوا ہے کہ معمولی سی گستاخی پر بھی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ دوسرے کی جان تو ایک طرف، وہ خود اپنی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا۔ لیکن نہ ہندو اکثریت نے اس طرف دھیان دیا اور نہ ہی برطانوی

حکومت کے کانوں پر جوں رینگی ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس مسئلے کی طرف توجہ نہ دی گئی تو ایسے ہولناک واقعات آئندہ بھی ہوتے رہیں گے، انہیں نہ ہندو اکثریت روک سکے گی اور نہ ہی تعزیرات ہند کی کوئی دفعہ“

جذبات کی فراوانی میں شاہ جی کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی ۔ اس مرحلے پر جج نے مداخلت کی ۔ ہاتھ کے اشارے سے روکتے اور پہلو بدلتے ہوئے کہا ۔

”کیا فاضل جیورسٹ اپنی بحث سے فرقہ وارانہ منافرت کو نہیں ابھار رہے ہیں؟“

شاہ صاحب نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا:

”منافرت کا سرچشمہ اور مخرج جہاں ہے، دراصل وہیں سے نفرت کے جذبات ابھر رہے ہیں ۔ میں تو مقتول نتھورام کی کتاب ”تاریخ اسلام“ کے ابھارے ہوئے جذبۂ منافرت کے عوامل و نتائج پر تقریر کر رہا تھا ۔ میں پھر عرض کیے دیتا ہوں کہ اس ضمن میں اہل اسلام اپنے اعصاب کا توازن برقرار رکھنے سے قاصر ہیں ۔ وہ تعزیرات ہند سے گھبرائے گا اور نہ ہی پھانسی کے پھندے سے ڈرے گا ۔ حتیٰ کہ مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے مسلمانوں کا بچہ بچہ اس کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آ جائے گا ۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسی صورت سے دوچار ہونے والے مسلمان کا سوچ سمجھ کر اٹھایا جانے والا قدم بھی اشتعال کی تعریف میں آنا چاہیے ۔“

اس مرحلے پر شاہ جی نے قرآن شریف کو ذرا سا بلند کیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

”میرے موکل نے جو کچھ بھی کیا اس قانون کی رو سے اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے جس کے ساتھ چودہ سو برس سے مسلمانوں نے پیمان وفا باندھ رکھا ہے اور جن خطوط پر پشت ہا پشت سے ہمارا تربیتی ماحول تشکیل پاتا چلا آیا ہے ۔ اپنی دانست میں عبدالقیوم خان نے قانون کو نہیں انصاف کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے ۔ اس اقدام میں شدید اور فوری غیظ و غضب کی عمل فرمائی تو ضرور ہے، مگر قاتل کے سے جذبہ و ذہنیت کا کوئی شائبہ دور دور تک نہیں ۔ سب سے معصوم جذبہ تو اس عہد کی پاسداری ہے، جس پر

میرے ایمان کی بنیاد ہے اور یہی چیز مجھے بے قصور اور سزا سے بری قرار دیتی ہے''۔

جج اس ٹھوس، دل آویز اور منطقی تقریر سے بہت جز بز ہوا۔ دراصل یہ فلسفہ اس کے مزاج سے ماوراء تھا۔ جج نے عہد کی پاسداری کے الفاظ دہرائے اور بڑبڑائے ہوئے بولا:

''آپ اپنے فہم و تدبر اور سطح سے نیچی بات کہہ رہے ہیں۔ آپ جیسے فاضل قانون دان سے اس کی توقع نہیں ہے''۔

سید محمد اسلم صاحب بار ایٹ لاء اس بات پر اپنی فطرت سلیمہ کے ہاتھوں تاؤ میں آ گئے۔ گویا یہ بات ایک وکیل کی جبلت کے برعکس تھی۔ مگر وکالت تو محض پیشہ ہے اور ایمان سرمایۂ زیست۔ ایک حقیقی مومن کسی جگہ اور کسی طور بھی انداز باطل سے صلح نہیں کر سکتا۔ مصلحتاً حق گوئی سے رک جانا بزدلی ہے اور مصالحتاً باز آ جانا منافقت۔ بھلا یہ بات عاشق رسولؐ کے کسی مخلص پیروکار سے کیونکر متوقع تھی! آپ نے جوش مین کہا:

''یوں سمجھ لیجئے کہ کچھ اسی قسم کے عہد کی پاسداری نہ کرنے پر ۱۹۱۴ء کو شہنشاہ برطانیہ جارج پنجم نے ایک چھوٹے سے ملک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ عظیم برطانیہ کو اس جنگ میں سب سے بڑے رکن کی حیثیت سے شامل ہونا پڑا۔ ایک چھوٹے سے عہد کی خلاف ورزی کے نتیجے میں وہ خونریزی ہوئی کہ لاکھوں بچے یتیم ہو گئے۔ لاکھوں عورتوں کے سہاگ لٹ گئے اور دنیا کا جغرافیہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ مگر میں نے جس عہد کا ذکر کیا ہے، اس میں آج بھی کروڑوں مسلمان بطیب خاطر بندھے ہوئے ہیں، جو کسی قانونی دفعہ، پھانسی کے پھندے یا تلوار کے گھاؤ کے ڈر سے اس عہد سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جہاں تک ناموس رسالت کا سوال ہے، مسلمان کا رونگٹا رونگٹا عبدالقیوم ہے۔

پس میرا مدعا یہ ہے کہ ایک ایسے معصوم نوجوان کو جو ذہنی اور تربیتی طور پر یقین محکم کی رسی میں جکڑا ہوا ہے اور اپنے عقائد و افکار کے مطابق صراط مستقیم پر گامزن بھی ہے۔ مزید یہ کہ اس نے جارحیت نہیں کی بلکہ مدافعت کی ہے۔ ایک دیہاتی نوجوان مذہبی جذبے کے تحت اس فعل کا

مرتکب ہوا ہے اور وہ آج بھی اسے اپنا فرض عین سمجھ رہا ہے۔اس کو کسی سزا کا مستوجب نہیں گردانا جانا چاہیے اور اگر عدالت یہ سمجھتی ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز کر گیا ہے تو اسے تھوڑی بہت قید با مشقت دی جائے۔

آپ کی عدالت رقابت کے معاملے میں رقیب کو دن دیہاڑے قتل کرنے والے اقبالی مجرم کو بری کر سکتی ہے۔اراضی کے قبضے اور بے دخلی کے سلسلے میں مالک کو ہلاک کرنے والے مزارع کے لیے صرف چار چھ سال کی سزا کافی سمجھتی ہے تو عبدالقیوم کے معاملے میں کیوں نرمی سے کام نہ لیا جائے''؟

بطل حریت، فدا کار رسالت، غازی عبدالقیوم خان نے پہلے روز ہی واضح کر دیا ہوا تھا کہ نہ تو میں عدالت کے روبرو کوئی غلط بیان دوں گا اور نہ ہی اس بات پر رضا مند ہوں کہ کوئی وکیل میرے اقدام کا انکار کر دے۔ایک موقع پر ان سے بہ اصرار کہا گیا:

''آپ انکار قتل ہرگز نہ کیجئے، مگر عدالت میں ایک بار یہ کہہ دیں کہ میں اس وقت ہوش میں نہیں تھا''۔

غازی صاحب یہ بات کیونکر مان سکتے تھے! انہوں نے اظہار ناراضی کرتے ہوئے فرمایا:

''زندگی میں ایک یہی لمحہ تو ہوش کا آیا اور آپ کہتے ہیں کہ میں اس سے بھی مکر جاؤں۔''

آپ نے اپنے بیان میں علاوہ اس کے یہ بھی کہا تھا:

''اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے ہزار بار قتل کرتا اور شاید یہ بات بھی میرے غم و غصہ کو سرد اور جذبات کو سکون نہ پہنچا سکتی۔میری زندگی کا خوشگوار دن وہی تھا جب میں نے دشمن رسول کو کیفر کردار تک پہنچایا اور خوشگوار ترین دن وہ ہوگا جب میں اپنے آقا و مولا ﷺ کی بارگاہ ناز میں پہنچ جاؤں گا۔نتھو رام نے حبیب خدا ﷺ کی شان میں زبان درازی کی جسے میری غیرت کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔میں نے یک بارگی چاقو گھونپ کر اسے انجام سے ہمکنار کیا تھا اور بجا کیا تھا۔اب مجھے کسی قسم کی سزا کی کوئی پروا نہیں ہے''۔

بیرسٹر سید محمد اسلم کی روح پرور، حلاوت آمیز، باطل سوز اور مدلل بحث ختم ہوئی تو عدالت نے

اسی روز تاریخ فیصلہ کا اعلان کر دیا۔ ۹۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء کے روز دفتری اوقات شروع ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں کا ایک اژدہام عدالت کے باہر جمع ہو گیا تھا۔ کراچی کے علاوہ حیدر آباد، ٹھٹھہ، نواب شاہ تک اور پنجاب، بالخصوص ہزارہ سے لوگ کشاں کشاں آئے۔ احاطۂ عدالت کے باہر اور اہم چوراہوں پر نظم و نسق درست رکھنے کے لیے پولیس کی بھاری نفری تعینات تھی۔

مسلم اکابرین کے علاوہ مشہور ہندو وکیل اور صحافی وغیرہ بھی موجود تھے۔ ہر طرف ایک بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری تھی کہ جج اچانک ڈائس پر نمودار ہوا۔ تقریباً دو منٹ مکمل خاموشی رہی۔ پھر جج کے اشارے پر پیش کار نے کہا کہ حاضر کیا جائے۔ غازی عبدالقیوم خان ہنستے مسکراتے، بیڑیاں پہنے، سر اٹھائے سنگین بردار محافظوں کے حلقے میں عدالت کے کٹہرے میں تن کر آ کھڑے ہوئے۔ کمرۂ عدالت میں مکمل سناٹا چھا گیا۔

جج نے کوئی فائل الٹ پلٹ کر دیکھی اور ایک کاغذ اٹھا کر دھیمی آواز میں پڑھ کر سنایا:

''عبدالقیوم خان کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔''

غازی صاحب نے کمال دلجمعی اور سکون سے سنا اور جج کا شکریہ ادا کیا۔ پھر آپ نے الحمدللہ کہا۔ دفعتاً ایک نعرۂ مستانہ گونجا...... ''اللہ اکبر''۔

یہ پراعتماد صدائے تکبیر سن کر کمرۂ عدالت، گیلری، برآمدے اور باہر والوں میں سے اکثر نے یہ سمجھا کہ عبدالقیوم خان بری ہو گئے ہیں۔ یہ نعرہ غازی صاحب نے ہی لگایا تھا۔ سزائے موت کا فیصلہ سن کر وہ خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ دیکھنے والوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کا قد ایک فٹ مزید اونچا ہو گیا ہو۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھر آئی، جس میں بے پایاں مسرت گھلی ہوئی تھی۔ غازی عبدالقیوم خان مسکرا مسکرا کر اور نعرے لگا لگا کر فرما رہے تھے:

''میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے اس انعام کا مستحق سمجھا گیا۔ یہ ایک جان کیا چیز ہے، میرے پاس لاکھ جانیں ہوں تو بھی ایک ایک کر کے اسی طرح اپنے نبی پاک ؐ کے نام پر قربان کر دوں۔''

تمام اخبارات میں یہ روداد شائع ہوئی۔ شہ سرخیوں کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ پروانۂ شمع رسالت غازی عبدالقیوم خان نے نہ صرف انتہائی صبر و سکون اور خندہ پیشانی کے ساتھ فیصلہ سنا بلکہ بآواز بلند نعرہ تکبیر لگایا اور یہ حکم صادر کرنے پر عدالت کا شکریہ بھی ادا کیا۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا:

''ملزم عبدالقیوم خان کو نتھو رام کے خلاف کوئی ذاتی عناد نہیں تھا۔ بلکہ اس نے اس علم اور یقین کے ساتھ اسے ہلاک کیا کہ ایک مسلمان کی زندگی پیغمبر اسلام ﷺ کی تعظیم و تقدیس پر قربان کی جاسکتی ہے۔ صفائی کا یہ موقف کہ قتل انتہائی اشتعال کے عالم میں ہوا، پر صاد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس قسم کے اقدام کا اختیار صرف حکومت کو حاصل ہے اور کوئی بھی شخص قانون کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اشتعال فوری تھا۔ یہ اشتعال ملزم کو واقعہ قتل سے قریباً چار ماہ پیشتر مل چکا تھا۔ لہٰذا اس کے جذبات میں تحمل پیدا ہونا چاہیے تھا۔ بایں سبب انہیں بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہمیں ملزم کے اغراض و مقاصد اور نیت سے تعلق نہیں بلکہ اس کے عمل سے سروکار ہے۔ اسلامی شریعت کے مطابق بھی کوئی مسلمان اپنے اعمال میں آزاد نہیں۔ ملزم کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ اسلام کی عزت و توقیر کی بحالی کے لیے اسے اپنی زندگی قربان کرنی پڑے گی۔ اگر شرعی قانون کو رائج الوقت ملکی قانون پر ترجیح دے دی جائے تو سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ قانون حکومت کے نزدیک ذات پات، عقائد اور مذہب کو کوئی امتیاز حاصل نہیں۔''

جیوری نے یہ فیصلہ متفقہ طور پر صادر کیا۔

خوشبو پھیلتی گئی

۹۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو غازی عبدالقیوم، عدالت میں سزائے موت کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ اس سے دو روز قبل مسلمانان کراچی کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوچکا تھا اور اس میں ایک قرارداد کے ذریعے بعض ہندو مقررین کی دلآزار روش پر اظہار نفرت کیا گیا جو پروانہ شمع رسالت ﷺ کے متعلق غیر ذمہ دارانہ اور پاجیانہ زبان استعمال کررہے تھے۔

۱۳۔ اکتوبر، کو روزنامہ ''انقلاب'' لاہور میں ایک نوٹ شائع ہوا جو حامل اہمیت ہے اور حریتِ خیال کا آئینہ دار بھی۔ بنابریں مزاج حروف سے آزاد اسلامی ریاست کا موہوم سا تصور بھی ابھرتا ہے۔ یہ تاریخی تجزیہ حسب ذیل تھا:

''حسب توقع غازی عبدالقیوم کو کراچی کی عدالت نے سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ جہاں عدالت بھی غیر مسلم ہو اور جیوری میں بھی کوئی مسلمان شامل نہ ہو، وہاں عدالت اور جیوری کے ارکان یہ اندازہ کیونکر لگا سکتے ہیں کہ وہ کونسی آگ تھی جس نے عبدالقیوم کو جرم قتل کے ارتکاب پر مجبور کیا اس چیز کو تو ایک مسلمان ہی سمجھ سکتا ہے۔

سید محمد اسلم بیرسٹرایٹ لا جنہوں نے عبدالقیوم کے مقدمہ کی پیروی نہایت قابلیت، سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ کی تھی وہ عدالت کو قانونی نکات تو سمجھا سکتے تھے، لیکن ان قلوب میں یہ احساس کیونکر داخل کر سکتے تھے کہ حضور سرور کائنات ﷺ کی حرمت مسلمانوں کے نزدیک جان و مال، قانون حکومت غرضیکہ بڑی سے بڑی دنیاوی چیز سے بھی قیمتی ہے! یہ صحیح ہے کہ ان حضرات کو اس جذبۂ مقدسہ کا عمق معلوم نہیں، لیکن کم از کم یہ تو سوچنا چاہیے کہ عبدالقیوم کو مہاراج نتھورام سے کوئی ذاتی عناد نہیں تھا۔ مہاراج نتھورام نے ''تاریخ اسلام'' میں مسلمانوں کے آقا و مولا ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کر کے ان کو ناقابل برداشت اشتعال دلایا تھا۔ اگر ایسی حالت میں ایک پر جوش مسلمان نے محض حرمت رسولؐ کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر نتھورام کو قتل کر دیا تو کون سا جرم کیا تھا''

۱۶۔ اکتوبر بروز بدھ، صبح دس بجے، غازی عبدالقیوم خان صاحب سے ان کی والدہ محترمہ اور دیگر رشتہ داروں نے جیل میں ملاقات کی۔ اس سے قبل ۱۲۔ اکتوبر کو بھی والدۂ غازی آپ سے مل چکی تھیں۔ مگر آج عزیز و اقارب بھی ساتھ تھے۔ مسلم اخبارات میں اہتمام کے ساتھ اس کی تفصیل چھپی:

''غازی صاحب بوقت ملاقات تلاوت قرآن مجید میں مصروف تھے اور نہایت ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ والدہ محترمہ نے فرمایا کہ بیٹا! میں خوش ہوں کہ تم نے ناموس سرور کونین ﷺ پر اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ کچھ خیال ہے تو صرف اتنا کہ اگر تمہارے دل میں یہی جوش قربانی تھا تو تمہاری شادی نہ کرتی جس کو صرف قلیل عرصہ ہوا ہے۔''

غازی صاحب نے عرض کیا:

''اماں! جو لوگ رات کو شادی کرتے اور صبح مر جاتے ہیں، وہ بھی تو ہیں، نا!''

آپ کا حوصلہ اور شوق شہادت دیکھ کر والدہ صاحبہ خوش ہوئیں اور دعا کے لیے کہا۔ غازی صاحب نے والدہ محترمہ کے تعمیل حکم میں نہایت خشوع و خضوع سے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھا کر سب کے لیے دعا کی۔ ذرا دیر بعد آپ کی اہلیہ موصوفہ نے بڑے جذباتی لیکن از سرتاپا خلوص میں ڈھل کر کہا:

میں نے آپ کو اپنے تمام حقوق معاف کیے۔''

'جزاک اللہ'

غازی صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

اختتام وقت پر آپ نے جامع مگر مختصر الفاظ میں اپنی والدہ صاحبہ، زوجہ، برادر حقیقی اور ہمشیرگان و جملہ اقارب کو تلقین صبر فرمائی اور کہا کہ......... ''یہ جان ناتواں جب شمع رسالت پر نثار ہو جائے اور میں شہید کر دیا جاؤں تو آپ لوگوں کو انتہائی صبر سے کام لینا چاہیے۔ ازاں بعد آپ انتہائی طمانیت سے السلام علیکم کہہ کر اپنے محبوب ترین شغل دوامی، تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو گئے۔ دراصل یہ آخری ملاقات تصور کی جارہی تھی، اور عوام میں افواہ گردش کر رہی تھی کہ اعلیٰ عدالت کی طرف سے اپیل مسترد کر دیئے جانے کی صورت میں ۱۸۔ اکتوبر کو آپ شہید کر دیے جائیں گے۔

تب ایک ایمان افروز واقعہ جلی حروف میں اخبارات کی زینت بنا اور مسلمانان ہند کے لیے راحت انگیزی کا سامان ٹھہرا۔ یہ مافوق الفطرت داستان از حد پرتاثیر مبنی برصداقت اور عظمتوں کی امین ہے۔ ۱۵۔ اکتوبر کی شب کو سنٹرل جیل، کراچی کے وارڈن نے جو پہرہ دے رہا تھا، دیکھا کہ غازی عبدالقیوم خان کی کوٹھڑی بقعہ نور بنی ہے اور دروازہ کھلا ہوا ہے۔ دو سفید پوش بزرگ اس قدر نورانی چہرہ ہیں کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی تاب نہیں، غازی صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ان سے ہمکلام ہیں۔ غازی موصوف کے سامنے پہلے سے قرآن حکیم کا نسخہ رکھا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہار و مہکار کا سماں بندھ گیا۔ تاہم اس خارق عادت واقعہ سے وارڈن گھبرا سا گیا اور دوڑ کر چند دوسرے اہل کاروں کو بلا لایا۔ انہوں نے بھی یہ بصیرت افروز اور بصارت نواز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

نور و نکہت کی بات تھوڑی دیر میں ہی چہار سو خوشبو کی طرح پھیل گئی اور حدود جیل میں عجیب کیفیت محسوس ہونے لگی۔ کچھ وقت بعد دروازہ بند ہو چکا تھا اور کوٹھڑی میں حسب سابق تاریکی چھا گئی۔ غازی عبدالقیوم صاحب کو دیکھا تو لگتا تھا کہ آپ گویا کیف سرور کی بارش میں نہار ہے ہیں۔



بیرسٹر سید محمد اسلم کے لیے یہ کوئی معمول کا مقدمہ نہیں تھا بلکہ وہ جذباتی واحساساتی طور پر بھی اس سے وابستہ و پیوستہ تھے۔ عدالت میں ان کی کیفیت اور لہجے کا اتار چڑھاؤ بھی غمازی کھا رہا تھا کہ موصوف، وکیل کی سطح سے آگے بڑھ اور اپنی پیشہ ورانہ حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ لہٰذا عدالت نے انہیں پروفیشنل مس کنڈکٹ کا نوٹس دے دیا۔ جس میں حدود قانون سے متجاوز ہو کر بحث کرنے کا الزام تھا۔ شاہ صاحب نے اس الزام کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر کے ججوں کی ناواقفیت و عصبیت پر مہر تصدیق ثبت کی۔

غازی عبدالقیوم خان کی زبردست خواہش تھی کہ اپیلوں وغیرہ کی مزید کارروائی ختم ہو، مگر ''غازی عبدالقیوم ڈیفینس کمیٹی'' اتمام حجت کرنا چاہتی تھی۔ غازی عبدالقیوم ڈیفینس کمیٹی، ملک عبدالعزیز، غازی ثناء اللہ، ایس ایم شفیع، مسٹر محمد ہاشم، ایم، ایل، سی، مولوی عبدالحئی حقانی، سیٹھ عثمان، رحمت اللہ جام اور مراد خاں صاحب کے علاوہ دیگر باہمت و دردمند مسلمانوں کی مساعی جمیلہ سے وجود میں آئی تھی۔

دراصل جب غازی عبدالقیوم خان عدالت میں رسم وفا نبھا چکے تو ہندو لیڈروں اور ان کے پریس نے اشتعال انگیز پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے نتھورام کے واقعہ قتل کو نہ صرف مسلمانان ہند کی منظم سازش کا نتیجہ قرار دیا بلکہ غازی صاحب کے متعلق بھی نازیبا زبان استعمال کی۔ اس موقع پر ڈیفینس کمیٹی کا اعلان ہوا اور پہلے روز ہی چھ ہزار دوصد پچاس روپے اشاعت و تشہیر وغیرہ کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

الغرض یہ کہ اس فیصلے کے خلاف اعلیٰ عدالت میں اپیل پیش ہوئی۔ چونکہ دونوں جوڈیشل کمشنران کراچی رخصت پر تھے، اس لیے طے پایا کہ ۲۶۔ نومبر ۱۹۳۴ء کو سماعت ہو گی اور ملزم کو مقامی جیل میں ہی رکھا جائے۔ جج صاحبان کو حسب ضابطہ مطلع کر دیا گیا کہ وہ تاریخ مقررہ کو اپیل پر غور و غوض کریں۔

سماعت کنندہ بنچ دو ہندو ججوں مسٹر روپ چند بیلا رام اور مسٹر حویلی والا پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی نے حفظ ماتقدم کے طور پر بارہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام زیر دفعہ ۱۴۴ امتناعی احکام جاری کر دیے کہ مذکورہ اشخاص کوئی اشتعال انگیز تقریریں نہ کریں جن سے فرقہ ورانہ جذبات برانگیختہ ہونے کا اندیشہ ہو اور نہ ہی وہ کسی اجتماع میں شریک ہو سکتے ہیں۔

۲۵۔ نومبر ۱۹۳۴ء کو حاجی عبدالعزیز صاحب کا یہ برقی پیغام پورے کراچی میں گونج رہا تھا کہ حاجی محمد یونس بارءایٹ لاء حضرت قبلہ غازی صاحب کے مقدمہ میں سید محمد اسلم شاہ صاحب کی معاونت کے لیے پٹنہ سے تشریف لا رہے ہیں۔ حاجی محمد یونس صاحب چوٹی کے قانون دانوں میں شمار ہوتے تھے اور پریوی کونسل میں بھی ان کو صفِ اول کا وکیل سمجھا جاتا تھا۔ ایک مدت تک انہوں نے انگلینڈ میں پریکٹس کی تھی اور پروانۂ شمع رسالت کے سلسلے میں نام لکھوانے اور بارگاہ نبوت ﷺ سے اپنے حصے کا ثمرہ پانے از خود تشریف لائے۔

موصوف نے ریلوے اسٹیشن پر ورود فرمایا تو ان کے استقبال کے لیے مسلمانان کراچی کا ایک عظیم الشان اجتماع موجود تھا۔ اس میں، ارکان اسمبلی، علمائے کرام اور اسلامی انجمنوں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ معزز مہمان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور ایک عظیم جلوس کے ساتھ حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کے بنگلے تک لائے۔ اگلے روز آپ سید محمد اسلم شاہ صاحب کی معاونت میں غازی ملت کے مقدمہ کے لیے پیش ہوئے۔ فاضل وکیل نے آپ سے جیل میں ملاقات بھی کی اور کہا کہ میں دور دراز سے فقط آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں اور ہدیہ تحسین پیش کیا۔

بیرسٹر حاجی محمد یونس آف پٹنہ اور بیرسٹر سید محمد اسلم شاہ صاحب آف کراچی نے اپنے دلائل عدالت کے گوش گزار کئے۔ یہ بحث قانونی قابلیت کا ایک اعلیٰ معیار تھی۔ انہوں نے واضح کیا کہ صفحہ ہستی پر کوئی بھی ایسا غیرت مند انسان موجود نہیں جو اپنے پیغمبر کی توہین پر خاموش رہے۔ عقائد کا تعلق ہی جذبات واحساسات سے ہے۔ اگر مذہبی پیشوا سے جذباتی لگاؤ نہ ہو تو مذہب کی اہمیت و حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ مگر یہ اجلی وضاحتیں غیر مسلم عدالتوں کو اس حقیقت کا قائل نہیں کر سکتی تھیں کہ غازی عبدالقیوم خان کا فعل مستلزم سزائے موت نہیں ہے۔

ایڈیشنل جوڈیشل کمشنران کراچی نے محافظ ناموس رسالت کے مذکورۂ بالا وکلاء کی تشریحات وتوضیحات پر کہا کہ ہم ملکی قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند ہیں۔ اس میں تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ اپیل درخور اعتنا نہیں ہے۔ درخواست خارج کر دی گئی اور

سزائے موت کا فیصلہ باقی رہا۔

ایڈیشنل جوڈیشل کمشنران کراچی کا فیصلہ ہرگز خلاف توقع نہیں تھا۔ از روئے قانون اب صرف پریوی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا جاسکتا تھا۔ تاہم ایک رائے یہ بھی تھی کہ معززین کا کوئی وفد وائسرائے ہند سے ملاقی ہو اور بہ دلائل گزارش کی جائے کہ وہ سزائے موت کو منسوخ کر دیں۔ بہرکیف انجمن تحفظ ناموس رسول کی تحریک پر شیخ صادق حسن صاحب ایڈووکیٹ امرتسر نے ایک وفد تشکیل دیا۔ شرکائے وفد کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

سر عبداللہ سہروردی، مسٹر غزنوی، مسٹر سر محمد یعقوب، مولانا شوکت علی، حاجی وجیہہ الدین، مولانا شفیع داؤدی، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں، مسٹر کے۔ ایل۔ گابا، نواب صاحب گنج پورہ، حاجی رحیم بخش، آغا لال بادشاہ اور شیخ صادق حسین۔ سربراہ وفد کی طرف سے وائسرائے ہند کو تار دیا گیا لیکن وائسرائے نے ان بزرگان قوم کو باریابی کی اجازت نہیں دی اور وجہ انکار یہ بتائی کہ جن افراد کو عدالتوں سے پھانسی کی سزا ہو جائے ان کے لیے وفود سے ملنا دستور کے خلاف ہے۔



غازی عبدالقیوم شہیدؒ غیرت کی پونجی، وفا کی خوشبو اور عشق کی آبرو ہیں۔ آپ کی طرف سے قانونی پیروکار بھی استقامت کی تاریخ اور پیشے کا وقار تھے۔ بیرسٹر سید محمد اسلم صاحب نے ہائی کورٹ سے اپیل مسترد ہو جانے کے باوجود دل نہیں چھوڑا اور اس کے خلاف پریوی کونسل لندن میں درخواست دائر کروا دی۔ انہیں غازی عبدالقیوم ڈیفینس کمیٹی کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ یہاں ضابطے کی کارروائی کے بعد ۲۸۔ فروری ۱۹۳۵ء کے اجلاس میں تاریخ فیصلہ مقرر ہوئی۔ پریوی کونسل سے بھی کسی مثبت فیصلے کی توقع نہ تھی۔ تاہم اپنی سی کوشش ہوتی رہی۔ حسب توقع پریوی کونسل نے بھی مسودۂ اپیل نامنظور کر دیا۔ آئندہ ایک دو روز میں بمبئی حکومت کی طرف سے یہ اطلاع بھی نشر ہوگئی کہ غازی صاحب کو ۴۔ مارچ ۱۹۳۵ء دوشنبہ کی صبح سنٹرل جیل کراچی میں جام شہادت پلا دیا جائے گا۔



بمبئی حکومت کو بوجوہ یہ تاریخ بدل دینا پڑی اور غازی صاحب پھر لمحہ وصال کے لیے تڑپتے رہ گئے۔ اہل عشق کا بھی عجب مسلک ہے کہ موت کے ساتھ زندگی سے بھی بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔

موت کو پاؤں کی ٹھوکر سے اڑاتے اور قضا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہیں۔

التوائے شہادت کے مندرجہ ذیل اسباب بیان کئے جاتے ہیں:

- ......غازی صاحب کے ورثاء نے حکام بالا کو درخواست گزاری تھی کہ ہمیں شہید کی نعش اپنے آبائی وطن ہزارہ لے جانے کی اجازت دی جائے۔ چونکہ یہ ان کا قانونی حق تھا اور ارباب حل وعقد ڈر رہے تھے کہ اس واقعہ سے مشکلات بڑھ جائیں گی اور راستے کے اسٹیشنوں پر مظاہروں اور فرقہ وارانہ فسادات کا شدید خطرہ ہے۔ اس لیے تجویز زیر غور تھی کہ آپ کو سرحدی جیل میں منتقل کر کے تختہ دار پر لٹکایا جائے۔ بنا بریں اس کے لیے حکومت ہند کی اجازت بھی ضروری تھی۔
- ......یہ کہ غازی صاحب کے وکیل سید محمد اسلم نے اپنی طرف سے گورنر بمبئی کے نام رحم کی عرضداشت بھیج رکھی تھی اور گورنر کی طرف سے اطلاع مشتہر ہوئی کہ درخواست زیر غور ہے، جب تک اس کا نتیجہ برآمد نہیں ہوجاتا سزا پر عمل درآمد نہیں کر سکتے۔

عبدالخالق صاحب، مولوی ثناء اللہ صاحب اور مولانا عبدالعزیز صاحب پر مشتمل ایک وفد کراچی سے لاہور پہنچا اور میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمانان کراچی اور بیرسٹر محمد اسلم (آپ کو علامہ اقبال سے شرف شاگردی بھی حاصل تھا) کی طرف سے جذبات پہنچائے اور عرض کیا کہ آپ وائسرائے سے ملاقات کریں۔ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں اور انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ غازی عبدالقیوم صاحب کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی جائے۔ ارکان وفد نے انتہائی جذباتیت اور اصرار کے ساتھ کہا کہ اگر آپ نے سعی وتوجہ فرمائی تو مکمل توقع ہے کہ رحم کی اپیل حکومت ہند ضرور منظور کر لے گی۔

حضرت علامہ محمد اقبال یہ گفتگو سن کر چند منٹ بالکل خاموش رہے اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ارکان وفد مضطرب ومنتظر تھے کہ دیکھئے کیا فرماتے ہیں۔ بظاہر امید یہی تھی کہ ایک عاشق رسول کا معاملہ دوسرے عاشق رسول کے سامنے پیش ہے، لہٰذا آپ رضا مند ہوجائیں گے۔ یہ سکوت علامہ اقبال صاحب کی آواز نے توڑا۔ انہوں نے پوچھا:

"کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گئے ہیں؟"

ارکان وفد نے جواب دیا:

"نہیں، غازی صاحب نے تو ہر عدالت میں برضا ورغبت اپنے اقدام کا اقبال اور اعتراف کیا ہے۔ مزید برآں یہ ہے کہ وہ اقرار وتسلیم پر

نازاں ہیں۔ آپ نے بیان تبدیل کیا اور نہ ہی لاگ لپٹ یا ایچ پیچ میں کوئی بات کہی۔ ان کا تو برملا کہنا ہے کہ میں نے دعاؤں اور التجاؤں سے شہادت خریدی ہے۔ خدارا مجھے شہادت سے محروم رکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔"

یہ جواب پا کر خوشی سے علامہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ذوق وشوق میں ٹوٹ پھوٹ گئے اور گھائل ہو کر فرمایا:

"جب میرے سرکار ﷺ کا دیوانہ و پروانہ کہہ رہا ہے کہ میں نے زندگی کے بدلے شہادت خریدی ہے تو میں ان کے اجر و ثواب راہ میں کس طرح حائل ہو سکتا ہوں؟ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایک ایسے غیرت مند کے لیے وائسرائے کی خوشامد کروں جو اسلام کی آبرو ہے، جس پر شہادت بھی ناز کرے گی؟"

علامہ صاحب کے لہجے میں یہ تیزی اور سختی دیکھی تو اور کچھ نہ کہہ پائے۔ وفد کراچی لوٹ گیا۔ حکیم الامت نے غازی علم الدین شہیدؒ اور غازی عبدالقیوم شہیدؒ کے جذبۂ قربانی اور حدت ایمانی سے بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا۔ اس قلبی تاثر کا اظہار ضرب کلیم میں "لاہور و کراچی" کے عنوان کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ پریوی کونسل لندن سے اپیل مسترد ہوتے ہی حکومت سندھ نے اعلان مشتہر کیا تھا کہ ۲ مارچ کی صبح غازی عبدالقیوم خان کو زینت دار بنا دیا جائے گا لیکن ازاں بعد بوجوہ تاریخ شہادت ملتوی کرنا پڑ گئی۔

بایں ہمہ، مسلمانان کراچی اسے انتظامیہ کی کوئی چال سمجھ رہے تھے۔ اس روز پورے شہر میں ایک عجیب سماں تھا۔ کاروباری حلقوں نے اپنے کام کاج چھوڑ کر علی الصبح جیل کے نزدیک اجتماع کیا اور مصر ہوئے کہ حضرت قبلہ غازی صاحب سے ملاقات کروائی جائے۔ جیل کے چاروں طرف پولیس کا حلقہ تھا۔ انتظامیہ کے عام ضلعی افسر صورت حال کا معائنہ کر رہے تھے۔ مجمع میں سے بعض لوگوں نے بآواز بلند کہا کہ ہم غازی عبدالقیوم کے لیے کٹ مریں گے اور کسی صورت بھی پھانسی نہ دینے دیں گے۔ جوش کے عالم میں کئی نوجوان جیل میں کود جانے لگے اور کہا کہ ہمیں ہمارے غازی کا دیدار کروایا جائے، ورنہ جیل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

مجمع ہزاروں نفوس پر مشتمل تھا۔ جم غفیر بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ فضا کشیدہ تھی۔ نوجوانانِ ملت،

دیوانہ وار جیل کی طرف کھنچے آتے اور مسلمان جا بجا ٹولیوں میں غازی صاحب کی تصویر اٹھائے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے تھے۔ حکام جیل وانتظامیہ پر سنگ باری سے متعدد کانسٹیبل اور دو افسر مجروح ہوئے۔ ایک کا چہرہ اور دوسرے کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔

بالآخر ارباب حل وعقد نے غازی عبدالقیوم خان کے ایک قریبی عزیز اور چند منچلے نوجوانوں کو آپ سے ملاقات کی اجازت دے دی۔ انہوں نے غازی صاحب کو ہشاش بشاش دیکھا اور ان کے کہنے پر سارا اجتماع امن وامان کے ساتھ منتشر ہو گیا۔



۱۷۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو غازی موصوف کا پورا خاندان بغرض ملاقات جیل میں موجود تھا۔ آپ کی والدہ صاحبہ، چھ بہنوں، برادر حقیقی اور دور ونزدیک کے تمام رشتہ داروں کے علاوہ کراچی وعلاقہ میں سے بعض احباب بھی حاضر تھے۔ گو حکام جیل کی طرف سے باقاعدہ طور پر نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، مگر حالات کی گواہی اور ماحول کا اشارہ یہی تھا۔

غازی عبدالقیوم آج ضرورت سے زیادہ خوش وخرم دکھائی دے رہے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ نے بالکل نیا جوڑا زیب تن کر رکھا ہے۔ سر میں تیل لگا اور بال سجا رکھے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل کی ایک ہلکی سی دھار ہے اور ہونٹوں پر دھیرا سا تبسم، لہجے سے تاثیر ٹپکتی اور چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی۔ یہ ملاقات خاصی طویل تھی اور بہت سی باتیں ہوئیں۔ حضرت قبلہ غازی صاحب چہک چہک کر گفتگو فرما رہے تھے۔ انہوں نے آہستگی کے ساتھ والدہ محترمہ سے کہا:

"امی جی! دُعا کریں کہ مجھے جلد پھانسی ہو جائے۔ میں بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضری کے لیے بہت بے قرار ہوں"

غازی صاحب نے مزید کہا:

"امی جی"! آپ میری ہر بات مانتی تھیں۔ ایک آخری بات ہے۔ یہ ماننے کا بھی پکا وعدہ کرو"

عظیم ماں اپنے عظیم بیٹے سے کہہ رہی تھی:

"بیٹا! تم کھلے دل کہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ضرور مانوں گی۔"

غازی صاحب سراپا سوال بن گئے۔

"امی جی! میں چاہتا ہوں کہ آپ میری میت پر آہ وبکا نہ کریں،

بلکہ سج دھج کر آئیں۔ بالکل یوں جیسے کہ اپنے بیٹے کی بارات میں آئی ہو۔ اگر میرے جنازے پر رویا دھویا گیا تو یہ ناشکری ہوگی۔ ایسی شہادت دراصل جشن مسرت کا موقع ہوتا ہے، صف ماتم کا نہیں۔"

یہ کہہ کر حضرت قبلہ غازی صاحب تھوڑی دیر چپ رہے اور فرمایا:

"ماں! میں پختہ یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر آپ نے محبت و عقیدت کے ساتھ مجھے حرمت آقا ﷺ پر قربان ہونے دیا تو آقائے مدنی ﷺ کے صدقہ آپ بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوجائیں گی۔"

آپ نے مزید کچھ سکوت فرمایا اور کہنے لگے:

"میں ہی ایک غازی نہیں، میرے پیچھے ہزاروں غازی آئیں گے۔ آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ نے ایسا بچہ جنا ہے، جس نے انگریز کے پنجرے میں کھڑے ہو کر مردود رسالت پناہ کو نہ صرف للکارا بلکہ موت کے گھاٹ اتارا اور ایک انوکھے انداز میں نبی پاک ﷺ کی عصمت و ناموس کے تحفظ کا اعلان کیا۔"

عاشق رسول ایک موقع پر اپنے چچا رحمت اللہ خان سے مخاطب ہوئے اور کہا:

"کاکا! میری تین باتیں بہر صورت یاد رکھنا۔ پہلی بات میری قبر کچی بنوانا۔ دوسری بات، میری نماز جنازہ سولجر بازار میں واقع قادری مسجد کے امام حافظ غلام رسول صاحب سے پڑھوانا۔ تیسری بات، میرے جنازہ کے جلوس میں دنگا فساد کی کوئی بات نہ ہونے دینا۔"

پھر آپ نے تمام حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں مسلسل دُعا کر رہا ہوں کہ اے اللہ، غاصب انگریزوں کو ہمارے وطن سے نکال پھینک۔ انشاء اللہ میں یہ درخواست دربار سرکارؐ میں بھی پیش کروں گا۔ انگریز کتنا ظالم ہے کہ مسلمانوں سے سخت مشقت لیتا اور غیر انسانی سلوک کرتا ہے۔ تم لوگ بھی دُعا کرو کہ یہ ہمارے ملک سے نکل جائے۔"

حضرت قبلہ غازی صاحب، عرصہ اسیری میں مزید صحت مند ہو گئے تھے۔ رنگ نکھر اور وزن پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ نھورام کو ٹھکانے لگانے کے بعد غم واندوہ کا کوئی جھونکا کبھی ان کے قریب سے بھی نہیں گزرا۔

شہباز محبت، پروانہ شمع رسالت، غازی عبدالقیوم خان کو ۱۹۔ مارچ ۱۹۳۵ء مطابق ۳ ذوالحجہ بروز منگل جام شہادت نوش فرمایا جانا تھا۔ مگر اندیشہ نقص امن عامہ کے سبب اس امر کی خبر نہ ہونے دی گئی۔ تاہم آدھی رات سے قدرے پہلے آپ کے بعض قریبی رشتہ داروں کو بصیغہ راز جیل کے اندر لایا گیا، تاکہ حصول میت کی رسید پر دستخط لیں اور ضابطے کی کارروائی مکمل ہو۔

سرفروش مجاہد کے لیے یہ شب گویا شب برات ہو گئی تھی۔ آپ نے صاف ستھرا لباس پہنا اور کوٹھڑی خوشبوؤں سے معطر کی۔ تمام رات نوافل اور تلاوت قرآن حکیم میں محو رہے۔ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ کی چاندنی رقص کناں تھی اور آنکھوں میں جلوہ حبیب ﷺ کے روشن چراغ! جب قربانی کا وقت نزدیک آ پہنچا تو آپ بصد شوق مقتل کی طرف روانہ ہوئے۔ پریشانی تو ان کا مقدر ہے جو غزل کے بھنور میں رہیں۔ جن کا قافلہ، وادئ نعت کی سمت چلے، وہاں داغ محرومی کا کیا علاقہ؟ اس جگہ تو گیسوئے رحمت دراز ہوتے ہیں۔ بہشت نظر سے کام چلتا ہے۔ گل پوشیوں سے نکلے تو گل پاشیوں میں گھر گئے۔

اب بزم دار ورسن سج رہی تھی۔ مستانہ حبیب کبریا پھانسی کے پھندے کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگا رہا ہے۔ ایسی موت پر تو کروڑوں زندگیاں نثار۔ تاجدار مدینہ ﷺ کا عاشق صادق، قتل گاہ میں پہنچا بھی تو کس شان سے۔ موت کو ٹھوکریں لگاتا، ہنستا مسکراتا، نعت گنگناتا، تبسم کی بجلیاں گراتا، بقا کا چراغ جلاتا اور رگ جاں کی تار ہلاتا۔

غازی عبدالقیوم مے خانے میں پہنچ چکے تھے۔ مدینہ منورہ کی طرف سے ہوا کی ایک ٹھنڈی لہر آئی۔ آپ نے اپنا رخ روشن ذرا اوپر اٹھایا۔ فضاؤں میں عجب مستی تھی۔ دیار حبیب ﷺ کی طرف رواں دواں ہوائیں اپنے آنچل میں سلام وعقیدت کے پھول باندھے اٹکھیلیاں لٹا اور مسکرا رہی تھیں۔

متعلقہ حکام اور جیل کا عملہ پھانسی گھر میں موجود ہے۔ غازی موصوف بڑی آن بان اور وقار و پندار سے شہادت گاہ الفت میں کھڑے ہیں۔ بارگاہ اقدس میں درود وسلام کا گلدستہ پیش کیا۔ تین بار ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھا اور ''میری قربانی قبول فرمائیے، یارسول اللہ ﷺ''

کا نغمہ الاپتے ہوئے تختہ دار پر جھول گئے۔ روح کا پرندہ پورے چار بج کر دس منٹ پر قفس عنصری سے اڑا اور سرکار اقدس ؐ کے نعلین مبارک سے لپٹ گیا۔ چوم چوم کر جھومنے اور جھوم جھوم کر چومنے کا یہ ایک عجیب نشاط انگیز منظر تھا۔

بھاری بھرکم دوہرا جسم، بڑی بڑی روشن آنکھیں، گورا چٹا رنگ مگر قدرے گندمی، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، گھنی سیاہ داڑھی، کتابی چہرہ اور معصومیت کا دیباچہ۔ موزوں خدوخال کہ سراپا سے جمال میں گھلا ملا جلال ٹپکتا ہے۔ یہ آئینے میں اترا ہوا غازی عبدالقیوم شہیدؒ کا ایک دلآویز و حلاوت آمیز عکس ہے۔ یہ خوبرو نوجوان، جب اپنے کریم آقا ﷺ کے نقش کفِ پا کے وقار و اقتدار پر قربان ہوا تو اس کی عمر ۲۳ سال سے ہرگز زیادہ نہیں تھی۔ وہ غازی عبدالقیوم شہیدؒ جس کی رگوں میں غیرت ایمانی کی بجلیاں دوڑتی تھیں۔ جنہیں پیا کے دیس سے سلام و پیام آتے تھے۔ وہ گلشن وصل کا ایک مہکتا ہوا گلاب، رفعت دار کا امین اور سوز و ساز محبت کا سوداگر! جس کے نقش وفا سے رفعت و عظمت کا معیار قائم ہوا اور جو مقام شہادت کے لیے بھی باعث ناز ہے۔

شہادت سے جنازے تک

۱۹۔ مارچ ۱۹۳۵ء، ہندوؤں کے تہوار ''ہولی'' کا دن تھا۔ واقعات کے مطابق ضلعی حکام نے رات کے بارہ بجے قبر کھدوائی اور پانچ بجے صبح ان کے ورثاء کو میت کے پاس لایا گیا۔ تفصیل اس کی یوں بیان کرتے ہیں کہ ۱۸، ۱۹۔ مارچ کی درمیانی شب بارہ بجے سپرنٹنڈنٹ پولیس غلام اکبر خان 'سعید منزل' آیا اور کہا:

> ''غازی صاحب کا مقدمہ پریوی کونسل میں دوبارہ سماعت کے لیے پیش ہو رہا ہے اور ایک برقی پیغام کے ذریعے وہاں سے عدالت نے عبدالقیوم خان صاحب کو لندن بلوایا ہے۔ لہٰذا آج ہی انہیں روانہ کر دیا جائے گا۔ اگر ملنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔''

غازی صاحب کے چچا رحمت اللہ خان مع اپنے بیٹے محمد عرفان خان وغیرہ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ پولیس افسر مذکور، ان لوگوں کو میوہ شاہ قبرستان لے گیا۔ یہاں شہید رسالت کی نعش پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر شہید موصوف کے چچا جان، برہم ہو گئے:

> ''تم لوگوں نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ تاریخ و وقت شہادت کی اطلاع تو دے دی ہوتی۔ ہم تو آخری وصیت سے بھی محروم رہ گئے ہیں۔''

انتظامیہ نے خان آف قلات نواب میر ایوب خان، انور شاہ، مستی خان اور ظاہری خان کے والد راجا عبدالقادر کو پہلے ہی یہاں بلوایا ہوا تھا۔ انہوں نے سمجھایا:

''بابا! شور نہ کرو۔ چوری چھپے پھانسی دینا حکومت کی مجبوری تھی۔
وگرنہ قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا۔ ہمارے لیے خاموش ہو جایئے۔ جو
ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب انہیں فی الفور دفن کرنا ہوگا۔

ضلعی حکام نے حافظ مولوی غلام رسول پیش امام مسجد قصاباں کو منگوا رکھا تھا، ان کی اقتدا'' میں جنازہ پڑھا گیا اور اس کے بعد غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی نعش کو قبر میں اتار دیا گیا۔ ابھی مٹی ڈالنا تھی کہ جونا مارکیٹ میں پنجاب ہوٹل کا مالک لاٹھیوں سے مسلح سوڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ آدھمکا وہ حالت غضب میں کہنے لگا:

''تم نے کتنی رقم لے کر غازی صاحب کو پھانسی لگوایا ہے۔''

ازاں بعد انہوں نے لحد میں سے زبردستی نعش نکالی۔ چارپائی پر رکھا اور اس کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھ کر لے چلے۔ چند ہی لمحوں میں انسانوں کا سیلاب آ گیا۔ میوہ شاہ کی ندی (موجودہ نیازی کالونی) کے قریب نماز جنازہ ادا ہوئی۔ اس کے بعد پرجوش و غضب ناک عوام آپ کے جنازے کا جلوس شیریں روڈ (مکرانی علاقہ) سے چاکیواڑہ کی طرف سے لے جانے لگے۔ جب چاکیواڑہ میں ''رجب کے ڈھیلا'' کے پاس پہنچے تو وہاں پر انگریز فوج کی ایک پلٹن لاری پر موجود کھڑی تھی۔ اس میں سے فائر کھول دیا گیا۔ غلامان مصطفیٰ گرنے اٹھنے اور تڑپنے پھڑکنے لگے۔ لوگوں کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جان بچانے کو ادھر اُدھر دوڑتے، لیکن گولیوں کی زد میں آ جاتے۔ زخمیوں کی تعداد بیان سے باہر ہے فائرنگ اس قدر سخت اور غیر متوقع تھی کہ وسط کراچی میں شاید ہی کوئی ایسا گھر تھا جو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہا ہو۔ کئی اشخاص ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے۔ عوام کا اندازہ یہی تھا کہ اس دوران ایک ہزار کے قریب مسلمان شہید ہو گئے ہوں گے۔ ہسپتال کی گاڑیاں دن بھر مجروحین و مرحومین کے لئے وقف رہی تھیں۔



حادثہ فاجعہ کی بعض تفصیلات ابھی تک خارج از تحریر رہی ہیں۔ خان بہادر غلام اکبر خان انگریز کا ایک وفادار و جانثار پولیس افسر تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا آبائی تعلق پنجاب سے تھا اور پیر پگاڑا صاحب کے والد کو اسی نے گرفتار کیا تھا۔ یہ بڑا ظالم، چاپلوس اور منافقت پیشہ تھا

سپرنٹنڈنٹ پولیس مذکور، پھانسی کی رات سے قبل کراچی کے سب سے بڑے اور مشہور قبرستان میوہ شاہ (یہ ایک معروف ولی اللہ سے موسوم ہے)۔ آیا اور حضرت پیر میوہ شاہ کے نواسہ و متولی صاحبزادہ انور شاہ سے ملا اور کہا: میرا ایک قریبی عزیز وفات پا گیا ہے۔ ازراہ مہربانی اس کے لیے احاطہ مزار میں ایک قبر بنوادیں۔''

شاہ صاحب نے خادموں سے کہہ کر ایک آسامی تیار کروادی اور ایس۔ پی مذکور لوٹ گیا۔ سید انور شاہ صاحب بتایا کرتے تھے کہ یہ واقعہ پانچ چھ بجے شام کا ہے۔ ہم نے کافی انتظار کیا۔ غصہ آیا اور پریشان بھی ہوئے۔ رات کافی گزر چکی تھی کہ ایک پولیس گاڑی آئی۔ وہی پولیس افسر اترا اور میرے پاؤں پکڑ کر کہنے لگا،''قبلہ! مجھے گستاخی کی معافی دو۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ غازی عبدالقیوم کو چوری چھپے پھانسی دی گئی ہے جو کہ حکومت کی مجبوری تھی۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور لاشہ لے آئیں۔ نیز تجہیز و تکفین کے لیے کسی مولانا صاحب کو بھی ساتھ لے چلیں۔''

میں اس کے ہمراہ بغدادی علاقہ گیا۔ ایک مولوی صاحب کو ہمراہ لیے جیل میں پھانسی گھاٹ سے ذرا دور نعش کے پاس گئے۔ مولانا غلام محمد صاحب حافظ قرآن تھے۔ وہ تلاوت قرآن مجید کرتے رہے اور میں نے غسل دیا۔ شہید رسالت کا جسم گلاب کی طرح نرم و نازک اور ہلکا پھلکا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے کوئی آدمی چاند کے اندر سو رہا ہو۔ جیل سے قبرستان کا فاصلہ تقریباً چھ سات میل ہوگا۔ شہید کی نعش ایک لاری میں رکھی گئی۔ میں اور مولوی صاحب بھی اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں نے دو ایسے خارق عادت منظر دیکھے کہ اب بھی چونک پڑتا ہوں۔ مگر یہ ہر کس و ناکس کے آگے ظاہر نہیں کر سکتا کہ مادیت گزیدہ ذہن اسے تسلیم نہیں کر سکیں گے۔ قصہ کوتاہ ہم ابھی شہید ناز کو سپرد خاک نہیں کر پائے تھے کہ سانحہ پیش آ گیا۔

حقیقت حال یوں ہے کہ ۱۹۔ مارچ، علی الصبح شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی تھی کہ غازی عبدالقیوم کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی کم و بیش ایک لاکھ مسلمان ڈسٹرکٹ جیل تک پہنچ گئے اور حصول میت کے لیے مظاہرے شروع کر دیئے۔

ضلعی حکام نے غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی نعش خفیہ طریقے سے میوہ شاہ پہنچا دی تھی۔ کسی طرح ہجوم کو بھی اس کا علم ہو گیا، جبکہ بہت سے لوگوں کا رخ پہلے ہی قبرستان کی طرف تھا۔ جوش و جذبات کی فراوانی اور کم از کم ایک لاکھ کا ہجوم، شہید ممدوح کی لاش قبر سے نکال لی گئی۔ کہا گیا کہ ہم اپنے شہید کے سفر آخرت کا جلوس شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں سے بڑی دھوم دھام سے

نکالیں گے۔ شرکاء میں متین بزرگ اور خواتین بھی شامل تھیں۔

ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ جب شہید رسالت کا تابوت جیل سے قبرستان لایا گیا تو سید امیر شاہ اور بیرسٹر محمد اسلم صاحب کے علاوہ دیگر معززین نے بھی ہجوم سے کہا کہ وہ جلوس کو قبرستان سے باہر لے جانے کی کوشش نہ کریں۔ لوگ نہیں مانے تو ایک جگہ گورا فوج گھڑی بھر میں آئی اور دو منٹ تک شرکائے جلوس پر گولیوں کی بارش ہوتی رہی۔ یہ حادثہ اس قدر الم انگیز، زہرہ گداز، قلق افزا، اور خونچکاں تھا کہ بیدردانہ خونریزی اور شقاوت قلبی کا ماتم لفظوں میں نہیں ہوسکتا۔ کراچی کے کئی گھر ماتم کدہ بن گئے۔ الغرض انتظامیہ نے جلوس سے غازی عبدالقیوم شہید کا لاشہ چھینا اور میوہ شاہ میں عزیز و اقارب کے علاوہ چند افراد کی موجودگی میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

ضلعی انتظامیہ نے موقف اختیار کیا کہ اگر موقع پر قابو نہ پایا جاتا تو خدا جانے صورت حال کیا شکل اختیار کرتی۔ گولی اس وقت چلائی گئی جب کہ ہجوم مشتعل ہو رہا تھا اور اگر یونہی چھوڑ دیا جاتا تو اس کے بے قابو ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ مزید برآں یہ کہ آمادہ فساد ہجوم پر گولی چلانے کا حکم پولیس کو نہیں بلکہ فوج کو دیا گیا تھا اور پچیس سپاہیوں نے کل سینتالیس گولیاں چلائیں۔ جاں بحق اور زخمی ہونے والوں کی کثرت کی وجہ یہ تھی کہ فوج جلوس کے بالکل قریب تھی۔ نیز یہ کہ مجمع کے پتھروں سے تین آنریری مجسٹریٹ بھی مجروح ہوگئے۔ قبرستان میں پولیس کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ جلوس نکالنے سے منع کرسکتی۔ حکام نے ہجوم کو اس وقت روکا، جب کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا، جہاں سے اسے روکا جاسکتا تھا۔ اس اثنا میں کراچی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹیلر نے فساد کے خطرات محسوس کرتے ہوئے فوج کو طلب کرلیا۔

سرکاری طور پر بتایا گیا کہ ستائیس افراد (ان میں گیارہ برس کا ایک بچہ بھی شامل ہے) ہلاک ہوئے اور ستانوے، شدید زخمی۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ چاکیواڑہ روڈ کے سرے پر ملٹری کا پہلے سے پہرہ تھا۔ فوج نے گولی چلائی اور نعش کو جبراً اپنے قبضے میں لے لیا۔ فائرنگ کا یہ منظر بے حد دردناک اور رقت انگیز تھا۔

اردگرد کی دیواریں تک دردناکی کا پتہ دے رہی تھیں۔ فرش خاکی شدت خون سے لالہ زار تھا۔ بعض لوگ سول ہسپتال میں داخل ہو کر دم توڑ گئے اور اکثر ایسے بھی تھے جن کے ہاتھوں، بازوؤں یا ٹانگوں کو کاٹنا پڑا۔ اور یہ کہ جب واقعہ ہائلہ پیش آیا تو جلوس جنازہ، عیدگاہ سے صرف ایک سوگز کے فاصلے پر تھا۔

ہسپتال ایک طرح سے ماتم کدہ بنا ہوا تھا، جہاں شہداء کے وارث، نعشوں کو حاصل کرنے کے لیے یا مجروحین کی تیمارداری کے لیے دھڑا دھڑ جمع ہو رہے تھے۔ ایک عورت نے جب دیکھا کہ اس کا خاوند اور لختِ جگر جامِ شہادت نوش کر گئے ہیں تو وہ حسرت و یاس کا پیکر بن کر بے ہوش ہو گئی۔

اس روز ہسپتال کا سول سرجن، میڈیکل آفیسر، لیڈی سپرنٹنڈنٹ اپنے دیگر عملہ سمیت رات گئے تک مصروف کار رہے۔ پٹیاں باندھتے باندھتے نرسوں کا تمام لباس خون آلود ہو گیا تھا۔ برٹش میڈیکل ہسپتال کے عملہ کی ڈیوٹی بھی زخمیوں کی نگہداشت کے لیے یہاں لگا دی گئی تھی۔

یہ حادثہ اس قدر المناک و دلآزار تھا کہ انسانیت لرز کر رہ گئی۔ سلیم الطبع لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت امداد کی درخواست لیے گلی کوچوں میں نکل آئے۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ، سندھ، مسٹر ٹیکم داس، مسٹر داد ہومل اور سیٹھ ایشور داس خاص طور پر بغرض عیادت ہسپتال آئے۔ کرنل وی ای سی ڈیلش اور کمانڈنگ آفیسر رائل سیکس نے بھی اظہار تاسف کیا۔ شیخ عبدالحمید صاحب اور خان صاحب حاجی فضل الٰہی کی کاوشیں بھی نا قابل فراموش ہیں۔

سید محمد اسلم شاہ صاحب بار ایٹ لا نے محترم ابوالفضل صدیقی کو ایک انٹرویو میں بتایا:

”صبح کے وقت میں نے دفتر میں سنا کہ رات عبدالقیوم کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ میں مولانا عبدالعزیز کو لے کر جیل پہنچا تو پرائیویٹ ذریعے سے پتہ چلا کہ صبح کی اذان کے وقت غازی صاحب کے لواحقین کو ان کی جائے قیام پر جگا کر بتایا کہ غازی عبدالقیوم خان کو پھانسی دیدی گئی ہے۔ اور لاشہ کو پولیس سرکاری گاڑی میں رکھ کر میوہ شاہ قبرستان میں لے جا چکی ہے۔ جنازہ تیار ہے۔ منہ دیکھنا ہے تو جلد چلو۔“

ہم لوگ قبرستان پہنچے تو معلوم ہوا کہ میت قبر میں اتاری جا چکی ہے۔ مسلمانوں کا جمِ غفیر وہاں پہنچ گیا اور اسے مٹی نہ ڈالنے دی۔ ایک جوشیلا قومی کارکن قلندر خان قبر میں کود گیا اور میت کو لحد میں سے نکالا۔ ادھر چارپائی، کفن وغیرہ کا بندوبست پہلے سے ہو چکا تھا۔ فوراً لاش کو کفنایا اور جنازہ لے کر روانہ ہو گئے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ کراچی مسلم اکثریت کا شہر تھا اور صبح کا وقت، دیکھتے ہی دیکھتے

دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود دس بارہ ہزار مسلمان جمع ہو گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوراً فوج طلب کر لی۔

ہم اس عرصے میں راستہ کاٹ کر چا کیواڑہ کے قریب ایک تنگ گلی سے گزر کر جنازے کے قریب پہنچ گئے۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ کندھا دینے والوں میں قلندر خان خاصا نمایاں نظر آتا تھا۔ اچانک ہجوم کا ریلا آیا اور پھر برابر والی پتلی گلی سے ''تڑتڑ'' کی آواز گونجی۔ نظر اٹھا کر آگے کا جائزہ لیا تو قلندر خان کے بدن سے خون کا فوارہ اچھلتے دیکھا۔ اس کے باوجود وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جنازے کو کندھا دیے جا رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔ اتنے میں پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی...... اندھا دھند فائرنگ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مکانوں اور جھونپڑیوں میں بیٹھے ہوئے بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی اس کا نشانہ بن گئیں۔

حالات قدرے پرسکون ہوئے تو میں، مولانا عبدالخالق، مولانا عبدالعزیز اور حاتم علوی، زخمیوں کی عیادت کے لیے سول ہسپتال گئے۔ ہسپتال کے اردگرد پولیس کی بھاری تعداد اور کچھ فوج بھی موجود تھی۔ ہم کسی نہ کسی طرح شہیدوں اور زخمیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، میں نے ایک سو چھ لاشیں گنیں اور بعد میں ان کی تعداد ایک سو تیں ہو گئی۔ ہسپتال میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لاشیں علیحدہ کی جا رہی تھیں اور تڑپتے، سسکتے، کراہتے اور چیختے ہوئے زخمی الگ۔ بڑی تعداد ایسے زخمیوں کی تھی جن کے ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں کے ٹکڑے اڑ گئے تھے۔ حادثہ اتنا مہیب تھا کہ بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ پھر صبح کے وقت جب جوانوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے ہاتھ پاؤں سے بھری ہوئی ایک وین ہسپتال سے نکلی تو بے اختیار میری چیخ نکل گئی بلکہ کئی دن تک حواس بجا نہ ہوئے۔ بے شمار لاشیں ان کے وارثوں نے پولیس میں رپٹ دیے بغیر چپکے سے دفن کر دیں۔

اتفاق سے ان دنوں دہلی میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہورہا تھا۔ ہم نے وائسرائے کے نام ایک تار دیا۔ ساتھ ہی ایک قاصد بذریعہ ریل قائداعظم کے پاس روانہ کیا۔ کراچی میں ہم نے مسلم ریلیف کمیٹی تشکیل دی، جس کی امداد کے لیے دہلی اور لاہور سے بھی چندے ملے۔ ادھر قائداعظم نے اسمبلی میں آواز بلند کی۔ پھر تو ہماری آواز برٹش پارلیمنٹ کے ایوانوں میں بھی گونجی اور سرونسٹن چرچل تک نے اظہار تاسف کیا''

انگریزی اخبار ''اسٹیٹسمین'' کے نامہ نگار مقیم کراچی نے اپنی رپورٹ میں مندرجہ ذیل تفصیل بیان کی:

''عبدالقیوم کو مہاراج نتھو رام کے قتل کے الزام میں جوڈیشل کمشنر، سندھ کے اجلاس سے سزائے موت کا حکم ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۹۔ مارچ کو صبح چار بجے انہیں کراچی سنٹرل جیل میں پھانسی دے دی گئی اور اس کی نعش ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، سٹی مجسٹریٹ اور پولیس پارٹی کی معیت میوہ شاہ جاکر ان کے خاندان والوں کے سپرد کردی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کہا کہ اس لاش کو جلد دفن کردو۔ اس کارروائی کے لیے انتظامات کیے جارہے تھے۔ اتنے میں کچھ لوگ آگئے اور انہوں نے چہرہ دیکھنا چاہا۔ اس میں دیر ہوگئی اور مجمع بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ نعش کئی بار قبر میں رکھی گئی اور کئی بار مشتاقان دیدار نے مٹی ہٹا دی۔ بالآخر اس مجمع کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور قبرستان میں اس مجمع کا رویہ پولیس اور افسروں کی جانب جارحانہ ہوگیا اور مجمع ان کو چاروں طرف سے گھیرنے لگا اور اس مجمع نے قبر کھود کر نعش کو نکالنا طے کیا۔ جوش اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ یہ عظیم مجمع بے قابو دکھائی دیا اور نعش کو اوپر اٹھا کر کراچی کی جانب لے چلا۔ پولیس کی پارٹی اس انتظار میں رہی کہ کوئی مناسب موقع آجائے جہاں اس مجمع کو روکا جائے۔''

اگر اس حادثہ کی اصل تحریک وسبب پر غور کیا جائے تو کئی اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ یکم مارچ کو انجمن مسلمانان پنجاب کا اجلاس ہوا، جس میں شیخ عبدالحمید کی رہنمائی میں آٹھ ارکان پر مشتمل ایک وفد مرتب کیا گیا۔ ان میں حاجی افضل الٰہی آنریری مجسٹریٹ، عبدالغنی، سیٹھ محمد اسحاق

، نبی بخش، محمد حسن، علی میر، محمد بلوچ اور آرا ے خان شامل تھے۔ وفد نے ایڈیشنل مجسٹریٹ سے مل کر درخواست کی کہ تجہیز و تکفین کے لیے عبدالقیوم کی لاش ان کے حوالے کر دی جائے۔ وفد نے ذمہ لیا کہ اس موقع پر کسی قسم کی بدامنی نہیں پھیلنے دیں گے۔

حکام کی طرف سے جواب دیا گیا کہ عبدالقیوم کے چچا اور دوسرے رشتہ دار انہیں اپنے وطن، صوبہ سرحد لے جانا چاہتے ہیں، اس لیے انہیں نماز جنازہ پڑھنے یا جماعتی جلوس میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ وفد نے نماز جنازہ پڑھنے پر زور دیا۔ دوسرے دن ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایس پی بھگوان داس اور ایس پی میر مقبول خاں کی موجودگی میں وفد کو ایک تار دکھایا، جس میں لکھا تھا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تاحکم ثانی پھانسی کو ملتوی کر دے۔ وفد کو بتایا گیا کہ بعد میں مسلمان لیڈروں کو پھانسی کی تاریخ سے مطلع کیا جائے گا۔ مگر اس کے برعکس ۱۹۔ مارچ کو نہایت خاموشی سے پھانسی دے دی گئی۔ رشتہ داروں کو آخری ملاقات کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

ہجوم، جنازہ کی چارپائی اٹھائے ایک جلوس کی شکل میں چاکیواڑہ عیدگاہ کی طرف روانہ تھا کہ اس دوران میں ایک موٹر آئی جس میں دو آنریری مجسٹریٹ جہانگیر پنتھاکی اور رائے بہادر شورام دیوان مل اور ایک فوجی افسر سوار تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور کیوں ہوا؟...... یہ تلخ حقائق اور سلگتے واقعات کی ایک طویل کہانی ہے۔

مسٹر کے ایل گابا (بیرسٹرایٹ لاء لاہور) حادثہ کراچی میں ہلاک شدگان و مجروحین سے متعلق وزیر ہند کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ ہوسکا تو انہوں نے ۲۱۔ مارچ کو اسمبلی میں تحریک التوا پیش کی۔ سردار سنت سنگھ نے اس کو رد کرتے ہوئے فرنگی حکومت کی خیر خواہی کا دوٹوک اعلان کیا۔ مسٹر غزنوی نے حکومت کا رویہ قابل مذمت ٹھہرایا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اسمبلی کے مذکورہ اجلاس میں کہا کہ حادثہ کراچی کی تحقیقات کے لیے ایک آزاد تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دی جائے۔ انہوں نے اس حادثے کو انتظامیہ کی مجرمانہ غفلت کا نتیجہ قرار دیا۔

اس سانحہ سے انگریزوں کا کھوکھلا پن صاف ظاہر ہو گیا اور ان کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل چکا تھا۔ ملکی سطح پر جلیانوالہ باغ کے بعد کراچی کا حادثہ خونین اس قدر غیر معمولی تھا کہ اس کی بازگشت برطانوی دارالعوام میں بھی سنی گئی۔ دوران اجلاس سیموئل ہور، وزیر ہند نے اس سلسلے میں بیان دیتے ہوئے کہا:

''گولی چلانے میں ہرگز زیادتی اور بدانتظامی سے کام نہیں لیا گیا۔ البتہ ہجوم بہت زیادہ اور فاصلہ کم تھا، اس لیے زیادہ اموات واقع ہوئیں۔ گولی چلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہجوم پسپا ہو گیا۔''

سرونسٹن چرچل (اس وقت حزب اختلاف میں تھے اور ازاں بعد وزیراعظم برطانیہ منتخب ہو کر تاریخ کا حصہ بنے) نے وضاحت چاہی:

> ''مشتعل مجمع کو منتشر کرنے کے لیے حکومت نے گولیوں کی بوچھاڑ کے بجائے گیس استعمال کیوں نہ کی، جیسا کہ امریکہ میں بلوائیوں کو منتشر کرنے کے لیے آنسو لانے والی گیس کے بم استعمال کئے گئے تھے؟ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایسے موقعوں پر کیوں نہ انسانیت اور عقل سے کام لے کر کامیابی حاصل کرنی چاہیے؟''

سرسموئیل ہور نے معذرت خواہانہ جواب دیا:

> ''حکومت ہند اس پر پہلے بھی غور کر چکی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پنجاب میں ایک موقع پر گیس ہی استعمال کی گئی تھی۔ میں اس معاملے پر ضرور غور کروں گا۔ لیکن ایوان کو یہ مطلب نہ لینا چاہئے کہ آئندہ فوج یا پولیس کو لائق خدمت نہیں سمجھا جائے گا''

کراچی کے اس حادثہ فاجعہ میں ہلاک شدگان اور زخمیوں کے اعداد وشمار میں اس لیے اختلاف پایا جاتا ہے کہ سرکاری طور پر کوئی رپورٹ تیار نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ سرکار انگلشیہ نے ۱۰ اپریل کو خلاف وعدہ تحقیقات کروانے سے انکار کر دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ۲۱۔ مارچ کو اسمبلی میں پیش ہونے والی تحریک التوا پر گفتگو کرتے ہوئے کے۔ ایل گابا کے بیان کے مطابق چالیس کے قریب آدمی شہید ہوئے اور ایک صد کے قریب مجروح۔ ایس۔ ایم شفیع، پروپیگنڈہ سیکرٹری، مسلم ریلیف کمیٹی کے کتابچے ''عبدالقیوم کی شہادت اور کراچی کے حادثہ خونین کے متعلق صحیح حالات'' میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ۴۹ اور زخمیوں کی تعداد ۱۰۰ ہے۔ گولی بارہ بج کر پچیس منٹ پر چلائی گئی۔

روزنامہ ''انقلاب'' کے مطابق ہلاک وزخمی ہونے والے مسلمانوں کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ غازی عبدالقیوم شہیدؒ کے وکیل سید محمد اسلم شاہ صاحب یہ تعداد زیادہ اور مختلف بیان کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ لائق اعتماد بیان ایس۔ ایم شفیع ہے۔ معلومہ ہلاک شدگان ۴۹ اور مجروحین کی

تعداد ۱۰۰۰ سے ہرگز کم نہیں ہے۔



غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی والدہ محترمہ کی یہ زبردست خواہش تھی کہ وہ اپنے فرزند دلبند جو شہر حبیب کی گلیوں کا بے تاب عاشق اور سرکار مدینہ ﷺ کا غلام صادق ہے، کے جسد خاکی کو تدفین کے لیے مدینہ منورہ لے جائیں۔ سفر نصیب کے جملہ مصارف اٹھانے کے لیے مسلمانانِ ہند کا ایک ایک فرد زبردست آرزومند تھا لیکن گورا حکومت نے اس کی اجازت بھی نہیں دی۔

حکومت برطانیہ کے اہلکار یہ اختیار تو رکھتے تھے کہ شہید رسالت کی نعش ان کے آبائی علاقہ سرحد میں نہ جانے دیں، مگر مدینہ منورہ سے رابطہ کاٹ دینا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ یہ بات ہر ایک نہیں سمجھ سکتا، یہ نکتہ تو فقط اہل دل کے لیے ہے، جو علم کے مدرسے سے اٹھ کر عشق کے میکدے میں آجاتے ہیں۔

بظاہر غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی میت، در مے خانہ تک نہیں پہنچ پائی، لیکن ساقی کوثرؐ نے تو اپنے کسی مے کش کو کبھی محروم تمنا نہیں رکھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل غلام رسول کو ڈیوٹی پر موجود ایک وارڈن نے بتایا اور پھر انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی یہ دیکھا کہ غازی موصوف کے قید کی کوٹھڑی میں رنگ و نور کی ایک بارش ہے۔ چہرے پر وہ بشاشت و تمازت تھی کہ نظر بھر کے دیکھا ہی نہ جاتا۔ یہ کس کے جلوؤں کی روشنی تھی۔ کون نہیں جانتا؟ کرم کے یہ سارے سلسلے تو پیا کی رحمت و توجہ کا حاصل ہیں اور یہ صرف انہیں کا نصیب ٹھہرتا ہے، جو رتجگوں کی جستجو اور اپنی آنکھوں کو باوضو رکھتے ہیں۔

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

غازی محمد صدیق شہیدؒ

قصور کی شہری آبادی سے ملحقہ لنک کچہری روڈ پر بڑا قبرستان واقع ہے۔ یہاں کینال کالونی کے عین متابل سڑک سے بائیں جانب ایک احاطے میں حضرت غلام محی الدین صاحب کا مقبرہ دکھائی دیتا ہے۔ ذرا دور ایک نومسلم بزرگ کا مزار ہے، اور اس کے بالکل نزدیک شہید رسالت کی روشن قبر!

۱۵۔ اگست ۱۹۸۵ء کی ایک اداس شام، میں اپنے چند احباب کے ہمراہ یہاں موجود تھا۔ سورج دن بھر کی طویل مسافت کے بعد پربت کی فلک بوس پہاڑیوں سے ذرا پرے دھیرے دھیرے یوں لڑھک رہا تھا، جیسے کوئی اجنبی گزرگاہوں کا مسافر نشیب کی سمت اترتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر قدم اٹھاتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جانے کتنے لوگ شہر خموشاں کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہم ملت اسلامیہ کے ایک غیور و جسور جانباز کے گوشۂ راحت کی زیارت سے محروم رہ گئے۔ متصل شارع عام سے ہزاروں افراد گاڑیاں دوڑاتے ہوئے بے خبری میں آگے نکل جاتے ہیں، مگر انہیں کون بتلائے کہ دو چار قدم ہٹ کر غیرت و فقر کا ایک زندہ مرقع درس عمل دے رہا ہے۔

مرقد کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی دیوار جس کی اینٹیں اُکھڑ چکی ہیں۔ تعویذ پر گلاب کے تازہ پھولوں کی چادر بچھی ہوئی۔ شکستہ لوح مزار پر تاریخ وصال اور کلمہ طیبہ کے علاوہ درج ذیل قطعہ رقم ہے۔ فارسی کے ان اشعار سے پروانہ شمع رسالت کی تاریخ شہادت بھی نکالی گئی ہے۔

"صدیق چوں شہید رہِ لاالہٰ شد
مسند نشین عشق بصد عزّ و جاہ شد
آمدند از غیب کہ آں مرد سرفروش
خاک رہِ جناب رسالت پناہ شد"

میں مقبرے کی دائیں سمت بیٹھا گزرے ایام کا جائزہ لے رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس خطۂ ارض پر اقدس و اکمل، اطیب و اطہر، نور مجسم، حضور اکرم ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائیوں کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پورے ہندوستان میں آپ کی سیرت پاک کا تقدس لہولہو تھا۔ دیار فرنگ

سے بلادِ ہند میں متعصب پادریوں کی یلغار، آریہ سماجیوں کی باطل پروری کا برملا مظاہرہ اور مرزا غلام احمد قادیانی کا انگریز کی جوتیوں میں بیٹھ کر دعویٰ نبوت۔ الغرض ہر طرف ایک طوفان بدتمیزی بپا ہے۔

دہن دراز گستاخانِ رسول اپنے تیروں کا رُخ مدینہ منورہ کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ ان حالات میں آقا و مولا ﷺ کی حرمت و توقیر کے سربکف مجاہد آگے بڑھتے ہیں۔ یہ خوبرو نوجوانوں کا ایک مختصر گروہ تھا۔ آنکھوں میں کوندتی بجلیاں، ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی، ہاتھوں میں آبدار خنجر اور دلوں کی ایک ایک دھڑکن جذبۂ شہادت پر گواہ۔ انہی وفا پیشہ نوجوانوں میں سے شمع رسالت کے ایک پروانے کا نام ''غازی محمد صدیق شہیدؒ'' ہے، جو صداقت کا پرچم تھام کر اُٹھا، اپنے لہو سے کتاب صدق رقم کی، رسم صدیقی ادا کرتے ہوئے مردودِ ازلی کو نزگباش کیا اور خود جناب صدیق اکبرؓ کی قربت میں مسند نشیں ہو گیا۔



غازی محمد صدیق شہیدؒ کا نسبی تعلق شیخ برادری سے تھا۔ اس خاندان کے تفصیلی حالات شاید کسی تاریخی کتاب میں درج نہیں۔ علم نساب سے واقفیت رکھنے والے بزرگ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ من حیث القوم کسی بھی دور میں نمایاں نہیں رہے۔ کوئی حوالہ اس قبیلے کی سیاسی آن بان پر گواہی نہیں دیتا۔ ایک ماخذ کی رو سے ان کا قدیمی وطن کشمیر تھا۔ برادری کے پھیلاؤ سے معاشی وسائل سکڑ کر رہ گئے۔ ان حالات میں نقل مکانی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ انہیں بھی مختلف علاقوں میں ہجرت کرنا پڑی۔ ان کی غالب اکثریت کارخانہ دار اور تجارت پیشہ ہے۔ چونکہ یہ لوگ لین دین میں کھرے اور ناپ تول میں مہارت تامہ رکھتے تھے، لہٰذا جہاں جہاں بھی یہ لوگ سکونت پذیر ہوئے، وہاں داد و ستد ہی ان کا ذریعہ معاش قرار پایا۔ اس قوم کی ایک شاخ 'خواجہ' بھی کہلواتی ہے۔

ایک اور روایت کے مطابق یہ عرب نژاد ہیں۔ ان کے آباواجداد تجارتی قافلوں میں شریک ہوا کرتے۔ اس غرض سے بحری راستوں کے ذریعہ سری لنکا میں آمد و رفت رہتی اور کبھی کبھار سندھ کی منڈیوں میں چکر لگ جاتا۔ راجہ داہر کے قزاقوں نے عرب تاجروں کا دیبل کی بندرگاہ کے قریب جو قافلہ لوٹا تھا، وہ بھی ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھا۔ محمد بن قاسم کی قیادت میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کے کئی بزرگ، تبلیغ اسلام کی نیت سے اس خطہ ارض کے ہو کر رہ

گئے۔ ابتداً یہ لوگ کشمیر کی زرخیزی کے باعث وہاں جا بسے اور ازاں بعد یہ گروہ اِدھر اُدھر پھیل گیا۔ بہر حال قبیلہ مذکور کی روایات کے علاوہ ان کی کئی عادات وخصائل اور موروثی اقدار بھی اہلِ عرب سے مشترک ہیں۔

المختصر اس خاندان کے ایک معزز رکن شیخ محمد بخش صاحب قریباً ڈیڑھ دو صدی پیشتر مستقلاً قصور میں مقیم ہو گئے تھے۔ موصوف غازی محمد صدیق شہید کے جدامجد ہیں۔ ان کے ہاں شیخ کرم الٰہی نے جنم لیا۔ آگے چل کر صرف انہی کے صلب سے افزائش نسل ہوئی۔ آپ کی اولاد میں چار بیٹیاں اور دو بیٹے یادگار رہے۔ چھوٹے صاحبزادے کا نام محمد شفیع رکھا گیا جو بقید حیات ہیں۔ فرزند اکبر غازی محمد صدیق شہید تھے۔ انہوں نے بڑے سلیقہ سے رسم دار ورسن نبھائی اور شہید رسالتؐ کے بلند منصب پر فائز ہو گئے۔



شمع نبوتؐ کے شیدائی کی مصدقہ تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی، تاہم یوم ولادت کی تحقیق و جستجو میں یہ انکشاف ضرور ہوا کہ بالیقیں آپ ۱۹۱۴ء کے دوران میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کا ہو جانے پر انہیں مسجد میں بٹھایا گیا۔ چند ماہ بعد رسمی تعلیم کی غرض سے سکول بھی بھیجا جانے لگا۔ ۱۹۲۰ء میں آپ فیروز پور کے ایک مدرسہ میں داخل ہوئے اور مارچ ۱۹۲۵ء تک پانچویں جماعت پاس کر چکے تھے۔ دراصل آپ کے والد ماجد شیخ کرم الٰہی صاحب فیروز پور چھاؤنی میں جو قصور سے قریباً پندرہ میل کے فاصلے پر ہے، پکے چمڑے کا آبائی کاروبار اختیار کئے ہوئے تھے، وہ اپنے اہل وعیال کو بھی وہیں لے گئے۔

غازی صاحب کو چھاؤنی کے قریب ہی ایک تعلیمی ادارے میں داخل کروا دیا گیا۔ وہاں آپ تین سال مزید زیر تعلیم رہے، اور ۱۹۲۸ء میں آٹھویں کا امتحان پاس کیا۔ نہ صرف پوری جماعت میں نمایاں پوزیشن حاصل کی بلکہ حصول علم سے غیر معمولی دلچسپی کے باعث انہیں وظیفے کا مستحق بھی ٹھہرایا گیا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ آپ کو زمانۂ طالب علمی میں ہی پورے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑ گئیں۔ یوں بھی ان کی فقر پسندی فارغ اوقات کو کھیل کود میں گزارنے کے بجائے انہیں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے پر اکسایا کرتی۔ کاروبار سے اچھی خاصی سوجھ بوجھ پیدا چکی تھی۔ اسی دوران نتیجہ کے منظر عام پر آنے سے قبل ہی آپ کے والد حضور چند روزہ علالت کے بعد اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی میت قصور لائی گئی اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

غازی محمد صدیق شہید کی والدہ محترمہ کا نام عائشہ بی بی تھا۔آپ بڑی نیک سیرت، حوصلہ مند اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ شعائر اسلامی سے ان کو فطری لگاؤ تھا۔آپ کی تربیت کا اثر اب تک اس گھرانے میں دکھائی دیتا ہے۔آپ صوم وصلوٰۃ کی سختی سے پابند تھیں۔ بتایا جاتا ہے کہ نماز پڑھنے کے بعد وہ دیر تک بارگاہ خداوندی میں دست بدعا رہتیں۔ سحر خیزی ان کا معمول تھا۔ اپنے ننھے منے بچوں کو سونے سے پہلے کلمہ پاک کا ورد کرواتیں اور کافی وقت تک پیارے رسول ﷺ کی میٹھی میٹھی باتیں سناتی رہتیں۔

غالباً یہی سبب ہے کہ آپ کی جملہ اولاد دین اسلام سے بے پناہ انس رکھتی ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال ان کے شیر دل لخت جگر محمد صدیق نے ۱۹۳۵ء میں قائم کی تھی۔ ہاتھوں میں چراغ لے کر ڈھونڈتے پھریں تو بھی کوئی ایسا سرفروش مجاہد کم ملے گا جو مچلتا، اکڑتا، سنورتا، اچھلتا اور ہنستا کودتا ہوا تختہ دار کو زینت بخشے۔ موت جس سے دامن بچا بچا کے نکل جاتی ہو۔

غازی صاحب کے ننھیال (بہ معروف چانپی والے) کا اجمالی خاکہ پیش کرنا بھی ضروری ہے۔آپ کے تین حقیقی ماموں تھے جن کے اسماء گرامی علی الترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

O......شیخ فضل دین صاحب
O......شیخ محمد دین صاحب
O......شیخ خوشی محمد صاحب

اول الذکر نے چشتیاں شریف کی جانب نقل مکانی اختیار کی۔ ثانی البیان نے تلاش معاش میں لاہور کا رخ کیا جبکہ موخر الذکر بدستور قصور میں مقیم رہے۔ شیخ خوشی محمد چونکہ تمام بھائیوں سے چھوٹے تھے اور اپنے بزرگوں کے گھر ہونے کے باعث رشتہ داروں سے ان کی زیادہ قربت رہی۔ بہنوئی کے فوت ہو جانے پر انہوں نے اپنی ہمشیرہ کا خاص طور پر خیال رکھا اور گھر کے تمام اہم امور میں معاونت کرتے رہے۔ شیخ موصوف قصور کے صرافہ بازار میں زین اور کاٹھیوں کی دکان چلاتے۔ یہ جگہ اسلم کابیوں والے کی موجودہ دکان کے بالکل نزدیک تھی۔

غازی صاحب ابتدا سے ہی کاروباری معاملات میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دکانداری سے بمشکل گزارا ہوتا اور گھریلو اخراجات کا معاملہ بالعموم الجھا رہتا مگر اس کے باوجود کبھی کبیدہ خاطر نہ ہوئے۔ تعلیم کا سلسلہ آپ مجبوراً جاری نہ رکھ سکے تھے۔ مدرسہ چھوڑ دینے کے بعد دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ محفل میلاد منعقد کروانا تو گویا ایک

معمول تھا۔نعت خوش الحانی سے پڑھتے،کوئی اور دلسوزی سے پڑھتا تو سر دھنتے تھے۔

وجود بزرگ و برتر (ﷺ) سے آپ کی عقیدت ومحبت والہانہ تھی۔عشق کی شدت کا یہ اثر ہوا کہ اپنی وضع قطع اسلامی طرز میں ڈھال لی۔لباس ہمیشہ سنت کے مطابق پہنتے۔آپ نے جذبۂ عشق کو جلا بخشی۔نماز تو آپ کبھی قضا نہ ہونے دیتے۔روزے کے بھی سخت پابند تھے۔شہید موصوف کے برادر حقیقی شیخ محمد شفیع طاہر صاحب نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے:

"چھوٹی عمر میں ہی آپ نے حضرت شیخ محمد صاحب محلّہ پیرانوالہ نزد دہلی دروازہ (فیروز پور) کے دست حق پرست پر بیعت کی اور اس کے ساتھ حفظ قرآن کے لیے بھی کوشاں رہنے لگے"۔

انہوں نے راقم الحروف کو ۱۶۔جون ۱۹۸۶ء کے روز ایک طویل ملاقات میں جوان کے دولت خانہ پر ہوئی بالوضاحت بتایا:

"حضرت قبلہ غازی صاحب تہجد گزار تھے۔شب بیداری اور ذکر میں مشغول رہنا آپ کی نمایاں خصوصیات تھیں۔نماز عشاء کے بعد دیر تک وظائف اور درود وسلام میں محو رہتے۔اشراق باقاعدگی سے ادا کیا کرتے تھے۔ازاں بعد ناشتے سے فارغ ہو کر دکان پر چلے جاتے۔عصر کی نماز کے بعد آپ کو کاروبار میں جتے رہنا پسند نہیں تھا۔ادھر تالا لگایا ادھر سیدھے اپنے مرشد کامل کے آستانہ پر جا پہنچے۔وہاں ان کا زیادہ وقت تلاوت قرآن حکیم میں گزرتا۔قرآنی رموز پر غور وتدبر کا لافانی ذوق پیر صاحب نے ہی ان کے سینے میں ودیعت کیا تھا"۔

آپ نے مزید بتایا:

"والدہ صاحبہ اپریل ۱۹۶۰ء کی ایک جمعرات،بعد از نماز عشاء اپنے خالق حقیقی سے جا ملی تھیں۔اپنے ذاتی مشاہدے کے علاوہ وقتاً فوقتاً ان کے بیان کردہ احوال بھی میں نے بطور خاص یاد رکھے ہیں۔یہ ایک مقدس امانت تھی،جو آپ کے سپرد کر رہا ہوں"۔

تذکروں سے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ محمد صاحب نقشبندیہ سلسلے کے مرد حق آگاہ تھے۔اپنے دور کے جید عالم دین اور متبحر فقیہ۔معقولات ومنقولات میں انہیں بلاشبہ دسترس حاصل تھی۔تصوف تو ان کا اصل میدان تھا لیکن علم مرموز سے بھی نابلد نہیں تھے۔آپ شریعت کی کاملتاً پیروی کی تلقین فرمایا کرتے۔ان کے افکار و عمل سنت نبوی کا دل موہ لینے والا نمونہ تھے۔بتاتے ہیں کہ آپ سے کئی

کرامات صادر ہوئیں لیکن اس جگہ فقط ایک کرامت کا بیان ہوگا۔ وہ زندہ کرامت جسے دیکھ کر تمام لوگوں نے دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ اور جس نے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ قربانی کی راحت افزاء مثال قائم ہوئی۔ وہ ولولہ اور جوش وخروش جو قیام پاکستان پر منتج ہوا۔

غازی صاحب کے کردار و عمل پر اسلام کی گہری چھاپ تھی۔ اس کی ایک جھلک اس واقعہ میں ملتی ہے۔ چونکہ آپ نے ابتدا سے ہی ریش نہ ترشوانے کا فیصلہ کر رکھا تھا، جب بال نمودار ہونے لگے تو سنت کے مطابق خط بنوالیا۔ اس لیے داڑھی بھری ہوئی نہیں تھی۔ ایک باران کی والدہ صاحبہ نے کہا:

''بیٹا! تم ایک بار داڑھی منڈ والو تاکہ زیادہ بال اگ آئیں اور خوبصورت لگے۔''

مگر آپ یہ بات کب ماننے والے تھے۔ ایک روز اس غرض سے ماں از راہ مذاق اپنے جواں سال نورِ نظر کی طرف ہاتھ میں قینچی لیے بڑھیں۔ جونہی نزدیک پہنچیں تو غازی صاحب ہنسنے لگے اور کہا: ''ان بالوں کو کاٹنا گناہ عظیم ہے''۔ اس پر آپ کی والدہ محترمہ نے اپنے فرزند دلبند کی اسلامی سوچ پر اظہار تشکر کیا۔

دوسری روایت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ آپ کا ذوق بہت بلند تھا۔ اپنے ہم عمروں کے برعکس انہیں ہاؤ ہو، گانے بجانے، کھیلوں یا تعیش سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ جوانی کی رُت میں ہر شخص شادی کے متعلق سوچتا ہے لیکن آپ کو ایسے خیالات و تفکرات سے کوئی نسبت نہ تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کی زندگی کا مقصد یہ نہیں تھا اور وہ ایام جوانی ان ہنگاموں کی نذر نہ کر سکتے تھے۔

جب آپ کی والدہ محترمہ کے دل میں اس فطری جذبہ نے انگڑائی لی کہ کہیں اپنے بیٹے کی نسبت ٹھہرا دوں اور رشتے کی بات چلی تو وہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پائی۔ ہوا یوں کہ ایک جگہ سے لوگوں نے آپ کو دیکھنے آنا تھا۔ والدہ صاحبہ نے حکم دیا کہ بن ٹھن کر رہو اور نفاست کا خاص طور پر خیال رہے۔ لطف یہ کہ اس روز آپ نے خلاف معمول عجیب حالت بنا رکھی تھی۔ پھٹی ہوئی صاف ستھری دھوتی اور قمیض، سر پر پگڑی، اڑے اڑے گیسو اور بے ڈھنگی چال ڈھال۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو مہمان انہیں ناپسند کر کے چلتے بنے۔ منگنی نہ ہوسکی۔ ماں نے اظہار خفگی کیا تو عرض کرنے لگے:

''امی حضور! میں اور خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ ایک وقت آئے گا
جب آپ کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا''۔

◉

پالامل جہنم رسید ہوتا ہے

دہلی میں شردھانند ملعون اور لاہور میں راجپال مردود وغیرہ کے واصل جہنم ہو جانے کے بعد بھی ان خبیثانِ ازلی کے مسلکاً و مشرباً بھائی اور چیلے کہیں کہیں سر اٹھاتے رہے۔ ایسے ہی ایک دہن دراز، کج رو، کور ذوق، کمینہ فطرت اور ملیچھ و ناپاک کا نام ''پالامل'' تھا۔ زرگری اس کا ذریعہ معاش تھا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ پالامل ایک صاحب ثروت ہندو سنار تھا۔ اس کی دکان درگاہ حضرت بابا بلھے شاہؒ سے ذرا ہی دور تھی۔ اس نے ہندوؤں کی آریہ سماج تنظیم کی باقاعدہ رکنیت حاصل کی۔ مدت تک قصور میں تحریک شدھی کی شاخ کا رکن رہا۔ بنابریں اس کی پشت پر ہندو ساہوکاروں کا ہاتھ تھا۔ بنیئے ٹولہ کی تعریف کرتے ہوئے ابتداً وہ مسلمانوں کی معاشی ناسازگاریوں پر ٹھٹھا کرتا رہا۔ اس نے کئی بار برملا کہا:

''قرضہ تو یہ دیتے نہیں اور بنے پھرتے ہیں غیرت مند مسلمان۔''

ایک اور مرتبہ سرِعام چیخنے لگا:

''مسلمانوں کا خدا تو اپنے بندوں سے زکوٰۃ کی بھیک مانگتا ہے، جبکہ ان بے چاروں کو دو وقت کی روٹی بھی کھانے کے لیے میسر نہیں آتی''۔

مسلمانوں کو چپ سادھے دیکھ کر اس کا حوصلہ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اب وہ مزید اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔ اولیائے عظام کے متعلق گالیاں بکنا اس کا معمول بننے لگا۔ ہندوؤں کو اکٹھا کر کے نماز کی نقلیں اتارنا اور اپنی عجیب و غریب حرکات سے انہیں ہنساتے رہنا تو گویا نت روز کا مشغلہ ہو گیا۔ بات فحش کلامی سے بھی بہت آگے جا چکی تھی۔

روزنامہ ''انقلاب'' لاہور کے ۷۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کی اشاعت کے مطابق مسمی پالامل نے بے ادبیوں کا کھلم کھلا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ امسال ۱۶۔ مارچ کو جبکہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے، مردود مذکور نے نہ صرف نماز کا مضحکہ اڑایا بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے متعلق بھی نازیبا کلمات بکے اور شان رسالت مآب ﷺ میں صریحاً گستاخی کی۔ شاتمانہ الفاظ کے استعمال پر ایک شخص محمد کلیم جو مسجد کے قریب ہی دکان کرتا تھا، طیش میں آ گیا۔ اس غیور مسلمان کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر شاتم نبی وہاں سے بھاگ نکلا۔

اس قبیح حرکت پر پورے شہر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور جابجا اظہار ناراضی کیا گیا۔ مسلم

معززین کے مشورے پر محمد کلیم پیر نے عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا۔ مسٹر نیل مجسٹریٹ درجہ اول لاہور نے بڑی تندہی سے مقدمہ سماعت کیا۔ کئی ماہ تک یہ کیس عدالت میں زیر سماعت رہا۔ بالآخر فریقین کے دلائل سننے کے بعد مجسٹریٹ مذکور نے اپنے فیصلے میں لکھا:

''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم نے واقعی توہین رسول ﷺ کی ہے، جس سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہوئے اور سخت فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے پالا مل سنار کو چھ ماہ قید اور دو صد روپے کی سزا دی جاتی ہے''۔

ملزم نے اس فیصلہ کے خلاف سیشن کورٹ لاہور میں اپیل گزاری۔ ایک دو پیشیوں کے بعد سیشن جج نے اس کو تا فیصلہ ضمانت پر رہا کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ اب حساس مسلمان، کڑی دھوپ میں جل رہے تھے۔ کوئی غمگسار نہیں تھا۔ ان کے آنسو کون پونچھتا؟ امید کی نگاہ کس طرف اٹھتی؟ زخم ہوا دینے لگتے تو نمک چھڑک دیا جاتا۔ ہر جانب سے پتھر پھینکے جا رہے تھے۔

ان دنوں فیروز پور روڈ سے گزرنے والوں نے سنا کہ لاہور میں چوبرجی کے نزدیک واقع مشہور گورستان میانی صاحب سے غمناک چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ درد کی شدت اور آواز کا کرب مسلسل بڑھتا ہی چلا گیا۔ دل دہلا دینے والی یہ آہیں ''غازی علم الدین شہید'' کے مقبرے سے اٹھ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا جیسے آپ کہہ رہے ہوں کہ میں قبر میں تڑپ رہا ہوں۔ کون ہو جو میرے لئے کہیں سے سامان تسکین ڈھونڈ لائے! راجپال کا ہم ذوق، قصور کی شاہراہوں پر دندناتا پھر رہا ہے۔ کیا میرے چاہنے والے مر گئے ہیں؟ اگر میرا کوئی جواں سال وارث زندہ ہے تو خدا کے لیے تختہ دار پر بزم رقص سجا کر مجھ سے ہم آغوش ہو جائے۔ وہ دیکھو! ہمارے آقا و مولا ﷺ کوہ امم کی چوٹیوں پر استقبال کے لئے تشریف فرما ہیں۔ ہے کوئی پروانہ شمع رسالت! جو آپ کے کھلے ہوئے بازوؤں میں سمٹ جائے؟



انہی دنوں کا ذکر ہے، ایک رات غازی محمد صدیق صاحب نیند میں تھے کہ ان کا مقدر جاگ اٹھا۔ نصف شب بیت چکی تھی جب آپ کو سرور بنی آدم، روح رواں عالم، انسان عین وجود، دلیل کعبہ مقصود، کاشف مکنون، خازن علم مخزون، جناب احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ قصور میں ایک بدنصیب ہندو، پے در پے ہماری شان میں گستاخیاں کرتا

چلا جا رہا ہے۔ جاؤ اور اس کی ناپاک زبان کو لگام دو۔

شہید موصوف کے برادر اصغر اپنی والدہ ماجدہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ اس روز آپ خوشی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ گمان گزرتا جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ آنکھوں میں کسی کیف آگیں منظر کا عکس اتر آیا تھا۔

آپ نے والدہ ماجدہ سے عرض کیا:

''مجھے خواب میں ایک دہن دراز کافر دکھلا کر بتایا گیا ہے کہ یہ ناہنجار توہین نبوی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اسے گستاخی کا مزہ چکھاؤ کہ آئندہ کوئی شاتم رسول اس امر کی جرأت نہ کر سکے''۔

بیٹے نے اپنی ماں کے گلے میں باز و حمائل کرتے ہوئے یہ ایمان پرور سرگزشت گوش گزار کی اور نقد حیات لٹانے کی اجازت چاہی۔ جواب ملا:

''تمہارے بہن بھائی یتیم ہیں۔ تم ہی ان کی کفالت کرتے ہو۔ کیوں نہ اس بارے میں کسی عالم دین سے پوچھ لیا جائے۔''

آپ کے جذبہ سرفروشی کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی مگر چونکہ والدہ صاحبہ بضد تھیں اس لئے آپ ایک مفتی صاحب سے ملے اور شرعی موقف دریافت کیا۔ انہوں نے فتویٰ دیا کہ بوجوہ اگر آپ کا کوئی چھوٹا بڑا بھائی موجود نہیں تو اجازت محال ہے۔ بصورت دیگر یہ فریضہ تکمیل ایمان کی شرط ہے۔ استفتا سے آگاہی حاصل ہونے پر ماں نے خوشی خوشی اپنے لخت جگر کو ناموس رسولؐ پر قربان ہونے کی اجازت دے دی۔

منزل ہے سفر میں مری یا میں ہوں سفر میں
اتنا بھی نہیں ہوش تری راہ گزر میں

قبلۂ اصحاب صدق وصفا، کعبۂ ارباب علم وحیا، وارث علوم اولین، مورثِ کمالات آخرین، مدلول حروف مقطعات، منشاء فضائل وکمالات، رحمت العالمین، خاتم النبین ﷺ کی حرمت وعزت کا جانباز محافظ، کئی روز تک شدت غم وغصہ میں پیچ وتاب کھاتا رہا۔ آپ کے سینے میں غصے کی چنگاریاں چیخ رہی تھیں۔

دکانداری اب بالکل آپ کے بس کا روگ نہ رہی۔ ان کے دل میں بس ایک ہی جذبہ موجزن تھا کہ وہ جلد از جلد قصور پہنچ کر اپنے آقا و مولاؐ کے دشمن کو جہنم رسید کریں۔ غالباً ۱۰۔ ستمبر

۱۹۳۴ء کی بات ہے کہ یہ مردِ مجاہد تمام رات اپنے مرشد کامل کی خدمت میں حاضر رہا۔ تہجد کی نماز پڑھی اور حسب معمول نماز فجر سے فارغ ہوئے۔ ازاں بعد تلاوتِ قرآن حکیم اور درود وسلام میں محو رہے۔ جب آفتاب افق مشرق پر اپنا جلوہ دکھا رہا تھا تو غازی موصوف نے اجازت چاہی۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حضرت شیخ محمد صاحبؒ کو آپ کے اس ارادے کا علم تھا یا نہیں۔ اس بارے میں بھی کچھ خبر نہیں کہ مرید نے اپنے مرشد سے قصور آنے کا کون سا سبب بیان کیا۔ لوگ صرف اتنا جانتے ہیں کہ آج کے دن بزرگ موصوف نے خلاف معمول حضرت قبلہ غازی صاحبؒ کو خلوت کدے میں طلب کیا اور جانے دیر تک کیا باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو ختم ہوئی تو ایک عجیب کیفیت تھی۔ کمرے سے نکلتے وقت خوش قسمت مرید سر جھکائے آگے آگے رواں تھا، جبکہ حضرت شیخ گردن اٹھائے نہایت باوقار طریقے سے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کیف و مستی کا انوکھا منظر تھا۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ اس روز حضرت قبلہ پیر صاحب نے الوداع کرتے ہوئے غازی صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ دیر تک اپنے بازوؤں کے حلقے میں بھینچ کر کھڑے رہے۔ وقت رخصت دونوں کی آنکھیں پرنم تھیں۔ اس کے بعد حافظ غازی محمد صدیق گھر آگئے اور والدہ محترمہ سے عرض کیا:

> ''اماں! خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے بخوشی تحفظ ناموس رسالت کی اجازت دے دی۔ ایک مومن ماں کو بھلا اس سے بڑھ کر کس بات پر فخر ہوسکتا ہے کہ اس کا بیٹا دین اسلام کے کام آئے! میں قصور اپنے ماموں کے پاس جا رہا ہوں۔ گستاخ موذی وہیں کا رہنے والا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس ذلیل کتے کی ذلت ناک موت، میرے ہی ہاتھوں واقع ہوگی۔ نیز مجھے تختہ دار پر جام شہادت پلایا جائے گا۔ آپ دعا فرمائیں کہ بارگاہ نبوتؐ میں میری قربانی منظور ہو اور میں اس عظیم فرض کو بطریق احسن نبھا سکوں''۔

رات کا ایک حصہ گزر جانے پر یہ سرفروش مجاہد، فیروز پور چھاؤنی سے قصور پہنچ چکا تھا۔ یہاں آپ نے چھوٹے ماموں شیخ خوشی محمد صاحب کے ہاں قیام کیا۔ ان لوگوں کے نزدیک غازی صاحب کی آمد خلاف معمول نہیں تھی۔ وہ یہی خیال کرتے رہے کہ آپ ملنے کی غرض سے تشریف لائے ہیں۔ تین چار دن گزر جانے کے بعد انہیں شک گزرا کہ کہیں یہ اہل خانہ سے ناراض ہو کر نہ

آئے ہوں۔ استفسار کیا گیا مگر آپ نے یہ کہہ کر یقین دلایا کہ میری آمد ایک نہایت ہی ضروری کام کے سبب ہے اور انشاءاللہ بہت جلد اس سے فارغ ہو جاؤں گا۔

گستاخ آریہ سماجی ساہوکار پالامل کو اب اپنے انجام کی فکر تھی۔ ہر وقت اس پر موت کا خوف طاری رہتا۔ اسے دن کو چین نصیب تھا، نہ رات کو آرام۔ زندگی ایک مسلسل عذاب بن چکی تھی۔ موذی مذکور نے اہل ایمان کی نظروں سے بچنے کے لئے ایک نئی راہ نکالی۔ وہ چاہتا تھا کہ چند ماہ شہر میں روپوش رہے تاوقتیکہ مسلمانوں کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں۔ اس نے معمول بنالیا کہ اکثر اوقات حضرت بلھے شاہؒ صاحب کے احاطہ مزار میں آجاتا۔ اپنا حلیہ اور وضع قطع وہ پہلے ہی تبدیل کر چکا تھا۔ عام لوگ یہی خیال کرتے تھے کہ یہ ایک اجنبی عقیدت مند ہے۔

غازی محمد صدیق شہیدؒ بھی ہر روز مغرب کی نماز آپ کے مزار اقدس سے ملحقہ مسجد میں ادا کرتے۔ ۱۷۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کی شام کا واقعہ ہے، آپ دربار سے بالکل نزدیک ''نیم'' کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ عقابی نگاہیں آنے جانے والوں کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ اتنے میں ایک ایسا شخص دکھائی دیا، جس نے چہرے پر کسی حد تک نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ آپ نے جھٹ اس کی راہ روکی اور پوچھا تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے یہاں کیا کرتا ہے؟ اسے اپنا نام بتانے میں تامل تھا۔ یہ نوجوان مجاہد اسے کیونکر چھوڑ دیتا! ہاتھا پائی میں اس کے منہ سے پردہ ہٹ گیا اور اس کی مکروہ صورت بالکل صاف دکھائی دینے لگی۔

ایک روایت یوں ہے کہ آپ نے اسے کہا اپنا نام بتاؤ۔ وہ بے دھیانی میں کھل گیا لیکن شاید یہ بیان درست نہیں۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ غازی صاحب نے اس کو گریبان سے پکڑ کر استفسار کیا کہ تم کون ہو؟ آپ کو تنہا دیکھ کر وہ الجھ پڑا۔ مردود کہنے لگا: مسلمانوں نے میرا پہلے کیا بگاڑ لیا ہے اور اب کون سی قیامت آجائے گی۔ مگر اس کا خوف زدہ رہنا اور چھپ چھپ کر چلنے پھرنے کی عادت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی شاید افسانہ ہے۔ تاہم آپ نے پہچان لیا کہ اسی نانہجار نے حضور پاک ﷺ کی شان اقدس میں غلیظ الفاظ بکے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

''میں تاجدار مدینہ کا غلام ہوں، کئی دنوں سے تلاش میں تھا۔ اب دہن دراز ملیچھ! آج تو کسی طرح بھی ذلت ناک موت سے نہیں بچ سکتا۔''

یہ کہہ کر آپ نے تہبند سے رمبی (چمڑا کاٹنے کا اوزار) نکالی اور للکارتے ہوئے اس پر حملہ آور ہو گئے۔ حضرت قبلہ غازی صاحبؒ متواتر وار کئے جا رہے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ زور زور سے

نعرہ تکبیر کہہ کر بے غیرت پر برس پڑتے۔ واقعات کے مطابق ساڑھے سات بجے شانِ رسالتؐ میں گستاخی کی جسارت کرنے والا گھناؤنا کردار، لوگ جسے لالہ پالامل کے نام سے جانتے تھے۔ جہنم واصل ہو گیا۔

مقتول مردود کے واویلے اور آپ کے نعرہ ہائے تکبیر سے کثیر تعداد میں لوگ اس جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے:

''آپ اس وقت تک ملعون ساہوکار کی چھاتی سے نہیں اترے، جب تک اس کی موت کا پختہ یقین نہیں ہو گیا۔''

غازی صاحب کا لباس خون کے چھینٹوں سے بری طرح آلودہ ہو چکا تھا۔ اردگرد بھی گندے لہو کے داغ ہی داغ تھے۔ مقتول کا چہرہ نہ صرف پوری طرح مسخ ہوا بلکہ ہیبت ناک شکل اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ ڈر کے مارے کوئی قریب نہ پھٹکتا۔ ایک اندازے کے مطابق گستاخ رسول، پالامل کو چالیس زخم آئے۔ بتایا جاتا ہے جب غازی محمد صدیق صاحب اپنے فریضہ سے فارغ ہو چکے تو نماز شکرانہ ادا کی اور مسجد کے باہر سیڑھیوں پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے اور وقفہ وقفہ سے زیرلب مسکراتے اور کچھ گنگناتے رہے۔



مقدمے کی کارروائی اور فیصلہ

واقعہ قتل کی رپورٹ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب پولیس اسٹیشن میں درج ہوئی۔ انچارج تھانہ مع گارد جائے وقوعہ پر پہنچا تو قاتل از خود گرفتاری کے لیے پیش ہو گیا۔

پولیس نے مسمی پالامل سنار کی میت کو اپنی تحویل میں لے کر بغرض پوسٹ مارٹم ہسپتال روانہ کیا اور ملزم کو ہتھکڑی پہنا کر تھانہ میں لائے۔ موقع پر موجود افراد کا بیان ہے کہ اس وقت تمام ہندوؤں کے رنگ فق اور چہرے اترے ہوئے تھے، مگر غازی محمد صدیق صاحب نہایت مطمئن اور سرشار نظر آئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ کی ادا مسلمانوں کی سربلندی اور غیرت مند فطرت کا ثبوت تھی۔

۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کو روزنامہ ''سیاست'' لاہور میں یہ خبر ان الفاظ کے ساتھ شائع ہوئی:

""قصور، ضلع لاہور ۱۷۔ ستمبر گزشتہ شب ۱۱ بجے کے قریب قصور سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ لالہ پالا مل شاہ ساہوکار کو شام کے ساڑھے سات بجے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس قتل کے سلسلے میں ایک مسلمان محمد صدیق کو گرفتار کیا گیا ہے۔ پالا شاہ کے خلاف توہین اسلام کے الزام میں مقدمہ چلتا رہا۔ مسٹر نیل مجسٹریٹ لاہور نے پالا مل کو چھ ماہ قید اور ۲۰۰ روپے جرمانہ کی سزا دی۔ اس فیصلے کے خلاف اس نے مسٹر بھنڈاری سیشن جج لاہور میں اپیل دائر کی تھی۔ اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ قتل بلھے شاہؒ کی خانقاہ میں ہوا اور پولیس بڑی تندہی سے تفتیش کر رہی ہے۔""

پولیس نے آلۂ قتل کے طور پر علاوہ رمبی کے ایک کھرپہ بھی اپنی تحویل میں لیا۔ پارچات مکمل ہو چکے تھے۔ درگاہ بلھے شاہؒ کا ایک خادم گونگا تھا جس نے واقعہ قتل اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے پولیس کو اشارات سے تمام صورت حال سمجھائی۔ دربار کے مجاور سردار علی سے بھی پوچھ گچھ کی گئی اور اس کا نام چشم دید گواہوں میں درج کر لیا گیا۔

اس واردات سے پورے شہر میں سنسنی پھیل چکی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کشیدگی کا سخت خطرہ تھا۔ نیز پالا مل کی وارث قوم نے اس پر بڑی لے دے کی۔ لاہور کے ہندو اخبارات نے لکھا کہ ""اس واقعہ سے مسلمانوں کی شقاوت قلبی اور خونی فطرت کا مزید ثبوت فراہم ہو گیا ہے۔"" وہ اپنے صفحات پر جلی حروف کے ساتھ شر انگیز سرخیاں شائع کرتے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہندو مسلم فساد برپا کرنا چاہتے ہوں۔ تاہم انتظامیہ نے اپنے فرائض ذمہ داری کے ساتھ نبھائے اور حالات کو کسی صورت بھی قابو سے باہر نہ ہونے دیا۔ ہندو روساء مسلسل زور دے رہے تھے کہ اس مقدمے کی فی الفور سماعت ہونی چاہیے۔ الغرض تفتیش کی کارروائی مکمل ہو جانے پر اب حسب ضابطہ مبینہ قاتل محمد صدیق کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ پہلے روز دس بجے سے لاتعداد مسلمان احاطہ عدالت اور جیل سے لے کر عدالت تک سڑک پر بیٹھے تھے۔ مستورات کا جم غفیر بھی پھولوں کے ہار لئے مضطرب کھڑا تھا۔ غازی صاحب کو مسٹر ڈیلس کپتان پولیس کی کار میں لایا گیا۔ واپسی پر سڑک کے دورویہ کھڑے مشتاقان دیدار کی سہولت کے لیے آپ کو موٹر میں سوار کیا گیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ آپ نے کھڑے ہو کر تمام مسلمانوں کو زیارت سے مستفیض فرمایا۔ کپتان پولیس مسٹر ڈیلس، مسٹر ایم۔ اے خان آنریری مجسٹریٹ قصور اور شیخ مرید احمد صاحب تھانے دار امن عامہ قائم

رکھنے کے لیے شہر کا انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔

اخبارات میں پیشی کی تفصیلات بڑی دلچسپی سے شائع ہوئیں۔ بیان تھا:

۱۱۔اکتوبر ۱۹۳۴ء آج غازی حافظ محمد صدیق کا مقدمہ بعدالت خان صاحب چوہدری غلام مصطفیٰ سب ڈویژنل مجسٹریٹ پیش ہوا۔ ہزاروں مرد وزن جیل کے دروازہ سے کچہری تک صف بستہ کھڑے تھے۔ کمرہ عدالت میں غازی صاحب کے ورثاء اور حاجی عبدالقادر میونسپل کمشنر، مولانا شیر نواب خاں، حکیم انعام اللہ اور چودھری محمد عاشق کے سوا کسی کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔ استغاثہ کی طرف سے مولوی محمد داؤد صاحب وکیل پیش ہوئے۔ فہرست گواہان صفائی داخل کروائی گئی، جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

- ......مولانا سید حبیب شاہ (ایڈیٹر و مالک روزنامہ ''سیاست'' مع فائل اخبارات ماہ اکتوبر)
- ......مولانا ظفر علی خاں (ایڈیٹر روزنامہ ''زمیندار'' لاہور مع فائل اخبارات)
- ......مولانا عبدالمجید سالک مع فائل اخبارات روزنامہ ''انقلاب''، لاہور
- ......مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد صاحب خطیب جامع مسجد وزیر خاں، لاہور
- ......جناب خطیب صاحب شاہی مسجد لاہور معرفت سیکرٹری انجمن اسلامیہ، لاہور
- ......مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور
- ......مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری
- ......مولانا شیر نواب خاں قصوری
- ......مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب (امرتسر)
- ......شیخ محمد عظیم صاحب قصوری (المعروف گھلاٹیا)
- ......شیخ خوشی محمد صاحب، قصور



پہلے روز کی رسمی سماعت کے بعد طے پایا کہ آئندہ پیشی پر باقاعدہ کارروائی عمل میں آئے گی۔ ۱۹۔اکتوبر ۱۹۳۴ء کے روزنامہ ''انقلاب'' لاہور میں مقدمے کی مزید وضاحت مندرج ہے۔ اخبار لکھتا ہے:

''قصور (بذریعہ ڈاک) ۱۵۔اکتوبر۔ محمد صدیق مبینہ قاتل پالامل قصوری کو چوہدری غلام مصطفیٰ صاحب ڈویژنل مجسٹریٹ کی عدالت میں زیر دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند پیش کیا گیا۔ حضرت بلھے شاہؒ کے مزار کے ایک

مجاور نے شہادت میں بیان کیا کہ جائے واردات پر میں نے اس شخص کو چمڑا کاٹنے کے ایک اوزار سے پالامل کو قتل کرتے بچشم خود دیکھا تھا۔''

مسٹر ایم۔اے خان آنریری مجسٹریٹ نے بتایا کہ سب ڈویژنل آفیسر کے حکام موصول ہونے پر ہم نے مقام وقوعہ کا معائنہ کیا اور فرش پر خون کے قطرے پڑے پائے تھے۔

باوا ہربنس سنگھ مجسٹریٹ سیکشن ۳۰ نے بیان کیا کہ میں ملزم محمد صدیق کے اقبال فعل کو ضبط تحریر میں لایا تھا۔ اسسٹنٹ سرجن آف قصور نے مقتول کی نعش کے پوسٹ مارٹم کیے جانے، آلہ قتل اور جسم پر ضربات کی نوعیت وغیرہ سے متعلق عدالت کو آگاہ کیا۔

جب غازی محمد صدیق سے پوچھا گیا کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا:

''چونکہ مقتول نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں سخت بے ادبی کی تھی اس لئے میں نے اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ میں بقائمی ہوش و حواس ہوں اور مجھے اپنے فعل کا دیانت داری کے ساتھ اعتراف ہے۔''

زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے میری بلا جانے



غازی ممدوح کا بیان قلمبند ہو جانے کے بعد مجسٹریٹ نے آپ کے وکیل سے استفسار کیا کہ گواہان صفائی کیا کہنا چاہیں گے؟ فاضل ایڈووکیٹ نے کہا کہ وہ تحریک قتل اور اس کے پس منظر میں جھانک کر حالات و واقعات کو منظر عام پر لانا اور بتانا چاہتے ہیں کہ توہین پیغمبرؐ کی ابتدا تحریروں اور تقریروں کی شکل میں ہمیشہ مقتول اور اس کے ہم مذہبوں کی طرف سے ہوئی ہے۔ مسلمان اپنے محبوب اور جان و مال سے پیارے نبیؐ کی اہانت کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ پھر وہ کیوں اس قسم کے ہتک آمیز رسائل وغیرہ کی اشاعت کر کے شیدایان پیغمبرؐ کو اشتعال دلاتے ہیں؟ عدالت نے اس کے جواب میں کہا: فی الحال اس کی ضرورت نہیں، یہ بحث سیشن کورٹ میں ہو سکتی ہے۔

۸۱۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ڈویژنل مجسٹریٹ کی کچہری میں غازی محمد صدیق صاحب کی آخری پیشی

تھی۔ احاطہ عدالت معززین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کالجوں کے مسلم طلبا غیور عورتیں اور غازی صاحب کے لواحقین واحباب وفور شوق میں زیارت کو کشاں کشاں چلے آئے تھے۔ عدالت نے معمول کی کارروائی کے بعد غازی محمد صدیق صاحب پر فرد جرم عائد کر دی اور مقدمہ سیشن کورٹ کے سپرد ہوا۔

''انقلاب'' اخبار نے اس بارے میں مکمل رپورٹ شائع کی اور لکھا:

> غازی موصوف نے اس سے آگاہ ہوتے ہی نعرہ تکبیر بلند کیا اور آپ کی نس نس سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ کمرہ عدالت میں غازی صاحب نے آب زم زم نوش کیا اور پھل تناول فرمائے۔ آپ نے چودھری محمد عاشق، حکیم انعام اللہ اور دیگر حاضرین سے مصافحہ و معانقہ بھی فرمایا۔ گاڑی کی طرف ان کے قدم یوں اٹھ رہے تھے، جیسے وہ نشہ میں ہوں۔ مشتاقان دیدار، سڑک کے دورویہ صف بستہ تھے۔ فلک شگاف نعرۂ تکبیر نے ایک گونج پیدا کر دی۔ راستے میں جگہ جگہ غازی صاحب پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ مسلمانوں نے جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے روپے اور پیسے برسائے۔ مسلمان عورتوں نے اپنے غازی کے لیے دعائیں مانگیں۔
>
> غازی صاحب نے خوبصورت اور نفیس لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں جھنک رہی تھیں۔ موٹر میں کھڑے ہو کر آپ نے ہاتھ اٹھائے اور شیدایان رسول کو سلام کہا۔ وہ نعرے بلند کرتے ہوئے اچھلتے اور پھولے نہ سماتے تھے۔ بالآخر آپ ہزاروں زائرین کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جاتی دفعہ آپ نے بآواز بلند فرمایا: ''مسلمان ہر ایک ذلت سہہ سکتا ہے مگر اپنے آقا و مولا کی ادنیٰ سی توہین بھی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا''



سیشن کورٹ میں حافظ غازی محمد صدیق کے مقدمہ کی سماعت ۶۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو سنٹرل جیل لاہور میں سیشن جج کے روبرو شروع ہوئی۔ استغاثہ کی طرف سے خان صاحب قلندر علی خاں پبلک

پراسیکیوٹر اور صفائی کے لیے میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر اور شیخ خالد لطیف گابا ایڈووکیٹ پیروکار تھے۔ نمائندگان پریس اور غازی موصوف کے لواحقین بھی مقام سماعت پر موجود تھے۔ ان میں غازی صاحب کی والدہ محترمہ، چھوٹا بھائی محمد شفیع اور آپ کے ماموں خوشی محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تیس چالیس دیگر حضرات بھی موجود رہے۔ غازی صاحب کے مقدمے میں چونکہ عام لوگوں کے جمع ہو جانے کا احتمال تھا، اس لئے حفاظتی بندوست نہایت سخت کر دیئے گئے اور اجازت خاص کے بغیر لوگوں کو جیل کے نزدیک آنے سے منع کر دیا گیا۔

فاضل قانون دان مولوی محمد داؤد صاحب بھی پیروی مقدمہ کے لیے قصور سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ٹھیک دس بجے سماعت کا آغاز ہوا۔ پبلک پراسیکیوٹر نے اسیسروں اور دیگر متعلقہ افراد کی آگاہی کے لیے مقدمہ قتل کے حالات و واقعات پڑھ کر سنائے کہ ۱۶۔ مارچ ۱۹۳۴ء کو جب لوگ نماز پڑھ رہے تھے تو پالا مل نے نماز کا تمسخر اڑایا اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے۔ اس پر ایک شخص محمد کلیم پیر نے جو مسجد کے قریب ہی دکان کرتا تھا، مقتول کی اس حرکت پر اظہار ناراضی کیا اور اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا جہاں پر مجسٹریٹ درجہ اول نے چھ ماہ قید اور دو سو روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ مقتول نے اپیل کی اور اسے تا فیصلہ ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

استغاثہ کے مطابق محمد صدیق جو فیروز پور کا رہنے والا ہے، قصور میں اپنے ماموں کے پاس آیا ہوا تھا اور وہیں سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ ۱۶۔ ستمبر ۱۹۳۴ء شام ساڑھے آٹھ بجے بکھے شاہؒ کے مزار کے قریب ایک شخص سردار علی نے شور سنا۔ جب وہ گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ ملزم ایک آہنی رمبی کے ساتھ مقتول پالا مل سنار کو مار رہا ہے۔

عابد شاہ کی طرف سے تھانے میں اطلاع دی گئی۔ خون آلود رمبی کو کیمیکل ایگزامیز کے پاس بھیجا گیا۔ خون کی تصدیق ہوئی۔ مقتول کے جسم پر ضربات کی واضح تعداد ۳۷ ہے جو کسی تیز دھار آلہ سے لگائی گئی تھیں۔ چونکہ مقتول مذکور نے رسول اکرم ﷺ کی توہین کی تھی اس لئے قاتل برداشت نہ کر سکا اور اسے ہلاک کر دیا۔ بقول ملزم کے جو شخص رسول پاک ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات بکے اس کو کسی صورت بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔



باقاعدہ کارروائی کی ابتدا میں صاحب داد خان کانسٹیبل کا بیان ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اس

نے فاضل وکیل میاں عبدالعزیز صاحب کی جرح کے دوران میں بتایا کہ ملزم نے جائے وقوعہ سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

علی اکبر کانسٹیبل نے گواہی میں کہا کہ میں نے مقتول کے خون آلود پارچات کے پارسل محرر تھانہ کے پاس پہنچائے تھے۔ خوشی رام محرر تھانہ نے بیان قلمبند کروایا کہ میں ماہ ستمبر ۱۹۳۴ء میں پولیس اسٹیشن قصور میں تھا۔ ۱۸۔ اکتوبر کو اکبر علی شاہ کانسٹیبل تین پارسل میرے پاس لایا۔

اس کے بعد محمد حسین نقشہ نویس کی شہادت ہوئی۔ میاں صاحب ایڈووکیٹ مذکور کی جرح پر گواہ نے بتایا کہ موقع واردات سے سردار علی (چشم دید گواہ) کے مکان کا دروازہ نظر آتا ہے۔ ویسراج گواہ نے اپنے بیان میں یہ وضاحت کی کہ مقتول پالا مل ساہوکار میرا حقیقی دادا تھا۔ وہ زرگری کے علاوہ بھی لین دین کیا کرتا۔ میں نے اس کی نعش کو شناخت کیا۔ لالہ ویر بھان سب انسپکٹر پولیس نے کہا کہ میں نے مقدمہ ہذا کی تفتیش کی تھی اور ملزم و مقتول کے خون آلود پارچات کو مع آلۂ قتل قبضے میں لایا اور یہ کہ ملزم ہمارے روبرو بار بار اعتراف فعل کرتا رہا۔ اس کے بعد امین چندر پلیڈر نے اپنی شہادت لکھوائی۔

دوسرے مرحلہ میں مسٹر ایم اے خان آنریری مجسٹریٹ نے اپنی گواہی قلمبند کرواتے ہوئے کہا کہ میں نے موقع واردات کا معائنہ کیا۔ دربار کی زمین اور فرش پر خون کے نشانات پائے گئے جو قطروں کی شکل میں مسجد کے سامنے ختم ہو گئے۔

ازاں بعد مرتب شدہ رپورٹ پڑھ کر سنائی گئی۔ گواہ مذکور نے جرح میں کہا: رسول پاک ﷺ کی شان میں ادنیٰ توہین بھی ایک سخت جرم ہے اور میں محبوب خدا ﷺ کی گستاخی کرنے والے کو بہت پاپی سمجھتا ہوں اور کسی بھی مذہبی پیشوا کو گالیاں دینا قبیح فعل ہے۔ ایسا کرنے والے شخص کو جب میں دیکھوں گا تو مجھے اس سے کراہت ہو گی۔ پھر پیر کلم محمد دکاندار کی بھی شہادت لی گئی۔

بناء بریں عباد علی سپاہی نے بیان کیا کہ ۱۷۔ ستمبر کی شام کو خانقاہ کے قریب میں نے شور سنا اور موقع پر پہنچ کر دیکھا کہ مقتول ضربات کی وجہ سے بے ہوش پڑا ہے۔ اس کے پاس محمد صدیق مذکور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ملزم مذکور کے ہاتھوں میں ایک خون آلود رمبی تھی، جسے میں نے قبضہ میں لے لیا اور سردار علی کو تھانے میں اطلاع کے لیے بھیجا۔ کچھ دیر بعد رام سنگھ اور صاحب داد کانسٹیبل وہاں آ گئے۔ مضروب کو کانسٹیبل صاحب داد کی معیت میں ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔

عینی گواہ سردار علی نے بیان درج کروایا اور کہا

''میں خانقاہ بابا بلھے شاہ کا مجاور ہوں۔ میرا گھر جائے وقوعہ سے پچاس قدم کے فاصلے پر ہے۔ شام کے آٹھ بجے میں اپنے گھر روٹی کھا رہا تھا کہ ایک گونگا اور بہرا فقیر آیا۔ جب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ ملزم پالامل ساہوکار کو ضربات پہنچا رہا ہے''۔

گواہ نے عدالت میں محمد صدیق کو شناخت بھی کیا اور کہا کہ مسجد کے سامنے مقتول کو میرے دیکھتے چار ضربات پہنچائی گئیں۔ اس نے مزید بتایا مجھے یہ معلوم نہیں کہ پالامل نے پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں لغویات بکی تھیں اور یہ کہ ہاتھا پائی کے دوران، قاتل و مقتول میں کیا گفتگو ہوئی۔ تاہم مضروب مسلسل چیخ رہا تھا اور محمد صدیق غصے میں بھرا ہوا نعرہ تکبیر لگاتے ہوئے وار پر وار کرتا رہا۔

معمول کی کارروائی کے بعد حضرت قبلہ غازی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا:

''بلاشبہ پالامل کو میں نے قتل کیا ہے، کیونکہ اس ملعون نے رسول کریم ﷺ کی توہین کی تھی۔ وہ دیدہ دانستہ اس جرم کا مرتکب ہوا۔ اسے راجپال اور غازی علم الدین کے واقعہ کا بھی بخوبی علم تھا۔ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے خود کو سزا کے لیے پیش کیا۔ اگر اس واقعہ (شان رسالتؐ میں گستاخی) کو بیس سال بھی گزر جاتے تو تب بھی میں اسے ضرور بالضرور واصل جہنم کرتا۔ ہمارے مذہب میں وہ ہرگز مسلمان نہیں بلکہ کوئی منافق ہے، جو سرکار اقدس ﷺ کی توہین دیکھ یا سن کر خاموش رہے اور عصمت رسولؐ پر جان کو قربان نہ کرے۔ کسی اور شخص کی ذات کا مسئلہ ہو تو برداشت ہو سکتا ہے۔ دنیوی امور میں کسی بھی فرد کی شان میں بکواس پر چپ رہا جا سکتا ہے لیکن آقائے نامدار، حبیب کردگار ﷺ کے مقام و مرتبہ پر ہرزہ سرائی کرنے والوں کے خلاف غیظ و غضب، جوش و ولولہ اور غصہ کسی حالت میں بھی کم نہیں پڑ سکتا۔

میں نے جو کچھ کیا خوب غور و فکر کے بعد غیرت دینی کے سبب

رسول مقبول ﷺ کی شان میں گستاخی کا بدلہ چکانے کے لیے کیا ہے۔
اس پر مجھے قطعاً تاسف یا ندامت نہیں بلکہ میں اپنے اس اقدام پر بہت خوش اور نازاں ہوں۔ عدالت زیادہ سے زیادہ جو سزا دے سکتی ہے، جب چاہے دیدے، مجھے قطعاً حزن و ملال نہ ہوگا۔ مگر جب تک ہمیں شہنشاہ مدینہ ﷺ کی حرمت و تقدس کے تحفظ کی ضمانت فراہم نہیں کی جاتی، کوئی نہ کوئی سرفروش نوجوان، بزم دار و رسن میں چراغ محبت جلاتا ہی رہے گا۔
یہ تو ایک جان ہے اس کی کوئی بات نہیں۔ میں تو آپؐ کی خاک قدم پر پوری کائنات نچھاور کر ڈالوں تو بھی میرا عقیدہ و ایمان اور عشق وجدان یہی کہتا ہے کہ گویا ابھی حق غلامی ادا نہیں ہو سکا۔"



وکیل استغاثہ خان قلندر علی خاں نے اقبالی بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تمام گواہان معتبر ہیں۔ اس امر کو بحیثیت مسلمان، میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ پیغمبر اسلامؐ کی عزت، بعداز خدا یقیناً بہت زیادہ ہے اور جو شخص رسول پاک ﷺ کی شان بابرکات میں ارتکاب گستاخی کرے ایک مسلمان کو اس سے لازماً رنج پہنچے گا۔ لیکن ایک ایسا شخص جس کے سامنے مقتول نے مقام رسالتؐ میں توہین کی تھی، اگر وہ اشتعال میں آجاتا تو قابل معافی تھا۔ مسٹر یونس بیرسٹر پٹنہ نے نتھو رام (اسے غازی عبدالقیوم شہید نے جہنم رسید کیا تھا) کے قتل کے متعلق کراچی میں دو الفاظ ایسے کہے ہیں، جن کی مثال اس جگہ دی جا سکتی ہے۔ فاضل ایڈووکیٹ نے کہا تھا: زخم دل، زمانہ گزرنے پر اچھے نہیں ہوتے بلکہ آہستہ آہستہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اس فلسفے کو شاید یہاں منطبق نہ کیا جا سکے، کیونکہ گستاخی کا ارتکاب محمد صدیق کے روبرو نہیں ہوا تھا"۔
وکیل مذکور نے اپنے دلائل عدالت کے گوش گزار کرتے ہوئے مزید کہا:

"میرا دوسرا موقف یہ ہے، چونکہ ملزم اپنے بیان میں برملا کہتا ہے کہ رسول پاکؐ کی شان کے تحفظ کے لیے قربان ہونا کار ثواب ہے، اس لئے وہ اس فعل کو مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتا ہے۔"

اس دوران وکیل مذکور نے غازی علم الدین شہیدؒ کے مقدمہ اور چند دیگر مقدمات کی تمثیلات جو اس نوعیت کی تھیں، عدالت میں پیش کیں۔ وکیل صفائی میاں عبدالعزیز صاحب

بیرسٹر نے اپنی طرف سے بڑے مدلل اور جامع قانونی نکات جج کے روبرو بیان کئے۔ انہوں نے اپنی طویل بحث میں کہا:

''میرا مسئلہ یہ ہے کہ ملزم کو مقتول سے کوئی ذاتی عداوت نہیں تھی۔ اگر اس نے یہ فعل کیا ہے تو مذہبی عقیدہ کے تحت کیا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان ملزم کا بیان کہ میں بیس سال بعد بھی توہین رسالت ؐ کا انتقام لینے سے نہ ٹلتا، یہ کس جذبے کا ترجمان ہے؟ اس لئے ہم کسی طور بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اسلامی روایات کے مطابق سید البشر ﷺ کی تعظیم و تکریم، خدا کے بعد دوسرے درجہ پر ہے۔ پکے اور سچے مسلمان وہ ہیں جو اپنے آقا و مولا ﷺ کی شان میں کسی طرح کی ادنیٰ سی گستاخی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اور وہ آپ ؐ کی شان برقرار رکھنے کے لئے اپنی جانیں دیوانہ وار فدا کیا کرتے ہیں۔ محمد صدیق کے دل میں بھی اٹھارہ ماہ سے یہی جذبہ موجزن تھا اور اس نے جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر شہنشاہ ہر عالم ﷺ کی حرمت و ناموس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ لہٰذا بہت سے گزشتہ ایسے مقدمات کی مثالیں موجود ہیں جن کے حوالے سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملزم کو زیادہ سے زیادہ حبس دوام کی سزا دی جائے''۔



سماعت کے آخری مرحلے میں سیشن جج نے اسیسروں سے ان کی رائے معلوم کی اور پوچھا کہ آیا ملزم محمد صدیق کے خلاف جو جرم عائد ہے اس نے کیا ہے یا نہیں؟

سید نوازش علی شاہ میونسپل کمشنر نے اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ استغاثہ اور ملزم کے اپنے اقبالی بیان کے مطابق اس سے یہ فعل سرزد ہوا ہے اور از روئے ضابطہ فوجداری سزا کا مستحق ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ملزم قتل کے بعد جائے وقوعہ سے نہیں بھاگا اور جس نیت سے اس نے پالا شاہ کو زخم لگا کر انجام تک پہنچایا، اس پر اول تا آخر قائم رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے یہ فعل مذہبی دیوانگی اور جوش کے تحت کیا ہے۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ ملزم کو سزائے موت کی بجائے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی جائے۔

علاوہ ازیں محمد علی اور مہتاب دین اسیسران نے بھی سید نوازش علی صاحب کی رائے اور خفیف سزا سے متعلق اپیل سے اتفاق کیا۔ تاہم چوتھے اسیسر مسٹر نانک چند نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ واقعات کی رو سے ملزم محمد صدیق واقعی قاتل ہے اور سزا دینا عدالت پر منحصر ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

قانونی بحث اور اسیسروں کی رائے کے بعد عدالت نے غازی محمد صدیق صاحب کو اپنی والدہ اور دیگر عزیز و اقارب سے ملاقات کی اجازت دی۔ آپ کی والدہ صاحبہ نے جواں سال بیٹے کی پیشانی چومتے ہوئے نہایت حوصلہ اور طمانیت کے ساتھ فرمایا:

''میں خوش ہوں۔ جس عظیم ہستی کی شان و عظمت کے تحفظ کی خاطر تم قربان گاہ کی سمت جا رہے ہو اس محسن انسانیت ﷺ کی حرمت و وقار قائم رکھنے کے لیے اگر مجھے تم جیسے بیس بیٹوں کی قربانی بھی دینا پڑے تو رب کعبہ کی قسم کبھی دریغ نہ کروں گی۔''

روزنامہ ''انقلاب'' لاہور اور دیگر معاصر مسلم اخبارات میں آپ کی والدہ صاحبہ کے اس جرأت مندانہ بیان کے علاوہ غازی صاحبؒ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ سنتے ہی زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور امی جان سے عرض کیا:

''میں نے پالامل کو قتل کر کے اپنے آقا و مولا ﷺ کی خوشنودی کے لیے جو قربانی پیش کی ہے، اس سلسلے میں مجھے ہزار مرتبہ جینا یا مرنا پڑے تو تب بھی میں ہر مرتبہ ناموس رسالت ﷺ پر پروانہ وار فدا ہوتا رہوں گا۔ کیونکہ میں اسے صدق دل کے ساتھ اپنا فرض عین سمجھتا ہوں''۔

ازاں بعد آپ نے چھوٹے بھائی محمد شفیع کو گود میں بٹھاتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر بوسہ ثبت کیا۔ پھر اپنے معصوم بھائی اور دوست کا ہاتھ اپنی والدہ صاحبہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا:

''ہمارا گھر، اس پھول سے مہکا رہے گا۔ اب میری جگہ اس سے دل بہلانا اور میرے شہید ہو جانے پر سجدۂ شکر بجا لانا کہ تمہارا لخت جگر مدینہ کی گلیوں کا عاشق تھا اور وہ اپنی منزل مراد پر پہنچ گیا ہے۔''

ملاقات کا وقت ختم ہو جانے پر غازی صاحبؒ اپنے لواحقین سے گلے ملے اور مکمل اطمینان کے ساتھ الگ جا بیٹھے۔ ملاقاتیوں کا بیان ہے کہ اس تمام وقفے میں ان کے ہونٹوں پر تبسم کی واضح

لکیریں رقص کناں تھیں۔ کبھی کبھی تو قہقہے کا گمان گزرتا اور یہ کہ سب کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ٹھیک پانچ بجے شام عدالت نے پروانۂ شمع رسالتؐ، بطل حریت، حافظ غازی محمد صدیق کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔

بہارِ صبح ازل پھر گئی نگاہوں میں
وہی فضا ترے کوچے کے آس پاس بھی ہے



ہائی کورٹ میں دستک

زندہ دلان قصور نے غازی ممدوح کے ورثاء سے بھرپور تعاون کیا اور سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ لاہور میں اپیل گزار دی۔ عدالت عالیہ میں مرافعہ کی سماعت ۳۱۔ جنوری ۱۹۳۵ء کے روز ہوئی۔ فیصلہ صادر کرنے کے لئے ایک ڈویژنل بنچ تشکیل دیا گیا۔ جس میں چیف جسٹس اور جسٹس عبدالرشید شامل تھے۔ ان کے روبرو میاں عبدالعزیز صاحب بار ایٹ لاء نے اس امر پر زور دیا کہ ملزم کی سزا کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا جائے۔

فاضل قانون دان نے دلائل کی بنا پر ثابت کیا کہ ملزم کے دل میں پالا شاہ کی حرکت قبیحہ کی وجہ سے اشتعال موجود تھا، جس کے سبب سے وہ قابو میں نہ رہ سکا۔ ملزم نے اپنے فعل کو چھپانے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ ملزم کو مقتول سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا اور یہ کہ وہ بعد از واردات از خود گرفتاری کے لئے پیش ہوا، حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اس کے لئے فرار ہونا بہت آسان تھا۔ ان پہلوؤں سے واضح ہوتا ہے کہ ملزم نے اس عمل کو اپنا مذہبی فریضہ خیال کیا۔ مزید برآں یہ کہ ملزم نوجوان ہے۔ اس لئے فاضل جج صاحبان کو رحم سے کام لے کر سزائے موت کے فیصلہ کو تبدیل کرنا چاہیے۔

الغرض عدالت نے ان قانونی نکات کو قابل توجہ نہ سمجھا۔ چونکہ حضرت قبلہ غازی صاحب نے ہر جگہ بلا خوف وخطر اعتراف فعل کیا تھا، اس لئے ہائی کورٹ نے سیشن کورٹ کی سزا بحال رکھی اور درخواست مسترد کرتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا:

”ان دلائل کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص مذہب کے نام پر فعل کرے تو اس کو پھانسی نہ دی جائے“۔



جب غازی محمد صدیق صاحب کو جیل میں اس امر کی اطلاع ملی کہ ہائی کورٹ سے ان کی

اپیل نامنظور ہوگئی ہے تو ان کی آنکھوں میں روشنی عود کر آئی۔ وہ اس خبر سے بہت ہی خوش ہوئے۔ انہوں نے جذب و مستی میں فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد فخر کائنات ﷺ کی بارگاہ ناز میں درود و سلام کے گلدستے پیش کروں مگر لوگ مجھے اس شرف سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ زندہ رہنا ہی متاع حیات نہیں بلکہ مرکر فنا کو بھی کمال زندگی عطا کر سکتے ہیں۔ اگر ان کے مقدر میں میری طرح جلوۂ جاناں لکھا ہوتا تو پھر جذبۂ قربانی، خواہش دیدار اور لطفِ قضا بآسانی سمجھ جاتے''

۵۔ مارچ ۱۹۳۵ء کے اخبارات میں لکھا تھا کہ رات قصور سے بذریعہ فون اطلاع پہنچی ہے کہ غازی محمد صدیق کے ایک عزیز کی طرف سے کی جانے والی درخواست رحم کو وائسرائے ہند نے مسترد کر دیا ہے اور کل صبح سات بجے آپ کو فیروز پور ڈسٹرکٹ جیل میں جام شہادت پلا دیا جائے گا۔ ساڑھے دس بجے تک غازی صاحبؒ کے ورثاء آپ کی نعش وصول کر کے قصور لا سکیں گے، جہاں ایک بجے بعداز دوپہر نماز جنازہ کا پروگرام طے ہے۔

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

بزم دار و رسن

غازی محمد صدیق صاحب کو ابتدأ سب جیل قصور ہیں ہی محبوس رکھا گیا تھا۔ جب مقدمہ سیشن کے سپرد ہوا تو آپ کو سنٹرل جیل لاہور میں لے آئے۔ ۳۱۔ جنوری ۱۹۳۵ء کو ہائی کورٹ لاہور میں سماعت ہوئی اور فیصلہ صادر ہو گیا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ کے اندر ہی غازی موصوف کو لاہور سے فیروز پور لے گئے۔ عمائدین کے استفسار اور عوام کے اضطراب پر انتظامیہ نے موقف اختیار کیا کہ چونکہ یہ ضلع فیروز پور سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے بغیر کسی خاص وجہ کے انہیں کسی اور مقام پر پھانسی نہیں دیا جا سکتا۔ مگر اصل سبب یہ ہوا کہ حکومت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ہنگامے کی بو سونگھ لی تھی۔ انتظامیہ کو معلوم تھا کہ لاہور میں کسی وقت بھی فساد کی چنگاری بھڑک سکتی ہے۔ لاہور میں غازی علم الدین شہیدؒ کے جنازہ میں یکا یک چھ لاکھ کے قریب عوام مستانہ وار امڈ آئے اور کراچی میں غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی شہادت کے موقع پر تو کشت و خون سے قیامت صغریٰ برپا

ہوگئی تھی۔ خوف لاحق تھا کہ اگر یہاں اشتعال کی ذرا سی بات بھی ہوئی تو پورا شہر تباہ ہوسکتا ہے۔ قبل ازیں مقدمے کی سماعت بھی کچہری کی بجائے اندرون جیل اسی خطرے کے پیش نظر ہوئی تھی۔



غازی محمد صدیق شہیدؒ کے برادر اصغر شیخ محمد شفیع طاہر صاحب نے راقم السطور کو ایک ملاقات میں بتایا:

اپنے بھائی کی شہادت کے وقت میری عمر قریباً بارہ برس تھی۔ ہمیں ۵۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو آخری ملاقات کے لئے ضلعی جیل فیروز پور میں پابند کیا گیا۔ ہم لوگ طلوع آفتاب کے وقت جیل خانہ کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کے حکم پر ملاقاتیوں کے دو گروپ تشکیل دیئے گئے۔ انہوں نے واضح کر دیا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد آپ لوگ حافظ محمد صدیق صاحب کو زندہ اور گرم سخن نہ دیکھ پائیں گے۔ ہمیں اس سے متعلق یوں بھی اندازہ تھا۔ الغرض پہلے وفد میں ماموں، بہنیں، والدہ صاحبہ اور خاکسار (شیخ موصوف) سمیت ننھیال کی طرف سے جملہ قریبی رشتہ دار شامل تھے۔ آپ بڑے حوصلہ کے ساتھ ملے اور تمام وقت ہنس ہنس کر گفتگو فرمائی۔ انہوں نے ہمیں صبر وضبط کی خاص طور پر تلقین کی اور فرمایا:

> ''خواہش تھی کہ میری زندگی کسی کام آئے اور میرا نام شمع نبوتؐ کے جانثار پروانوں میں لکھا جائے۔ میں نے قصۂ زندگی کو بفضل تعالیٰ لہو کے چھینٹوں سے رنگین بنالیا ہے۔ انشاء اللہ کل میری روح گنبد خضرا کے سائے میں شوخیٔ تقدیر پر سجدہ تشکر بجالا رہی ہوگی۔ میرے بعد ہرگز ہرگز آہ وزاری یا واویلا نہ کرنا۔
>
> امی جان! مجھے صرف قرآن اور صاحب قرآن سے اُنس ہے۔ آپ بھی ہمیشہ انہی سے لو لگائے رکھیں۔ مری قبر پر کبھی کوئی خلاف شرع عمل نہ کیا جائے اور نہ اس کی کسی کو اجازت دینا۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ خدانخواستہ اگر پھر بھی کہیں کوئی گستاخ رسول جنم لے تو میرے متعلقین میں سے ایک نہ ایک فرد اس باطل علامت کو ٹھکانے لگا دے''۔



شہید رسالتؐ کے برادر موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں:

''معززین شہر، احباب یا رشتہ داروں میں سے جب کوئی زیارت کے لئے جیل میں جاتا تو آپ ان سے فرماتے تھے کہ میرے ساتھ دنیا یا دنیاداری کی کوئی بات نہ کریں۔ مجھے تلاوت قرآن مجید اور نعت رسول مقبول ﷺ کے علاوہ کسی اور شے سے کوئی لگاؤ نہیں''۔

۱۵۔ اگست ۱۹۸۵ء کی صبح جب میں بکھری یادیں سمیٹنے کی غرض سے قصور میں موجود تھا۔ غازی محمد صدیق شہیدؒ کے سلسلے میں حکیم بشیر احمد صاحب سے بھی انٹرویو کیا۔ انہوں نے ایام گزشتہ کی بھولی بسری یادوں کو اپنے ذہن میں تازہ کرتے ہوئے بتایا:

غازی موصوف سے میں پہلے بھی ناواقف نہیں تھا۔ اس واقعہ کے بعد تو آپ اس دور کے جوانانِ ملت کے دلوں کی دھڑکنوں میں بس گئے تھے۔ جسے دیکھو ان کا دیوانہ! آپ نے کیا اچھے دور کی بات چھیڑ دی۔ تب مسلمان، مسلمان تھے۔ اپنے رسولؐ کی عظمت وتوقیر پر مر مٹنے سے انہیں کوئی اندیشہ یا مصلحت نہیں روک سکتی تھی۔ ان کے ہیرو کرکٹر یا فلمی اداکار نہیں تھے۔ اگر سرمایہ زیست تھا تو غازی علم الدین شہیدؒ، غازی عبدالقیوم شہیدؒ، اور غازی محمد صدیق شہیدؒ کا جوش وولولہ!

جیل میں ہمیں بارہا ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ خوبصورت اور ہنستا مسکراتا چہرہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ قید خانے میں بھی سدا مسرت واطمینان کی خیرات بانٹی۔ یہاں کے خان بہادر شہباز خاں، مولوی شیخ نواب خان اور اللہ بخش داروغہ آپ کے بڑے قدردان تھے۔ انہوں نے ہر طریق سے کوشش کی کہ غازی مرد پھانسی کی سزا سے بچ جائے۔ وہ اپنے ذاتی اثر ورسوخ سے متعلقہ جج کو بھی ملے اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر غازی صاحبؒ، اقبال فعل نہ کریں تو میں ان کی بریت کے لئے لازماً کوئی نہ کوئی قانونی جواز ڈھونڈ نکالوں گا۔ مگر جانثار نبوتؐ سے بات ہوئی تو انہوں نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا:

''میں چار روزہ زندگی بچانے کے لئے اپنی عاقبت برباد نہیں کر سکتا۔ آپ کیوں مجھے جوہر ایمان سے محروم کر دینا چاہتے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ عدالت میں کہوں کہ میں نے گستاخ نبیؐ کو واصل جہنم نہیں کیا! اگر ایسا کہہ دیا تو میں حبیب خدا ﷺ کی بارگاہ میں کیا منہ لے کر جاؤں گا؟''

ایک روز مجھے وارڈن نے بتایا کہ غازی صاحب کی کوٹھڑی رات بھر بقعہ نور بنی رہتی ہے اور لگتا ہے جیسے کسی نے عطر وگلاب کی بوتلیں چھڑک دی ہوں۔ میں نے شہید ناز سے پوچھا تو آپ

بتانے پر رضامند نہیں تھے۔ آخر سرکارِ مدینہ کا واسطہ دے کر پوچھا تو انہوں نے فرمایا:
روشنی اور خوشبو کا تو مجھے علم نہیں۔ فقط اتنی خبر ہے کہ میں رسول پاک ﷺ کے حضور موجود رہتا ہوں اور میری بیتاب نگاہیں آپ کے چہرۂ اقدس پر ٹکی رہتی ہیں۔

تیری ہی نگاہوں کا تصرف تھا کہ ہم نے
رعنائی افکار کے اعجاز دکھائے



الغرض یہ خبر پورے پنجاب میں پھیل چکی تھی کہ کل صبح، پروانہ شمع رسالت ﷺ کو تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی کھیم کرن، پٹی، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے علاوہ گردونواح کے دیہات سے کافی عقیدت مند آپ کی زیارت اور جنازے میں شرکت کے لیے کھنچے چلے آئے تھے۔ رات کو ہر طرف پڑاؤ ہی پڑاؤ دکھائی دیے۔

دوسری طرف ۵۔ مارچ کی شام سے ہی قصور کے عوام نے کاروبار بند کر لئے۔ اگلے دن پورے شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ دکانوں کے علاوہ سکول اور کارخانے بھی بند رہے۔ چونکہ انتظامیہ اور جملہ مجسٹریٹ بھی شہر کے انتظام میں مصروف تھے۔ اس لئے عدالتیں بھی سونی پڑی تھیں۔ نہ صرف پولیس اور تحصیل کے حکام انتظام میں محو تھے بلکہ ضلع کے حکام، پولیس اور فوجی افسر جن میں گوروں کی بڑی تعداد تھی، نے بھی آنے جانے والوں پر کڑی نگاہ رکھی۔

چونکہ نقص امن عامہ کا زبردست خطرہ تھا، اس لئے انتظامات بہت سخت کر دیئے گئے۔ ادھر جنازے میں شرکت کے لئے ایک اژدہام تھا، تو دوسری طرف فیروز پور ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ، مجسٹریٹ، ڈاکٹر اور جلاد بھی پھانسی گھر میں پہنچ چکے تھے۔ مجاہد ملت حافظ غازی محمد صدیق شب بھر تلاوت قرآن مجید اور درود وسلام کے ورد میں مشغول رہے۔ آخری رات تو آپ پہلے سے کہیں زیادہ خوش وخرم تھے۔ انہوں نے آدھی رات کے وقت محبت بھری لے میں نعت رسول ﷺ باآواز بلند پڑھنا شروع کر دی۔

آواز میں جادو اور لہجے میں مٹھاس تھی، اس پر وجدان اور ذوق وشوق مستزاد! عجیب کیفیت تھی کہ جیل میں مسلمان قیدی تمام وقت کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہے۔ اکثر اوقات قید خانے کے درو دیوار درود پاک کے ذکر اور نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھتے۔ غازی صاحب کا منہ مدینہ منورہ کی طرف تھا اور آنکھوں سے مستی چھلک رہی تھی۔

آپ نے کوٹھڑی کو صاف کر رکھا تھا اور خوشبوؤں کی مسلسل مہک آ رہی تھی۔ لگتا جیسے کوئی ان سے ملنے آ رہا ہو اور بدن سے ایسے نفاست ٹپکتی، گویا کسی سے ملنے جا رہے ہوں۔ انتظار تھا کسی کے آنے کا، کسی کے پاس جانے کا۔ اس وقت غلام کے پاس آنے والا، آقا کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ اور محبّ، محبوب کے علاوہ بھلا کسی اور کے لئے کب تڑپ اٹھتا ہو گا؟ جیل کی کوٹھڑی تو فیوض و برکات کا ایک مے خانہ تھی، جہاں ساقی کوثر ﷺ اپنے مے کش کو جام پر جام عطا فرماتے رہے۔

۲۹۔ ذیقعد ۱۳۵۳ھ مطابق ۶۔ مارچ ۱۹۳۵ء بروز بدھ، ساڑھے چھ بجے صبح آپ تختہ دار کی طرف چلے۔ نپے تلے قدم، نشیلی چال، آنکھوں میں مقدس چمک اور سرخ ڈورے۔ دل تصور جاناں میں گم اور ہونٹوں پر درود وسلام کے گلاب۔ حکام جیل نے قواعد کے مطابق آخری خواہش کے متعلق پوچھا تو فرمایا:

''جن کی عزت و ناموس کا تحفظ کرتے ہوئے اس بلند مقام تک آ پہنچا ہوں، وہ بخوبی جانتے ہیں۔ میرے سرکار ﷺ نے ادنیٰ غلام کی ہر تمنا پوری فرما دی ہے''۔

یہ کہا اور قبلہ رو ہو کر سجدے میں پڑ گئے:

''میرے اللہ! تیرا ہزار ہزار شکر کہ تو نے حبیب پاک ﷺ کی عصمت کے تحفظ کے لئے مجھ ناچیز کو کروڑوں مسلمانوں میں سے منتخب فرمایا''۔

پورے سات بجے آپ تختہ دار پر کھڑے تھے۔ کنٹوپ پہنایا گیا۔ آپ نے زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور پھر گویا ہوئے:

''میں حاضر ہوں یا رسول اللہ ﷺ...... الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ''

اسی ثانیے جلاد اشارہ پا کر آگے بڑھا اور ذرا دیر بعد آپ سولی پر جھول رہے تھے۔ خاکی پنجرے سے روح کے پنچھی نے اڑان لی۔ وہ سامنے، صاحب الجود والکرم ﷺ اپنے صحابہ کے جھرمٹ میں استقبال کو تشریف فرما ہیں۔ یہ تو اہل نظر ہی بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا کیفیت تھی جب فدا کار نبوت، غازی محمد صدیق شہیدؒ اپنے آقا و مولا ﷺ کے نعلین مبارک سے لپٹ کر کہہ رہا ہو گا:

مجھ سے زیادہ میری آنکھوں کو مدینہ کی طلب
میں نہ جاؤں تو چلی جائیں گی پیدل آنکھیں

قربان گاہ میں خونِ دل کی حدت سے مشعلِ وفا کو فروزاں رکھنے والے خوبرو مجاہد کی عمر اس وقت فقط اکیس سال تھی۔



بانکپن

اگلے دن روزنامہ زمیندار لاہور۔'انقلاب' اخبار اور موقر جریدہ 'سیاست' لاہور میں مندرجہ ذیل مضمون کی خبر جلی حروف کے ساتھ شائع ہوئی:

> ''کل سات بجے صبح، فیروز پور ڈسٹرکٹ جیل میں غازی محمد صدیق صاحب کو جام شہادت پلا دیا گیا۔ قصور اور فیروز پور کے مسلمان کافی تعداد میں اپنے غازی کی نعش حاصل کرنے کے لئے جیل کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ آٹھ بجے کے قریب جیل کے عملہ نے شہید کی نعش ورثاء کے حوالے کر دی۔ پھولوں سے سجی ہوئی ایک لاری میں جو پہلے سے تیار کھڑی تھی، آپ کی میت کو قصور لایا گیا۔ مسلمانان فیروز پور کی خواہش تھی کہ جنازہ وہاں بھی پڑھایا جائے، مگر حکام کی سخت تنبیہ کے سبب اس کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا''۔

فیروز پور سے قصور تک سڑک کے دورویہ لاتعداد کلمہ گو کھڑے تھے، جو عقیدت میں ڈوب کر درود پاک کا ورد کرتے اور قافلۂ شوق پر پھولوں کی بارش برساتے تھے۔ مختلف جگہوں پر ہزاروں عقیدت مند، شہید رسالت کی زیارت سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ جنازہ، عید گاہ کے قریب اسلامیہ ہائی سکول قصور کے ہال کمرے میں رکھا گیا۔ (موجودہ بوائز ڈگری کالج) جہاں ان گنت مسلمان پرنم آنکھوں سے اپنے شہید کی زیارت سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ لوگ ایک دروازہ سے داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے۔ کافی دیر تک باپردہ خواتین، شہید کا چہرۂ مبارک دیکھنے کے لئے آتی رہیں۔ ٹھیک ایک بجے جنازہ اٹھایا گیا اور ایک جلوس کی صورت میں نصف میل کا فاصلہ پورے تین گھنٹے میں طے ہوا۔ نماز جنازہ پریڈ گراؤنڈ میں ادا کی گئی، جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق قریباً ایک لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ مولانا سید عبدالحق صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بزم چشتیہ کے رضا کار، ڈاکٹر عبدالغنی لاہوری، حاجی میاں محمد صادق (باغبانپوری) اور انجمن امامیہ کے رضا کار انتظام کر رہے تھے۔ راستہ میں پولیس کے سپاہیوں کے

علاوہ انگریز فوج کا ایک دستہ بھی موجود تھا۔ آپ کے سفر آخرت کے فوٹو اتارنے والوں میں چند یورپین لیڈیز بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ عورتوں کی کثیر تعداد نے بھی نماز جنازہ مین حصہ لیا۔ اس کے بعد آپ کا جنازہ جس کو کاندھا دینے کے لئے چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے تھے، قبرستان میں پہنچایا گیا اور فدیۂ حبیب کبریا غازی محمد صدیق شہیدؒ پورے چھ بجے شام سپرد خاک ہوئے۔



غازی محمد صدیق شہیدؒ کی والدہ صاحبہ نہایت ہی پرہیزگار اور صابر و شاکر خاتون تھیں۔ اپنے فرزند دل بند کی تربیت انہوں نے ایسے خطوط پر فرمائی کہ آگے چل کر وہ ایک عظیم منصب پر فائز ہوئے۔ آپ نے شہید موصوف کو بخوشی اجازت دی کہ اس گستاخِ رسول کو جہنم رسید کر دیں۔ بعداز شہادت جب نعش جیل سے باہر لائی گئی اور جونہی آپ نے بیٹے کا مہکتا ہوا چہرہ دیکھا تو ان کی زبان سے ''سبحان اللہ، ماشاءاللہ، میں اللہ کے قربان، یا اللہ میری قربانی قبول فرمالینا، یارسول اللہ خوش ہوجانا'' ایسے ایمان پرور کلمات بے ساختہ ادا ہوئے۔

غازی محمد صدیق شہیدؒ کی والدہ صاحبہ نے دیگر مستورات کو رونے اور چیخ پکار سے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا۔ جب کوئی عورت تعزیت کو آتی تو آپ کہتیں۔

''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قربان ہوجانا تو خوشی کا مقام ہے''۔

شہباز عشق کے برادر خورد جناب ایم ایس طاہر (محمد شفیع) بتاتے ہیں:

جب غازی ممدوح، گھر سے جہاد کی نیت لے کر قصور تشریف لائے تو ہمیں ہر روز انتظار رہتا تھا کہ دیکھئے آپ کب کامیاب ہوتے ہیں۔ چونکہ آپ فیروز پور سے اپنی دکان وغیرہ بیچ آئے تھے اور اب ان کا یہی مقصد حیات قرار پا گیا تھا۔

قیام قصور کے دوران، شہید عشق رسول ﷺ ایک دفعہ لاہور میں غازی علم الدین شہیدؒ کے مقبرہ پر بھی حاضر ہوئے۔ یہاں انہوں نے بہت دیر اعتکاف فرمایا۔ میزبان و مہمان کے راز و نیاز کا تو کچھ علم نہیں، البتہ جاتی دفعہ انہوں نے رو رو کر دُعا مانگی اور مرقد شہید کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

''میرے بھائی! جب تک میں زندہ ہوں، اس دھرتی پر کوئی راجپال جنم نہیں لے سکے گا''

غازی علم الدین شہیدؒ کی آخری آرام گاہ سے غازی محمد صدیق شہیدؒ کو پروانۂ صداقت ملا تھا

تو آپ کے گوشۂ راحت سے ہمیں کوئی اور علم الدین بھی عطا ہو سکتا ہے۔"

غازی محمد صدیق شہیدؒ کو ماقبل گرفتاری قرآن پاک کے ۱۳ سپارے یاد تھے مگر جیل میں آپ نے باقی سترہ بھی حفظ کر لئے اور دوران اسیری آپ کا وزن کئی پونڈ بڑھ گیا تھا۔ قید خانے میں وزن کا بڑھتے جانا، جب یہ بھی احساس ہو کہ جلد ہی پھانسی دی جانے والی ہے، انتہائی تعجب انگیز ہے۔ یہ راز عقل سے ماوراء ہے۔ اُسے فقط روحانی معالج ہی سمجھ سکتے ہیں۔

^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^

غازی مرید حسین شہیدؒ

پنجاب کے نقشے پر سرگودھا سے قدرے گریزاں بیضوی نما لکیروں میں گھرے ہوئے ایک شہر کا نام ’چکوال‘ ہے۔اس کے اردگرد راولپنڈی، جہلم، گجرات اور میانوالی کے اضلاع گھیرا ڈالے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شہر راولپنڈی سے تقریباً ایک سو کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔اس کے رقبے پر ایک قطار میں پہاڑوں کا عظیم سلسلہ بھی اپنی میخیں گاڑے کھڑا ہے۔علاقہ مذکور کی زمین ریتلی ہے اور بعض جگہ پتھریلی۔ زراعت کے میدان میں خاص اہمیت نہ سہی، تاہم اس قطعۂ ارض کے دامن میں سیاحوں کے لئے قدرت نے مختلف النوع دلچسپیوں اور کشش کا وافر سامان پیدا فرما رکھا ہے۔ علاوہ ازیں جغرافیے کے لحاظ سے اس کی اہمیت جو بھی ہو، تاریخ کے حوالے سے قدر و قیمت میں کلام نہیں۔اس کے مغربی پہلو میں واقع تلہ گنگ کا تاریخی قصبہ بھی انفرادیت رکھتا ہے۔

جب بھی آزادی کے سفر کی بات چل نکلتی ہے تو یہ مقامات ضرور زیر بحث آتے ہیں۔ جہاد کشمیر کا موضوع ہو یا بھارت اور پاکستان کے درمیان لڑی جانے والی کسی جنگ کا تذکرہ، ان مقامات کے باشندوں کا جذبۂ سرفروشی، شجاعت و جوانمردی اور وطن دوستی کا موضوع لازماً چھڑ جاتا ہے۔مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آزادی سے قبل اس سرزمین پر ایسے جانباز بھی تھے، جنہوں نے نہ صرف یہاں بلکہ دیارِ غیر میں بھی اپنا مقام پیدا کیا۔اپنی جان پر کھیل کر تاریخ کو تازہ عنوان بخش گئے۔ انہوں نے نوکِ خنجر سے جبین وقت پر یہ ابدی حروف لکھے کہ آج کے بعد قریۂ زوال میں کبھی قحط الرجال کا ماتم نہیں ہوگا۔

تحفظ ناموس رسالت کا بیان ہو تو ہم انہیں تحسین و آفرین کے گلدستے پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔زندہ رہے تو زندگی دین کے لئے وقف تھی، موت کی آغوش میں پہنچے تو چہروں پر بشاشت اور ہونٹوں پر تبسم تھا۔دار و رسن کو چوما اور تختے پر کھڑے ہو کر قوم کو درس وفا دیا۔

’’غازی مرید حسین شہیدؒ...... شمعِ رسالت ﷺ کا پروانہ‘‘ یہ قریشی زادہ عبقری چکوال سے چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع معروف گاؤں ’’بھلہ شریف‘‘ میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں چوا سیدن شاہ جانے والی سڑک پر آباد ہے۔

''غازی مرید حسین شہید'' کے والد محترم کا نام عبداللہ خان ہے۔ چودھری عبداللہ خان مرحوم ومغفور، بھلہ کے نمبردار اور باوقار بزرگ تھے۔گاؤں میں ان کی اچھی خاصی زمین تھی۔آپ کے کردار میں حسن تھا اور گفتگو میں سلیقہ۔ ایک روشن ضمیر مرد مومن سے نسبت روحانی کے سبب چودھری صاحب کا دل درد وسوز کی کیفیتوں سے لبریز رہتا۔آپ کی آنکھیں بالعموم نم ہوتیں اور زبان یادِ الٰہی میں مصروف۔خدا تعالیٰ نے آپ کو عزت، دولت اور شہرت عطا کر رکھی تھی۔مگر ان تمام نعمتوں کے باوجود گھر کے در و دیوار پر اداسی چھائی رہتی۔ ماحول میں افسردگی ہوتی۔ایک خلا سا دکھائی دیتا۔وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ طویل مدت تک اولاد سے محروم رہے۔بالآخر ہزار دعاؤں اور منتوں کے بعد بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے ۲۴۔فروری ۱۹۱۴ء کو فرزند ارجمند سے نوازا۔سید جمیل شاہ صاحب نے ان کا نام مرید حسین رکھا۔ یہ بزرگ آپ کے والد محترم کے مرشد اور موضع ڈھڈیاں کے رہنے والے تھے۔

غازی صاحب کی پیدائش عشاء کے وقت ہوئی۔نومولود ان کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور تھا۔اس کو دیکھ کر جیتے تھے۔بچے کی پرورش بڑی محبت اور محنت سے کی گئی۔ولادت کے روز تو ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔وہ پھولے نہ سماتے۔کہتے ہیں نام سے شخصیت و کردار پر گہرا اثر پڑتا ہے۔البتہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بچے کا تعارف والدین کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔گہرائیوں میں سوچنے والے تو اس سے ان کے اسلامی وغیر اسلامی ذہن کا تجزیہ بھی کر لیتے ہیں۔نام کے حوالے سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے ماں باپ کو خانوادۂ نبوت سے کس قدر والہانہ شیفتگی تھی۔

مرید حسین کی قسمت کا صفحہ جب کارکنانِ قضا و قدر نے الٹ کر دیکھا تو مسکرا پڑے۔اس مرید کو آگے چل کر حاصل مراد بننا تھا۔اس سے ایک گھر ہی نہیں، مستقبل میں ان گنت دل آباد ہو جانے والے تھے۔

تاریخی لحاظ سے یہ روایت دلچسپی کا موجب ٹھہری کہ ایک قریشی النسل بزرگ کا صدیوں پہلے ہندوستان میں ورود ہوا، وہ عزم تبلیغ رکھتے تھے۔اس نیت کے ساتھ انہوں نے خطۂ عرب سے ہجرت کی اور بت پرستوں کے وطن میں تشریف لائے۔ان کے حجاز مقدس سے ہندوستان کے سفر کا خلاصہ یہ جانا گیا کہ مسجدیں تو تربیت کا کام دیتی ہیں، تبلیغ کے لئے شرک وکفر زار کی بستیاں چنی جانی چاہئیں۔الغرض مختلف علاقوں کی سیاحت فرماتے ہوئے جب آپ سرگودھا کے

معروف قصبہ جھاوری وشاہ پور کے نزدیکی گاؤں ''کہوٹ'' پہنچے تو یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہ بزرگ غازی مرید حسین شہیدؒ کے مورث اعلیٰ اور سیدنا حضرت علی المرتضیٰ کے شیر دل صاحبزادے حضرت عباس کی اولاد سے ہیں۔ دوسری روایت کے مطابق ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ کے فرزند محمد بن حنیفہ سے جاملتا ہے۔

حضرت محمد عون قطب شاہ اسی سلسلے کے ایک بزرگ تھے، جن کی اولاد برصغیر پاک و ہند میں ''اعوان'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپ نے خاندانی شرف و وقار، حسن کردار اور دیگر ذاتی اوصاف کی بنا پر لوگوں کے دل موہ لئے۔ یہ سوال کہ برصغیر میں آپ کے جدامجد کی گوت ''کہوٹ'' کیوں کہلائی اور دیہہ ''کہوٹ'' کا نام پہلے سے موجود تھا یا آپ کی نسبت سے پڑ گیا، یہ پہلو راقم کے محدود علم کے مطابق تشنۂ تحقیق ہے۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد عون شاہ کے پوتے ''محمد'' کا عرف کہوٹ تھا۔ چنانچہ ان سے جو اولاد ہوئی، وہ اپنے کو کہوٹ کہلواتی ہے۔

وجہ تسمیہ اس کی کچھ بھی ہو، آپ کے صلب سے چلنے والی نسل نے برصغیر پاک و ہند میں ہمیشہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ المختصر قریباً پونے دوسو سال پہلے غازی مرید حسین شہید کے قائم مقام مورث اعلیٰ مہر خان کسی وجہ سے بھلہ شریف میں منتقل ہو گئے تھے۔



ولادت سے جوانی تک

شہید موصوف کی عمر پانچ برس بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ۱۹۱۹ء کے آغاز میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جب غازی ملت زندگی کی پانچ بہاریں دیکھ چکے تو آپ کی والدہ محترمہ نے اپنے پیارے اور لاڈلے بیٹے کو قرآن حکیم پڑھنے کی غرض سے سید محمد شاہ صاحب کے ہاں بھیج دیا۔ یہ بزرگ جامع مسجد بھلہ کے خطیب و امام مسجد تھے۔ دوسری طرف عام تعلیم کے حصول کی خاطر اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ جو اس وقت کالا سکول کہلواتا تھا۔ آپ کے اساتذہ میں غلام محی الدین اور خوشی محمد قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر تواہی کے ہاں رہتے تھے۔

دس سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد انہیں قریبی قصبہ کریالہ کے اینگلو سنسکرت مڈل سکول میں بٹھا دیا گیا۔ آپ شروع ہی سے بلا کے ذہین اور محنتی تھے۔ مڈل کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول چکوال، جو اب ڈگری کالج بن چکا ہے۔ میں زیر تعلیم رہے۔ نصیرالدین صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ پابند صوم و صلوٰۃ اور نہایت محنتی۔ دیگر

اساتذہ میں چودھری فضل کریم، مولوی محمد لطیف، مولوی محمد دین، قاضی غلام احمد، قاضی غلام مہدی اور ادیب صاحب کے اسماء گرامی معروف ہیں۔ میجر شیر محمد آپ کے کلاس فیلو تھے۔ اگرچہ آپ دبلے پتلے تھے لیکن باوجود اس کے کھیلوں میں بھی دلچسپی رکھتے۔ کبھی کبھی چوگان، ہاکی، کبڈی، کشتی اور والی بال بھی کھیلا کرتے۔ عموماً آپ کے ساتھی کھیل کے دوران بظاہر کمزور جسمانی ساخت کی وجہ سے مذاق کرتے۔

آپ کی عمر پندرہ برس سے چند ماہ اوپر ہو چکی تھی۔ دو سال کی مدت پوری کرنے کے بعد میٹرک کا امتحان منعقدہ ۱۹۳۱ء میں شامل ہوئے۔ ۱۹۳۲ء کے آغاز میں رزلٹ آؤٹ ہوا۔ آپ نے نہ صرف فرسٹ ڈویژن حاصل کی، بلکہ جماعت بھر میں اول رہے اور ضلع میں بھی نمایاں پوزیشن تھی۔ گو اعلیٰ تعلیم کا شوق اور وسائل رکھتے تھے مگر بعض ناگزیر گھریلو ذمہ داریوں اور گاؤں کی نمبرداری کے بوجھ سے مجبوراً سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔



نیک سیرت والدہ کی تربیت اور خاندانی شرافت نے آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا سچا شیدائی بنا دیا تھا۔ طبیعت اس قدر حساس پائی تھی کہ کسی انسان کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو تڑپ اٹھتے۔ ہندوؤں کی ستم کاریاں اور مسلمانوں کی زبوں حالی انہیں ہر وقت بے قرار رکھتی۔ لہٰذا آپ نہایت انہماک اور خاموشی سے خدمتِ خلق میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ مسلمانوں کی مرفہ الحالی ہر وقت ان کے پیشِ نگاہ رہتی۔ چونکہ خوشامد آپ کو پسند نہ تھی، اس لئے انگریز انتظامیہ چڑ گئی۔ غیور مردِ مومن کو غیروں کی ناز برداریاں کب گوارا ہو سکتی تھیں۔ آپ کی مومنانہ فراست اور قوم سے ہمدردی کے سبب ہندو بھی بگڑ بیٹھے۔ لیکن قبلہ غازی صاحب کو ان کی کب پرواتھی۔ غازی موصوف زمانہ طالب علمی سے ہی نماز روزے کے پابند تھے۔

جب آپ نہم جماعت میں داخل ہوئے تو پہلے پہل ایک مقامی تعلق دار جو چکوال شفٹ ہو گیا تھا کے ہاں رہائش رکھی۔ ان کا گھر امام باڑہ کے بالکل قریب تھا۔ ازاں بعد سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں آ گئے۔ ان دنوں ہاسٹل سپرنٹنڈنٹ قاضی مہدی صاحب تھے۔ ان اصحاب سے روایت ہے کہ غازی مرید حسین شہیدؒ کو ہم نے کبھی نماز چھوڑتے نہیں دیکھا۔ آپ ہمیشہ باجماعت نماز ادا کرتے اور فارغ اوقات میں اکثر اسلامی کتب کا مطالعہ فرماتے۔ درود و سلام کی تلاوت ان کا معمول تھا۔ اس لئے ہمہ وقت باوضو رہتے۔

نبی پاک ﷺ کے عاشق صادق کے ماموں ماسٹر غلام سرور صاحب کے علاوہ چودھری خیر مہدی صاحب کا بھی بیان ہے:

''آپ صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند اور ہمیشہ پاک صاف رہنے کے عادی تھے۔ نماز باجماعت کی پابندی کی یہ حالت تھی کہ اللہ اکبر کی آواز کان میں پڑتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور خانہ خدا میں پہنچ جاتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کھانا کھا رہے ہوتے اور اذان کی آواز سن کر کھانا وہیں چھوڑ دیا اور مسجد پہنچ گئے''۔

اس طرح کا ایک قرار آفریں اور الفت انگیز واقعہ چودھری مذکور نے راقم کو بوقت ملاقات بتایا کہ مقامی برادری کے ایک شخص اللہ داد نے شادی کی خوشی میں، مجھے اور غازی صاحب کو کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران عشاء کی اذان سنائی دی۔ ادھر موذن کے منہ سے اللہ اکبر نکلا ادھر آپ نوالہ برتن میں ہی چھوڑ کر مسجد کو چل پڑے کہ جماعت سے نہ رہ جائیں۔ میزبان نے بڑی ضد کی مگر آپ نہ مانے۔ اس وقت ان کے مابین ایک خوبصورت اور دلچسپ مکالمہ بھی ہوا۔ اللہ داد صاحب نے کہا کہ یہ ایک طویل اور صبر آزما سفر ہے۔ جس پر آپ چل نکلے ہیں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا: لمبے سفر کا یہ تو اہتمام کرنا چاہیے کہ منزل سے محروم نہ رہیں۔

آپ کی نیک طبیعت ظاہری نمود ونمائش اور چودھراہٹ سے کس قدر متنفر تھی، اس کا اندازہ نمبرداری کے جنجال اور غلامی کے جوئے سے گلوخلاصی کروا لینے سے ہی ہو جاتا ہے۔ چودھری خیر مہدی صاحب کا اس سلسلے میں بیان ہے: ابتدا آپ نے نمبرداری کی ذمہ داری کو خود ہی سنبھالے رکھا۔ پھر کچھ مدت کے لئے یہ ذمہ داری بطور معاون ایک رشتے دار غلام محمد نے نبھائی۔

چھوٹا سا پاکستان

قبلہ غازی صاحب ہاتھ کے سخی اور دل کے فیاض تھے۔ ان سے مہمان نواز اور ایثار صفت بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ الغرض اجنبی اور شناسا مہمانوں کے علاوہ ڈیرے میں پولیس بھی آیا جایا کرتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ آپ کا مزاج بدلتا گیا۔ جب آپ نمبرداری نظام کی خرابیوں سے باخبر ہوئے تو آپ کی طبیعت میں اکتاہٹ پیدا ہو گئی۔ محسوس کیا گیا آپ متفکر سے رہنے لگے ہیں۔ اس کیفیت کو زیادہ مدت نہیں گزری کہ دسمبر ۱۹۳۵ء کی ایک رات آپ کو جانے کیا خیال آیا کہ اپنے چچازاد بھائی شاہ ولی اور چودھری خیر مہدی صاحب کو بلا بھیجا۔ چودھری خیر مہدی صاحب بتاتے

ہمارے جانے پر انہوں نے سرہانے کے نیچے سے دو تین صفحات نکال کر پڑھنے شروع کر دیئے۔ آپ نے نمبرداری کی تاریخ و تحریک بتاتے ہوئے کہا کہ اس بارے میں پہلی تجویز ۱۸۷۵ء میں انگریز کے زیر غور آئی۔۔ برطانوی حکومت کے کارندوں نے مقامی آبادی کو مرعوب رکھنے کے لیے ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈے اپنا لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ نہ صرف لوگوں کو ورغلانا بلکہ بلیک میلنگ کا ایک منظم محکمہ بھی قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ایسے افراد پیدا کئے جائیں جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی لیکن فکر و خیال کے حوالے سے پورے پورے انگریز ہوں، لہٰذا انہی مقاصد کے پیش نظر ۱۸۸۰ء میں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا گیا''۔

یہ بتا چکنے کے بعد آپ نے ہمیں نصیحت فرمائی کہ بہتر تو یہی ہے کہ تم بھی اس جنجال سے بچے رہو۔ اگر باز نہ رہ سکو تو پھر تمہاری مرضی، میں نے تو آج سے اسے خیر باد کہہ دیا ہے اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سن کر ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ آپ یہ قدم نہ اٹھائیں مگر ان کے فیصلے حتمی ہوا کرتے تھے۔ اس کے دوسرے روز ہی انہوں نے کئی صفحوں پر مشتمل اپنا تحریری استعفیٰ متعلقہ افسر ملک قطب خان سے مل کر ارباب اختیار تک پہنچا دیا۔ نمبرداری سے قطع تعلق کر لینے کے چند روز بعد ملک قطب خان صاحب یہاں تشریف لائے اور حسب سابق غازی صاحب کو بلوا بھیجا۔ آپ نے ان کے پاس جانے سے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھے ان معاملات سے الگ ہی رہنے دیجئے۔ تھانے میں آنا جانا اور پولیس والوں سے میل ملاپ رکھنا میری طبیعت پر گراں گزرتا ہے''۔

اب آپ نے ہندوؤں سے ہر قسم کا مقاطعہ شروع کر دیا۔ ان کی مشینوں پر آٹا بھی نہ پسنے دیتے۔ ایک دو بار مسلمان عورتوں کے سر سے گندم کی بوریاں بھی گرائیں کہ وہ ہندوؤں کی چکی پر نہ لے جائیں۔ آپ شریف النفس تھے اور باکردار بھی۔ کون تھا جو آپ کے طرز سلوک اور اخلاق حمیدہ سے متاثر نہ ہو! پس آپ کی تمنائیں رنگ لائیں۔ ہر سعی جمیلہ بارآور ثابت ہوئی کہ تمام مسلمان آبادی آپ کی ہمنوا بن کر اپنے رسول ﷺ کے دشمنوں سے نفرت کرنے لگی۔

غازی مرید حسین شہیدؒ اس قدر مخلص اور مستقل مزاج ثابت ہوئے کہ ہندوؤں ہی کی بسوں میں سفر کرنا بھی چھوڑ دیا۔ چونکہ اس وقت صنعت، تجارت اور دیگر معاشی وسائل ہندوؤں کی دسترس میں تھے اور ٹرانسپورٹ پر بھی انہی کا قبضہ تھا اس لئے جہاں بھی جانا ہوتا، آپ پیدل چل پڑتے۔

دوقومی نظریے کے اس عظیم حامی وداعی نے مقامی مسلمانوں کی ایک انجمن بنا کر ہندوؤں کا مکمل طور پر معاشرتی بائیکاٹ کر دیا۔ اپنے سرمائے اور اثر ورسوخ سے غریب مسلمان بھائیوں کی دکانیں کھلوا دیں۔ بیداری کی یہ لہر دیکھ کر غیروں نے آپ کو رام کرنے کی ہر ممکن کوششیں کیں۔ پہلے سرکاری دباؤ کے ذریعے پھر دھمکیوں اور لالچ کے ساتھ۔ مگر آپ نے ڈرنا تھا نہ ڈرے۔ تحریک کو زور وشور کے ساتھ جاری رکھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ آپ کی ملی محبت و ہمدردی کے سبب چالباز دشمنوں کو نہ صرف معاشی بلکہ سیاسی موت بھی نظر آ رہی تھی۔ معاشرتی رعب داب دم توڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے اس امر کا بڑی سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ آپ کے عظیم مشن کو ناکام بنانے کی خاطر کفار کی پوری فوج میدان میں اتر آئی۔ ان میں بھلہ کے بھائی پرمانند جیسے بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی شامل تھے۔

معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کی تحریک کے آغاز سے نہ صرف مقامی بلکہ علاقہ بھر کے ہندو گھبرا اٹھے۔ اس کی بازگشت دور دور تک سنی گئی۔ ایک دو ہندو جرائد نے اس پہلو کو موضوع سخن بناتے ہوئے مسلمانوں کی تنگ نظری و تنگ دلی کا رونا رویا اور اشارتاً و کنایتاً اسے تقسیم ہند کی سازش کا شاخسانہ قرار دیا۔ ہندوؤں کا پراپیگنڈہ منظم تھا، وہ ہر جگہ واویلا کرتے رہے۔ ایک دفعہ مقامی ہندوؤں کی شکایت پر جہلم کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایف ایم انز اور چکوال کے ایس ڈی ایم سید نثار قطب صاحب نے بھلہ شریف کا دورہ کیا۔ ڈسٹرکٹ کمشنر صاحب نے یہاں کھلی کچہری لگائی اور ہزاروں افراد کے روبرو حضرت قبلہ غازی صاحب سے استفسار کیا کہ آپ نے ماحول میں گھٹن اور فضا میں منافرت کیوں پھیلا رکھی ہے؟

غازی صاحب کو جیسے زخم دل دکھانے کا موقع مل گیا۔ آپ نے اس اعتراض کے جواب میں نہایت متانت و وقار کے ساتھ اپنا موقف بیان کیا۔ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ آپ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مجاہد ملت نے مجمع اور انتظامیہ کے مذکورہ افسران کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”مجھے ہندوؤں سے کوئی ذاتی عناد نہیں اور نہ ہی ہم نے ان پر کسی

قسم کی کوئی زیادتی کی ہے۔ چونکہ ہمارے عقیدے کے مطابق یہ لوگ مشرک و ناپاک ہیں اس لئے مسلمانوں نے ان سے لین دین ترک کر رکھا ہے اور کئے رکھیں گے۔ ویسے بھی لین دین کے لئے کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارا دین اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنے رسول ﷺ کے گستاخوں کو دوست بنائیں۔ آریہ سماجیوں نے ہمارے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟ دوسری ہندو تحریکوں، پارٹیوں اور انجمنوں کی اسلام دشمنی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اپنے اردگرد متمول ہندوؤں کی چیرہ دستیاں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

ایک مدت تک ہم دل ہی دل میں کڑھتے رہے ہیں۔ اب ہماری غیرت مند طبیعت متعصب اور دریدہ دہن ہندو بنیوں سے نفرت کے سوا اور کوئی رشتہ قائم نہیں رکھ سکتی۔ کیا ہم شانِ رسالت ﷺ میں ان کی طرف سے گستاخیوں کی طویل کہانی کو بھول جائیں؟ ابھی تو وہ زخم بھی تازہ ہیں جو ہمیں دہلی، لاہور اور کراچی میں بخشے گئے۔ سوامی شردھانند، راجپال اور نتھورام کے چیلوں کو ہم سینوں سے کس طرح لگا سکتے ہیں؟''

ایسا نوجوان جس نے ابھی شباب کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تھا۔ اس کی جرات و بیباکی اور دینی جذبے کا یہ انداز دیکھ کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ آپ کی تمام گفتگو بغور سن لینے کے بعد انگریز افسر نے مسکراتے ہوئے کہا:

''تم لوگوں نے تو ابھی سے ایک چھوٹا سا پاکستان بنا لیا ہے''۔



سن وسال کے آئینے میں غازی مرید حسین شہید کا سوانحی خاکہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک خوش قسمت بچہ ۱۹۱۴ء میں چودھری عبداللہ خان کے گھر بھلہ شریف میں تولد ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں آپ کے والد محترم داغِ مفارقت دے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مسجد میں بٹھایا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ نے میٹرک کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء تک نمبرداری کے جھمیلوں میں پڑے رہے۔ آئندہ برس ان کے غور وفکر کے لئے مختص تھا۔

جب آپ زندگی کی بیس بہاریں دیکھ چکے تو ان کی نیک سیرت والدہ صاحبہ کے دل میں خوشیاں منانے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۳۵ء میں بیس سالہ مرید حسین کی شادی،

محترمہ امیر بانو صاحبہ، (متوفی ۱۹۴۳ء) ہمشیرہ چودھری خیر مہدی صاحب (نمبردار بھلہ شریف) سے انجام پائی۔ فضول رسمیں غازی صاحب کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ سادگی سے محبت اور تصنع سے انہیں نفرت تھی۔ اس لئے خلافِ روایت آپ کی رسم نکاح خاموشی سے ادا کی گئی۔ پہلی بار اس موقع پر آتش بازی کا مظاہرہ ہوا نہ ڈھول بجایا گیا۔

اس رنگ کو دیکھ کر والدہ صاحبہ نے حسرتاً کہا:

"بیٹے کی شادی پر میرے ارمان پورے نہیں ہوئے۔ یہ کیسی شادی ہے کہ بارات بھی نہیں چڑھی؟"

یہ سن کر آپ نے نہایت عاجزی سے عرض کیا: ماں! آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ میری بارات کو دیکھ کر تو ایک دنیا دنگ رہ جائے گی۔ جو بھی دیکھے گا، دانتوں میں انگلی دبا لے گا۔ لوگ کف افسوس مل کر کہیں گے کاش! یہ شرف ہمیں نصیب ہوتا۔

غازی صاحب اکثر نزدیکی شہر چکوال جاتے رہتے تھے۔ وہیں علامہ عنایت اللہ المشرقی کی مشہور خاکسار تحریک کی عسکریت سے متاثر ہوئے اور خاکسار بن گئے۔ خاکساروں میں تنظیم اور قواعد و ضوابط کی پابندی کے باوجود روحانی و رومانی جذبے کی شدید کمی تھی۔ وہ کوئی منزل متعین کئے بغیر پرخطر راستوں پر محو سفر رہے۔ ظاہر ہے صرف خاکسار بن جانے سے آپ کی عشق رسالت ﷺ میں ڈوبی ہوئی روح کو سکون نہیں مل سکتا تھا۔ روحانیت کی پیاس آپ کو خواجہ چاچڑوی حضرت پیر محمد عبدالعزیز چشتی صاحبؒ کے پاس لے گئی۔ مرد قلندر کی پہلی ہی نظر نے ان کو دیوانہ بنا ڈالا۔ شیخ کامل کے جذب و مستی کا اثر مرید صادق کی آنکھوں کے جھروکوں سے گزر کر دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گیا۔ طائر لاہوتی نے تیر نظر کا شکار ہو کر قلندر کریم کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ جوہری نے موتی تلاش کیا یا دُر نے دریاب کو ڈھونڈ نکالا، ساقی جام و سبو لے کر اٹھا اور صدا لگائی "ارے او دیوانے کہاں ہے تو" کہ بادہ خوار مے کشوں کے امام کی خاک پا چومتا ہو! سر بام جا پہنچا۔ بہر حال اکسیر اور کیمیا گر کا باہم تعلق جڑ گیا۔ گوہر، صاحب گوہر کی تلاش قرار پایا۔ سنا ہے قریشی زادہ عبقری مرید نہیں مراد بن کر میکدۂ عزیزؒ میں حاضر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے قدح شراب میں ڈھل گیا۔

بھلہ شریف کے قریب ایک اور مشہور و معروف قصبہ 'کریالہ' واقع ہے۔ غازی مرید حسین شہیدؒ کے ننھیال کا تعلق اسی گاؤں سے ہے۔ یہ گاؤں حضرت شہید کے مسکن و مولد بھلہ شریف کی

گود میں پناہ لئے ہوئے ہے۔حضرت قلندر کریم کے زمانے میں یہ قصبہ ایک مائی صاحبہ المعروف مائی بیگماں کا تکیہ تھا۔ان کی بیعت تونسہ شریف تھی۔قدرت نے انہیں قلندرانہ طاقت ودیعت کی تھی۔اگر وہ کسی کی طرف نگاہِ کرم سے دیکھتیں تو ماحول پر مستی چھا جاتی۔فضا کیف سے معمور ہوتی اور مرکز توجہ بننے والے کے ہاتھ سے لقمہ تک گر پڑتا تھا۔انہی مائی صاحبہ کا ایک نوجوان بھانجا تھا جس کا رنگ گندمی مگر سفیدی غالب تھی۔ہونٹ باریک نہ زیادہ موٹے۔البتہ اکثر اوقات ذرا سے کھلے رہتے۔چہرہ لمبائی میں کم اور چوڑائی میں موزوں۔آنکھیں قدرے چھوٹی معلوم ہوتیں، تاہم مژگان کا سایہ یہ کمی چھپا دیتا۔گردن گوشت سے بھری ہوئی اور پروقار تھی۔ناک کی بناوٹ سے گمان گزرتا جیسے کسی مصور کا تخیل چرایا گیا ہو۔ماتھے کی ساخت ایسی تھی کہ پورے جسم کا دیباچہ معلوم ہوتا۔بظاہر دیکھنے والوں کو ان کی صحت کمزور و ناتواں محسوس ہوتی۔صاف ستھرا مگر سادہ لباس پہنتے۔اہل نظر کو یہ نوجوان کروڑوں میں منفرد اور خوبصورت دکھائی دیا۔جن لوگوں کی آنکھ جسم کے جدول پر ٹھہری انہوں نے اسے قبول صورت جانا۔یہی جواں سال غازی مرید حسین شہیدؒ ہیں۔



مرید قلندر

مخدوم خاندان، پنجاب میں مشہور ترین اور عالی نسب ہے۔حضرت خواجہ غوث بہاؤ الحق ملتانی بھی اس معزز قبیلے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔اس خاندان کی ایک شاخ سے خواجہ برہان الدینؒ ہیں، جن کا مزار پرانوار موضع چنگڑانوالہ ضلع سرگودھا میں اب بھی مرجع خلائق ہے۔یہی صاحب کرامت بزرگ حضرت خواجہ عبدالعزیز صاحب چاچڑویؒ کے جدامجد ہیں۔

قبلہ قلندر کریمؒ مخدومی و آقائی شیخ شیوخ عالم حضرت خواجہ محمد فضل الدینؒ کے چھوٹے صاحبزادے اور فطرتاً صوفی تھے۔بچپن میں ہی آپ سے تحیر انگیز کرامات نمودار ہونا شروع ہوگئیں۔جوں جوں عمر پختہ ہوئی، جذب و مستی کا رنگ چڑھتا گیا۔عشقِ سرمدی کا یہ نورانی پیکر ہمہ وقت استغراق و کیفیات میں رہتا۔سوز و گداز کا یہ عالم تھا کہ اپنے مرشد کامل کی بارگاہ اقدس، سیال شریف میں عرس کے موقع پر ایک بار آپ کیفیت وجد سے کنویں میں جا گر پڑے۔جب آپ کو نکالا گیا تو وجدانی کیفیت میں اور بھی شدت آچکی تھی۔

ایک روایت ہے کہ کسی شخص نے سیال شریف میں حضرت خواجہ محمد شمس الدین کی خدمت میں نذر گزاری اور عشق کے لئے عرض کیا۔آپ نے فرمایا: ''نذرانہ اٹھالو اور چاچڑ شریف چلے

جاؤ۔ عشق ہم نے وہاں بھیج دیا ہوا ہے"۔

حضرت غریب نواز خواجۂ خواجگان محمد شمس الدین کا زمانہ تھا۔ عرس مبارک کے موقع پر سیال شریف میں ایک فقیر آ گئے جو پاؤں سے برہنہ، بکھرے ہوئے بال اور لمبا پیرہن زیب تن کئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی مستی میں ایک سوال کر دیا۔ اس وقت شمس العارفین کی خدمت میں درویشوں کے علاوہ پیر سید حیدر شاہ صاحب جلالپوریؒ، حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ حضرت پیر محمد عبدالعزیز صاحب چاچڑویؒ اور مولوی صاحب مرولہ شریف بھی حاضر تھے۔ حضرت شمس العارفین نے ابھی اس مجذوب کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ قبلہ قلندر کریم (چاچڑ دی) نے برجستہ کہا: جس کا جواب بیٹا دے سکے، اس کے متعلق باپ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ وہ فقیر بے ساختہ آہ و بکا کرنے لگا اور دربار سے باہر نکل کر جہاں گوشت کے مٹکے لگائے گئے تھے، اس آگ کی چر میں ننگے پاؤں چلنا شروع کر دیا۔ حضرت غریب نواز شمس العارفین مع احباب باہر تشریف لائے اور یہ منظر دیکھنے لگے۔ ان کے پیرہن پر خون کے چھینٹے پڑتے اور فقیر بار بار کہتے کہ یہ اس کا خون ہے، جس نے مجھے قتل کیا۔ ذرا دیر بعد وہ فقیر حضرت شمس العارفین سے مخاطب ہوئے اور حضور قلندر کریمؒ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ یہ بیٹا مجھے دے دو۔ اس پر پیر سیال، جلال میں آ گئے اور فرمایا: آپ کے سید اور مہمان ہونے کی وجہ سے ہم نے آپ کا بہت لحاظ کیا ہے، لیکن آپ حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ وہ آگ سے نکل کر سیال شریف سے چلے گئے۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ ان بزرگ کا نام احمد شاہ قندھاری تھا، جو گندم یا گندم کی بنی ہوئی کوئی چیز نہ کھاتے۔

حضرت قلندر کریمؒ نے زندگی کے آخری چھ سال (۱۹۳۲۔۱۹۳۸ء) میں نان ونفقہ سے بڑی حد تک احتراز کیا۔ آپ نے بھی عموماً اس دوران گندم یا گندم سے بنی ہوئی کوئی چیز تناول نہ فرمائی۔ حتیٰ کہ آخری دس ایام میں خوراک بالکل کم پڑ گئی اور گھٹتے گھٹتے لقمے سے بھی کم رہ گئی۔ اس مدت میں علاج کی خاطر آنے والے ڈاکٹر اور حکیموں کو آپ کی نبض نہیں ملتی تھی اور وہ حیران ہوتے کہ اللہ کا یہ بندہ زندہ کیسے ہے۔

آپ کا فقر بڑا انوکھا تھا۔ لٹو چلتا دیکھتے تو "ہو ہو" کی گونج دار آواز میں گم ہو جاتے۔ آپ کو جوگ سے بے حد شغف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وقت آخر آپ نے گدڑی پہنی۔ چونکہ آپ منزل کے بجائے سفر پسند کرتے اور سکون پر اضطراب کو ترجیح دیتے تھے، اس لئے جوگیوں کا روپ اور

متوکلانہ گشت آپ کو نہایت بھاتا تھا۔ سو بعض اوقات جوگی لباس پہن لیتے۔ نیز چمٹا، کشتہ ،کھڑاؤں، بیراگن، ناد اور کشکول کو عزیز رکھتے۔

ماضی میں ایک موقع ایسا بھی آیا، جب پیر مہر علی شاہ صاحب کا لاہور میں مرزا قادیانی سے مناظرہ طے پایا تھا۔ قبلہ گولڑوی اس میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کی نمائندگی فرما رہے تھے۔ پھر مباہلے کی بات چلی جس پر آپ نے مزید خوشی کا اظہار کیا۔ حضرت قلندر کریمؒ اس تقریب میں اپنے ہم مشربوں کے ہمراہ موجود رہے۔ قادیانی کذاب تیرہ بختی کے سبب سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا، ورنہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کی نگاہ کیمیا اثر سے اس کے دل کی دنیا بدل جاتی۔

"حیات عزیز" میں چشم کرم سے قلوب خلائق ہمیشہ مخزن انوار بنتے رہے۔ ایک گمنام نوجوان جسے لوگ مرید حسین کے نام سے جانتے ہیں، غازی و شہید کے بلند رتبے پر فائز ہو کر دائمی شہرت کا معیار قائم کر گیا۔ دربار رسالت مآب ﷺ میں اسے قدوم میمنت لزوم کے قریب جگہ ملی۔ ایسا مقام کہ کونین کی دولت لٹا دینے سے بھی شاید ہاتھ نہ آئے۔ غازی مرید حسین شہیدؒ ناموس رسالت ﷺ پر صدق دل سے فدا ہو گئے۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ دیوانہ گر اپنے دیوانے کی جدائی میں جل اٹھا۔ یہ دیوانہ بھی کتنا خوش نصیب تھا، جس نے دیوانہ گر کو اپنا دیوانہ بنا ڈالا۔ آخر یہ نادرِ روزگار ہستی جسے اہل نظر قلندر کریمؒ اور اہل دل حضرت خواجہ محمد عبدالعزیز صاحب چاچڑویؒ کے حوالے سے جانتے ہیں ۷ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۸ء کو واصل بحق ہوئی۔



غازی مرید حسین شہیدؒ نے اپنے خاص احباب پر مشتمل ایک انجمن تشکیل دے رکھی تھی۔ اس کا رکن بننے کے لئے یہ حلف اٹھانا پڑتا کہ میں وقت آنے پر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہوں گا۔ وفاداری، شرط اول تھی اور یہی شرط باضابطہ رکنیت کی سند قرار پائی۔ اس وقت لوگ عام طور پر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سر پھرے نوجوانوں کا گروہ سمجھتے تھے۔ المختصر انجمن کے مقاصد اور غرض و غایت کی فہرست درج ذیل ہے:

o...... ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ اور عشق رسول ﷺ کا درس۔

o...... آریہ سماجیوں کی یاوہ گوئیوں کا منہ توڑ جواب۔

o...... مقامی مسلمانوں کی معاشی حالت کو سدھارنا۔

o...... اپنی قوم کے نوجوانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنا۔

o...... ہراس تنظیم سے تعاون وحمایت کرنا جو مسلمانوں کی بھلائی چاہے۔

مرید حسین ایک جدت پسند اور صاحب فکر نوجوان تھے۔ انہوں نے پنجابی سے ملتی جلتی ایک زبان ایجاد کی اور حسب ضرورت ایک ذخیرۂ الفاظ ترتیب دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ نے چند دوستوں کو بھی اس زبان کے اصول وقواعد سمجھائے اور جب وہ آپ کے پاس آتے تو اسی میں گفتگو ہوتی۔ دیگر لوگ کچھ نہ سمجھ پاتے۔ آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زبان دو طرح سے لکھی جاتی تھی۔ ایک پنجابی رسم الخط میں مگر عکسی طرز پر یعنی حروف الٹی طرف سے لکھتے اور دوسرا طریقہ الفاظ کو خفیہ بنانے کا تھا۔ ایک جگہ آپ نے اس حصۂ زبان کا نام، انگریزی میں "SAD-HANG-GADNU-AP-AGE" لکھا ہے۔

مولانا قاضی مظہر حسین صاحب (چکوال) کے قریبی حلقے نے اس امر کا دعویٰ کیا ہے کہ مولانا موصوف کے برادر حقیقی قاضی منظور حسین نے خاکسار کی طرز پر ''خدام اسلام'' کے نام سے ایک مقامی تنظیم قائم کر رکھی تھی اور غازی مرید حسین شہیدؒ اس کے باقاعدہ رکن تھے، حالانکہ یہ محض غلط فہمی ہے۔ تاہم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ قاضی منظور حسین، شہید رسالت ﷺ غازی مرید حسینؒ کے جہاد عمل سے متاثر تھے۔

غازی مرید حسین شہیدؒ کی کوشش ہوتی کہ ملکی حالات سے باخبر رہیں۔ آریہ سماجیوں کی خبریں اور ان کی سرگرمیوں پر مبنی رپورٹیں تو وہ غور سے پڑھا کرتے۔ ۱۹۳۶ء کی بات ہے ایک روز آپ نے ''زمیندار'' اخبار میں ''پلول کا گدھا'' کے عنوان سے ایک المناک خبر پڑھی۔ سرخی کے بعد تفصیل پڑھ کر رگوں میں خون کی بجائے بجلیاں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ خبر میں جو کچھ بتایا گیا تھا، تفصیل اس کی یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک مسلمان احمد خاں نامی چاہتا تھا کہ اس کے پاس خچر ہو۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنی گھوڑی کو پلول ضلع گوڑگانواں کے حیوانات کے ہسپتال میں لایا اور ڈاکٹر سے گدھے کے ملاپ کے لئے بات کی۔ ملعون نے ماتحت ملازم کو بلا کر کہا

''جاؤ اور...... کو لا کر گھوڑی سے ملاپ کرا دو''

احمد خاں نے استفسار کیا کہ یہ...... کون ہے؟

اس پر بے غیرت ملیچھ یعنی حرامزادے ڈاکٹر نے بتایا:

''ہسپتال میں شناخت کے لئے ہر ایک جانور کا نام رکھا جاتا ہے۔

اسی نام کے تحت اس کے کاغذات مرتب ہوتے اور ان کاغذات کو دیکھ
کر جانوروں کو خوراک مہیا کی جاتی ہے۔ اس اصول کے تحت ایک
گدھے کا نام...... ہے۔''

احمد خاں غم و غصے میں تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی دلچسپی سے علاقہ کے سرکردہ مسلمانوں کی ایک جماعت متعلقہ ڈپٹی کمشنر حسن اختر سے ملی اور ان کو اس ناپاک جسارت کی اطلاع دی۔ چند روز بعد ڈپٹی کمشنر نے شفاخانہ حیوانات پر چھاپہ مارا اور ریکارڈ کا معائنہ کیا تو اس قسم کی خباثتیں واقعی موجود تھیں۔

اس خبر کے ساتھ ہی اخبارات میں احتجاجی بیانات کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ یہ طرز گستاخی اس قدر گمراہ کن اور زہر آلود تھی کہ جس نے بھی یہ الفاظ پڑھے گھائل ہو کر رہ گیا۔ اہل ایمان کے کلیجے چھلنی ہو گئے۔ اس پر مستزاد مولانا ظفر علی خاں کا تبصرہ اور الفاظ کا مزاج تھا۔ ان کا قلم ایسے موضوعات پر لہو اگلتا رہا ہے۔ فقرات کیا تھے ایک تیز آگ تھی، جس نے ہر مسلمان کو جلا کر رکھ دیا۔

ایک منجھے ہوئے صحافی کی طرح آپ نے اس ذلیل حرکت پر خوب نقد و نظر کی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی ایسی دیگر جسارتیں گنوائیں۔ نیز انہیں ناموس رسالت ﷺ پر مر مٹنے والوں کی عزت و سربلندی کا نظارہ کروایا۔ انہوں نے ہندوؤں پر واضح کیا کہ نبی آخر الزمان ﷺ کی سیرت پر حرف گیری کا سلسلہ شروع کر کے ان کے عشرت کدوں میں کب تک قہقہے گونجتے رہیں گے۔ اگر شاتمان نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ وقت دور نہیں جب شمع رسالت ﷺ کے پروانے حسب سابق اپنی وفاؤں کے چراغ روشن کریں گے۔ دشمنان رسول ﷺ کو یہ بھی یاد دلایا گیا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کی توہین پہلے کبھی برداشت کی ہے اور نہ ہی آئندہ کسی وقت کریں گے۔

غازی مرید حسین شہیدؒ نے اپنے چند قریبی و راز دار دوستوں کا ایک اہم اجلاس بلایا اور خبر سے متعلق تمام صورتحال ان کے گوش گزار کی۔ معاملے کی نوعیت سے کما حقہ آگاہی کے بعد جھامرے کے ایک غریب نوجوان محمد عارف نے جو پیشہ کے اعتبار سے جولاہا تھا، اپنا نام پیش کیا۔ چودھری خیر مہدی صاحب کے بقول: ان کی رہائش جھامرہ نہیں چکوال میں تھی۔ انہوں نے بحوالہ تعارف یہ کہہ کر مزید شک میں ڈال دیا کہ اس کا نام عارف یا صدیق تھا۔ مگر ایک جگہ اس بارے میں بالوضاحت مرقوم ہے:

شہر چکوال سے ملحقہ قصبے ''جبیر پور'' کے محمد یوسف کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے شاتم

رسول ﷺ کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی تھی۔ (اس نوجوان نے بعد میں فوج میں ملازمت کر کے پنشن لی اور ۱۹۸۵ء میں چکوال میں وفات پائی) محمد یوسف نے دل میں عہد کر لیا کہ میں اس ملعون کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور گھر سے عازم دہلی ہوا۔

ایک جواں سال مزدور اس نیت سے رخت سفر باندھ رہا ہے کہ دور دراز کے علاقے میں اپنا سویا مقدر جگانے چلے۔ تاریخ کے صفحہ پر میں نے یہ سطر بھی پڑھی ہے، جو منصورؒ کے لہو سے تحریر ہوئی۔ لکھا تھا کہ جو سر دار نہ ہو وہ سر دار نہیں ہوتا۔ مجاہدوں کی یہ ٹولی فلسفۂ زندگی سے آگاہ تھی۔ اس لئے عزت رسول ﷺ کا پاسبان ہتھیلی پر اپنا سر سجائے شہید کربلا کے نقش قدم کو چومتا ہوا سوئے مقتل روانہ ہوا۔ سفر خرچ جو ستر روپے کے قریب تھا غازی مرید حسین شہیدؒ نے اپنی گرہ سے ادا کیا۔ یہ مسافر اپنی آنکھوں میں امیدوں کے دیپ جلائے بڑے ولولے اور جوش سے منزل شوق کی جانب رواں دواں تھا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ علامت باطل مٹانے جا رہا ہے مگر یہ خدمت تو خدائے قدوس نے کسی اور کے سپرد کر رکھی تھی۔ اس کے مقدر میں صرف سفر لکھا تھا۔ منزل کسی اور کے حصے میں آئی۔

تلاش شکار میں نکلنے والے شخص نے گوڑ گانواں پہنچ کر کسی راہ گیر سے ''پلول'' کا راستہ دریافت کیا۔ چہرے پر سفر کی تھکاوٹ کے آثار ہویدا تھے، اور کچھ مردود کے بارے میں شدید غصے کی علامتیں۔ راستہ بتانے والا ہندو تھا۔ اس نے مشکوک حالت میں دیکھ کر بھانپ لیا کہ یہ آدمی کچھ نہ کچھ کرنے جا رہا ہے۔ اسے وٹرنری ڈاکٹر کے فعل کا علم تھا اور مسلمانوں کے متوقع ردعمل کی خبر بھی۔ اس نے بہ عجلت ڈیوٹی پر متعین پولیس مین کو رپورٹ کر دی۔ پولیس اسے گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ تلاشی کے وقت خنجر برآمد ہوا۔ تفتیش کے دوران پولیس انسپکٹر نے سوال کیا کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کس کے پاس جانا ہے؟ اور یہ تیز دھار خنجر کیوں اپنے پاس رکھا ہوا ہے؟ منزل سے دور رہ جانے والے مسافر نے جواب میں کفِ افسوس ملتے ہوئے جواب دیا:

> شاتم رسول ﷺ کے ناپاک لہو سے خنجر کی پیاس بجھانے آیا تھا۔ قسمت نے بے وفائی کی ہے کہ اس سے پہلے ہی دھر لیا گیا۔ کاش میں اس ذلیل کمینے ڈاکٹر تک پہنچ جاتا! مگر چھوڑنے والے ہم بھی نہیں۔ میں ناکام رہا ہوں تو عنقریب میرا کوئی دوست اس کی غلیظ زبان کاٹ کر رکھ دے

گا۔

میرے ریکارڈ میں ہفت روزہ ''نیر اسلام'' لاہور (۱۶۔ ستمبر ۱۹۳۶ء) کے ایک پرچہ کی فوٹو کاپی محفوظ پڑی ہے، جس میں دہلی سے ۷۔ ستمبر کی ایک اطلاع کے مطابق سردار سنت سنگھ کی عدالت سے آج چکوال ضلع جہلم کے ایک (بیس) سالہ مسلم نوجوان کہ جس کا نام محمد یوسف ہے اور جو پلول کے شفاخانہ حیوانات کے ڈاکٹر کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، اپنے قبضہ میں بلا لائسنس اسلحہ رکھنے کے جرم میں اسے زیر دفعہ ۱۹ (الف) قانونِ اسلحہ کے تحت چار ماہ قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا گیا ہے۔ اس پیکر غیرت نے عدالت میں اپنا حسب ذیل بیان دیا تھا:

> ''میں نے 'زمیندار' اور 'انقلاب' میں پلول کے ڈاکٹر کی گستاخی تفصیل سے پڑھی...... میرے جذبات اس قدر مشتعل ہو چکے تھے کہ میں ایک دن پلول روانہ ہو گیا اور میں نے قصد کر لیا کہ خواہ مجھے قید کر دیا جائے یا پھانسی چڑھا دیا جائے میں ضرور گستاخ ڈاکٹر کو کیفر کردار تک پہنچا کر رہوں گا اور اسے موت کے گھاٹ اتارے بغیر کسی طرح بھی چین سے نہیں بیٹھوں گا''۔

غازی محمد یوسف نے حال ہی میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا اور اب وہ غیرت و وفا کے امتحان میں سرخرو ہونا چاہتا تھا، مگر شاید ڈاکٹر مذکور کا تبادلہ ہو جانے کے سبب اسے دہلی لوٹ آنا پڑا اور پھر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ مجاہد جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ غصے کے سبب اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اس واقعے کی اطلاع اخبارات تک پہنچی۔ ڈاکٹر مردود اور اس کے رشتہ داروں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ہر لمحے اسے موت کا سایہ اپنی طرف لپکتا ہوا دکھائی دیتا۔ وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ ''اگر ہزاروں میل کی مسافتیں پھلانگ کر اس نیت سے کوئی مسلمان یہاں تک پہنچ سکتا ہے تو میں مقامی مسلمانوں سے کس طرح محفوظ رہ سکوں گا؟'' پلول اور اردگرد کے دیہات میں تمام مذاہب کے پیروکاروں کی قریباً یکساں آبادی تھی۔

ڈاکٹر مردود، سر چھوٹو رام کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اس نے خطرۂ موت کے پیش نظر سیاسی اثر کی وجہ سے اپنا تبادلہ جلد ہی ''پلول'' سے ''نانوند'' میں کروا لیا۔ یہ ضلع حصار میں واقع ہے۔ تبدیلی کے احکامات پر عمل درآمد ہو گیا، مگر یہ تمام کارروائی اس قدر صیغۂ راز میں رکھی گئی کہ محکمے کے بعض اہم افراد سے بھی خفیہ تھی۔ تعیناتی کا نیا مقام بہت ہی کم لوگوں کو معلوم تھا۔

ڈاکٹر رام گوپال ایک انتہا پسند اور کمینہ فطرت ہندو تھا۔ سوامی شردھانند، راجپال اور نھتو رام سندھی کو وہ اپنا قومی ہیرو خیال کرتا۔ اس لئے انہی کا راستہ منتخب کیا اور چلتے چلتے اپنے پیش روؤں کی طرح جہنم رسید ہو گیا۔ ناز و نوند میں پہنچ کر وہ مطمئن تھا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں اور مجھ تک کوئی نہیں پہنچ پائے گا۔ اس خود فریبی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس گاؤں میں مسلمانوں کے صرف دو گھر تھے اور وہ بھی نہایت غریب۔ بنا بریں اسے تسلی تھی کہ اب کفن بردوش رضاکاروں کو میری جائے تقرر کا کسی طرح علم نہیں ہو سکے گا۔

غازی مرید حسین شہیدؒ اپنے ساتھی کو بغرض جہاد روانہ کر چکنے کے بعد گستاخ مصطفیٰ ﷺ کے قتل کی خبر کے منتظر تھے۔ ان کا اضطراب روز بروز بڑھتا گیا۔ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ سینے میں ایک خلش سی بیدار رہتی۔ مختلف وسوسے پیدا ہوتے۔ کئی خیالات جنم لیتے۔ بالآخر انہیں یہ منحوس اطلاع ملی کہ نبی کریم ﷺ کے گستاخ کا وجود ابھی تک سینۂ خاک پر بوجھ ہے اور ان کا مجاہد دوست پولیس کی حراست میں ہے۔

اس موقع پر آپ کے دل میں خیال آیا کہ خدمت محبوب ویسے بھی غیر کے ہاتھوں سے جائز نہیں۔ اگر اجازت ہوتی تو اس رعایت سے بادشاہوں کی جگہ ان کے ملازم نمازیں ادا کیا کرتے۔ احساس ندامت میں ان کی پلکیں شبنم سے سلگ اٹھیں۔ خانہ دل دولت درد سے بھر گیا۔

اس کیفیت سے آپ کی کیا حالت ہوئی اور جذبات پر کیا گزری؟ اس کے بیان سے قلم قاصر اور قوتِ اظہار عاجز ہے۔ اب ان کی نگاہ بلندیوں پر لگی تھی۔ غیرت و خودداری کے جذبے نے تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ جذبہ جو انہیں نہ صرف تاریخ میں ایک مخصوص مقام دے گیا بلکہ اس سے مسلمانانِ ہند کو جداگانہ جغرافیے کا شعور بھی حاصل ہوا۔ یہ بے قراری اللہ کرے کہ پوری ملت اسلامیہ میں بٹ جائے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ان کا رونا پوری قوم کو رلا دے!

دشمن اسلام نے مسلمانوں کو عشق رسول ﷺ کی متاع بے بہا سے محروم کر دینا چاہا۔ وہ جانتا تھا، کہ یہ دولت لٹ جائے تو ایمان متزلزل اور دنیا ویران ہو جاتی ہے۔ اگر مدھ بھرے نینوں سے عہد وفا نبھانے کا احساس مٹ جائے تو گویا مومن کا تمام اثاثہ ہی چھن کر رہ گیا۔

نیند میں بخت جاگا

اب غازی صاحب کو دو مسئلے درپیش تھے۔ ایک تو انہیں اپنے مجاہد ساتھی کی ضمانت کروانی تھی۔ سو جملہ اخراجات آپ نے برداشت کئے اور قانونی چارہ جوئی کا کام ان کے لواحقین کو سونپ،

دیا۔ دوسرا نہایت اہم معاملہ بدزبان ہندو سے گستاخیٔ رسول کا بدلہ لینا تھا۔ اس مقدس مشن کی تکمیل کا مرحلہ آپ نے بذات خود طے کرنے کا تہیہ کیا۔ یہ ارادہ باندھے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ ایک رات آپ استراحت فرمارہے تھے کہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ادھر ادھر بغور دیکھا۔ فضاؤں میں خوشبو رچ بس گئی تھی۔ جانے دل کے کانوں سے آپ نے کیا آواز سنی کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کرنیں فروزاں ہوگئیں۔ شاید چشم تصور جلوۂ جاناں دیکھ آئی اور امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ ساری رات آپ کی آنکھ نہ لگی۔ وقت تھا جو کٹنے کا نام نہ لیتا۔ یہ شب فراق تھی نہ ساعت وصال۔ آپ کے قلب ونظر میں ٹھن گئی۔ دل کو آنکھ سے چشمک کہ اسے لذت دیدار حاصل ہوئی۔ آنکھوں کو یہ اضطراب کہ دل سے یادوں کے سلسلے وابستہ ہیں۔

رات جیسے بھی کٹی کٹ گئی۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ آپ کے ہاتھ میں قلم تھا اور اپنی لال رنگ کی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہے تھے۔ بالآخر یہ کاپی اپنے سرہانے رکھی اور مطمئن ہو کر لیٹ رہے۔ غازی مرید حسین شہیدؒ نے اپنا دل آغاز سے ہی شیشے کی مانند صاف رکھا ہوا تھا۔ اس تک کسی بھی ''بت'' کی رسائی نہ ہوسکی۔ ان کی لوح قلب پر فقط ایک نام مرتسم تھا۔ شہید موصوف کے حسب حال قمر الملت خواجہ سیالویؒ نے بہت خوب کہا ہے: اگر ڈاکٹر معائنہ کرتے اور آپ کے دل کو چیرا جاتا تو اس پر بالیقیں ''محمد ﷺ'' ہی لکھا ہوتا۔

''محمد ﷺ ہی لکھا ہوگا اگر مسلم کا دل چیریں''

ایک اور رات غازی صاحب نے رفیقہ حیات کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ شاتم رسول کا کام تمام کردوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بخوشی اس امر کی اجازت دے دیں۔ اور نہ صرف مسکرا کر مجھے خدا حافظ کہیں بلکہ میری کامیابی کے لئے دُعا بھی کریں''۔

آپ کی اہلیہ نے جواب دیا:

> ''میرے سرتاج! خادمہ کی خوشی، آقا کی رضا میں گم ہوتی ہے۔ کوئی بھی مسلمان عورت اس نیک کام سے منع نہیں کرسکتی۔ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کی کنیزوں کا فرض ہے کہ بیویاں ہوں تو اپنے شوہروں کو خدمت اسلامی کے لئے اکسائیں اور بہنیں ہوں تو پیارے بھائیوں کی قربانیاں پیش کیا کریں۔ میں آپ کو سرخرو دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ میرے لئے

سربلندی کا سبب ہوگا۔ اس لئے میں اپنے محبوب خاوند کے راستے میں
روڑے اٹکانے کی جرأت نہیں کرسکتی"۔

غازی صاحب نے اپنا یہ پروگرام کسی اور پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس معاملے میں انہوں نے زبردست احتیاط برتی۔ والدہ محترمہ کو اس وجہ سے نہ بتایا کہ وہ رقیق القلب ہیں۔ نیز اکلوتے بیٹے کا یہ زاویہ نگاہ دیکھ کر کہیں گھبرا نہ جائیں۔ حضرت غازی صاحب نے اہل خانہ کو یہ کہہ کر رخت سفر باندھا کہ وہ بھیرہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے قبلہ پیر صاحب کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوں گے۔ پھر ایک ضروری کام کرنا ہے۔ اس کے بعد واپسی متوقع ہے۔ الغرض آپ جون ۱۹۳۶ء کے آخری ہفتے میں گھر سے روانہ ہوئے۔

چاچڑ شریف کے سجادہ نشین صاحبزادہ محمد یعقوب صاحب بتاتے ہیں کہ غازی مرید حسین کی پہلی منزل چاچڑ شریف تھی۔ آپ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، ایک راز ہے، جو کسی کو معلوم نہیں۔ تاہم اتنا جانتے ہیں کوئی انتہائی اہم اور خاص بات تھی کہ جب آپ حضرت خواجہ سے مل کر باہر نکلے تو آنسو پونچھ رہے تھے۔ ہم نے ان سے بہت پوچھا لیکن انہوں نے کچھ نہ بتایا اور یہاں سے تشریف لے گئے۔ مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ غازی صاحب کے چلے جانے کے بعد قبلہ پیر صاحب بارہا اپنے مرید صادق کی کامیابی کے لئے دعا فرماتے۔ بعض اوقات تو پرنم بھی ہو جاتے تھے۔ ہم حیران ہوتے تھے کہ یہ بھی کیا معاملہ ہوا کہ مرید اپنے پیر کو دیوانہ بنا گیا ہے۔ اس وقت تو ہم کچھ نہ سمجھ سکے تھے۔ مگر چند روز بعد یہ بھید کھل گیا کہ جب مرید حسین الوداع ہوئے تو قبلہ پیر صاحب ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر انہیں اس وقت تک کیوں دیکھتے رہے جب تک کہ آپ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ یہاں تک تو غازی مرید حسین شہیدؒ کی آپ بیتی، حالات و واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے اور بحوالہ روایات بیان ہوئی، آگے ان کی کہانی خود ان کی زبانی سنئے:

"یہ سفر شوق انکشاف ذات سے شروع ہوا اور عرفان ذات تک جا پہنچا۔ اس میں چاندنی سی ٹھنڈک ہے اور سورج کی تپش بھی۔ لمحہ لمحہ سوز و ساز سے معمور تھا تو قدم قدم راز و نیاز سے آگاہ! ماہِ طیبہ کی کشش سے دل کے سمندر میں جوار بھاٹا کی اضطراری کیفیت کا پیدا ہو جانا یقینی ہوتا ہے۔ اس کا نام ایمان ہے اور حاصل ایمان بھی اسے ہی کہتے ہیں۔

میں یہ تہیہ کر چکا تھا کہ پیغمبر خدا علیہ کے گستاخ کو جہنم رسید کر کے واضح کر دوں گا کہ گو ہم میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی سی تڑپ موجود نہیں، تاہم اس قدر بے غیرت بھی نہیں ہیں کہ رسول اکرمؐ کی ذات اقدس پر پاجیانہ اور ناروا حملے کرنے والوں کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں۔ اس عزم کے ساتھ میں حضرت قبلہ پیر صاحب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔ آپ خلاف معمول اٹھ کر ملے، معانقہ کیا اور ماتھے کو چومتے ہوئے فرمایا: بیٹا میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تین دن سے آپ نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے۔ مبارک ہو، بارگاہ رسالت مآب علیہ میں آپ کو ایک نمایاں اعزاز کا مستحق ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قلندر کریمؒ کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وارفتگی میں مجھے دوبارہ اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ بڑی دیر تک تخلیے میں راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں حیران ہوا کہ پورے تین دن سے مجھے بھی ذرا شکیب و قرار نہیں۔ آپ فرما رہے تھے: عزیز، مرید ناز کی ذات میں اس طرح فنا ہو چکا ہے کہ مجھے جو بھی دیکھ لے گا اسے تمہارا دیدار ہو جائے گا۔ جاؤ! منزل تمہارے لئے مضطرب ہے اور آستانے تمہاری جبیں کو ترس رہے ہیں۔

مرد قلندر نے موت کے آئینے میں رخ دوست دکھا کر یہ زندگی میرے لئے اور بھی دشوار کر دی۔ جی چاہا ایسی زندگی پاؤں، جسے موت نہ آئے، میرا ہر قدم خود آگہی سے خدا آگہی کی سمت اٹھ رہا تھا۔ تمام راز فاش ہو گئے۔ آنکھیں بند کرتا تو تصورات میں اجالا پھیل جاتا اور نگاہیں وا ہوتیں تو منزل صاف دکھائی دینے لگتی۔ گویا میری نظروں کے سامنے سے تمام حجاب اٹھ گئے ہیں۔ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا۔

اب میں جلد از جلد شاتم رسول کے ٹھکانے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ چونکہ بھیرہ میں تلوار بننے کو دے رکھی تھی، اس لئے وہاں سے قبل ازیں ہی ہو آیا۔ اسی دوران مختلف مقامات سے اہل خانہ کو خطوط بھی لکھتا رہا۔ آج یہاں ہوتا تھا تو کل وہاں۔ کئی جگہوں کے چکر کاٹے۔ سوچتا تھا خدا کی

زمین کتنی وسیع ہے۔ پہلے اپنے دوست شیر محمد نائیک سے راولپنڈی میں ملا، ازاں بعد چلتے چلتے آزاد قبائل میں حاجی فضل احمد صاحب المعروف حاجی ترنگزئی کے پاس چلا گیا۔ میں نے خود کو جسمانی طور پر مضبوط بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اچھی خوراک کھاتا اور ورزش بھی کرتا۔ چند روز وہاں ٹھہرا رہا۔ میں نے اس کام میں سرخروئی کے لئے پلان کو ضروری خیال کیا۔ اندیشہ تھا منصوبہ بندی کے بغیر کہیں ناکام نہ ہو جاؤں۔ منصوبے کا پہلا مرحلہ ختم ہوا تو آزاد قبائل کے علاقہ سے چل پڑا۔

راستے میں پولیس والوں نے مجھے شک کی بنیاد پر گرفتار کر لیا۔ زبردست پوچھ گچھ کی، مگر کچھ نہ اگلوا سکے۔ بھلا میں اپنا عزم کیونکر بتاتا۔ غلام حسین نامی ایک پولیس افسر (جو ''ادھڑ وال'' چکوال سے تلہ گنگ روڈ پر واقع معروف قصبے کے رہنے والے تھے) کو خفیہ تصدیق کی غرض سے ہمارے گاؤں بھیجا گیا۔ ان دنوں غلام حسین صاحب کا ایک بھائی اس جگہ بطور پٹواری متعین تھا۔ جب میرے سابقہ کردار سے تشکیک کا کوئی پہلو نظر نہ آیا تو انہیں مجھے مجبوراً باعزت طور پر چھوڑ دینا پڑا۔ تین چار دن کی دلچسپ قید سے رہائی کے بعد راولپنڈی آ پہنچا اور کچھ وقت ایک تعلق دار کے پاس ٹھہرا رہا۔

یہاں سے قدم اٹھے تو کوئٹہ کی راہ لی۔ جانے کیوں پولیس ہر جگہ میرا پیچھا کئے جا رہی تھی۔ مجھے ایک پولیس چوکی لے جایا گیا مگر انہیں کوئی وجہ گرفتاری نہیں مل سکی۔ کوئٹہ سے بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر لاہور آنا پڑا۔ اسلامیہ کالج کے ہاسٹل میں اپنے قریبی دوستوں محمد فیروز، شیخ رشید اور شیخ سخاوت کے کمروں میں قیام کیا۔ یہاں حضرت داتا گنج بخشؒ کے حضور حاضری دی۔ ایک روز اپنے ہم مسلک وہم نظر غازی علم الدین شہید کے مقبرے پر میانی صاحب بھی جا پہنچا۔ شہید عشق رسول کی آرام گاہ پر حاضر ہوا۔ دل کی دنیا میں ایک قیامت بپا تھی۔ یہاں میری کیا کیفیت ہوئی اور کتنی حقیقتیں منکشف ہوئیں، میں بیان نہیں کروں گا۔ مجھے

محسوس ہوا کہ ہمارے درمیان سے پردۂ لحد اٹھ گیا ہے اور ہم دونوں گلے مل رہے ہیں۔ میں نے اپنی کامیابی کی خاطر دعا کے لئے عرض کیا۔ انہوں نے مجھے مبارکباد دی۔

یہ سیاحت مکمل کر چکنے کے بعد احساس ہوا کہ میں تلوار ہمراہ رکھ کر شاید اس مردود تک نہ پہنچ پاؤں، تو تلوار کو اپنے اسی دوست کے سپرد کر کے کہا کہ کبھی میرے گھر پہنچا دینا اور خود دہلی کا رخ کیا۔ وہاں چند لوگوں سے جان پہچان تھی۔ بھلہ کے ایک کوچوان، حاجی طوراخان، وہیں مقیم تھے۔ پورا ہفتہ ان کے ہاں اندرون کشمیری گیٹ، چاندنی گنج کے مکان نمبر ۱۶۱۴ میں رہائش اختیار کئے رکھی۔

اس تاریخی شہر میں میرے ایک اور ہم مشرب آسودۂ خاک ہیں۔ سوچا، ان کی خاک قبر چوم آؤں۔ وارفتگی میں قدم اٹھے اور بے خودی کھینچ کر وہاں لے گئی۔ تھوڑی دیر قبرستان میں غازی عبدالرشید شہیدؒ کے حضور کھڑا رہا۔ جوش تھا جو تھمنے میں نہ آتا۔ ان کے مقبرے کی پائنتی کھڑے ہو کر عہد کیا کہ آپ نے خون جگر سے جس باب کا عنوان رقم کیا تھا، میں اس کی تفسیر لکھے بغیر دم نہیں لوں گا۔ شردھانند کا کوئی ہم فکر جہاں بھی نظر آیا، آپ کے جذبے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں رسم وفا نبھاتا رہوں گا۔ سچ ہے، اہل درد کی قربت، شراب کا کام دکھاتی ہے۔ یہ نشہ موت سے گھٹتا نہیں کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس گوشۂ راحت کے آس پاس بھی کچھ یہی معاملہ ہوا''۔

یہ تھی، غازی مرید حسین شہیدؒ کی مختصر کہانی خود ان کی زبانی۔ اس سے بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے کہ شمع رسالت ﷺ کا یہ پروانہ مختلف علاقوں کے فاصلے بلا مقاصد ہی ناپتا رہا۔ لیکن غور کیا جائے تو کسی اور ہی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ ہندو پہلے ہی غازی موصوف سے بہت بیزار تھے۔ ازاں بعد وہ آپ کے اس قدم سے بھڑک اٹھے کہ انہوں نے ڈاکٹر رام گوپال کو قتل کرنے کی غرض سے ایک مجاہد بھیجا۔ انہیں یہ بھی تسلی تھی کہ یہ غیور مجاہد گستاخ رسول کا ناپاک وجود ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔ مقامی ہندوؤں نے اس امر کی اطلاع ڈاکٹر رام گوپال کو

پہنچائی۔اسے یہ خوف لاحق ہوگیا کہ ایک کم سن جانباز میری موت کا پروانہ لئے پھرتا ہے۔لہٰذا اس نے سر چھوٹو رام اور دیگر ہندو افسروں کی وساطت سے یہ انتظام کروایا کہ پولیس کے ذریعے مرید حسین کی خفیہ نگرانی کی جائے۔اب پولیس کے چند نوجوان شبانہ روز ان کی حرکات وسکنات اور سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔جب سرور کائنات علیہ ﷺ کا یہ غلام صادق بغرض جہاد روانہ ہوا تو اجنبی بن کر کئی اشخاص نے ان سے پوچھا: آپ کہاں اور کیوں جارہے ہیں؟ قبلہ غازی صاحب بھی بڑے محتاط تھے۔آپ کو جلد ہی اس گھٹن اور تعاقب کا احساس ہوگیا۔اب ان کے سامنے ایک ہی راہ تھی کہ فی الحال کوئی اور روپ اختیار کیا جائے۔اسی لئے انہیں مختلف علاقوں میں گھومنا پڑا۔ مگر آپ کا پیچھا ایک لمحے کے لئے بھی نہیں چھوڑا گیا۔ایک دوبار گرفتار بھی ہوئے اور کوئی معقول وجہ گرفتاری نہ پاکر چھوڑ دیئے گئے۔

اسلامیہ کالج کے ہاسٹل میں تلوار ایک دوست کے سپرد کی تھی اور بھیس بدل کر پولیس کو چکر دینے میں کامیاب ہوگئے۔اس کے بعد آپ چھپتے چھپاتے دہلی پہنچ گئے۔یہیں سے آپ کی لافانی وابدی حیات کا آغاز ہوا۔اب انہیں ثبوتِ وفا دینا تھا۔مدت سے ان کے دل میں ایک کسک اور چبھن تھی۔اس خلش کے مٹ جانے کا وقت بالکل قریب آرہا تھا۔آپ اقبالؒ کی ہمنوائی میں اس حقیقت کا انکشاف کرنے والے تھے کہ مومن قاری نہیں،قرآن ہے۔انہیں ''پلول'' پہنچ کر پتہ چلا کہ ڈاکٹر مذکور یہاں سے ٹرانسفر ہوکر کسی نامعلوم جگہ جاچکا ہے۔آپ کو بے حد پریشانی ہوئی۔فدا کار رسالت اب اس ٹوہ میں لگ گیا کہ کسی طرح کم بخت کا سراغ ملے۔آپ کو اس سلسلے میں کیوں اور کیسے کامیابی حاصل ہوئی،اس بارے میں عموماً تین روایتیں بیان ہوتی ہیں۔جن سے صورتحال کا کھوج ملتا ہے۔

قیاس ہے حضرت غازی صاحب نے متعلقہ محکمے کے کسی آدمی کو اعتماد میں لے کر اپنے شکار کا نیا ٹھکانہ معلوم کرلیا۔دوسری روایت کے مطابق آپ ایک دن حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے مقبرہ اقدس پر یہ حسرت لئے حاضر ہوئے۔ایک سفید پوش اور نورانی صورت بزرگ نے فرمایا: ''بیٹا! ضلع حصار کے گاؤں نارنوند چلے جاؤ،تمہاری مرادیں برآئیں گی''۔تیسری روایت جو اچھوتی ہے اور دلچسپ بھی،جس سے ایمان کو حرارت ملتی ہے اور دل کو تڑپ۔بیان ہے کہ آپ نے تلاش میں ناکام ہوکر مدینہ منورہ کی طرف رخ کیا اور کرب سے چیخیں نکل گئیں۔آنسوؤں کے الفاظ میں اپنے آقا مولا علیہ ﷺ کے حضور استغاثہ کیا۔اس رات نبی کریم علیہ ﷺ کی زیارت نصیب

ہوئی، اور دہن دراز ڈاکٹر کے موجودہ ٹھکانے کی نشاندہی فرمادی گئی۔

مندرجہ بالا روایات پر غور کرنے سے اول الذکر قیاس معتبر نہیں ٹھہرتا ہے، اس لئے کہ مبینہ روداد میں ہم حضرت قبلہ غازی صاحب کی احتیاط و راز داری کا منظر دیکھ چکے ہیں۔ ثانی البیان میں بلاشبہ صداقت کے پہلو موجود ہیں۔ تاہم اگر مجاہد ملت کا بلند مرتبہ و عشق رسول ﷺ پیش نگاہ رہے تو آخر الذکر روایت نہ صرف مبنی بر حقیقت معلوم ہوتی ہے، بلکہ دل کی دھڑکنیں بھی اس پر گواہ ہیں۔ پیارے نبی ﷺ کے حضور سے بشارت ملنا۔ اس امر کی دلیل ٹھہری کہ منزل تک پہنچنے میں بس بالشت بھر فاصلہ باقی ہے۔



رام گوپال موت کے گھاٹ اترتا ہے

ملت اسلامیہ کے شاہین نے شکار۔ پر جھپٹنے کے لئے پر تولے اور ۶۔ اگست ۱۹۳۶ء کو دہلی سے ٹرین پر سوار ہوئے اور ہانسی اسٹیشن پر اترے۔ انہیں صرف تین چار میل آگے جانا تھا۔ آپ نہر کی پٹڑی پر پیدل چل پڑے۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ افق سے سرخی مائل رنگت آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔

سنا ہے اجالوں کی سمت سفر کرنے والوں کی اندھیرے بھی قدر کرتے ہیں۔ غازی صاحب نے یہ رات باہر درختوں کے ایک جھنڈ میں گزاری۔ علی الصبح گاؤں میں داخل ہوئے۔ اس جگہ مسلمانوں کے فقط دو گھر تھے۔ یہاں مسجد بھی نہیں تھی۔ کسی طرح معلوم کر کے ایک مسلمان جو پیشے کے لحاظ سے تیلی تھا کے گھر چلے گئے۔ میزبان نے انہیں مسافر سمجھ کر خوب آؤ بھگت کی۔ باتوں باتوں میں آپ نے گاؤں کے حالات اور دیگر ضروری معلومات حاصل کیں۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد آرام کیا۔ دیر گئے بیدار ہوئے۔ غسل سے فارغ ہو کر نیا لباس پہنا۔ ناشتے سے تھوڑی دیر بعد چہل قدمی کا بہانہ کیا اور کہا: ''میں ابھی آتا ہوں'' اور باہر نکل گئے۔ آپ ایک بار پھر دہلی میں تھے۔

ظہر کی نماز کے بعد آپ نے جامع مسجد کے باہر سے تین روپے میں ایک چاقو خریدا تھا، اس کا دستہ پیتل کا تھا اور پھر سان سے خوب تیز کرایا۔ چار بجے شام دہلی سے حصار جانے والی بس میں سوار ہوئے۔ طورا خاں کے چھوٹے بیٹے غلام محمد کی ہاکی بھی ساتھ لیتے گئے۔

۸۔ اگست ۱۹۳۶ء کو آپ اس انداز سے ہسپتال کے قریب پہنچے کہ کوئی شک نہ کر سکے۔ اپنی

چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر ایک محفوظ جگہ کھڑے ہو گئے اور آنے جانے والوں کو بغور دیکھا گیا۔ آپ کی احتیاط اور جگہ کے انتخاب کی خوبی تھی کہ ان میں سے آپ کو کوئی شخص بھی نہ دیکھ سکا۔ بالآخر ایک ہٹے کٹے آدمی پر آپ کی نظریں ٹک گئیں۔ یہ وہی بدنام زمانہ، گستاخ ڈاکٹر تھا جس نے نبی پاک ﷺ کے اسم پاک کی توہین کی تھی۔

معلوم ہوا کہ ایک بار مرید عزیزؒ نے آدھی رات کو اٹھ کر کاغذ کے پرزے پر اسی بدقسمت کا حلیہ درج کیا تھا۔ اسی شب آپ آقائے مدنی ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ رسول عربی ﷺ نے ہی اپنے ہندی دیوانے کو اس کا ناک نقشہ لکھوایا۔ یہ بھی انہی کی نظر کرم کا اعجاز تھا کہ مرید حسین غازی کے روپ میں اس ملعون کا پیٹ چاک کرنے کی نیت سے یہاں آموجود ہوئے۔

شہباز عشق نے اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے دشمن کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اس ناپاک کو دیکھنا تھا کہ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جی میں آیا کہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر اسے موت سے دو چار کر دیں، مگر آپ جوش میں آکر ہوش نہیں کھونا چاہتے تھے۔ کون برداشت کر سکتا ہے کہ اتنے عرصے کی محنت اکارت چلی جائے۔ انہیں کامل یقین ہو گیا کہ یہ وہی ڈاکٹر ہے جسے وہ اتنی مدت سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ پوری تسلی اور پختہ اطمینان کے بعد آپ دوبارہ میزبان کے ہاں آ گئے۔ خداوند قدوس کے حضور رو رو کر اپنی کامیابی و کامرانی کے لئے دعا مانگی اپنے مسلمان بھائی کو یہ کہہ کر الوداع ہوئے: میرے یہاں ٹھہرنے کے بارے میں کسی کو مت بتانا نہیں تو مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔

ہسپتال کے ارد گرد گھنے درختوں کی قطاریں تھیں۔ جب غازی صاحب وہاں تشریف لے گئے تو ڈیوٹی کا مقررہ وقت ختم ہونے کو تھا۔ آپ نے ایک جگہ کھڑے ہو کر دیکھا کہ ۱۰۔۱۱ فٹ دور نیم کے درخت کے سائے میں اس کی بیوی ساوتری دیوی کشیدہ کاری میں گم ہے۔ قریباً ۱۲۔فٹ دور ایک کمپوڈر سویا ہوا تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ عملہ کے افراد تاش کھیل یا گپیں ہانک رہے تھے۔ شیر دل مجاہد موقع کی تلاش میں رہا۔ ڈاکٹر مذکور اخبار کا مطالعہ کرتے کرتے چارپائی پر دراز ہو رہا۔ اب اس نے اپنا مکروہ چہرہ اخبار سے ڈھانپ لیا تھا۔

غازی صاحب آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اب مزید انتظار ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ اس فتنے کو ابدی نیند سلا دینا چاہتے تھے۔ ان کے بقول:

''میں موقع غنیمت جان کر گیٹ میں داخل ہوا۔ میرے پاس ایک ہاکی اور کمانی دار چاقو تھا۔ کاندھے پر چادر لٹکی تھی۔ چند لمحوں کے لیے میرے دل میں خوف پیدا ہو گیا۔ شیطان نے ورغلایا، ''یہ تمہاری نسبت صحت مند و توانا ہے اور تم کوئی موزوں آلۂ قتل بھی نہیں رکھتے۔ ایسا نہ ہو یہ بچ رہے اور تم مارے جاؤ'' ایک لمحہ کے لئے ماں کا خیال بھی آیا۔ مگر دوسرے لمحے ہی میں ان گمراہ کن وسوسوں پر قابو پا چکا تھا۔ سوچا کہ میں عزرائیل تو ہوں نہیں کہ اسے ضرور موت سے دوچار کر سکوں مگر اپنا فرض تو ادا کر جاؤں گا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ لعین میرے وار سے نہیں بچ سکے گا۔ اس کے بعد میرے مقدر میں اجالے اور روشنیاں لکھی جائیں گی''۔

غازی صاحب نے راجپال کے مقلد کو سوتے میں ہلاک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی خواہش تھی کہ گستاخ و مردود موت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کل تک یہ ہنستا تھا ہم روتے رہے۔ آج یہ آہ و بکا کرے، میں قہقہے لگاؤں۔ اب آوارہ کتے کی ہلاکت یقینی تھی۔ غازی ملت و دین اس کے سر پر کھڑے تھے۔ چاہتے تو ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیتے، مگر آپ نے جوش شجاعت میں دینی غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے پاؤں کی ٹھوکر ماری اور للکارتے ہوئے کہا:۔

''او گدھے کے موذی بیٹے! اٹھ اور اپنا انجام دیکھ! آج تجھے کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے رسول عربی ﷺ کا غلام تیرے سامنے موجود کھڑا ہے۔''

وہ پھڑک کر اٹھا اور دہشت سے نیچے گر رہا تھا کہ آپ نے زور سے نعرہ تکبیر لگا کر چاقو اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ زخمی کی چیخ بلند ہوئی نہ ہائے ہائے کی آواز اٹھی۔ غازی صاحب نے اللہ اکبر اتنے زور و جوش سے کہا تھا کہ جسے سن کر ڈاکٹر کی بیوی بچے شور مچاتے ہوئے باہر کی طرف دوڑے۔ یہ واویلا دور دور تک پہنچا۔ آپ کے دل میں خیال گزرا کہ میرا وار خالی گیا ہے، وگرنہ مقتول ضرور تڑپتا، پھڑکتا یا چیختا چلاتا۔ ملت اسلامیہ کا ہیرو یہ سوچ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ دراصل آپ اسے جہنم رسید کرنے سے پہلے گرفتار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ جائے واردات سے قریباً فرلانگ بھر

ادھر آپ نے چاقو ایک تالاب میں پھینک دیا اور خود بھی چھپ کر بیٹھ رہے۔ لوگ ان کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ہر طرف بھگدڑ مچی تھی۔ ایک ہندو یہ کہتے ہوئے دوڑ رہا تھا، ''ڈاکٹر مر گیا ہے۔ ارے لوگو! کوئی ڈاکٹر کو مار گیا ہے''۔ یہ کیف آور دسرور بخش بات آپ کے کانوں میں رس گھول گئی۔ احساس کے آنگن میں نقرئی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ انہیں اس قدر مسرت ہوئی کہ تن کر اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور پوچھا:

''کیا ڈاکٹر واقعی مر چکا ہے؟''

اس نے روتے ہوئے کہا:

''اور کیا''۔

اس خوش کن خبر سے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پھول کھل اٹھے اور خوشی کی کیفیت میں دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ لوگوں کو پکار پکار کر کہا:

> ''رام گوپال کا قاتل میں ہوں: میں نے ہی اسے دوزخ کا ایندھن بنایا ہے۔ یہ میرے رسول ﷺ کا گستاخ تھا۔ میں نے بدلہ چکا دیا۔ اب مجھے کسی بات کا ڈر ہے نہ خوف''۔

آپ تالاب کے درمیان میں جا کھڑے ہوئے۔ کمر تک پانی تھا۔ ہندوؤں نے ان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ اس موقع پر آپ نے نہایت پامردی کا ثبوت دیا۔ جرأت مندی کے ساتھ ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اگر تم میں سے کسی نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو اس کا حشر بھی عبرتناک ہوگا۔ البتہ اپنی گرفتاری کے لئے اس شرط پر رضامند ہوئے کہ کوئی مسلمان افسر ہی مجھے ہتھکڑی پہنائے گا۔ ہندو خوفزدہ ہو چکے تھے۔ ایک آدمی بھاگتا ہوا پولیس اسٹیشن گیا اور تھانے میں ابتدائی رپورٹ درج کروائی۔ چنانچہ نارنوند میں متعین ایس ایچ او چودھری احمد شاہ کھوٹ (والد بزرگوار چودھری محمد افضل صاحب کھوٹ سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج چکوال سی ایس پی آفیسر حکومت پاکستان) نے آپ کو اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلا کر گرفتار کر لیا اور ہتھکڑی پہنائی۔

بکھرے حقائق

تھانے میں ابتدائی رپورٹ کے بعد کیس کا باقاعدہ اندراج بیوہ رام گوپال کی طرف سے ہوا۔ انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں نے جائے واردات کا معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ خون

کا کوئی قطرہ مٹی میں جذب ہوا اور نہ ہی اس کا نشان مقتول کے لباس پر ملتا تھا۔ کوائف کی خانہ پری اور پارچات کی تکمیل پر مقتول رام گوپال کی نعش پولیس نے خاص اپنی نگرانی میں ہسپتال پہنچوائی۔ سول سرجن نے مردے کا پوسٹ مارٹم کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا:

''حملہ اتنا شدید اور زخم اس قدر گہرا تھا کہ تمام آنتیں ٹکڑے ہوگئیں۔ اس گھاؤ سے مقتول کا بچنا محال تھا۔ جسم کی اندرونی ساخت اور ظاہری حالت سے منکشف ہوتا ہے کہ مقتول پر حملہ آور کی دہشت کے سبب سکتہ طاری ہوگیا۔ چونکہ اس کا خون خشک ہو چکا تھا، اس لئے تن مردہ پر لہو کا کوئی خاص دھبہ یا داغ نہیں ہے۔ یہ زخم کسی تیز دھار آلہ قتل کا لگا ہوا ہے۔ اگر چاقو کا پورا پھل سینے میں اتر جائے تو بھی ایسا زخم لگ سکتا ہے۔ لباس پر خون کے نشانات موجود نہیں ہیں۔ تاہم بنیان پر ایک کٹ واضح ہے۔ آلہ قتل اسی کو پھاڑ کر سینے میں داخل ہوا''۔

ڈاکٹری معائنے کے بعد میت ورثاء کے حوالے کر دی گئی، جنہوں نے اگلے روز اسے سپرد آتش کر دیا۔ گستاخ، گستاخی کی سزا پا گیا اور نوجوان مجاہد جزا کے لئے مضطرب تھا۔ جو زندگی کے تعاقب میں بھاگتا رہا، وہ پنجہ موت کی گرفت میں دم توڑ چکا تھا، جس نے موت سے بے نیازی برتی، وہ ہمیشہ کے لئے امر ہوگیا۔

رام گوپال کا قتل ہونا تھا کہ ہندو جرائد نے سنسنی خیز سرخیاں جمانا شروع کر دیں۔ کسی نے اس واقعے سے مسلم تنگ نظری کا جواز پیش کیا۔ بعض نے اسے جاہل مسلمانوں کا جنون اور انتہا پسندی قرار دیا۔ کچھ کو یہ اقدام تقسیم ہند کا شاخسانہ نظر آیا۔ الغرض ان کے ذہن میں جو کچھ آیا لکھ دیا۔ آریہ سماجیوں کے اخبارات ملزم کو سخت سے سخت سزا دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مخالفوں کا واویلا غازی صاحب کی شہرت کا سبب بنتا گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ مسلمانان ہند کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ جسے دیکھو آپ کا دیوانہ۔ ہر ایک کی زبان پر یہی نام۔ کیوں نہیں رشتۂ محبت میں منسلک، محبوب کو دیکھنے والی آنکھوں سے بھی پیار کرتے ہیں۔

حضرت قبلہ غازی صاحب کو گرفتار کر کے جامہ تلاشی لی گئی۔ آپ کی جیب سے ایک نوٹ بک ملی، جس پر ڈاکٹر رام گوپال کا پورا حلیہ درج تھا۔ اس بارے میں آپ سے خاصی پوچھ گچھ کی گئی۔ ابتداً انہوں نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ جب پولیس والوں کا تجسس ختم نہ ہوا تو آپ نے

فرمایا:

"جس عظیم ذات نے مجھے اس امر کی اطلاع فرمائی ہے اور مردود ڈاکٹر کی غائبانہ شناخت کرائی، ان کے حضور تم تو کیا تمہارے خیال کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ مقتول نے میرے رسول ﷺ کو تکلیف پہنچائی تھی۔ آپ کا کرم ہوا۔ میری قسمت جاگ اٹھی۔ ایک رات نور مجسم، رحمت ہر عالم، نبی کریم رؤف الرحیم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ خواب میں مجھے اس کی مکروہ صورت دکھائی گئی۔ میں نے اسے اچھی طرح پہچان لیا۔ اسی وقت اٹھا اور حلیے کو جامۂ الفاظ پہنایا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بمشکل اس کے گریبان تک پہنچا اور اللہ اکبر کہہ کر گستاخ کا کام تمام کر چکا ہوں۔ یہ میرا فریضہ تھا۔ آگے آپ کا کام ہے جس طرح جی چاہے قانونی تقاضے پورے کریں۔"

غازی صاحب کو حراست میں لینے کے بعد پیدل جائے واردات کی طرف لایا گیا۔ تھانیدار کے ہمراہ مقامی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ راستے میں دونوں نے انگریزی میں باتیں کیں۔ ایک دفعہ ہیڈ ماسٹر نے تھانیدار کی طرف متوجہ ہو کر انگریزی میں کہا: ملزم بچہ ہے۔ جس طرح ہم کہیں گے بے چارہ مان جائے گا۔ یہ سن کر آپ نے بآواز بلند کہا: جو میرا جی چاہے گا۔ کروں گا اور کہوں گا۔ میں تمہاری باتوں پر چلنے والا نہیں۔

جائے وقوعہ پر قواعد کے مطابق پارسل تیار کیے گئے۔ مقتول کی نعش تھانے پہنچائی گئی۔ پولیس اسٹیشن میں قدم رکھتے ہی غازی صاحب نے ایس ایچ او سے کہا: "مجھے پیاس لگی ہے پانی پلاؤ۔ نیز کھانے کی احتیاج بھی ہے، اس لئے روٹی کا بندوبست کرو۔ دوسرا کام میرے کپڑوں کی صفائی اور غسل کا ہے۔ چونکہ میں نے ایک ناپاک وجود کو جہنم واصل کیا ہے جس سے میرا لباس اور جسم ناپاک ہیں"۔ تھانیدار نے تعمیل ارشاد کی۔ آپ نے شکرانے کے نفل ادا کئے اور نماز عصر پڑھی۔

تھانیدار کو ہم علاقہ اور مسلمان ہونے کے سبب آپ سے ہمدردی تھی۔ غازی صاحب کی باتوں نے بھی اسے بہت متاثر کیا۔ بہر حال رسمی کارروائی پوری کی گئی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ رام گوپال کو کیوں قتل کیا ہے؟ انہوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ استفسار کیا گیا: "ہنس کیوں رہے ہو؟" آپ نے قدرے جذباتی ہو کر فرمایا: "کیا روؤں؟ میں تو ایک مدت سے اس کے پیچھے تھا،

اب میرے ہنسنے اور ہندوؤں کے رونے کا موسم ہے۔ مقام شکر ہے کہ میری مراد پوری ہوئی۔
تفتیشی افسر نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: عاشق رسول۔ پولیس افسر نے کہا: میں تمہارا اصلی نام پوچھ رہا ہوں، وہ بتاؤ۔ غازی صاحب نے فرمایا: رسول عربی ﷺ کا شیدائی مرید حسین۔ پھر پوچھا گیا: تمہارا چاقو کہاں ہے؟ آپ نے نشاندہی فرمائی کہ فلاں تالاب کے کنارے کے قریب پانی میں پڑا ہے۔ انہوں نے اپنا آدمی بھیج کر وہاں سے تلاش کروایا اور یہ آلہ قتل اپنے قبضے میں لے لیا۔ چونکہ غازی مرید حسین کے ساتھ ایس ایچ او کا رویہ بہت اچھا اور قابل قدر تھا، اس نے آپ کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اور ہمہ وقت آپ کے مرتبے کا لحاظ رکھتا۔

اس پر ہندوؤں کو شک گزرا کہ وہ بھی اس سازش میں ملوث ہے۔ آریہ سماجیوں سے ہم آہنگی رکھنے والوں نے فی الفور ایک خفیہ میٹنگ بلائی۔ اس میں سرکردہ چیدہ چیدہ افراد نے شرکت کی۔ ہندوؤں نے اتفاق رائے سے یہ تجویز منظور کی کہ رات گئے مرید حسین کو حوالات سے اغوا کر کے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ دوسری طرف تھانیدار پر یہ الزام تھوپ دیں کہ ملزم اس کے تعاون سے فرار ہو گیا ہے۔ انہوں نے تمام انتظامات نہایت رازداری کے ساتھ مکمل کیے، مگر کسی طرح تھانیدار کے علم میں بھی یہ بات آ گئی۔ اس نے نہ صرف پہرے کا انتظام سخت کر دیا بلکہ یہ تمام معاملہ اعلیٰ افسروں کے نوٹس میں بھی لایا گیا۔ بالآخر وائرلیس پر طے شدہ فیصلے کے مطابق رات کے پہلے حصے میں غازی صاحب کو جیپ میں ڈسٹرکٹ جیل 'حصار' بھیج دیا گیا۔ یوں ہندوؤں کو بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

غازی صاحب ابتدائی دنوں میں لواحقین کو متواتر اپنی خیریت سے آگاہ کرتے رہے۔ پھر وقفے پڑنے شروع ہو گئے۔ مگر جوں جوں آپ منزل مراد کے قریب تر ہوتے گئے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ خطوط سے کہیں پولیس کو سراغ نہ مل جائے۔ رشتے دار آپ کی سرگرمیوں سے بالکل بے خبر تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ آج کل غازی صاحب کہاں ہیں اور ان کا اگلا اقدام کیا ہوگا۔

واقعہ قتل، ۸۔ اگست ۱۹۳۶ء کو رونما ہوا۔ دوسرے روز نارنوند پولیس اسٹیشن کا ایک ملازم گوپی نامی بغرض تفتیش تھانہ چکوال سے بھلہ شریف آیا کہ معلوم کرے ملزم واقعی اسی جگہ کا رہائشی ہے یا کہیں اور کا؟ اہل دیہہ اپنے اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ عائشہ بی بی کی آنکھیں آج بھی

دروازے پر لگی تھی کہ شاید میرا لختِ جگر آ جائے۔ اے ایس آئی کی اچانک آمد اور مرید حسین سے متعلق سوالات نے لوگوں کو چونکا دیا۔ جب اس نے بتایا کہ آپ ایک وٹرنری ڈاکٹر کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو چکے ہیں تو یہ خبر پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ کسی کو غم ہوا کہ ماں باپ کا اکلوتا فرزند تھا۔ بعض نے شادی کے حوالے سے باتیں کیں۔ چند نے کہا اپنے نام کو زندہ جاوید کر گیا۔ والدہ حیران تھی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ عزیز و اقارب پریشان ہو گئے۔ مگر آپ کی زوجہ محترمہ نے آپ کی کامیابی کی خبر سن کر اپنا سر بارگاہ ایزدی میں جھکا دیا اور شکرانے کے نفل ادا کیے۔

صورتِ حال سے آگاہی کے بعد غازی صاحب کی والدہ محترمہ، چودھری خیر مہدی صاحب، آپ کے بے تکلف دوست اور منہ بولے بھائی محمد بخش صاحب جو قریبی گاؤں تھرپال کے رہنے والے تھے کے علاوہ بعض دیگر تعلق دار بھی ۱۱۔ اگست کو حصار پہنچ گئے اور اسی روز ملاقات کی۔ یہ مختصر قافلہ زیارت کے لئے ڈسٹرکٹ جیل مین حاضر ہوا تو آپ ہنس پڑے اور فرمایا: آپ لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا ہے! انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آپ نے دھیمے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا: چلو اچھا ہوا، اس طرح ملاقات تو ہو گئی۔ کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بعض اوقات ملاقاتیوں کی آواز رندھیا جاتی۔ لیکن آپ تسلی و تشفی دیتے۔ وہ خوش ہوتے تو انہیں بھی چین آ جاتا۔

آپ نے والدہ محترمہ سے عرض کیا:

''ماں! میں نے یہ پروگرام اس لئے خفیہ رکھا تھا کہ کہیں آپ مجھے اس راہ پر چلنے سے روک نہ دیں۔ آپ کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ کے بیٹے کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہے۔ اگر میں نے کبھی خدمت میں کوئی کوتاہی کی ہو تو مجھے معاف فرما دینا اور میری قربانی کی قبولیت کے لیے دعا فرمانا۔ مجھے یقین ہے آپ والدۂ شہید کے حوالے سے دربار نبوت میں خصوصی اعزاز کی مستحق ٹھہریں گی''

بیان کیا جاتا ہے کہ غازی صاحب کی والدہ صاحبہ نے خلاف توقع بڑی حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا۔ دورانِ سفر ان کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ ہر لمحے شدتِ غم سے گھبرا اٹھتیں۔ مگر بیٹے کے سامنے جا کر خوش خوش نظر آنے لگیں۔ اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے چین کا منہ سر چوما اور

محبت بھری باتیں کیں۔ بے چینی ظاہر ہوئی نہ آنکھوں سے آنسو ٹپکے۔ بڑا ایمان افروز منظر تھا۔ دیکھنے والے جگر تھام کر رہ گئے۔ دوسرے روز ۱۲۔ اگست کو دوبارہ ملاقات کا بندوبست ہوا۔ غازی صاحب نے فرمایا: آپ لوگ واپس چلے جائیں۔ مقدمہ سیشن کے سپرد ہونے پر میں خود ہی یاد کر لوں گا۔ اس طرح ایک تو ملاقات ہو جائے گی اور بعض دوسرے مسائل بھی زیر بحث آئیں گے۔

اس بات پر چودھری خیر مہدی صاحب بول پڑے کہ ہم انشاءاللہ مقدمے کی پیروی کریں گے۔ وکیل سے بات ہو چکی ہے۔ ہمیں تسلی ہے کہ آپ بری ہو جائیں گے۔ یہ سن کر قبلہ غازی صاحب زیر لب مسکرائے اور فرمایا:

> 'میں نے اسے دن دیہاڑے دو تین بجے کے قریب قتل کیا ہے۔ پولیس کے سامنے اعتراف اقدام کر چکا ہوں اور عدالت میں بھی میرا موقف یہی ہو گا۔ اب بتاؤ کہ تمہاری چارہ جوئی اور وکیل صاحب کی قانونی موشگافیاں کیا کر سکیں گی؟ مناسب ہے اپنا وقت اور سرمایہ ضائع مت کرو۔ پردیس میں کیوں پریشان ہوتے ہو؟ آپ چلے جائیں میں وقتاً فوقتاً خط لکھتا رہوں گا'۔

چودھری صاحب بضد ہوئے کہ آپ اقبالی بیان نہ دیں۔ پولیس کے سامنے دیئے گئے بیانات سے کچھ فرق نہیں پڑے گا، مگر عدالت میں ایسی غلطی کا ارتکاب ہرگز نہ کریں''۔

حضرت غازی مرید حسینؒ کے لہجے میں قدرے خفگی آ گئی اور فرمایا: 'میں اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہوں، آگے آپ کی مرضی۔ میں کسی صورت بھی صحت مقدمہ سے انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرے مسائل آپ جس طرح سے چاہیں خود نپٹائیں۔

اس واقعہ قتل کی تفصیلات و جزئیات ہندوستان کے تمام اہم اخبارات میں شائع ہوئیں۔ ہندو جرائد نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینا چاہا۔ کئی پرچوں میں عجیب و غریب سرخیاں جمیں۔ لیکن روزنامہ 'زمیندار' کا رنگ منفرد تھا۔ اس کے اولین صفحات پر صحیح صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ مضمون نگار نے انتہا پسند ہندوؤں کی گستاخیاں گنوائیں اور آئندہ کے لئے بھی تنبیہ کی۔ خبر کے ساتھ یہ بھی درج کیا گیا کہ غازی صاحبؒ موصوف کو پہلے روز ہی ڈسٹرکٹ جیل حصار میں بھیج دیا گیا ہے۔

اس خبر کے چھپتے ہی غازی ملت پورے ملک میں موضوع گفتگو بن گئے۔ ملاقات کی غرض

سے جیل کے اردگرد ایک جم غفیر رہتا۔ دور دور سے مسلمان آپ کی زیارت کے شوق میں کھنچے چلے آتے۔ حصار میں دیکھتے ہی دیکھتے کئی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ محلّہ دار کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ طالب علموں اور دیگر مسلم نوجوانوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ لوگ باہر سے آنے والے قافلوں کے قیام و طعام کا بندوبست کرتے۔ ان کے پروگرام میں غازی صاحب کے لواحقین کا پرجوش استقبال، ان کی ضروریات کا خیال اور مرافعے میں تعاون شامل تھا۔ بیک وقت کئی گھروں سے کھانا پک کر آتا، جسے آپ مسلمان قیدیوں میں تقسیم فرما دیتے۔ چند ہی دنوں میں یہ وفا کیش مجاہد پوری قوم کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ اب آسمان شہرت پر آپ کا آفتاب اقبال پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

غازی موصوف سے ابتدائی ملاقاتوں اور قانونی چارہ جوئیوں کے سلسلے میں چودھری خیر مہدی صاحب کا بیان نہایت اہم اور قیمتی معلومات پر مبنی ہے:۔

> ''مقدمے کی پیروی میرے ذمہ تھی۔ ہمارے قریبی رفیق محمد بخش صاحب بھی ہمراہ رہے۔ حصار کے مسلمانوں نے جس ایثار اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ یہاں سے جو بھی پروانۂ شمع رسالت کی ملاقات کو جاتا، اس کے قدموں میں آنکھوں کا فرش بچھاتے۔ ان کی عقیدت و احترام کا رنگ ہی نرالا تھا۔
>
> ہماری خواہش تھی کہ کسی بلند پایہ قانون دان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس لئے جب میں دوسری بار حصار جانے لگا تو پہلے لاہور کی راہ لی۔ پروگرام تھا کہ مولانا ظفر علی خان سے مشورہ کیا جائے۔ 'زمیندار' کے دفتر پہنچ کر مولانا ظفر علی خان کے فرزند اختر علی خان اور خدا بخش اظہر سے تفصیلی بات چیت ہوئی۔ ان کی سفارشی چٹھی لے کر ہم حصار جا پہنچے اور ایڈووکیٹ جلال الدین قریشی سے ملاقات کی۔ قریشی صاحب کی پرانی رہائش گاہ چوبرجی لاہور میں تھی، لیکن ان دنوں ضلع کچہری حصار میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وکیل مذکور اور ان کے ایک بھائی ایڈووکیٹ بدر الدین قریشی ہائی کورٹ لاہور میں وکالت کرتے رہے ہیں۔''

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنے دوساتھیوں کے ہمراہ قریشی صاحب کی کوٹھی کے باہر باغیچے میں بیٹھا تھا۔ چند اور آدمی بھی اپنے اپنے کاموں کے سلسلے میں موجود تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا کہ اسی اثنا میں حصار کی تحصیل 'سرسا' کے مولانا محمد اسماعیل صاحب تشریف لے آئے۔ مولوی صاحب بااثر اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ علاقہ بھر میں ان کی عزت کی جاتی۔ قریشی صاحب ۱۹۳۶ء کے صوبائی الیکشن میں ایک نشست پر امیدوار تھے۔ انہیں مولانا موصوف کی ہمدردیوں اور تعاون کی ہر ممکن ضرورت تھی۔

چونکہ ہم اجنبی تھے اس لئے قبلہ مولوی صاحب نے میزبان سے ہمارے متعلق دریافت کیا۔ وہ شخص موج میں تھا، لہٰذا ہمارا تعارف کرواتے ہوئے کہا: یہ اس جنونی نوجوان کے بدقسمت وارث ہیں جس نے ہندو ڈاکٹر رام گوپال کو قتل کیا۔ مولوی صاحب کے سینے میں عشق رسول کا چراغ فروزاں تھا۔ یہ جملہ سن کر برداشت نہ کر سکے اور غصے میں چائے کی پیالی دور پھینکتے ہوئے فرمایا: ارے کم عقل! اگر یہ بدقسمت ہیں تو پھر خوش نصیب کون ہے؟۔ کیا تو بلند بخت ہے؟ نبی پاک ﷺ کی عصمت کے محافظ کو جنونی کہتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی؟

وکیل مذکور نے مولانا موصوف کو جانے نہیں دیا اور اظہار شرمندگی کے باعث ان سے معذرت کا خواستگار ہوا۔ مولوی صاحب نے اسے نصیحت فرمائی کہ عاشق رسول کا ہمیشہ دل و جان سے احترام کرنا چاہیے، بصورت دیگر سرکارِ مدینہ ﷺ ناراض ہوجاتے ہیں۔ ان کا سایۂ رحمت سر سے اٹھ جائے تو انسان کڑی دھوپ میں جل کر رہ جاتا ہے۔"



داستانِ مقدمہ

قبلہ غازی صاحب پہلے روز ہی ڈسٹرکٹ جیل حصار پہنچا دیئے گئے تھے۔ پوچھ گچھ کے لئے پولیس افسران بھی جیل میں ہی آتے رہے۔ جب تفتیش مکمل ہو چکی تو ابتدائی سماعت ایک ہندو مجسٹریٹ پنڈت لکشمی دت نے شروع کی۔ ماتحت عدالت میں آپ کی جانب سے جلال الدین

قریشی، احمدزئی صاحب اور میاں منظور الدین ایڈووکیٹ پیروکار تھے۔ مجسٹریٹ مذکور نے ایک دو پیشیوں کے بعد فرد جرم عائد کی اور مقدمے کی فائل سیشن کورٹ کے سپرد کر دی۔ کلونت رائے نامی سیشن جج ایک متعصب ہندو تھا۔ اس نے مذہبی عناد کی بنا پر ترتیب وار کیس کے خلاف جلد ہی سماعت کی تاریخ مقرر کر دی۔ جب سیشن کورٹ میں دو تاریخیں بھگتی جا چکی تھیں تو باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔

گواہوں کی فہرست خاصی طویل تھی۔ چشم دید گواہ وٹرنری کمپوڈر ایک ہندو وشوانا تھ نے بتایا:

'میں ڈیوٹی ختم ہونے پر آرام کر رہا تھا کہ اتنے میں اللہ اکبر کی گرجدار آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی مقتول کی خوفناک چیخیں بلند ہوئیں۔ ایک نوجوان حملہ آور اسے مسلسل للکار اور چاقو سے وار کر رہا تھا۔ چونکہ میں ذرا دور ایک درخت کے نیچے ستا رہا تھا، یہ دیکھ کر اس طرف دوڑا۔ مجھے اپنی سمت بھاگتے دیکھ کر قاتل نے فرار ہونا چاہا۔ میں نے پکڑو! پکڑو!! کا شور مچا دیا۔ ملزم ایک تالاب کے درمیان جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے واویلے پر کافی تعداد میں لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ازاں بعد پولیس آئی اور گرفتار کر کے جائے واردات کی طرف لے گئی۔ حملے کے وقت ملزم شدید غصے کے عالم میں کہہ رہا تھا: ''ارے کم بخت! آج میں اپنے رسول ﷺ کا بدلہ لینے آیا ہوں اور تجھے ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا'۔

دوسرے چشم دید گواہ دینا ناتھ بیراگی نے وشوانا تھ کے بیان کی تائید کی۔ اس کے بعد بیوہ رام گوپال کا بیان قلمبند کیا گیا۔ ڈاکٹر نے عدالت میں طبی رپورٹ کے حوالے سے بیان کیا کہ چاقو کا پھل گو خاصا لمبا اور تیز تھا مگر اس کے ایک ہی وار سے پیٹ کی اس قدر اندرونی شکستگی بے حد حیران کن ہے۔ نیز جسم سے خون نہ نکلنے کی توجیہ دہشت کے اثر اور سکتے کے سبب سے کی۔ جب ڈاکٹر مذکور سے برآمد شدہ چاقو دکھا کر پوچھا گیا کہ اس سے اتنا کاری زخمی آ سکتا ہے؟ تو اس نے کہا: ''ہاں! ناممکن نہیں ہے اور اسی شدید ضرب سے موت واقع ہوئی۔''

آئندہ پیشی پر برآمدگی کے گواہان اور پولیس والوں کی شہادتیں ہوئیں۔ نقشہ نویس نے جائے موقع سے آگاہ کیا اور پارسل تیار کرنے والوں نے اپنی اپنی کارگزاری عدالت کے گوش

گزار کی۔

جج کی جانبداری کا برملا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ وہ گواہوں کی لغزشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سٹینو کو خلاف واقعی عبارت لکھواتا۔ بہر حال غازی صاحب کے وکلا نے گواہان صفائی طلب کرنے کی درخواست گزاری جسے مسترد کر دیا گیا۔ دوسری درخواست آپ کے لواحقین نے درج کروائی، جس میں استدعا کی گئی کہ ہمیں پیروی کے لئے لاہور سے ڈاکٹر محمد عالم ایڈووکیٹ کو بلوانے کی اجازت دی جائے۔ اسے بھی قابل اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ان حالات میں وکیلوں کی کوششیں مطلقاً بے سود تھیں۔ انہوں نے عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے بائیکاٹ کی پالیسی اپنائی۔ اس کے ساتھ ہی ہندو جج کلونت رائے کی طرف سے انہیں دھمکی دی گئی کہ تمہارے پریکٹس لائسنس منسوخ کر دیئے جائیں گے۔ ایڈووکیٹ جلال الدین قریشی اس بات سے گھبرا گئے۔ غازی صاحب نے انہیں تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں، اس کا تمام ذمہ میں خود اٹھا لوں گا۔ جب غازی صاحب کی طرف سے کوئی وکیل بھی حاضر عدالت نہ ہوا تو جج مذکور نے آپ سے کہا:۔

''کیوں نہ سرکاری خرچ پر کوئی وکیل کھڑا کیا جائے؟''

غازی صاحب نے فرمایا: مجھے حصار کے کسی وکیل پر قطعاً بھروسہ نہیں ہے۔''

الغرض رسمی کارروائی کی تکمیل کے لئے ایک ہندو ایڈووکیٹ بدھ رام کو سرکاری خرچ پر مقرر کیا گیا، جس نے گواہوں پر جرح مکمل کی۔ اس کے بعد جج نے غازی صاحب سے دریافت کیا: کیا آپ نے ڈاکٹر رام گوپال کو قتل کیا؟ اور کیا گرفتاری کے وقت چاقو، نوٹ بک اور ایک تسبیح آپ سے برآمد ہوئی تھی؟ آپ نے فرمایا: ''میں کوئی بیان دینے کو تیار نہیں۔ عدالت صریحاً جانبداری ظاہر کر رہی ہے۔ نہ صرف میرا کیس ترتیب کے خلاف سماعت کیا گیا ہے بلکہ میرے لواحقین کو لاہور سے وکیل لانے کی اجازت بھی نہیں دی گئی اور نہ ہی گواہان صفائی طلب کئے گئے ہیں۔ نیز میری طرف سے ناپسندیدہ وکیل مقرر کر دیا گیا۔ مجھے مناسب فیصلے کی توقع نہیں ہے، اس لئے میں کوئی بھی بیان نہیں دینا چاہتا۔ تاہم اگر ہو سکا تو میں ایک اور بے غیرت کو ضرور ٹھکانے لگاؤں گا''۔

غازی صاحب کا یہ بیان ریکارڈ نہیں کروایا گیا۔ برعکس اس کے فیصلے میں لکھا کہ ملزم کوئی بھی بیان لکھوانے سے انکاری ہے۔ فائل پر حتمی فیصلہ درج کرنے سے پہلے سیشن جج نے نائب کورٹ سے کہا کہ ملزم کے دستخط کرواؤ۔ غازی صاحبؒ نے ٹائپ شدہ صفحات پڑھ کر پھینک دیئے اور

فرمایا: میں اس وقت تک دستخط نہیں کروں گا، جب تک میرے بیان کا پورا متن نہ لکھا گیا۔ جج نے کہا: آپ کو جو شکایت ہے، علیحدہ کاغذ پر لکھ کر جمع کروا دیں۔ آپ نے دوبارہ فرمایا: مجھے اس بد دیانت عدالت پر قطعاً اعتبار نہیں، لہٰذا میں دستخط کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی کوئی درخواست دوں گا۔ اس پر مجبوراً جج کو آپ کا بیان لکھنا پڑا اور دستخط کروائے۔ آئندہ پیشی پر فیصلہ صادر کیا گیا۔ عدالت نے نوٹ میں لکھا:

> ''بیانات اور گواہوں پر جرح سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملزم ہی حقیقی قاتل ہے۔ جرم مذہبی جنون کے باعث ہوا...... استغاثہ حقائق پر مبنی ہے اس لئے عدالت کے نزدیک مجرم سزائے موت کا مستحق ہے''۔

فوجداری مقدمات کے برخلاف یہ مرافعہ بہت جلد نپٹا دیا گیا۔ ۷۔ اگست ۱۹۳۶ء کو واقعۂ قتل پیش آیا اور رواں سال کے اختتام تک سیشن کورٹ سے فیصلہ بھی صادر ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں جس روز حضرت غازی مرید حسین کو سزائے موت سنائی گئی۔ آپ بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔ جس قدر انہیں مسرت ہوئی لواحقین اتنے ہی رنجیدہ تھے۔ آپ کو سایۂ رحمت میں چھپ جانے کی خوشی، دوسروں کے دل میں جدائی کا بھیانک تصور۔ آپ جام شہادت نوش کرنے کے لئے تڑپ رہے تھے، رشتے داران کو عرش سے فرش کی سمت کھینچنا چاہتے تھے۔ آپ ہار مانتے تھے نہ وہ شکست، دونوں طرف ٹھن گئی۔

سیشن کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ لاہور میں اپیل دائر کی گئی۔ غازی صاحب کی طرف سے معروف قانون دان سلیم صاحب نے یہ موقف اختیار کیا کہ سیشن جج نے ملزم کو صفائی کا موقع فراہم نہیں کیا اور نہ ہی انہیں اپنی پسند کے ماہر قانون سے خدمات حاصل کرنے کی اجازت دی گئی۔ ریکارڈ میں بھی اس امر کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ ماتحت عدالت نے جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ اس لئے سیشن کورٹ میں اس مقدمے کی دوبارہ سماعت ہونی چاہئے۔ یہ اپیل جسٹس میاں عبدالرشید صاحب (بعد میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے) اور ایک انگریز جج گولڈ سٹریم نے سماعت کی۔

۱۹۳۷ء کے ابتدائی مہینوں میں ہائی کورٹ میں پیشی ہوئی۔ ڈویژنل بنچ نے مختلف تاریخوں کے بعد بحث و فیصلے کی تاریخ مقرر کی۔ اس روز سلیم صاحب نے بڑے وزنی دلائل پیش کئے۔ لیکن جج صاحبان کترا رہے تھے کہ اس صورت میں جب کوئی ملزم بیان نہیں دے گا تو مرافعہ دوبارہ سپرد

سیشن کرنا ایک باقاعدہ قانون بن جائے گا۔ ایڈووکیٹ مذکور نے جسٹس حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مائی لارڈ! اگر ملزم کی جگہ جناب کی ذات ہوتی تو کیا پھر بھی آپ اسے انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق گردانتے؟ اگر عدالت میرے موقف کو تسلیم نہیں کرتی تو مجھے حق پہنچتا ہے کہ یہ مقدمہ پریوی کونسل میں لے جاؤں۔''

اس پر زور و مدلل بحث کے سبب جسٹس میاں عبدالرشید صاحب مان گئے اور فیصلے میں لکھا: سیشن جج جگن ناتھ زوتشی کو مقرر کیا جاتا ہے کہ وہ یہ تمام کیس دوبارہ سماعت کریں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جب چودھری خیر مہدی صاحب معاملہ طے کرنے کی غرض سے سلیم صاحب کے پاس پہنچے اور فیصلے کی نقل دکھائی تو انہوں نے مطالعے کے بعد بتایا کہ یہ کیس خاصا کمزور ہے اور سزا میں تخفیف کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ جب انہیں سیشن کورٹ میں وقوع پذیر ہونے والی بے ضابطگیوں سے مطلع کیا گیا تو ان کی رائے میں یہ غلط تھا، کیونکہ کوئی عدالت بھی اتنی متعصب، غیر سنجیدہ اور بے وقوف نہیں ہو سکتی۔ پختہ یقین دلائے جانے پر انہوں نے پیروی کی ہامی بھر لی۔ پیپر بک چھپنے پر انہوں نے غازی صاحب کے لواحقین کو بذریعہ خط بلوا لیا اور اپیل دائر کرنے پر انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس قانونی جدوجہد کے عوض انہوں نے ۶۲۰ روپے فیس وصول کی جو کہ ان دنوں ایک نہایت ہی بھاری معاوضہ تھا۔

درحقیقت سلیم صاحب اس رقم پر بھی رضامند نہ تھے۔ کہا: میں نے ہندوؤں کی ناراضگی مول لے کر مقدمہ لڑنا ہے، اس لئے معاوضہ زیادہ ہونا چاہیے۔ پاک و ہند کی معروف شخصیت راجہ غضنفر علی خان بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے سلیم صاحب سے کہا: ۵۰۰۰ روپے طلب کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ وہ بھی ایک مسلمان ہے جس نے اپنی جان کی بازی لگا دی اور آپ بھی مسلمان ہیں کہ مفت بات بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح ان کی مداخلت سے فیس کا مرحلہ طے ہو گیا۔

سیشن جج نے یہ کیس ''حصار'' میں سماعت کیا۔ تمام گواہوں کی شہادتیں دوبارہ قلم بند ہوئیں۔ ابتداً مقدمے کی فائل جج مذکور کے زیر مطالعہ رہی۔ بالآخر ۲۔ جون ۱۹۳۷ء کو چشم دید گواہ طلب کر لئے گئے۔ حرمت مصطفیٰ ﷺ کے شیدائی کی جانب سے ڈاکٹر شیخ محمد عالم صاحب ایڈووکیٹ پیروکار تھے۔ ان کا آبائی تعلق بھلہ شریف کے نزدیکی گاؤں کھوکھر زیرے سے تھا۔ سیاسی

طور پر وہ تا زندگی کانگریس سے وابستہ رہے۔ اس مقدمے کی پیروی کے لئے انہوں نے ۲۵۰۰ روپے فیس وصول کی۔ یہ صاحب ۱۹۔ جون ۱۹۳۷ء کو لاہور سے حصار پہنچے اور اگلے روز عدالت میں پیش ہوئے۔ بحیثیت قانون دان انہوں نے آئین فوجداری سے اپنی وسیع واقفیت اور گہری دلچسپی کا ثبوت فراہم کیا۔ ٹھوس جرح کے سبب مبینہ چشم دید گواہ بیراگی نے ان کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا کہ جب وشوانا تھ نے رام گوپال کو چھرا مارا تو کیا تو نے دیکھا؟ اس نے کہا: ''ہاں''۔ گواہ سے دوبارہ پوچھا گیا کہ واقعہ قتل کے بعد تم نے ایک نوجوان جو ہتھکڑی پہنے ہوئے ہے کو نہیں دیکھا ہوگا؟ اس نے بتایا: جی نہیں دیکھا اس طرح جب وہ الٹی سیدھی ہانکنے لگا تو جج نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: آپ نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ اور اپنے اسٹینو کو ڈکٹیشن دی کہ یہ گواہ پاگل ہے یا پاگل بننا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا: جناب! آپ یہ کیوں نہیں لکھواتے کہ گواہ جھوٹا ہے اور اس نے وقوعہ نہیں دیکھا؟ لیکن عدالت نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ۲۰، ۲۱۔ جون ۱۹۳۷ء کے دو دن شہادتیں ہوتی رہیں۔ ۲۲۔ تاریخ کو وقفہ تھا۔ ۲۳ جون کو فریقین کے وکلاء کے مابین قانونی بحث ہونا قرار پائی۔ شیخ محمد عالم ایڈووکیٹ نے استغاثے میں قانونی سقم گنوانے کے بعد مندرجہ ذیل نکات پر بڑی جامع اور طویل بحث کی۔

- ……جائے وقوعہ پر خون کے نشانات نہیں پائے گئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیان کردہ جگہ واردات مفروضہ ہے۔
- ……چونکہ طبی رپورٹ کے مطابق جسم سے خون جاری نہیں ہوا، اس لئے پولیس نے فرضی پارسل تیار کئے ہیں۔
- ……ڈاکٹر کا بیان ہے کہ چاقو پر آلائش نہیں تھی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آلۂ قتل فرضی ہے اور پولیس نے برآمدگی کے سلسلہ میں کماحقہ، قانونی تقاضے پورے نہیں کئے، بلکہ تھانے میں بیٹھے بٹھائے ہی خانہ پُری کر دی۔
- ……خون کا نہ بہنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ رام گوپال حملہ آور کے وار سے پہلے ہی مر چکا تھا۔
- ……عدالت میں گواہوں کی بدحواسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چشم دید شاہد نہیں۔ بیراگی کی گھبراہٹ اور غلط ملط بیان اس کے جھوٹا ہونے کا ثبوت ہے۔
- ……مقتول کی صحت قاتل کی صحت سے بدرجہا بہتر تھی۔ گواہوں کے بیان کے مطابق حملہ آور

نے ڈاکٹر رام گوپال کو جگایا اور للکار کر وار کر دیا۔ کیا کوئی کمزور، طاقتور کے آگے اس جرأت اور بے باکی کا اظہار کر سکتا ہے؟ اسے تو چاہیے تھا کہ سوتے میں کام تمام کر دیتا۔

○......ان حقائق سے منکشف ہوتا ہے کہ استغاثہ کے بیانات حقیقت پر مبنی نہیں۔ مفروضہ قاتل کم سن اور نوجوان ہے اس لئے فاضل جج صاحب کو ملزم کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھنا چاہیے......وغیرہ



ایڈووکیٹ مذکور کے قانونی دلائل بہت وزنی ہونے کے باوجود موثر ثابت نہ ہوئے۔ دراصل غازی صاحب کے اقراری بیان کے ہوتے ہوئے کوئی بھی نکتہ سنجی نہ چل سکی۔ آپ نے عدالت میں برملا اعتراف کیا کہ یہ میرے رسول ﷺ کا گستاخ اور واجب القتل تھا، سو میں نے اسے جذبۂ ایمانی کے تحت جہنم رسید کر دیا ہے۔

آئندہ تاریخ پر فیصلہ سنایا جانا تھا، اس لئے اس روز غازی صاحب بھی کمرۂ عدالت میں موجود تھے۔ آپ کے کافی دوست اور رشتہ دار بھی ملاقات کے لئے آئے اور مقامی آبادی کے ہزاروں مسلمان جن میں بہ تعداد کثیر نوجوان تھے زیارت کے لئے مختلف جگہوں پر کھڑے رہے:

پھانسی پانے کا فیصلہ آپ نے نہایت حوصلے اور سکون سے سنا۔ گویا یہ سولی پر لٹکنے کی خبر نہیں، چشمۂ حیات پر پہنچنے کا پیغام ہو۔ ہزاروں افراد نے دیکھا کہ رسول عربی ﷺ کے عاشق صادق نے مدینہ منورہ کی طرف منہ کر کے جوشِ عقیدت سے سر جھکا لیا اور مترنم مگر بلند آواز سے عرض کیا:

''غلام حاضر ہے، یا رسول اللہ ﷺ



ایک واقعہ

سیشن کورٹ سے اب کے بھی سزائے موت کا حکم بحال رہا۔ حضرت قبلہ غازی صاحب کے لواحقین کو کب چین آتا تھا۔ انہوں نے فیصلے کی نقول حاصل کر کے ہائی کورٹ لاہور میں اپیل گزار دی۔ اس وقت ''سر جان ڈگلس ینگ'' چیف جسٹس تھے۔ جسٹس ''منرو'' نے ان کی معاونت کی۔ فیصلے کے دن بیرسٹر شیر محمد نے ملزم کے حق میں قانونی نکات کی تشریح کرتے ہوئے بڑی اثر آفریں تقریر کی، مگر اپیل مسترد کر دی گئی۔ ہائی کورٹ سے اپیل خارج ہونے کی اطلاع ''حصار'' میں ساقی کوثر ﷺ کے متوالے تک پہنچی تو وہ بہت شادکام ہوئے۔

دوسری طرف آپ کے عزیز و اقارب اس بھاگ دوڑ میں تھے کہ بریت کی کوئی صورت نکل آئے۔ انہوں نے بے چینی کے عالم میں رحم کی اپیل گورنر کے پاس اور دماغی معائنے کے لئے ہوم سیکرٹری کی خدمت میں درخواست گزاری۔ سر سکندر حیات خاں جو کمانڈر انچیف کے پرائیویٹ سیکرٹری اور خان بہادر کے خطاب یافتہ تھے۔ اُن کو شمع رسالت ﷺ کے اس پروانے سے خاص انس تھا۔ انہوں نے شملہ سے چودھری خیر مہدی صاحب کے نام اس امر کا ایک خط لکھا کہ آپ فی الفور یہاں آ کر مجھ سے ملاقات کریں۔ چودھری خیر مہدی نے حسب ہدایت شملے کا سفر کیا۔ ہوم سیکرٹری برطانوی نژاد تھا۔

خاں بہادر صاحب کے ایک دوست نے اطلاع دی کہ اس کے اللہ بخش ٹوانہ اور خضر حیات خاں ٹوانہ کے ساتھ دوستانہ مراسم ہیں۔ اس نے ٹیلی فون پر مزید بتایا کہ ان سے بھلائی کی توقع فضول ہے۔ بہر حال ہوم سیکرٹری کے لئے موزوں سفارش ڈھونڈ لی گئی۔ مگر اس نے بتایا کہ ''گو ایسے تمام امور میرے ذمے ہیں، لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے گورنر صاحب نے یہ کیس خاص طور پر لکھوایا ہوا ہے۔ اسے سر چھوٹو رام نے کہہ رکھا تھا کہ اس مقدمے میں ملزم کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ البتہ آپ کی خواہش پر ڈاکٹری رپورٹ مانگ لیتا ہوں۔''

۲۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو چودھری موصوف نے شملے سے حصار کا سفر اختیار کیا اور ۴۔ ستمبر کو فدیۂ حبیب کبریاؐ سے ملاقی ہوئے۔ اس روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اسے کوئی کرامت کہے یا دلچسپ حکایت! بعض اسے کشف سمجھیں گے اور کچھ حسب عادت روایت! بہر حال کوئی بھی خیال کیا جائے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مردان باصفا کے سامنے پوری کائنات ہتھیلی کی طرح کھلی رہتی ہے اور شرق تا غرب کی تمام وسعت ان کے ایک گام میں محیط!

ملاقات کے لئے جونہی چودھری صاحب سامنے پہنچے، غازی حضور نے پوچھا: ''آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟'' بتایا گیا: ''یہ درخواست دی ہے کہ سزا پر عمل درآمد کسی نزدیکی جیل میں ہو۔'' آپ نے فرمایا: اس بارے میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کے پاس کیا حل ہے۔؟ اس سوال پر شہید ناز نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''وہی جو بہانے آپ بنا رہے ہیں۔ میں کسی کے سر پر ایک زخم لگا دیتا تو انہیں مجھے پاگل سمجھ کر کہیں اور شفٹ کرنا پڑتا۔ میرے جیسے خوش نصیب کو خواہ مخواہ پاگل بناتے ہوئے تمہیں حیا نہیں آتی؟ خاموشی سے گھر چلے جاؤ۔ جلد ہی مجھے کسی نزدیکی جگہ بھیج دیا جائے گا''

غازی صاحب کو یہ کس نے بتایا کہ مینٹل ہسپتال میں آپ کے دماغی معائنے کے لئے درخواست دی جاچکی ہے، حالانکہ طے پایا تھا فی الحال کہ آپ کو اس معاملے سے مطلع نہیں کیا جائے گا، مبادا آپ ناراض ہوں ؟

اس موضوع پر سوچا اور سمجھا تو جاسکتا ہے لیکن یہ بیان سے باہر ہے۔ آقا نے ہی تنہائیوں میں اپنے غلام کی دستگیری فرمائی۔ یہ سہارا نہ ہوتا تو قید کی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں بہاروں کا گزر کیسے ہوسکتا تھا!

غازی صاحب کے لواحقین کی یہ کوششیں بارآور نہ ہوئیں، جو آپ کو کسی نزدیکی جیل میں منتقل کرنے سے متعلق تھیں۔ تمام لوگ اس بات سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے تھے، مگر اچانک حکومت نے آپ کو جہلم بھیجنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ یہاں جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جہلم جیل سے غازی صاحب کو بغرض معائنہ پولیس کی زیرنگرانی مینٹل ہسپتال لاہور لے جایا گیا۔ ایک انگریز ڈاکٹر یہاں کا انچارج تھا جس کے ڈاکٹر حق نواز صاحب آف چکوال سے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ آپ کے رشتے داران کو بھی برائے سفارش لاہور لے گئے۔ دماغی امراض کے اس ڈاکٹر نے لیبارٹری میں جب نفسیاتی ٹیسٹ لینا شروع کیا تو آپ انتہائی باوقار لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے: میں نہ صرف زیور تعلیم سے آراستہ ہوں بلکہ صاحب نصاب بھی ہوں۔ لوگ میرے دماغ کے بارے میں بے جا شک کرتے ہیں، حالانکہ میں ہی عقل مند ہوں کہ جس نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور پروگرام کے ساتھ اس مردود کو ٹھکانے لگایا۔ یہ اس قدر منافع بخش سودا ہے جس کا کوئی بھی اندازہ نہیں کرسکتا۔

ڈاکٹر مذکور نے اپنی رپورٹ کے آخر میں لکھا: ''مجھے تعجب ہے کہ اس باشعور اور منجھے ہوئے نوجوان کے دماغی معائنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟'' جب الحاج خیر مہدی صاحب کو مذکورہ بالا بیان کی خبر چلی تو وہ غصے سے بھرے ہوئے آئے اور زبان سے کچھ کہنا ہی چاہا کہ آپ نے ان سے فرمایا:

> ''میں ایسی باتوں میں آکر اپنی عاقبت خراب نہیں کرسکتا۔ آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ طیبہ کی نسیم جاں فزا ہر روز پیغام لاتی ہے۔ خدارا، مجھے جلد بارگاہ رسالت ﷺ میں پہنچنے دیں''۔

جیل اور ملاقاتوں کی کہانی

شمع رسالت ﷺ کا جاں نثار جہلم کے قید خانے میں منتقل ہو چکا تھا۔ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ان کے جملہ رشتے دار ملنے کے لئے یہاں آئے۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ آپ کے لواحقین نے عارضی طور پر رہائش کا بندوبست بھی وہیں کر لیا۔ ایک ملاقات میں والدہ غازی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: مجھے غم یہ ہے کہ میرے اکلوتے بیٹے کے گلے میں رسہ ڈالا جائے گا۔ آہ! گھر میں کس کے دم سے رونق ہوگی؟ مجھے افسوس ہے کہ میرا صرف ایک ہی بیٹا تھا اور وہ بھی چند دن میں جدا ہو جانے والا ہے۔

غازی صاحب نے مسکراتے ہوئے عرض کیا: ''اماں حضور! اگر بیٹا ایک ہو تو زیادہ پیارا ہوتا ہے نا، اور سب سے پیاری شے ہی اللہ کی راہ میں قربان کرنی چاہیے۔ اس لئے آپ زیادہ خوش ہوں کہ دین اسلام اور حرمت رسول ﷺ پر اپنے اکلوتے اور پیارے بیٹے کو فدا کر رہی ہیں۔ بھلا آپ سے بڑھ کر اور کون خوش قسمت ہوگا۔''

ایک اور ملاقات میں جب غازی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کی قبر کہاں بنائی جائے تو آپ نے فرمایا: میری لاش حضرت شیخ قلندر کریم کے آستانہ عالیہ پر لے جا کر پھینک دیں اور یہ عرض کریں کہ میخانے کی مٹی میخانے میں ہی رہے تو اچھا ہے۔ اس لئے میری میت کو بھی اسی فضا میں دفن کیا جائے۔ جب ان کے پیرومرشد نے درد کی لے میں یہ کہانی سنی تو بے قراری میں فرمانے لگے:

> ''مرید حسین نے مجھے بے دام خرید لیا ہے۔ ان کی نعش کو آبائی گاؤں میں ہی سپرد خاک کیا جائے گا۔ جب تک بھلہ ... چاچڑ کا نقشہ نہ بن جائے میں اس سرزمین سے نہیں اٹھوں گا''۔

جوں جوں آپ کی شہادت کا وقت قریب آرہا تھا، ملاقاتیوں کے ٹھٹھ لگ رہے تھے۔ لاتعداد لوگوں نے زیارت کی اور دلوں کو نور ایمان سے بھر لیا۔ آپ کے سامنے آتے ہی ملنے والوں کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ سینے میں سانس رکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ غازی صاحب کا صبر و استقلال مثالی تھا، بلکہ یوں کہیے کہ آپ شہادت کے لئے مضطرب تھے اور ہر شب دعا کرتے کہ طلوع سحر سے پہلے ہی خواجہ بطحا ﷺ کی چوکھٹ تک رسائی ہو جائے۔

حضرت قبلہ قلندر کریمؒ سیاہ کپڑوں کو پسند نہیں رکھتے تھے۔ مرید بھلہ بھی اس سے خاص طور

پرگریزاں رہتے۔ آپ نے لحہ وصل سے دو دن قبل سپرنٹنڈنٹ جیل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: مجھے پھانسی کے وقت سیاہ لباس نہ پہنایا جائے۔ اس نے کہا کہ میں مجبور ہوں اور یہ روایت از خود بدلنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ نے اسے واضح اور بالکل صاف الفاظ میں بتا دیا کہ چاہے مجھے گولی مار دینا، میں کالے رنگ کا کپڑا زیب تن نہیں کروں گا۔

سپرنٹنڈنٹ مذکور نے بذریعہ فون لاہور میں آئی جی جیل خانہ جات سے رابطہ کیا اور ساری صورت حال گوش گزار کی۔ جیل انتظامیہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر غازی صاحب کی خواہش کا احترام نہ کیا گیا تو جہلم کے مسلمان بلکہ مضافاتی قصبات اور اردگرد کے دیہات میں بسنے والے کلمہ گو مر مٹنے پر تیار ہو جائیں گے۔ جب یہ بات گورنر کے نوٹس میں لائی گئی تو جواب ملا: قیدی کے لواحقین کو ہدایت کریں کہ وہ اپنے عزیز کی رائے معلوم کر کے اسی طرز کا پسندیدہ لباس بنوا لیں۔ یوں شہید وفا کی خواہش کے پیش نظر تمام کپڑے سفید تیار کروائے گئے۔ یہ ٹوپی کرتے اور پاجامے پر مشتمل تھے۔

محبت کے باب میں ایک اور شہید کا اضافہ ہونے والا تھا۔ وفا کی شاخ پہ حسین رنگ کا گلاب کھلنے میں بس تھوڑی دیر باقی تھی۔ جب حکومت کی طرف سے غازی مرید حسین کے بلیک وارنٹ جاری ہوئے تو گویا کالی گھٹاؤں کا موسم اُمڈ آیا۔ یہ خبر اس قدر مسرت بخش تھی کہ روز بروز عندلیب طیبہ کی رنگت نکھرتی چلی گئی۔ آپ کا چہرہ اتنا پر رونق اور ہشاش بشاش نظر آتا جیسے کسی نے چاندنی مل دی ہو۔ آپ کی خمار آلود آنکھوں میں ایک میخانہ تیرتا رہتا۔

ڈسٹرکٹ جیل جہلم میں بادہ عرب کے مشتاق کا عرصہ قیام ۱۰۔ ستمبر کی مخمور شام سے شروع ہوا تھا اور ۲۴۔ ستمبر کی ایک سہانی صبح سمٹ گیا۔ اس دوران کئی ایمان پرور واقعات رونما ہوئے۔ کہتے ہیں جو شخص بھی زیارت کے لئے آپ کے سامنے آتا دم بخود ہو کر یوں جھومنے لگتا جیسے بادۂ آتشیں چڑھا رکھی ہو۔

حضرت غازی مرید حسینؒ سے آخری ملاقات کا حال بھی عجیب ہے۔ ۲۲۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو تمام دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ ملاقاتیوں کو تین گروپوں میں بانٹ دیا گیا۔ پہلے دستے میں اہلِ خانہ و اقارب شامل تھے۔ دوسرا دستہ آپ کے بے تکلف دوستوں اور قریبی احباب سے مرتب ہوا، جبکہ تیسری ٹولی میں شکل آشنا لوگ اور آپ کے سینکڑوں اجنبی عقیدت مند شریک تھے۔

اس روز پولیس کی کڑی نگرانی تھی۔ پورے شہر کے اہم چوراہوں اور قابل ذکر سڑکوں پر

پہرے کا سخت انتظام ہو چکا تھا۔ جا بجا اسلحے سے لیس فوجی بھی نظر آئے۔ ایک اعلیٰ افسر نے انتظامات کا معائنہ کیا۔ جیل حکام کو مزید ہدایات دیں۔ بنا بریں دیگر کئی گورے اپنی گاڑیوں پر مختلف جگہوں کا چکر لگاتے رہے۔ اہل شہر کو معلوم ہو چکا تھا کہ غازی صاحب کو پھانسی دی جانے والی ہے۔ اس لئے مسلم معززین نے اپنے طور پر جنازے کے پروگرام کو حتمی شکل دی۔ مساجد میں اعلان کروائے گئے کہ کل غازی صاحب شہید کئے جانے والے ہیں۔ تمام مسلمان جوق در جوق جنازے میں شامل ہوں اور بندۂ مومن کی آخری زیارت کریں۔

ادھر دل گرفتگی کا یہ سامان مہیا ہو رہا تھا، ادھر شکیب و قرار کے باب کا ایک نیا ورق سامنے آیا۔ حضرت غازی مرید حسینؒ سے آخری ملاقات کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ پہلا وفد جب آپ کے سامنے پہنچا تو غازی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ قرطاس جبیں کی شکنیں عجب منظر پیش کر رہی تھیں۔ ان خراشوں کو ترتیب دے کر پڑھا گیا تو مژدۂ جانفزا کی جھلک نظر آئی۔ لوحِ دل پر مرقوم نام مبارک کا عکس صفحۂ رُخ پر اتر آنا گویا تفسیر محبت کی تمہید ہے۔

جب بھی آتا ہے شبِ غم میں مجھے تیرا خیال
دل کے آنگن میں اجالا سا بکھر جاتا ہے

''آپ کی والدۂ محترمہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ جدائی کے جان لیوا تصور سے لرز گئیں۔ رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے۔ اشکوں کا سیلاب تھم نہ سکا تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ ممتا کی دل دہلا دینے والی صدائے باز گشت سے کربناک کیفیت پیدا ہو گئی۔ والدہ حضور کو زار و قطار روتے دیکھ کر آپ نے عرض کیا: ''ماں! میں چاہتا تو عدالت سے بچ سکتا تھا مگر یہ راستہ تو میں نے خود اختیار کیا ہے۔ جس وجہ سے آپ پریشان ہو رہی ہیں، میں تو یہاں تک بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔ خدا کے لئے مت روئیے۔ میری خوشی اس میں ہے کہ آپ مجھے مسکراتے ہوئے چھوڑ جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب بارگاہ نبوی ﷺ میں پہنچوں تو میرے لباس پر آنسوؤں کا کوئی نشان نہ ہو۔ آپ کے ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی سی لکیر سے میرے شوق کا قافلہ جھوم اٹھے گا اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ کو بیٹے کی قربانی کے سبب خاتون جنت کے قدموں میں جگہ مل جائے گی۔''

اس کے بعد آپ کی رفیقۂ حیات سامنے آئیں۔ روتے روتے ان کا برا حال ہوا جاتا تھا۔ آپ نے فرمایا: مجھ سے کوئی غلطی یا زیادتی ہوئی ہے تو خدارا معاف کر دینا۔ اس سے آگے کوئی بات نہ ہوئی۔ بس ایک دوسرے کو دیکھا گیا۔ اب پلکوں پر شبنم کے قطرے نہیں ہونٹوں پر تبسم کے شرارے رقص کر رہے تھے۔ یہ خاموشی بھی ایک طرز گفتگو ہے۔ حاصل کلام یہ ٹھہرا کہ قوموں کے بگاڑ اور بناؤ میں سب سے اہم کردار ہمیشہ عورتیں ادا کرتی ہیں۔ غازی صاحب کی شریکۂ زندگی محترمہ امیر بانو صاحبہ نے اپنے محبوب شوہر کی آغوشِ محبت، حرمت رسول ﷺ پر نثار کر دی اور اس جذبۂ وفا نے انہیں حوروں کی محبوبہ بنا دیا۔

چودھری خیر مہدی صاحب کو آپ نے وصیت فرمائی: ”میں نے ایک قطعۂ اراضی خانہ خدا کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس کو جوں کا توں رہنے دینا۔ بقیہ زمین اس لئے مصرف میں نہیں لایا کہ آپ مجھے رشتۂ قرابت توڑنے والا نہ کہیں۔ کبھی لالچ میں نہ پڑ جائیو۔ یہ اشیا ضرورت زندگی تو ہیں، زندگی نہیں ہیں اور یہ کہ اسلامی اصولوں کو ہمیشہ حرز جاں بنائے رکھنا۔ خدانخواستہ آئندہ کوئی بدطینت، مقام مصطفی ﷺ کی طرف ترچھی نگاہ اٹھائے تو اس راہ میں نقد حیات لٹا دینا۔

میں ایک حقیر بندہ ہوں جو کوئی خوبی نہیں رکھتا۔ تاہم کلمہ گو، عشق رسالت ﷺ کے حوالے سے میری تربت پر آتے رہیں گے، ان کی ہر ممکن خدمت کرنا۔ میرے مقبرے کے نزدیک تمبا کو نوشی نہ کی جائے۔ وضو کے لئے معقول انتظام ہونا چاہئے۔ زائرین کو کہہ دیں کہ یہاں فاتحہ خوانی کی ضرورت نہیں ہے۔ احاطۂ قبر میں جتنی دیر ٹھہریں فقط درود وسلام کا ورد کرتے رہیں۔ میں سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتا۔ زندگی کے ایام اسم مبارک ﷺ کے وظیفے میں گزرے ہیں، بعد از موت بھی یہی رنگ چاہتا ہوں۔ میری والدہ صاحبہ کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھنا اور بندہ کی اہلیہ کو بھی کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دینا“۔

ملاقات کی غرض سے آنے والے احباب کو آپ نے یادوں کی بہاریں اور الفاظ کے موتی عطا کئے۔ اجنبی اشخاص کو بھی آپ بڑے تپاک سے ملے اور پند ونصائح فرماتے رہے۔ بہر حال آخری ملاقات کا یہ سلسلہ ۲۳۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو صبح آٹھ بجے شروع ہوا اور چار بجے شام ختم ہو گیا۔ اس موقع پر غازی مرید حسین شہیدؒ نے اپنے ہاتھ سے جائیداد سے متعلق ایک وصیت لکھی، اس پر مجسٹریٹ درجہ اول عبدالرحیم نے تصدیقی دستخط ثبت کئے تھے:۔

”من کہ مرید حسین ولد عبداللہ خان قوم کھوٹ قریش ساکن موضع

بھلہ تحصیل وتھانہ چکوال ضلع جہلم کا ہوں۔ میری وفات کے بعد میری تمام جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ معہ حصہ شاملات وجھنگی درختاں ومکانات سکنی مع ملبہ وجائے سفید ورقبہ آبادی الیہ موضع بھلہ ودیگر ہر قسم کی جائیداد جو کہ مظہر کی مملوکہ ومقبوضہ ہے کی وارث ومالک وقابض میری والدہ مسماۃ غلام عائشہ ومیری زوجہ مسماۃ میراں (امیر بانو) دختر شاہ نواز خان بحصہ برابر نصف ہوں گی۔ بحیثیت میرے مالک وقابض تصور ہوں گی اور ان کو ہر قسم کا اختیار حاصل ہوگا۔ رہن وبیع وتبادلہ وپٹہ دار کا قطعی اختیار حاصل ہو گا۔ اگر ان دو میں سے کوئی ایک بھی نکاح کر جائے یا فوت ہو جائے تو دوسری سالم حصہ جائیداد کی مالک وقابض ہو گی۔ لیکن نمبری خسرہ اس وصیت مندرجہ بالا سے مستثنیٰ ہوگی۔ ان میں میری خسرہ واقع رقبہ بھلہ کی مالک وقابض میری زوجہ مسماۃ میراں دختر شاہ نواز خاں واحد بعوض حق مہر ہوگی اور اراضی زرعی، نمبری خسرہ کی مالک وقابض مسجد کلاں موضع بھلہ ہوگا۔ مسجد مذکورہ کو رہن وبیع تبادلہ وپٹہ داری وغیرہ کا ہر قسم کا اختیار حاصل ہوگا۔ بحیثیت میرے ان ہر دو کو اول مزارع زمین ودوسری سفید قطعۂ زمین آبادی الیہ موضع بھلہ مذکورہ بالا کی مالک وقابض تصور ہوں گے''۔

بقلم خود مرید حسین ولد عبداللہ خان قوم کھوٹ قریش ساکن بھلہ۔

۲۴۔ستمبر ۱۹۳۷ء۔



بتاتے ہیں کہ گرفتاری کے بعد سیشن کورٹ میں آپ کی ابتدائی پیشیاں تھیں۔ ایک روز لنچ کا وقفہ ہونے پر عدالت میں ان کی طلبی ہوئی۔ مقدمے کی کارروائی جاری تھی کہ اتنے میں ظہر کا وقت ہوگیا۔ آپ نے سیشن جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''مجھے نماز پڑھنا ہے، میرے وضو کے لئے پانی اور مصلے کا بندوبست کروادیجئے۔'' جج چونکہ ہندو تھا، وہ غصے سے لال پیلا ہو کر بولا: ''نوجوان! یہ کورٹ ہے مسجد نہیں۔ ویسے بھی تمہیں اپنی ملزم کی حیثیت کو بھول نہیں جانا چاہیے''۔ آپ بھی تلخ کلامی پر اتر آئے۔ فرمایا: ''میں سب سے بڑی عدالت کی بات کر رہا ہوں اور تم اس دنیاوی اور فانی کچہری کی بات لے بیٹھے ہو۔ انتظام کراتے ہو یا میں خود کوئی قدم اٹھاؤں؟'' اس پر وہ سہم گیا اور

اپنے سٹینو کو اشارہ کیا۔ جو نہایت مخلص اور صاحب درد مسلمان تھا۔ پھر لوگوں نے آپ کو کمرہ عدالت میں خدا کے حضور سر بسجود ہوتے دیکھا۔

قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ اس شاہین صفت نوجوان کو حکومت نے ازخود حصار سے جہلم منتقل کر دیا تھا۔ یہ سرورِ کونین کے غلام صادق کی ایک انوکھی اور دلچسپ کرامت ہے۔ مگر اس کا ظاہری سبب کیا تھا؟ کہتے ہیں حصار جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے حکام بالا کو اس امر کی رپورٹ کی تھی کہ اگر قیدی مذکور کو چند دن اور یہاں رہنے دیا گیا تو مجھے بجا طور پر ڈر ہے کہ زندان کے تمام غیر مسلم ان سے متاثر ہو کر مذہب اسلام قبول کر لیں گے۔

ہنوز قصۂ شوق ناتمام ہے۔ مختلف روایتوں کے باہمی ربط سے ایک بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ لواحقین کی طرف سے حسینی فوج کے سرفروش سپاہی پر عدالت میں اقبالی بیان نہ دینے کی خاطر ہر طرح سے دباؤ ڈالا گیا۔ مقامی جامع مسجد کے خطیب و امام نے بھی آپ سے ملاقات کی اور قائل کرنا چاہا۔ کشمیری گیٹ دہلی کے ایک مولوی صاحب جن کا آبائی تعلق کوہاٹ سے تھا اور شیر دل مجاہد کی دہلی میں چند روزہ رہائش کے دوران متعارف ہو چکے تھے، انہوں نے بھی آپ کو انکارِ فعل کی ترغیب دی، مگر آپ نہ مانے۔

جب مولاناؤں کا فلسفہ اثر نہ کر سکا تو غم زدہ قرابت داروں کو ایک اور تجویز سوجھی۔ درحقیقت غازی صاحب کی طرف سے اشارہ ملا تھا کہ اگر حضرت قبلہ قلندر کریم فرما دیں تو اس بارے میں غور کیا جا سکتا ہے۔ پیر صاحب کو حصار کی جیل میں لے جایا گیا۔ مرید سلاخوں کے اندر تھا اور حضرت شیخ باہر۔ سامنے آتے ہی صبر و ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ محبت کا آبگینہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ معروضۂ شوق سننے کے لئے احساس کے کان درکار ہیں۔ جذبۂ الفت کی تصویر دیکھنے کو دل کی آنکھیں چاہئیں۔ ہر کوئی اشکوں کے گوہر کا شناسا نہیں ہوتا۔ بہر حال خواجہ چاچڑوی نے جذبات پر قابو پاتے اور آنسوؤں کو آستین میں جذب کرتے ہوئے فرمایا:

''مرید حسین! میں تو کوئی چیز نہیں تھا۔ آج تمہارے قدم چومنے کو جی چاہتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کے جوتوں کو سر پر تاج کی طرح سجاؤں اور کوچے کوچے میں اعلان کرتا پھروں کہ یہ اس مرد سعید کا جوڑا ہے جس نے مجھے بے دام خرید کر اپنا دیوانہ بنا ڈالا۔ یہ سب کچھ کر چکنے پر بھی حق ادا نہیں ہوگا۔ یہ لوگ مجھے آپ کے پاس بطور سفارش لائے

ہیں۔کیا آپ بھول گئے ہیں کہ جب آپ نے والی بطحاﷺ کے قدموں پر اپنی جوانی نثار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے کیا کہا تھا؟''

غازی صاحب نے بصد احترام عرض کیا:

''غریب نواز! مجھے اچھی طرح یاد ہے اور اس پر کاربند بھی ہوں۔ کئی دنوں سے دل میں زیارت کی خواہش مچل رہی تھی، اور بلوانا گستاخی خیال کیا۔ بے چینی زیادہ بڑھی تو یہ بہانہ ڈھونڈ نکالا۔ ورنہ میں اور انکار کا خیال! بھلا آغوش رحمت سے اٹھنا کون گوارا کرے گا؟''

یہ سن کر مرد قلندر خوش ہوئے اور فرمایا: میں ایک بات بتاتا ہوں کہ کمانا مشکل اور گنوانا آسان ہوتا ہے۔ جو لوگ اس سرمایۂ حیات کو سنبھالے رکھتے ہیں، ان کی زندگی ایک مثال بن جاتی ہے اور موت بے مثال۔

غازی مرید حسین شہیدؒ سے ضلعی قید خانہ جہلم میں کئی خرقِ عادت واقعات رونما ہوئے۔ آپ کی کال کوٹھڑی سے ملحق منڈی بہاؤ الدین کے موضع ڈنگا کا ایک سکھ قاتل بھی اسیر تھا۔ عدالتوں سے اس کی تمام اپیلیں خارج ہو چکی تھیں۔ اب اس کی سزائے موت پر عمل درآمد میں فقط چند روز باقی تھے۔ ایک رات مجرم مذکور نے دیکھا کہ غازی صاحب کا کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے، اور بہت سے آدمی درود و سلام کا ورد کر رہے ہیں۔ وہ ششں و پنج میں پڑ گیا۔

یہ مناظر مسلسل اس کے مشاہدے میں آتے رہے۔ حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے سنتری سے پوچھا: ''ساتھ والے کمرے میں ہر روز یہ روشنی کہاں سے آتی ہے؟'' جواب ملا: یہ عقدہ مجھ سے حل نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگوں نے ایسا قیدی زندگی بھر نہیں دیکھا۔ میرے تمام ساتھی اس پر حیران ہیں۔ یہ خلافِ عقل واقعات تو خود میں بھی نہیں سمجھ پایا۔ جونہی سورج کی ٹکیہ مغرب کی زریں آغوش میں گرتی ہے تو یہاں میلے کا سماں ہو جاتا ہے۔ عشاء کی نماز سے قبل آپ پاک صاف کپڑے زیب تن فرما لیتے ہیں۔ کمرے کے در و دیوار پر مشک و عنبر چھڑک دیا جاتا ہے، پھر رات گئے یہ کوٹھڑی دفعتاً جگمگا اٹھتی ہے۔ آپ کس سے محو کلام ہوتے ہیں، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

غازی صاحب کے حسن کردار سے احقاق حق اور ابطال باطل کی ایک انوکھی مثال قائم ہوئی۔ روح پرور مشاہدات نے اس غیر مسلم قیدی کو اسلام کی حقانیت کا قائل کر دیا۔ وہ سکھ آپ سے زبردست متاثر ہو چکا تھا۔ اس نے قبول اسلام کی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ کے دست حق

پرست پر دین حقہ کی قبولیت کے بعد اس کا نام غلام رسول رکھا گیا۔ اس موقع پر مسلمان قیدیوں نے جیل میں اظہار خوشی کے طور پر مٹھائی تقسیم کی، شکرانے کے نفل ادا ہوئے اور بعض جگہوں پر چراغاں بھی ہوا۔ یہ بات جیلر کے نوٹس میں لائی گئی، جو مذہباً ہندو تھا۔ اس نے نومسلم قیدی کے ورثا کو بلوا بھیجا، چونکہ اس کے حواس پر رسول عربی ﷺ کی غلامی کا نشہ چھا گیا تھا۔ لہٰذا وہ جیلر، لواحقین اور دیگر اشخاص کے کسی دباؤ میں نہ آیا بلکہ ملاقات سے قبل اپنے اقارب کو کہلوا دیا:

> ''ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہارا مذہب چھوڑ چکا ہوں۔
> اب تعلق قائم رکھنے کی ایک ہی صورت ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ یا مجھے
> میرے حال پر چھوڑ دو''۔

غلام رسول کی سزائے موت پر عملدر آمد کے بعد اس کی میت حسب وصیت جہلم کے مشہور احراری جناب عبداللطیف کے سپرد کی گئی اور اسلامی طریقے سے جنازہ پڑھ کر نہایت احترام کے ساتھ انہیں جہلم کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ جنازہ گاہ کے قریبی شہر خموشاں میں عاشقِ خیرالورا کے اس شاہکار کی قبر آج بھی اپنی خوش بختی پر نغمہ سنج ہے۔

جہلم کے قید خانے میں چند دن بھی انہیں بہت طویل معلوم ہوئے۔ یہاں عرصۂ اسیری کے دوران میں ان کا اپنے ایک ہم مشرب و ہم ذوق سے بھی تعلق خاطر پیدا ہوا۔ آپ کے اس دوست کا نام غازی غلام محمد شہیدؒ ہے۔

ان کے مقدر جاگنے کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ شہنشاہ ہر عالم ﷺ کی ولادت باسعادت کا دن تھا۔ ہر طرف خوشیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ کائنات کی نعمت کبریٰ کے ورود مسعود پر کون شکر ادا نہ کرتا۔ اس روز تو خدا تعالیٰ کے اس احسان عظیم پر پوری ملت اسلامیہ سربسجود تھی۔ اظہارِ مسرت کے طور پر عید میلاد کا ایک جلوس تشکیل دیا گیا۔ فرزندان توحید کا یہ قافلہ مذکورہ بالا شہر کے کسی چوراہے سے گزر رہا تھا۔ قریب ہی سکھوں کی آبادی تھی۔ سکھ مت کا ایک بدمست پیروکار آوازے کسنے لگا۔ یہ خوش قسمت مسلمان، اس کے نزدیک کھڑا نہ صرف اس کی تمام اوچھی حرکات دیکھ رہا تھا بلکہ اسے زہر میں بجھے ہوئے مردود کے بے باکانہ الفاظ بھی سنائی دے رہے تھے۔ اسی اثنا میں جلوس کے پیچھے گدھے پر سوار کوئی آوارہ لڑکا دکھائی دیا۔ اب کے وہ انتہائی گمراہ کن ولرزہ خیز الفاظ بک رہا تھا۔ اس نے زور سے چلا کر کہا: ''وہ دیکھو، (نعوذ باللہ) مسلمانوں کا نبی، براق پر چڑھ کر آ رہا ہے''۔

غیور مجاہد سے رہا نہ گیا۔ بہ عجلت اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور ٹوکتے ہوئے فرمایا: ''بے غیرت ملیچھ! اپنی زبان کو قابو میں رکھ! ورنہ میں تیری ناپاک زبان کھینچ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔'' مگر وہ اپنی ذلیل حرکتوں سے باز نہ آیا۔ غازی غلام محمد شہیدؒ نے غصے کی حالت میں اپنا چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔ وہ تھوڑی دیر تڑپا اور کتے کی موت مر کر خاموش ہو گیا۔ قاتل کی گرفتاری عمل میں آئی۔ عدالت میں مقدمہ چلا۔ بوقت فیصلہ انہیں سزائے موت کا مستحق ٹھہرایا گیا۔

ان کی رہائش جہلم شہر میں دریا کے کنارے شمالی محلے میں تھی۔ اندرون جیل غازی مرید حسین شہیدؒ اور ان میں پیغامات کے تبادلے ہوتے رہے۔ بہر حال یہ دونوں مجاہد اپنے اپنے کردار میں مختلف کیفیات رکھتے ہیں، لیکن دنیائے عشق میں ان کا جذبہ مستحسن ہے۔ قبلہ غازی صاحب کی قربانی کے کچھ عرصہ بعد حضرت غلام محمد غازی نے بھی جام شہادت نوش فرمایا۔

سفر نصیب

غازی صاحب مرید حسین شہیدؒ کی آرزوؤں کا چمن جوبن پر تھا۔ چلتے چلتے وہ منزل کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اپیلوں کے بکھیڑے نہ رہے۔ قانونی چارہ جوئیوں سے جان چھوٹ چکی۔ انتظار کی کلفتیں ختم ہوئیں۔ آپ کو واصل بحق کرنے کے لئے بروز جمعۃ المبارک ۸۔ رجب المرجب ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۴۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ تختۂ دار پر لٹکانے کے تمام مراحل مکمل ہو چکے تھے۔ شب بھر جیل میں قرآن حکیم کی تلاوت، درود شریف کا ورد اور کلمہ طیبہ کا ذکر ہوتا رہا۔ مسلمان قیدیوں نے فرط عقیدت سے تمام رات جاگ کر گزاری۔ سرکاری ڈاکٹر اور مجسٹریٹ درجہ اول عبدالرحیم جیل میں پہنچ چکے تھے۔ رات گئے ڈی سی صاحب نے جیلر کی معیت میں انتظامات کا جائزہ لیا۔ علاقے بھر کی اہم سڑکوں اور چوراہوں پر پہرے لگے تھے۔ جیل کی چار دیواری پر باقاعدہ ایک فورس کنٹرول کئے ہوئے تھی۔ انتظامیہ نے پورے شہر پر کڑی نگرانی رکھی۔ جنازہ ادا کرنے کی غرض سے تین مولوی صاحبان بھی پابند کر لئے گئے۔ کفن، شہید موصوف کے لواحقین سے حاصل کیا گیا۔

غازی صاحب نے رات کا ایک حصہ شکرانے کے نوافل میں گزار دیا۔ آدھی شب کے بعد درود و سلام کے ورد میں مشغول ہو گئے۔ فجر کی اذان کے وقت آپ کو پھانسی دیا جانا تھا۔ اس سے تھوڑی دیر قبل ان سے غسل کرنے کو کہا گیا۔ آپ نے اس پر بخوشی عمل کیا۔ انہیں خلاف قاعدہ سفید وردی پہنائی گئی (ازاں بعد یہ وردی آپ کی والدہ مرحومہ کے کفن میں شامل ہوئی تھی۔) مؤذن

کے روح پرور نغمے میں ابھی ذرا وقت باقی تھا۔ ڈاکٹر نے چیک اَپ کے بعد رپورٹ دی کہ قیدی پر بقائمی ہوش وحواس ہے۔ ساقی بدست جام اور بادل گھرے ہوئے تھے۔ غرور حسن اور سرور عشق میں ٹھن گئی۔ ماحول پرچشم دلہن کی طرح مستی چھائی تھی۔ ایسے میں جھومتی گھٹاؤں نے دلوں کو عشق کی حلاوت سے آشنا کر دیا۔

چاندنی رات کا غلاف چہرے سے برستا نور، پیشانی کی طلعت، نگاہوں کا جلال، امیدوں کا چمن، فراق کی لذت، دیوانۂ عشق کا کیف، نظر کا خمار، سرمدی نغموں کا ترنم، بھیگی پلکوں کی برسات، ایمان کی تپش، لب ہائے گہر ریز کی جنبش اور تصور جاناں کا اضطراب...... یہ قیامت نہیں تو قیامت خیز منظر ضرور تھا۔ مئے توبہ شکن تھی اور توبہ جام شکن۔ آنکھ اٹھا کے دیکھا تو پیمانوں کا ڈھیر پڑا نظر آیا۔ امتی کے دل میں محبوب امت ﷺ کے عشق کا چراغ جل رہا تھا۔ رحمت ونور اور محبت ودلکشی کی دنیا ذہن میں گھوم رہی تھی۔ لالہ رخ حسینہ کے جمال اور گل کدۂ فردوس کی حور کو سرور کونین کے مبارک ومقدس پاؤں کی گرد کا خراج کہنا ہی تو روا ہے۔

کتنی سہانی گھڑی تھی، جب مرید حسین کی قسمت بیدار نے آواز دی۔ سرکار مدینہ ﷺ کا نورانی پیکر، دلربا چہرہ، سرگیں آنکھیں، عطر برساتی ہوئی عنبریں زلفیں، موجۂ نور میں لہراتا ہوا عارض تاباں، جمال سراپا کا ایک ایک نقش ونگار تصورات کی دنیا پر چھایا ہوا تھا۔

غازی اسلام سربکف، کفن بدوش اور دست بدعا، شوق شہادت میں سرشار نظر آتا ہے۔ طیبہ کی تجلیوں کو آنکھوں میں بسائے ان کے ہونٹوں پر نعت رسول مقبول ﷺ مچل رہی تھی۔ آپ کی مناجات کیا تھیں؟ مشک اذفر گویا نسیم بطحا کے پہلو بہ پہلو سوئے طیبہ چلی۔ لمحہ بہ لمحہ صلوٰۃ وسلام کے تحفے روانہ ہو رہے تھے۔ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ جیل اور چند وارڈن آپ کی کال کوٹھڑی کے قریب آ کر رکے۔ ایک جھٹکے سے آہنی تالا کھل گیا۔ دروازے کوئی بھی ہوں بڑی ریاضت سے کھلتے ہیں۔ حجاب یونہی نہیں اٹھ جاتے۔ زندگی بھی ایک قفل ہے، جس کے ٹوٹ جانے سے اسیر وفا۔ محبوب ﷺ کے سانسوں کی مہک میں گھر جاتا ہے۔ الغرض آپ سے کہا گیا کہ پھانسی کا وقت قریب ہوا جاتا ہے۔ مقصد حیات کی تفسیر اور داستان محبت کی تکمیل کے لئے ہمارے ساتھ سوئے دار چلیں آپ کے یاقوتی ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر نمودار ہوئی اور فرمایا: ''شکر الحمد اللہ چلئے میں حاضر ہوں''۔

جاں نثار خیر الانام نے باہر قدم نکالتے ہی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ کہتے ہیں اللہ اکبر کی یہ آواز تین

تین میل دور تک سنی گئی تھی۔ ہزاروں لوگ اس صدائے عظیم کی شیرینی سے خود جیل کی طرف بھاگتے چلے آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قید خانے کے آس پاس ایک جم غفیر ہو گیا۔

جب تمام قیدی ہم آواز ہو کر اللہ اکبر کہتے تو فضا گونج اٹھتی۔ حضرت غازی مرید حسینؒ مسلسل نعرۂ تکبیر لگاتے، عالم شوق میں مچلتے، تیز تیز ڈگ بھرتے، اکڑتے، سنورتے، سنبھلتے، سینہ تانے اور نعت پڑھتے پھانسی گھر کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

اب آپ ہاتھوں میں گویا نذرانۂ جان لئے آنکھوں میں عقیدت کے پھول سجائے مقتل میں پورے قد سے کھڑے تھے۔ چہرے پر بشاشت تھی۔ پیشانی نورِ سعادت سے یوں چمک رہی تھی جیسے یکا یک افق پر کوئی روشن ستارہ نمودار ہو جائے۔ یقیناً تصور صاحب مزمل و مدثر پیش نگاہ تھا۔ لڑکھڑاہٹ یا گھبراہٹ نام کو نہیں تھی۔ جیلر اور مجسٹریٹ گھڑیوں پر نظریں ٹکائے ہوئے تھے۔ آپ نے مدینہ شریف کی طرف منہ کر کے تین بار با آواز بلند کلمہ شریف کا ذکر کیا اور پھر درود شریف کے ملکوتی وظیفے میں جت گئے۔ تھوڑی دیر گزرنے پر سر جھکا دیا اور بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں عرض کرنے لگے: ”میرے آقا ﷺ غلام حاضر ہے۔ بندہ اپنی حقیر جان کا تحفہ آپ ﷺ کے قدموں میں نچھاور کرنا چاہتا ہے۔ قبول فرمائیے، یا رسول اللہ ﷺ“۔

آپ کے خون جگر سے وفا کا زریں باب رقم ہونے میں صرف تھوڑی دیر باقی تھی۔ کائنات کا حسن سمٹ کر اس احاطے میں کھنچ آیا۔ اتنے میں نور و نکہت کا ایک جھونکا آتا ہے۔ فضاؤں میں نورانی صدائیں بلند ہوتی گئیں۔ کنٹوپ پہنتے وقت شہید ناز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ آخری وقت آپ نے پھانسی گھر میں موجود افراد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”لوگو! گواہ رہنا کہ میں نے دار پر بھی محبت کے سرمدی گیت گائے ہیں اور رسے کو چوم کر اپنے ہاتھوں سے گلے میں ڈال رہا ہوں......انظر حالنا یا رسول اللہ“

فجر کی اذان کے ساتھ ہی جلاد نے اشارہ پاتے ہوئے تختہ کھینچ دیا۔ رسول کریم ﷺ اپنے غلام صادق کے استقبال کے لئے تشریف لائے تھے...... بے تاب روح، قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے آقا و مولا ﷺ کے مبارک کفِ پا سے لپٹ گئی...... ایک ازلی پیاسا ساقی کوثر کے تلوے چاٹ رہا تھا...... دریائے کرم میں طغیانی تھی...... حور و ملائک شہید رسالت کا منہ تک رہے تھے......وفا کی شاخ پہ ایک اور گلاب کھل اٹھا...... پریت کی مالا میں نئے موتی کا اضافہ

ہوا......کوئی خوش قسمت مسافر، قافلۂ شوق کا امام بن گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ غازی مرید حسین شہیدؒ نے نہایت سکون کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔ تختۂ دار پر آپ کے جسم مبارک کو تڑپنے، پھڑکنے کی بالکل زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔ بس ایک لحظے میں جسد رعنا اور زلف دوتا کا یہ ۲۲۔ لحظے سالہ دیوانہ واصل بحق ہو گیا۔

جنازہ و مقبرہ

غازی مرید حسین شہیدؒ کی نعش کو جیل کے اندر ہی غسل دیا گیا اور نماز جنازہ بھی ادا ہوئی ازاں بعد زیارت عام کے لئے آپ کی میت کو نزدیک ہی ایک وسیع میدان میں رکھا گیا۔ یہاں مضافاتی دیہات اور جہلم شہر کے ہر شعبہ ہے زندگی جائے تعلق رکھنے والے کثیر تعداد کلمہ گوؤں نے نماز جنازہ ادا کی۔

شہید کے لاشہ کو بھلہ شریف تک پہنچانے کے لئے انتظامیہ نے ملک اللہ داد آف کھیال کی ایک بس پابند کر رکھی تھی۔ علاوہ ازیں دو گاڑیاں غازی موصوف کے اقارب کی طرف سے موجود تھیں۔ وہ منظر بڑا دلنواز تھا جب آپ کی مسہری کو بس میں رکھا گیا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ عقیدت مند پھولوں کی ٹوکریاں اٹھائے ہوئے آتے اور فرطِ محبت سے نچھاور کر جاتے۔ اس قدر پھول برسائے گئے کہ ان سے نہ صرف آپ کی چارپائی ڈھک گئی بلکہ بس کا اندرونی حصہ گلہائے رنگا رنگ سے چمن زار میں بدل گیا۔ گاڑی کے ہمراہ پولیس کے چند آدمی بھی موجود تھے۔

جہلم تا بھلہ کریالہ قریباً پچھتر میل کا فاصلہ ہے۔ اس طویل راستے میں سڑک کے کنارے متعدد جگہوں پر فرزندان توحید اور غلامانِ مصطفیٰ نے ناقابل فراموش جذبات کا مظاہرہ کیا۔ جہلم کے علاوہ راستے میں ان گنت مقامات پر نماز جنازہ ادا کی گئی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کا ایک عظیم اجتماع تھا۔ دو دو تین تین میل کے فاصلے پر لوگوں نے بغرض جنازہ صفیں درست کر رکھی تھیں۔ ان کے سامنے گاڑی روک دی جاتی اور وہ نماز ادا کر کے شاد کام ہو جاتے۔

الحاج چودھری حاجی خان صاحب نمبردار سکنہ سلطان آباد (کھوتیاں) جو اس زمانے میں جہلم کچہری کے عرائض نویس تھے، کا بیان ہے کہ جہلم شہر میں مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ شہر کے علاوہ دور دراز کے دیہات و قصبات سے بھی مسلمان جوق در جوق آئے اور آپ کے جنازے میں شرکت کی۔ راستے میں لحہ بہ لحہ اس انبوہِ کثیر میں اضافہ ہوتا گیا۔ بھلہ شریف میں

حاضرین کی تعداد تو گنتی سے باہر تھی۔ چشمِ فلک نے شاید ہی کبھی ایسا ہجوم دیکھا ہو۔ جدھر آنکھ اٹھتی اور جہاں تک نظر کی رسائی ہو سکتی، مخلوق خدا کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔

غازی مرید حسین شہیدؒ کے مزار مبارک سے لے کر کریالہ کی بوہڑ گراؤنڈ تک اور شمالاً جنوباً وسیع رقبے پر زائرین کا میلہ لگا تھا۔ کہتے ہیں دس ایکڑ کی فصل تو بالکل پامال ہو کر رہ گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تین لاکھ خوش قسمت افراد جنازے کی نماز میں شریک ہوئے۔ یہاں قریباً چار بجے مولوی غلام محمد صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ملک بھر سے جید علمائے کرام اور مشائخ عظام بھی تشریف فرما تھے۔ ترمنی شریف کے سجادہ نشین تو جیسے دیوانے ہو گئے ہوں۔ بار بار آپ کے چہرۂ انور کی زیارت کی اور اپنا گریباں چاک کر لیا۔

روایت ہے کہ جنازہ پڑھانے کے لئے حضرت قبلہ سید پیر مہر علی شاہ صاحب درگاہ عالیہ گولڑہ شریف سے عرض کیا گیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور تڑپ کر کہا:

''شہیدؒ ناموس رسول تصورات کی دنیا سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔
میں آپ کے جلووں کی تاب نہ لا سکوں گا۔ مجھ سے تجلی حق کا یہ روپ برداشت نہیں ہو سکتا۔ بندۂ عاجز کو خوف ہے کہ کہیں کوئی راز نہ کھل جائے۔''

نماز جنازہ کے بعد لوگوں کو آپ کے پُر جلال چہرے کی زیارت کروائی گئی۔ غلام عائشہ کا لختِ جگر بعد از مرگ بھی مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ رخ تاباں سے اطمینان اور سرور جھلک رہا تھا۔ جانے آپ کی مسہری پر مشک و عنبر کی کتنی بوتلیں چھڑکی گئیں۔ پھولوں کا تو کچھ حساب نہیں ہے۔ لوگ کندھا دینے کے لئے دیوانہ وار لپک رہے تھے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے آپ کے سفر آخرت کا نظارہ کیا۔ بظاہر آپ کا جسم بے جان دکھائی دیا مگر اس میں بھی ایک ندرت تھی۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے آپ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں: ''حضور اکرم ﷺ کے نام پر فدا ہو جائے موت کا فرشتہ اس کے وجود سے دور رہتا ہے۔ انہیں ایسی زندگی عطا کی جاتی ہے جو وہم و گمان سے بھی ماورا ہو۔ اہل بصیرت ہو تو دیکھو کہ فنا کا ہاتھ مجھے کبھی نہیں چھو سکے گا۔

اس موقع پر خاکسار تحریک کی ایک جماعت نے چودھری شیر سالار چکوال کی قیادت میں آپ کو سلامی بھی پیش کی۔ جنازے کے تمام مناظر کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کئے گئے۔ جناب نثار قطب صاحب کے ایک فرزند ارجمند مرحلۂ تدفین تک لمحہ لمحہ کی عکس بندی کرتے رہے۔ غازی صاحبؒ کے لئے صندوق پہلے سے ہی تیار تھا۔ چونکہ ہر شخص عقیدتاً قبر کھودنے میں شریک ہونا

چاہتا تھا اس لئے یہ خاصی کشادہ تیار ہوئی۔

جب آپ کے جسد کو صندوق میں لٹا دیا گیا تو تین اجنبی آگے بڑھے۔ ازاں بعد معلوم ہوا کہ ان تینوں کا تعلق آستانہ عالیہ چاچڑ شریف سے ہے۔ قاضی موصوف کا تعلق خواجہ چاچڑوی کے قریبی حلقے سے تھا۔ بسمل صاحب مریدِ خاص جبکہ نبی بخش صاحب وہاں کے رہائشی اور درباری قوال تھے۔ ان اصحاب کو قلندر کریمؒ نے شہید رسالت ﷺ کی آخری رسومات میں حاضری کی غرض سے بھیجا۔

آخر کار بعد نماز جمعہ تقریباً چار بجے آپ کو بھلہ شریف کے نزدیک غازی محل میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ لحد میں صندوق سے جو اضافی جگہ بچ رہی اس میں عقیدت مندوں نے پھول پھینکنے شروع کر دیئے اور چند لمحات کے اندر ہی آپ پتیوں کے ڈھیر میں دب گئے۔ آپ کے دوست مولا بخش نے پتھر لگائے اور پھر مٹی ڈالنے کا کام مکمل ہو گیا۔ بکتا کہ حورانِ خلد، کشورِ حسن کے احاطے میں اشارۂ ابرو سے کہہ رہی ہیں، شہنشاہ عالم ﷺ کی رحمت کا تقاضا تھا کہ پسینے کے چند قطرے کفن کی چادر پر ٹپک پڑیں۔ اب ان کی خواب گاہ محشر تک مہکتی رہے گی۔



بھلہ کریالہ کے بالکل قریب شمال مشرق میں پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ غازی محل میں کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو زیبائی و رعنائی کا ایک نیا جہان نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ مقبرۂ شہید گویا آئینے کے سامنے آئینہ ہے۔ نہایت دلکش اور حسین و جمیل نقشہ۔ ایک خوبصورت مسجد، حجرہ، مجلس خانے، کنواں، برآمدہ اور لنگر خانہ۔ مرقدِ غازی کے دائیں طرف آپ کی والدہ حضور کا مزار ہے جو ۱۹۶۲ء میں فوت ہوئیں۔ بائیں سمت شہید موصوفؒ کی رفیقۂ حیات آرام فرما ہیں، جن کا سانحہ ارتحال ۱۹۴۳ء میں پیش آ گیا تھا۔ غازی صاحب کی والدہ مرحومہ نے بقیہ زندگی کے زیادہ ایام غازی محل میں ہی بسر کئے۔ آپ کی اہلیہ نے بھی نکاح ثانی کو پسند نہیں کیا تھا اور صبح و شام اپنے عظیم خاوند کی تربت کے قریب رہیں۔

ابتداً چھت کے لئے لکڑی استعمال کی گئی تھی، اب اس کی جگہ لنٹر نے لے لی ہوئی ہے۔ مزار کا سنگِ بنیاد قلندر کریمؒ نے تدفین کے تین دن بعد اپنے دست مبارک سے رکھا۔ کام شروع ہوا تو شہید موصوف کے ایک تعلق دار امیر محمد خاں نامی نے جو ہانگ کانگ میں سروس کرتے تھے، کچھ رقم از راہ عقیدت پیش کی۔ زیادہ تر مصارف اہل خانہ نے خود ہی برداشت کئے۔ پہلے مجاور کا نام مہر

دین ہے جو ہندوستان کے کسی شہر سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ غازی محل میں بہت سے لوگ مدفون ہیں۔ باغ بہشت کے کئی دریچے اس سمت کھلتے ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، تر و تازگی بخشتی رہتی ہے۔

غازی مرید حسین شہید کی خواہ گاہ ادب و احترام کی دنیا میں شیشے کا نرم و نازک گھر ہے۔ مئے آتشیں کے نشے میں چور عالم وارفتہ حال میں مسرور۔ یہاں جو بھی آیا وہ پلک نوا تھا اور دیدہ بہ گریاں۔ حسیناؤں نے ان کی صبا خرامی اور نکہت رفتاری کے آگے اپنی گول مٹول اور چمکدار آنکھیں بچھائیں۔ ان کا تعارف سرخمیدہ اور اخلاق حمیدہ کے حوالے سے ہے۔

آستانۂ شہید کا ہر زائر اشکوں کے موتی لٹا گیا۔ یہاں درد اور سوز کی دولت عام ہے۔ سوز سے سوزِ جگر مراد ہے اور درد سے درد دل۔ اس درگاہ سے شاید ہی کوئی مئے آشام، تشنہ لب اٹھا ہو۔ بے طلب ملتا ہے مگر بقدر ظرف۔ آپ کا مقبرہ آج بھی مرجع خلائق ہے۔ شوق زیارت میں ہزاروں لوگ حاضری دیتے ہیں۔ ہر ایک کے آنے کا رنگ علیحدہ ہے اور جانے کا ڈھنگ بھی جدا۔ کسی کو جھومتی زندگی مل جاتی ہے، کسی کو راہ کے پیچ و خم۔ اپنے اپنے مقدر اور تلاش کی بات ہے۔



سر دلبراں

حضرت قبلہ قلندر کریمؒ، غازی مرید حسین شہیدؒ کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ نے پھانسی سے ایک دن پہلے جہلم میں ملاقات کی اور لالہ موسیٰ چلے گئے۔ دو تین روز بعد بھلہ شریف میں قدم رنجہ فرمایا۔ بعض لوگوں نے پوچھا کہ حضور! آپ تجہیز و تکفین کے وقت کیوں تشریف نہ لائے؟ جواب ملا: محبوب الٰہی حضرت نظام الدینؒ نے آخری وقت میں حضرت چراغ دہلوی کو نصیحت فرمادی تھی کہ امیر خسرو کو میری قبر پر نہ آنے دینا۔ اس کا سبب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ان کے آنے سے باطن کا راز فاش ہو سکتا ہے۔ پردۂ لحد ان سے برداشت ہو سکے گا نہ داغِ ہجر کا کرب میں جھیل سکتا ہوں۔

خواجہ چاچڑوی قلندرانہ صفات کے حامل تھے۔ جذب و مستی ان کے ہر گوشۂ زندگی پر محیط رہی۔ بعد از شہادت تو گویا آپ اپنے مرید کے دیوانے ہو گئے تھے۔ ہر وقت روتے رہتے۔ البتہ ان کے ذکر سے خوش ہوتے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے: بات تب بنتی ہے، جب پہچان کروانے

والا موجود ہو اور کرنے والا بھی۔ اصل مین درد والے ہی فرزانے ہوتے ہیں مگر بظاہر یہ لوگ دیوانے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک بار آپ سے پوچھا گیا کہ کبھی غازی صاحبؒ کی زیارت بھی نصیب ہوئی ہے۔ فرمایا: ''میرے جیسے گنہگار کو زیارت......'' یہ فرماتے ہوئے آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور بے ساختہ پکار اٹھے:

''مجھ میں وہ مستی کہاں، جو میرے دیوانے میں ہے!''

پیر صاحب نے غازی مرید حسین شہیدؒ کا مقبرہ اپنی زیر نگرانی تعمیر کروایا۔ روز شہادت کے بعد آپ زیادہ مدت بھلہ شریف میں ہی ٹھہرے رہے۔ آخری دنوں میں جب آپ حالتِ سکر میں تھے اور عام ملنا جلنا بند کر رکھا تھا، بذریعہ مکتوب شہید محبت کے اقارب کو چاچڑ شریف بلوایا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی آپ وجد میں آ گئے اور فرمانے لگے: ''خدا کی قسم! میرا جسم تو یہاں پڑا ہے، لیکن روح ہر وقت بھلہ میں رہتی ہے۔ اگر مرشد کا حکم نہ ہوتا تو میں اپنی قبر بھی مرید کے قدموں میں بنواتا''۔



رب نواز (ڈسپنسر) آف ڈوہمن کا بیان ہے: مجھے غازی صاحب سے ہرگز کوئی عقیدت نہیں تھی اور کبھی مقبرے پر حاضر بھی نہیں ہوا تھا۔ مگر آج سے چند سال پہلے کا ذکر ہے ایک روز میں نے خواب میں دیکھا کہ اچانک غازی مرید حسین شہیدؒ کے مزار پر حاضر ہوں۔ مسجد کے صحن میں ایک خوبرو نورانی صورت نوجوان تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے غازی محل کے متعلق دریافت کیا۔ ارشاد ہوا تشریف رکھیئے! میں ہی صاحب مزار ہوں۔ اس پر میں دست بستہ عرض کرنے لگا کہ میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔ انہوں نے کہا: ذرا ٹھہریئے! میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نور کا ایک جانفزا جھونکا آیا زمین سے آسمان تک اجالا ہو گیا۔ اسی اثناء میں رسول اکرم ﷺ جلوہ فرما ہوئے۔ اس پر غازی صاحب استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ میرا تعارف کروایا گیا۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ آج تک یہ نشہ میرے حواس پر چھایا ہوا ہے۔ میرے مقدر کا ستارہ چمک اٹھا تھا۔ صبح گاڑی لے کر بھلہ شریف آیا اور مقبرے کی زیارت کی۔ یہاں ہو بہو وہی منظر تھا جو رات میں نے خواب میں دیکھا''۔

اس طرح ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں خارقِ عادت واقعات رونما ہوئے ہیں۔ جب غازی مرید حسین شہیدؒ کا مقبرہ تکمیل کے مرحلے سے گزر چکا تو تعویذ مبارک سے شہد رسنا شروع ہو گیا۔

اس سے ہر روز بیسیوں زائرین فیض یاب ہوتے رہے۔ خواجہ غلام نصیر الدین صاحب نے ''مرقع قلندر'' میں اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ محبت کے عالم میں حضور قلندر کریمؒ سے رہا نہ گیا تو غازی صاحب کے مزار پر بوسہ دیا۔ جس جگہ آپ نے بوسہ کے لئے دہن رکھا وہاں سے شہد نکلنے لگا۔ اس وقت آپ کے پاس چند غلامانِ باصفا بھی موجود تھے۔ ضلع جہلم کے سینکڑوں باشندے اس شہد سے مستفیض ہوئے۔ جب اس بات کا راز افشا ہوا تو شہد نکلنا بند ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا: کاش! تم اس راز کو سربستہ رکھتے تو واللہ! یہ شہد روزِ حشر تک اس مزارِ اقدس سے نکلتا رہتا۔

رقم الحروف کو اس بارے میں چند مزید معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ شہد کا یہ فیض تین چار ماہ تک جاری رہا۔ جب خواجہ قلندر کریمؒ کو اس بارے میں بتایا گیا تو آپ نے تعویذ کو از سرِ نو تعمیر کروانے کا حکم دیا۔ اس پر عمل کیا گیا اور یوں شہد نکلنا بند ہو گیا۔

الحاج خیر مہدی صاحبؒ کے خوش قسمت فرزند دلبند غلام اکبر بیان کرتے ہیں:

''میں خانہ کعبہ کے طواف میں محو تھا کہ یکا یک میرے دل میں یہ خواہش مچل اٹھی کہ کاش مقدور ہو اور میں حرم شریف کے اندر داخل ہو کر نفل گزار سکوں۔ حسنِ اتفاق سے اسی دن بیت اللہ کا دروازہ بھی کھولا جانا تھا، اس لئے کہ غسل کے پروگرام کو آخری شکل دی جائے۔ میرے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن پیدا ہوئی۔ مجھے کسی طرح پتہ چل گیا کہ جن صاحب کی زیرِ نگرانی یہ تمام کام ہونا ہے، وہ میرے پاس ہی سے گزر رہے ہیں۔ میں غیر ارادی طور پر ان کے پیچھے چل پڑا۔ میری چال سے انہیں گمان گزرا کہ تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ اچانک رک گئے اور پیچھے آنے کی وجہ دریافت کی۔ بندے کی زبان سے بلا جھجک آرزو کا اظہار ہو گیا۔ انہوں نے کہا یہ کام آسان نہیں ہے۔ بہر حال آپ کل علی الصبح مجھے مسجد الحرام کے صدر دروازے پر ملیں۔ ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ جانے کیا وجہ ہے میں آپ کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ رات بھر مجھے اضطراب رہا۔ یہ تو بتائیے کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اور اس کشش کا سبب کیا ہے؟

میں نے غازی صاحب کے تعارف اور ان سے اپنی نسبت کا مکمل

حال بیان کیا۔ وہ میرے ساتھ چل پڑے۔ مگر رضا کار نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا کہ تمہارے پاس اجازت نامہ نہیں ہے۔ میرے اجنبی کرم فرما نے بہت کوشش کی لیکن کوئی محافظ بھی اپنے طور پر اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ بالآخر یہ بات حاکم اعلیٰ کے علم میں لائی گئی اور اس نے تمام صورتحال سے آگاہ ہو کر مجھے اس شرف سے بہرہ ور ہونے کا حکم جاری کر دیا۔ کہاں میں اور کہاں یہ سعادت! اب میں سوچتا ہوں تو مقدر پر غرور آجاتا ہے۔ انہی کی نسبت کا اثر ہے کہ میرے ایمان کا چمن مہک اٹھا۔ آپ ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں تنہا کب ہوں!''



ایک شاعر ایک ادیب

غازی مرید حسین شہیدؒ کے تعارف کی خاطر یہ حوالہ ہی کافی ہے کہ وہ رسول پاک ﷺ کے عاشق صادق تھے۔ کچھ عرصہ قید رہے اور جام شہادت نوش فرما کر دائمی عزت ولازوال شہرت کے مستحق قرار پائے۔ بنا بریں ان کی زندگی کا ایک پہلو ذوق ادب اور شاعری سے عبارت ہے۔ ان کے مخطوطات، ملفوظات اور نگارشات یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ بحیثیت شاعر وادیب بھی ان کا قد کاٹھ نہایت بلند اور پرکشش ہے۔ جہد مسلسل کے بعد ان کا جو کلام بہم پہنچا وہ اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ اگر سرمایۂ سخن کا تمام ذخیرہ اور خطوط دستیاب ہو جاتے تو شہید موصوف اس لحاظ سے بھی بڑا نام پاتے۔ مگر اسے گردش دوراں کہیئے یا ناقدریٔ عالم کا صلہ کہ اس متاع بے بہا کا بہت بڑا حصہ ہم سے چھن گیا۔ شائد قدرت کو یہ گوارا ہی نہیں تھا کہ ناموس رسالت ﷺ کا غیور محافظ باعتبار ادیب وشاعر پہچانا جائے۔

قبلہ غازی صاحبؒ کے مطبوعہ کلام کے مرتب محمد منیر نوابی صاحب نے تلاش وجستجو کا حال کچھ یوں بیان کیا ہے: ''جنوری ۱۹۶۵ء کی بات ہے محترم پروفیسر ملک انور بیگ اعوان (گورنمنٹ کالج چکوال) سترہویں صدی کے نامور صوفی شاعر حضرت شاہ مراد خانپوریؒ پر تحقیق کر رہے تھے۔ آپ کے کئی مضامین اخبارات میں اشاعت پذیر ہوئے جو علمی اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اس پر میں نے پروفیسر صاحب کی توجہ عاشقِ رسول غازی مرید حسین شہیدؒ اور ان کی شاعری کی طرف مبذول کرائی۔ اس گزارش کے جواب میں اعوان صاحب

نے ۳۱۔ جنوری ۱۹۶۵ء کو ایک خط کے ذریعے مجھے مطلع فرمایا کہ غازی مرید حسین کا کلام آئندہ عرس (یوم شہادت) تک چھاپ دیا جائے گا میں مطمئن ہو گیا کیونکہ اُردو مجلس چکوال کی کارکردگی پر مجھے بھروسہ تھا۔ اسی سال کے دوران دارالاشاعت اُردو مجلس چکوال کی اولین پیشکش 'سبزہ بیگانہ' منصۂ شہود پر آئی پروفیسر ملک اللہ بیگ صاحب 'سبزہ بیگانہ' کی مجلس ادارات کے ممتاز رکن تھے۔ انہوں نے باکمال مہربانی اپنے دستخط سے ۴۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کو وہ کتاب مجھے عنایت فرمائی۔ اس میں بیگ صاحب کا یہ مضمون بھی شامل تھا۔ ''غازی مرید حسین شمع رسالت ﷺ کا ایک پروانہ''۔

یہ مضمون میرے لئے بڑی روحانی کشش رکھتا تھا۔ کتابی سائز کے سولہ صفحات پر پھیلے ہوئے اس مضمون کو دیکھتے ہی دیکھتے پڑھ ڈالا۔ پروفیسر صاحب کی کاوش اپنی جگہ پر قابل داد تھی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میری تشنگی باقی رہی۔ اس لئے غازی صاحب کے حالاتِ زندگی، کارنامے اور شاعری کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی آرزو لئے نگری نگری پھرا۔ بہت سے بزرگوں سے ملتا رہا۔ کئی بار بھلہ شریف گیا لیکن یہ سن کر دلی صدمہ ہوا کہ غازی صاحب کا کلام، خطوط اور دوسری تمام نگارشات مولوی ممتاز علی صاحب ایم اے (سابق ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چکوال) کے ہاں سے ضائع ہو چکی ہیں۔ میرے لئے اس ضیاع پر یقین کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اس قومی، ملی اور ادبی سرمایہ کی گمشدگی پر چپکے چپکے چند آنسو بہا کر سکوت میں غرق ہو گیا۔ لیکن آرزوئے ناتمام اور عاشق رسول کی روح نے پل بھر چین نہیں لینے دیا۔ ایک بار پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ اب کے عزیزی اخلاق احمد (گورنمنٹ ڈگری کالج چکوال) اور برادرم چودھری محمد ایوب صاحب (گورنمنٹ ہائی سکول چکوال) نے دست تعاون دراز کیا۔ انہوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ غازی صاحب کی نگارشات میں سے کچھ بھی کہیں سے دستیاب ہو جائے۔ آخر مصداق جوئندہ یابندہ...... تلاش بسیار اور جہد مسلسل کے بعد اخلاق احمد کے ذریعے اللہ نے میری قلبی آرزو پوری کر دی، ہوا یوں کہ ملک اخلاق احمد کے ایک عزیز اور غازی صاحب کے ہم نام رشتہ دار مرید حسین کے ہاں جب اچھی طرح تلاشی لی گئی تو خوش قسمتی سے ایک انتہائی بوسیدہ کاپی مل گئی، جس میں غازی صاحب کے دست مبارک سے پنسل کا لکھا ہوا کچھ پنجابی اور اُردو کا کلام محفوظ تھا۔ اس تاریخی کاپی کے بارے میں چند ضروری گزارشات پیش کی جاتی ہیں۔

○ ...... کاپی میں تمام اشعار کالی پنسل سے لکھے ہوئے ہیں لیکن صفحات کے نمبر سرخ پنسل سے لگائے گئے۔ بعض صفحات بڑی دقت سے پڑھے جاتے ہیں۔

o......کاپی کے کل صفحات چوہتر تھے لیکن ان میں سے تیس صفحات خالی، چوبیس غائب اور صرف بیس صفحات پر اُردو اور پنجابی تحریریں ہیں۔

o......غائب اور موجودہ لکھے ہوئے صفحات کی ترتیب دیکھ کر قیاس ہے کہ غائب شدہ صفحات پر بھی کلام ہوگا، لیکن بدقسمتی کہ ان سے ملک وملت اب محروم ہو چکے ہیں۔

o......پنجابی کلام میں زیادہ تر ایم، اپچ (مرید حسین) اور اُردو میں اسیر لیکن بعض اشعار میں دونوں تخلص اکٹھے بھی استعمال کئے گئے ہیں۔

o......اُردو کلام میں دو شعر ایسے بھی ہیں جن میں اُردو اور پنجابی ملی جلی ہے۔ نیز اُردو کلام کے شروع میں غازی صاحب نے خود یہ عنوان دینا پسند فرمایا ہے...... ''خیالات اسیر۔'' لیکن پنجابی کلام کے آغاز میں کوئی بھی عنوان نہیں۔''

نوابی صاحب کی بیان کردہ روداد اور بیاض کی آپ بیتی اس خیال کو تقویت بخش کر یقین کے درجہ تک پہنچا دیتی ہے کہ پھٹے ہوئے اوراق پر بھی شہید موصوف کا اُردو و پنجابی کلام درج تھا۔

غازی صاحب کا انداز بیان، الفاظ کی بندش، رفعت خیالی اور کلام میں پختگی اس امر کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے سنِ شعور میں قدم رکھتے ہی سخن آرائی شروع کر دی تھی۔ نیز آپ ابتدا سے ہی خوش فکر تھے۔ مزید برآں یہ کہ مذکورہ بیاض کے علاوہ بھی کئی جگہوں پر شہید رسالت کا منظوم کلام موجود ہوگا۔



بنابریں خود راقم الحروف نے چاچڑ شریف (سرگودھا) کے سجادہ نشین جناب صاحبزادہ محمد یعقوب صاحب سے رابطہ کیا کہ شاید شہید موصوف کا کوئی خط یا دیگر معلومات مل جائیں۔ ان کی طرف سے آپ کے صاحبزادے جناب ریاض الدین مخدوم نے اظہار دلچسپی فرمایا۔ جب میرے الفاظ میں شدت جذبات کی تلخی آ گئی تو جناب صاحبزادہ صاحب نے مکتوب ثانی میں اپنی کاوشوں سے مطلع فرماتے ہوئے ۸۔ مئی ۱۹۸۶ء کو تحریر فرمایا:

''عرس مبارک کے موقع پر چاچڑ شریف میں مولوی ممتاز صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے عرض کی تھی کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے، وہ عنایت فرمائیں، پھر واپس کر دیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی مسودہ نہیں ہے۔ البتہ اگر کمال صاحب تشریف لائیں تو مجھے جو زبانی یاد ہے بتا دوں گا...... جلد ہی ''حیات عزیز'' بھیج دوں گا''۔

چودھری خیر مہدی صاحب کے بقول: غازی صاحب نے سفرنصیب کے آغاز سے لے کر جام شہادت نوش فرمانے تک ایک سو کے قریب خطوط تحریر فرمائے تھے۔ حصار جیل میں قید کے دوران جب پہلی دفعہ آپ کو سزائے موت سنائی گئی تو آپ نے تسلی کی غرض سے میرے نام ایک طویل خط لکھا۔ حرف بحرف از بر تو ہے نہیں مگر مضمون کا مزاج تحریر اور خلاصہ کچھ یوں ہے:

- ''......دعا، کچھ کہئے نا، کیا حال ہے؟ کس قدر خوش ہوں، الفاظ کی قبا نہیں پہنا سکتا اور لکھ بھی چکا تو آپ سمجھ نہیں سکیں گے۔ میرے مالک نے لطف و کرم کی بارش کر رکھی ہے۔ بادل رحمت ہر وقت مائل بہ کرم ہیں۔ یہ نہ پوچھئے کہ خدائے لم یزل نے کیا کیا احسان فرمائے البتہ پوچھنے کی بات یہ ہے کہ مجھ پر کیا کیا آسائش نہیں اتری۔ اچھا، سچ کہے دیتا ہوں۔ مجھ پر رب کریم کے احسانات بیان سے باہر ہیں۔ بھلا مالک حقیقی کی عنایات کا شمار ممکن ہے؟ رہنے کو ایک مکان مل گیا، جس میں تمام جہان کی رعنائیاں اور وسعتیں سمٹ آئی ہیں اور اپنا وجود پوری کائنات میں پھیلتا دکھائی دے رہا ہے۔ ہوا کے ہر جھونکے میں خوشبوئیں رچی ہیں۔ اسے مشک نافہ کا فسانہ مت جانیے، یہ تو میرے آقا و مولا ﷺ کے گیسوؤں کی مہک ہے۔''

آپ کے ایک اور خط میں اس طرح کا مضمون تھا:

- ''......لوگ مجھے موت سے ڈرانے آتے ہیں۔ ان کی عقل کو پیٹوں یا انداز فکر پر روؤں۔ موت تو ایک اچھا رفیق ہے! انسان اسے زندگی بھر بھلائے رکھتا ہے اور یہ ایک گھڑی بھی فراموش نہیں کر پاتی۔ اُسے وفا کہتے ہیں۔ جو بھول جائے وہ دوست ہے اور نہ یاد کرنے والا قابلِ دوستی۔ یاد وہ کرتے ہیں جو بھول جائیں اور جو کبھی بھولے ہی نہ ہوں وہ یاد کیونکر کریں۔ معراج محبت تو یہ ہے کہ اگر کوئی طالب کو دیکھے تو اسے مطلوب کا دیدار ہو جائے اور محبوب کے طلبگار چشم حیرت سے محبّ کو دیکھا کریں......زندگی موت سے بہتر اور موت زندگی سے حسین ہونی چاہئے۔ میں زندگی کو اپنے رسول ﷺ کی خاکِ قدم پر نچھاور کر کے اس وادی میں پہنچنا چاہتا ہوں، جہاں میرے سجدوں کو ٹھکانا مل جائے''۔

ابتدائی خطوط میں سے ایک کا انداز تحریر یوں تھا۔ یہ چودھری موصوف کے خط کے جواب میں لکھا گیا، جس میں والدہ کی بیماری اور مکان گرنے کی اطلاع دے کر آپ کو واپس آنے کے لئے کہا گیا تھا۔

O ''......ایسا مکان جو ایک بار والد بنائے، پھر بیٹے کو مشقت اٹھانی پڑے۔ وہ مکان اچھا ہے نہ مکیں اچھا۔ مکان ہمارے لئے ہیں، ہم مکانوں کے لئے نہیں۔ معلوم ہوا مکانات گر گئے۔ چلو گرے رہیں۔ میں وہ بنیاد اٹھا رہا ہوں، جن پر ایک ایسی عمارت کھڑی کی جائے گی جو تا قیامت نوجوانانِ ملت کے ایمان گرمائے رکھے اور زندگی کا راز بخشے گی۔ والدہ حضور کے بیمار ہونے کی اطلاع میرے لئے ایک امتحان ہے مگر میں اس ذات کی عزت کے تحفظ کی نیت لے کر گھر سے نکلا ہوں، جس نے ہمیں ماں کا احترام سکھایا۔ مجھے اطمینان اس بات سے ہے کہ میری ماں ممتا کے ہاتھوں مجبور یہ کوتاہی معاف فرما دیں گی۔ کیا والدہ صاحبہ اس کو برداشت کرسکتی ہیں کہ میں اپنا مقدس مشن ادھورا چھوڑ کر چلا آؤں؟''



محمد منیر نوابی صاحب کی رپورٹ سے یہ انکشاف ہو چکا ہے کہ غازی مرید حسین شہیدؒ اُردو کلام میں اپنا تخلص اسیر کرتے تھے، جبکہ پنجابی اشعار میں ایم، ایچ لکھتے۔ آپ کی نثر نگاری کا مختصر سا تجزیہ تو ہو چکا، اب ان کے منظوم کلام کی طرف ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں جس میں سوز و ساز اور جوش و جلال کا رنگ جا بجا ملتا ہے۔ ان کے شعروں میں مرزا غالب کی شوخی وجدت، میر کا حزن و ملال، خواجہ درد کا تصور دردمندی اور اقبال کے جذب وفقر کا تاثر موجود ہے۔ صوفی اسے عارفانہ شاعری کا گنج معانی اور سرمایۂ لاثانی کہے گا۔ سالک کے حصے میں ہر لحظہ نیا دلولہ اور وجد آفریں سرور آئے گا۔ مجذوب کے لئے آرزوئے دید، ہجر و فراق، عشق و مستی اور معرفت و معانی کے دریا موجزن ہیں۔ ایک ایک حرف میں تمام شاعرانہ شوخیاں، بلند پروازیاں، ادیبانہ لطافتیں، حسن اور رعنائیاں موجود ہیں۔ الغرض ان کا انداز بیان نپا تلا، الفاظ کی بندش موزوں اور ترنم دلنواز ہے۔ آپ کے کلام میں پیغام ہے اور غنایت بھی۔ سفر کا ذوق اور منزل پر پہنچنے کی تڑپ بھی ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے قلم سے ٹپکنے والا ہر لفظ نوائے دل کی تفسیر ہوتا تھا۔ غازی مرید حسین شہیدؒ ہی کا ایک شعر ہے۔

یاالٰہی! اس اسیر خستہ جاں کو دار پر
خواہش دیدار احمد کے دگر کچھ بھی نہیں

^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^

غازی میاں محمد شہیدؒ

اٹک کا علاقہ پاکستان کا مردم خیز خطہ ہے۔ جانبازوں اور سرفروشوں کی یہ سرزمین عہد آفریں جدوجہد اور جرأت وحمیت کے لازوال کارناموں کی امین ہے۔ اس دھرتی کے کئی سپوت ایثار وخلوص اور عشق ومستی کی روشن تاریخ کا عنوان بنے۔ ان گنت مجاہد قومی تاریخ کے اوراق پر جلی حروف بن کر ابھرے۔ تحریک آزادی میں یہاں کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ آزادئ کشمیر کی خاطر سینکڑوں نوجوانان قوم سروں پر کفن باندھ کر میدان عمل میں آئے۔

اگر پنجاب کے نقشے کو غور سے دیکھا جائے تو چند لکیروں میں گھرے ہوئے اس علاقے کی نشاندہی میں کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حکومت پاکستان نے انتظامی امور کے باعث چند برس قبل ضلع اٹک کی پیشانی پر خطِ فاصل کھینچی تو ''چکوال'' کے نام سے ایک اور ضلع کا یوم تاسیس منایا گیا۔ اس شہر کے قرب وجوار میں دو مقام امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔ بھلہ کریالہ ان میں سے ایک ہے جسے شہید محبت، پروانہ شمع رسالت ﷺ غازی مرید حسین کے مسکن ومولد ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ دوسرا قصبہ، تلہ گنگ کے نام سے ملقب ہے، جہاں محبوب خدا کے عاشقِ صادق، فدائے محبت، غازی میاں محمد شہیدؒ پیدا ہوئے جنہوں نے دیار غیر میں اپنے پاک لہو سے وفا کیشی کی کتاب رقم کی اور ان کا خون، چہرہ ملت کو سرخی بخش گیا۔

یہ ہندی مسافر، قافلہ سالار عشق مولانا جامیؒ کے نقش پا کا کھوج لگاتے جب دربار رسالت مآبﷺ میں پہنچا تو ساقی کوثرﷺ کے حضور میں اپنے منفرد مقام پر فائز ہوا۔ مقام عشق! مقدور ہو تو جی چاہتا ہے کہ کفش شہیدؒ کو سر کا تاج بناؤں اور دیوانہ مصطفیٰ ﷺ کے پاؤں سے آنکھیں ملتا رہوں۔

تیرے قدموں میں جو ہیں غیر کا منہ کیا دیکھیں
کون نظروں پہ چڑھے دیکھ کے تلوا تیرا

غازی میاں محمد کا تعارف اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ایک مستانہ خواجۂ یثرب کی حرمت و توقیر پر نثار ہو کر عشق ومحبت کی زندہ علامت بن گیا۔ بالیقین بارگاہ حق میں ان کی مخلصانہ قربانی منظور ہوئی۔ جذبۂ محبت ابھارنے کی خواہش دل میں مچلتی ہے۔ عشق رسول ﷺ اور عاشق رسول سے متعلق، مقدس دستاویزات کو اوراق میں محفوظ کرنے کا تقاضا پیش نگاہ ہے۔ قوم کے محسنوں کی زندگی کے مخفی پہلوؤں کو منظر عام پر لانا ایک اہم فریضہ ہے۔ نادر روزگار شخصیتوں سے متعلق جملہ

موضوعات اگر صفحات کی زینت نہ بنائے گئے تو خدشہ ہے کہ آئندہ نسلیں مشاہیر سے لاعلمی کے سبب کہیں ان کی عظمت کردار سے ہی منحرف نہ ہو جائیں۔

شہید موصوف اعوان برادری کے لاڈلے چشم و چراغ تھے۔ اعوان قوم کے جد امجد حضرت قطب شاہؒ جن کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے، محمد بن قاسم کی فوج کے ایک سردار تھے۔ اعوانوں کی غالب اکثریت کیمبل پور۔ میانوالی۔ چکوال اور سرگودھا کے اضلاع میں آباد ہے۔ اس لئے علاقہ مذکور کو 'اعوان کاری' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان ضلعوں کے علاوہ اس قبیلے کی بہت زیادہ تعداد حافظ آباد، ہزارہ اور جالندھر میں ہے۔ بنا بریں دیگر مختلف مقامات پر بھی اکا دکا خاندان پائے جاتے ہیں۔ سید الفقراء زندۃ الاولیاء حضرت قبلہ سلطان باہو صاحبؒ کی ذات باصفات سے متعلق ایک مشہور کتاب ''سلطان العارفین'' میں بھی اعوان قوم کی مختصر تاریخ درج ہے۔ اس کے مطابق دیبل اور سندھ کے علاقوں میں محمد بن قاسم کی مثالی فتوحات عمل میں آئیں تو حضرت قطب شاہ صاحبؒ اپنے چند لواحقین کے ہمراہ تبلیغ دین کے ارادے سے یہیں رہ گئے۔ آگے چل کر ان کی اولاد دندہ، شاہ بلاول اور جھنگ وغیرہ میں آباد ہوئی۔

لفظ اعوان کی مورخین اور علم نسب سے واقفیت رکھنے والے افراد نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں، جو معقول بھی ہیں اور وزنی بھی۔ لیکن عرب نژاد قبیلے کو عجم میں 'ملک' کب اور کیوں کہا جانے لگا، نیز اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ تاریخ اس بارے میں کوئی خاص رہنمائی نہیں کرتی۔ اس بارے میں کئی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں، لیکن وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال لغوی اعتبار سے 'ملک' کا معنی بادشاہ کا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لفظ بھی خالصتاً عربی زبان کی ملکیت و سرمایہ ٹھہرا۔ شاید علوی ہونے کی بنا پر ملک عرب میں بھی انہیں احتراماً ملک (سردار) ہی کہا جاتا ہو اور یہ تعارفی کلمہ بھی ان کے ساتھ ہی ساحل سمندر پر اترا اور آگے چل کر نام کے ساتھ بطور سابقہ چسپاں ہو کر رہ گیا۔ مگر ناواقفیت کی بنا پر یہاں بحث و تمحیص کے کئی پہلو نکل آئے۔

علاقہ اعوان کاری کا مرکزی شہر تلہ گنگ، جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے راولپنڈی کے ایک طرف سرگودھا اور کیمبل پور کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ اس اہم قصبے کی آبادی بیس ہزار سے کچھ زائد ہو گی۔ ایک صدی پیشتر اس کے شرقی حصے میں ایک نہایت نیک دل مسلمان اور متمول زمیندار ملک بڈھا خاں رہائش پذیر تھے۔ ان کے ہاں دولڑکے پیدا ہوئے۔ بڑے کا نام غلام محمد تھا جبکہ دوسرا ملک مرزا خان کے نام سے متعارف ہوا۔ اول الذکر فوج میں صوبیدار کے عہدہ پر فائز

رہے جبکہ موخر الذکر بطور تحصیلدار ملازمت کرتے تھے۔

دونوں بھائی نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ علاقے کی جانی پہچانی شخصیتیں تھیں۔لوگ اب بھی ان کی شرافت اور سادگی و ہمدردی کے مداح ہیں۔ کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ان کی خدمت دین کا زندہ ثبوت مسجد عید گاہ ہے۔انہوں نے سات کنال کا یہ ازحد اور قیمتی قطعہٴ اراضی ۳۵۔۱۹۳۴ء میں خانہٴ خدا کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد بنوائی گئی اور زندگی بھر اس کے حسن و خوبصورتی کے لئے کوشاں رہے۔

تحصیلدار مرحوم کے دو صاحبزادے ملک احمد حسین اور ملک عبدالرشید ہیں۔ آگے چل کر صوبیدار غلام محمد صاحب دائمی شہرت کے مستحق ٹھہرے، کیونکہ فرزند اکبر کی قربانی انہیں بھی لازوال کر گئی۔ جب کبھی غیرت و حمیت کی یہ ایمان پرور داستان چھڑتی ہے تو بیٹے کے ساتھ باپ کا تذکرہ بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

صوبیدار غلام محمد صاحب ۲۔ فروری ۱۹۰۲ء کو کوئٹہ میں فوج میں سپاہی بھرتی ہوئے تھے۔ ملازمت کے دوران ہی ان کی شادی خانہ آبادی کی رسم ۱۹۰۸ء کے قریب ادا ہوئی۔ ایک عرصے تک وہ اولاد جیسے میٹھے پھل سے محروم رہے۔ بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ۱۹۱۵ء میں ایک چاند سا بیٹا عطا کیا جس کا نام میاں محمد رکھا گیا۔آپ کی والدہ محترمہ کا نام فتح بیگم تھا جو نہایت نیک دل اور دیندار خاتون تھیں۔کون جانتا تھا کہ یہ بچہ غازی اور شہید کے دو بلند مرتبوں سے سرفراز ہوگا! شہادت بھی وہ کہ بڑے بڑوں کے دل مچل جائیں۔

آپ کے بچپن کے حالات و واقعات پر قریب قریب لاعلمی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا یوم پیدائش بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ مرقومہ بالا سن ولادت کے ساتھ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جب غازی موصوف تولد ہوئے مارچ یا اپریل کی کوئی تاریخ تھی۔ ننھے مہمان کی آمد پر بے حد خوشیاں منائی گئیں۔

پسر کا جنم، پدر کی شب تہجد کی دعاؤں کا ثمر تھا، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کا تارا ایک مدت تک بچشم خود نہ دیکھ پائے۔ ۱۲۴۔ بلوچ رجمنٹ کی خدمات، جس میں صوبیدار موصوف بھرتی ہوئے تھے، بین الاقوامی فوج کی ذمہ داری کے لئے مستعار لی جا چکی تھیں۔ لہٰذا اس پلٹن کو تین سال کے لئے چین بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک آپ چین میں رہے۔ مقررہ مدت گزر جانے پر جب یہ پلٹن واپس پہنچی تو تھوڑے عرصے بعد پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی اور پلٹن مذکور کو

مڈل ایسٹ کے علاقہ میں سمندر پار بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔

اس وقت تک ملک غلام محمد صاحب اپنی بہتر کارکردگی کی بنا پر جمعدار کے عہدہ پر فائز ہو چکے تھے، جنگ کی نازک صورتحال کے تحت دور دراز علاقوں کی طرف روانگی سے قبل وہ عزیز واقارب سے ملاقات کی خاطر گھر تشریف لائے اور چند دن ٹھہر کر طویل مسافت پر روانہ ہوئے۔ ان کی پلٹن عراق وشام اور فلسطین میں کافی عرصہ تک ٹھہری رہی۔ شام سے ایک ماہ کے لئے وہ استنبول (ترکی) بھی گئے۔ اس سفرنامہ کی اہم بات یہ ہے کہ دوران جنگ، مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے سلسلے میں جن خوش نصیبوں کی ڈیوٹی لگی ان میں ملک غلام محمد صاحب بھی شامل تھے۔ تین ماہ تک آپ یہاں مقرر رہے۔ ایک بار انتظامیہ کی اجازت سے مسجد اقصیٰ کو صاف بھی کیا۔ فرش دھونے میں ملک صاحب پیش پیش تھے۔ ایک رمضان شریف بھی وہیں گزارا۔ خانۂ خدا میں ان کی پرسوز مناجاتیں سندِ قبولیت لے کر لوٹیں کہ ان کی شریک حیات کی گود ہری ہوئی۔

روشن کئے ہیں دل میں تمناؤں کے چراغ
ویران بستیوں میں مسافر بسائے ہیں

تاج برطانیہ جس کی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، بالآخر اس کا دامن اقتدار ایک خطے میں سمٹ کر رہ گیا۔ آزادی کی دلہن جس کے رخساروں پر شہیدوں کے جمال افزا لہو کا غازہ سجا تھا، مسلمانان برصغیر کے حلقہ آغوش کی زینت بنی۔ مگر دوسری جانب سجدوں کی مقدس بارگاہ پر اک انوکھا ناٹک رچا کر ڈکٹیٹر آخری وصیت میں ناجائز اولاد کو اپنی وراثت کا حق دار ٹھہرا گئے۔

یہودی ان کے خانہ زاد جانشین تھے۔ اسرائیل کا معرض وجود میں آنا، قبلہ اول کے چھن جانے کا نوشتہ تھا۔ خدانخواستہ ہندوستان میں یہی عمل دہرایا جاتا تو بلاشبہ ہندو ہی انگریز باپ کی نمائندہ حکومت قائم کرتے۔ برطانوی عملداری میں صوفیاء کے دیس کے ایک فرد کو یادگار اسلام کے وسیع صحن میں سربسجدہ ہونے کا موقع تو مل گیا تھا، مگر آج ہماری جبینیں سجدوں کا حق مانگیں تو سنسناتی گولیاں پیشانیوں کو چومنے آجاتی ہیں۔ صوبیدار مرحوم نہایت ہی خوش نصیب تھے، جن کی جبین نیاز سے اس پاک سرزمین پر سجدے ٹپکتے رہے اور غازی میاں محمد شہیدؒ کی صورت میں دعاؤں کا صلہ ملا۔ یہ خوشخبری جلد ہی انہیں بذریعہ خط پہنچا دی گئی۔ لیکن وہ جنگ کے اختتام یعنی ۱۹۱۹ء تک وطن تشریف نہ لا سکے۔

جب ہلاکت و بربادی کے بعد آسمان دنیا سے جنگ کے بادل چھٹے تو بچے کی عمر پانچ سال کے لگ بھگ تھی۔ ایک برس بعد اسے تلہ گنگ کے شرقی محلے میں موجودہ گورنمنٹ ہائی سکول کے بالمقابل واقع پرانا پرائمری سکول جہاں اب گرلز ہائی سکول قائم ہے، داخل کروادیا گیا۔ ساتویں جماعت تک باقاعدگی سے پڑھتے رہے مگر اب کے ان کی طبیعت پڑھائی سے اچاٹ ہوگئی۔ مکتب جانا یوں ترک کیا کہ کوششوں کے باوجود اس جانب مائل نہ ہوسکے۔ وادیٔ شباب میں قدم رکھا تو ڈرائیوری کا شوق پیدا ہوگیا۔

ان دنوں وہاں کے دو ٹرانسپورٹروں شیخ فضل کریم اور شیخ محمد دینؒ صاحبان کی ایک بس تلہ گنگ اور انجرہ ومیانوالی کی طرف چلتی تھی۔ اس پر بیٹھ گئے لیکن مطابقت پیدا نہ ہوسکی۔ ذرا سنبھلے تو ۱۹۳۱ء میں کوئٹہ چلے گئے۔ وہاں چند ماہ ایک ٹھیکیدار کے ساتھ بطور منشی کام کیا۔ مگر طبیعت کو یہ ماحول بھی راس نہ آیا۔ ۱۹۳۱ء کے اواخر یا ۱۹۳۲ء کے آغاز میں واپس گاؤں چلے آئے۔ چند مہینے گزرنے پر ۱۹۳۳ء میں انڈین نیوی میں بھرتی ہوگئے۔

ملازمت کے دوران ہی غازی موصوف کا جشن عروسی منایا گیا۔ آپ کا نکاح ایک خوبصورت وخوب سیرت دوشیزہ 'نیک بخت' سے قرار پایا۔ جو آپ کی پھوپھی انارہ بیگم کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد محترم کا اسم گرامی سردار خان ہے۔ ان کی رہائش بھی تلہ گنگ میں تھی۔ سن وصال کے لحاظ سے آپ کی شادی شہادت سے قریباً پانچ برس قبل ہوئی۔ اگر ان کے پیمانۂ روز وشب کو شمار کیا جائے تو چھ سال کی عمر میں وہ مدرسہ میں داخل ہوئے۔ جب تیرہ برس کے قریب پہنچے تو تعلیمی امور سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا۔ تین چار ماہ کنڈیکٹری وڈرائیوری کے پیشے سے وابستہ رہے۔ پھر چند ایام بطور منشی کام کیا۔ سولہ سال کے ہوئے تو ملازمت اختیار کرلی۔ زندگی کی سترہ و بہاریں دیکھ چکنے کے بعد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ فوج میں نوکری کرتے ہوئے بمشکل ڈیڑھ برس گزرا ہوگا کہ کھیلتے ہوئے کسی ساتھی کی بدکلامی پر بگڑ گئے اور اسے ہاکی سے پیٹ ڈالا۔ نیوی ایکٹ کے تحت مقدمہ چلا۔ تین ماہ کی سزا دی گئی اور ملازمت سے برطرف ہوئے۔ الغرض سروس سے سبکدوش ہوکر گھر لوٹ آئے اور ایک برس کے قریب یہیں مقیم رہے۔

ازاں بعد اپنے والد محترم کے مشورے سے ۲۔ جنوری ۱۹۳۵ء کو بلوچ رجمنٹ میں سپاہی بھرتی ہوگئے۔ ابتدائی ٹریننگ کراچی میں مکمل کرنے کے بعد اسی سال اکتوبر میں مدراس بھیج دیئے گئے اور وہاں کی چھاؤنی جو سینٹ تھامس ماؤنٹ کے نام سے مشہور تھی کے مقام پر بلوچ رجمنٹ

نمبر ۱۰/۳ جس کا پرانا نمبر ۱۲۷ ہے میں جا شامل ہوئے۔

بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے کہ غازی صاحب فکرِ معاش کی الجھنوں میں مختلف مقامات کے بلا مقصد فاصلے ناپتے رہے۔ لیکن گہرائی میں جانے سے قدرت کے کسی اور فیصلے کی غمازی ہوتی ہے۔ طبیعت میں لا ابالی پن اور کسی مشغلے میں جی کا نہ لگنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی ذات صرف گردش روزگار سے نپٹنے کو پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ان کے افکار بلند تھے جن کی تکمیل ایسے مشاغل سے ممکن نہیں ہو سکتی۔ قیام کراچی کے دوران بھی انہیں ایک روح پرور مشاہدہ کرانا مقصود تھا۔ جو تاریخ اسلام کا ایک اچھوتا حصہ ہے۔ لیکن اس خواب کی تعبیر تلہ گنگ میں نہیں مدراس میں پوری ہونا تھی۔ سو اس جگہ تدبیر نے تقدیر کو مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

وثوق سے کہا جاتا ہے کہ غازی موصوف نے ٹریننگ مکمل کر چکنے کے بعد وطن کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یقینی ہے کہ وہ کراچی سے ایک دو بار ضرور گھر تشریف لائے ہوں گے۔ ۱۴۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو جب کراچی کی زمین لالہ زار بنی اور پورے شہر کی فضا شہیدوں کے لہو سے مہک اٹھی تو غازی صاحب بھی وہیں تھے۔ یہاں کی سڑکوں پر شہید رسالتؐ کے متوالوں کے خون کے جا بجا بکھرے ہوئے چھینٹوں کا جانکاہ منظر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ حرمتِ رسولؐ پر قربان ہونے والوں کی عزت افزائی کا نظارہ بھی کیا۔

غازی عبدالقیوم شہیدؒ نے ۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کو اپنی وفاؤں کا پہلا باب رقم کیا اور آئندہ سال نصف مارچ گزر جانے پر موصوف کو رسالت مآبؐ سے وفاؤں کا صلہ ملا۔ اس لحاظ سے جب غازی عبدالقیوم کراچی میں مسلمانانِ ہند کے دلوں کی دھڑکنیں بنے ہوئے تھے۔ ملک میاں محمد شہیدؒ بھی قریباً چھ ماہ اس دھرتی پر فروکش رہے۔ تاہم اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ انہوں نے غازی عبدالقیوم شہیدؒ سے کبھی ملاقات کی یا نہیں۔ البتہ ذہنی ہم آہنگی اور ایک ہی منزل کے مسافر ہونے کے ناطے سے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر یہ واضح ہے کہ اس کیفیت نے ان پر فلسفۂ زندگی آشکارا کیا اور وہ اس دن سے چشمۂ حیوان کی جستجو میں مضطرب رہنے لگے۔

مدراس میں ہی صوبیدار اللہ دتہ (۱۴۔ جنوری ۱۹۸۴ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے) نے جو آپ کے قریبی دوست۔ ملازمت کے ساتھی اور منہ بولے بھائی تھے، مرید حسین کی سرفرازئ شہادت کا تذکرہ سنایا، جو ۲۴۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو واصل بحق ہونے والے تھے۔ صوبیدار مذکور موضع

''جنگا'' کے رہنے والے تھے۔ یہ گاؤں شہید مرید حسینؒ کے مسکن سے صرف ڈیڑھ میل دور جانب مغرب واقع ہے۔ یاد رہے کہ دونوں دیہات تلہ گنگ سے چند کوس کے فاصلے پر ہیں۔

چمن چمن اسے پھولوں کی جستجو کیوں ہے
وہ ایک شخص جو خود دامن بہار میں تھا

ملک میاں محمد صاحب محبت کی راہوں پر رواں دواں مدراس پہنچ چکے تھے۔ اب مرحلۂ شوق طے کرنا باقی تھا۔ دنیائے عشق میں آفتاب بن کر چمکنے سے پہلے ان کے شب و روز کس طرح بسر ہوئے، فکر و تخیلات کے سمندر میں مدو جزر کی کیفیات معلوم نہیں ہیں، کیونکہ عرصۂ ملازمت میں انہوں نے اہل خانہ کو جتنے خطوط ارسال کئے تھے وہ محفوظ نہیں رہ سکے۔ احباب اس لئے کچھ نہیں کہہ پاتے کہ نگاہِ سب رنگ میں کون جچتا تھا کہ ان کے معمولات پر توجہ کی جاتی۔ آپ کا بچپن عام بچوں سے مختلف تھا نہ لڑکپن میں کوئی نمایاں خصوصیت! جوانی کے ایام بھی عام جوانوں سے مشابہ تھے۔ اب جانے ان کے نام میں کون سی کشش ہے کہ ہونٹوں پر مچل جائے تو طراوت ملتی ہے اور اگر رودادِ محبت دہرائیں تو احترام سے گردنیں جھک جاتی ہیں۔

وہ کیا معاملہ تھا جو بندۂ احقر کو باوقار کر گیا؟ کیا وجہ تھی کہ پاک و ہند کے ایک نوجوان نے قافلۂ حجاز میں عزت پائی؟ حوریں جس کی راہوں میں پلکیں بچھائے بسوئے جنت لے جانے کو بیتاب تھیں۔ مگر وہ مدینے کے کوچہ سے اٹھ کر فردوس بریں کی سمت روانگی پر رضامند نہ ہوسکا، شائد اس لئے کہ وہ ''محمد ہی لکھا ہوگا اگر مسلم کا دل چیریں'' کا نمونہ بن گئے تھے اور ان کے خون کا ہر ایک قطرہ انمول جذبوں کی کتاب لکھ گیا۔ ان منزلوں میں ٹوٹے ہوئے تارے بھی مہ کامل بن جاتے ہیں۔ پنکھڑئ گلاب میں پورے گلستان کی بہار سمٹ آتی ہے۔ شراب خانہ صراحی میں بند، دریا قطرے میں محیطؔ اور صحرا ذروں میں گم ہوجاتے ہیں۔ گویا ہر کاندھے پر ایک میکدہ سجا رہتا ہے۔

بعض کم فکرے اب بھی کہہ جاتے ہیں کہ ناداں تھے جو زندگی سے کھیل گئے۔ عقلیت پرستوں نے قہقہے تو سنے، پر آغوش مرگ میں دلنواز مسکراہٹ کہاں دیکھی۔ آب گلگوں کے جام چھلکانے سے آنکھوں میں شعور ذات کی چمک نہیں آسکتی۔ تماشائیوں کے منہ پر بھی کبھی نور کی جھلک آئی ہے؟ کون بتائے کہ زندگی اگر حسین موت ڈھونڈنے نکلے تو خود مرگ ورق حیات سے دامن بچا کے نکل جاتی ہے۔ جھپٹنے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے میں جو لذت پنہاں ہے، وہ حجلہ عروسی کی رعنائیوں میں کہاں!

الغرض محافظ ناموسِ رسالت کو قربان گاہ میں پہنچے سات ماہ گزر چکے تھے۔ قربانی پیش کرنے والے کی خلوصِ نیت اور پیش کی جانے والی شے کا خوبصورت، بے داغ اور دلکش ہونا ایک ضروری جزو ہے۔ محبوب خدا نے جسے کروڑوں مسلمانوں میں سے اپنی حرمت و تقدیس کے تحفظ کے لئے چنا، فی الواقع حسن و رعنائی کا مرقع تھا۔ آپ کی رفیقۂ حیات اور احباب ولواحقین نے اپنی یادداشتوں کے دریچے وا کرتے ہوئے جو کچھ بیان کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں محمد صاحب ابتدا سے ہی پیغمبر پاک ؐ کے شیدائی تھے۔ وہ تنہائی میں بعض اوقات نعت رسول مقبول گنگنانے لگتے۔ طبیعت میں قدرے شوخی تھی۔ بالعموم ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ نہایت پختہ عزم اور حوصلے کے مالک تھے۔ ہمہ وقت بنے ٹھنے رہتے۔ نفاست طبع انتہائی متاثر کن تھی۔ عمدہ غذا کھانا، قیمتی لباس زیب تن کئے رکھنا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ گفتگو سے مترشح ہوتا جیسے کوئی عظیم کام کرنے کے لئے مضطرب ہوں۔ مگر کیا؟ اس وقت معلوم تھا نہ بظاہر اس کا کوئی امکان دکھائی دیتا۔ کبھی کبھی اسلامی کتب کا مطالعہ بھی فرما لیتے، بالخصوص غازیوں اور شہیدوں کے تذکرے پڑھتے۔

نرم گفتار تھے اور خوش رفتار بھی۔ گو حیا کے پتلے تھے مگر ان کے روز و شب میں کوئی ایسی منفرد یا نمایاں بات نہ پائی جاتی، جس سے ندرت فکر جھلکتی ہو۔ ان کے خدوخال اور قد کاٹھ کا مرقع بھی بڑا دلکش تھا۔ آپ کا رنگ کسی حد تک گندمی مگر سرخی و سپیدی کے مٹکے میں ڈوبا ہوا۔ دیکھنے سے دل کو تسکین ملتی تھی اور نگاہوں کو بصارت۔ ہونٹ باریک اور حسن گل سے مشابہ تھے۔ چہرہ دست مصور کا شاہکار۔ بھنویں گھنی تھیں اور ناک معیار حسن کے عین مطابق۔ گردن تراشے ہوئے پتھر کی مانند گول اور گوشت سے بھری ہوئی۔ پیشانی چوڑی مگر لمبائی میں خاصی کم۔ آنکھوں میں چمک رہتی جن پر جام بلوریں کا گمان ہوتا۔ جسم تنومند، ہاتھوں میں مضبوطی، جو بھرپور جوانی کا اظہار کرتی۔ پتلیاں سیاہ دراز اور زاویۂ چشم رنگ تغزل کا عکس لئے ہوئے۔ ریش مبارک پتلی، بال چھوٹے چھوٹے، خط ہمہ وقت بنا رہتا۔ مونچھوں میں ایک خاص ادا تھی جس سے مردانہ وجاہت ٹپکتی۔ البتہ ان کی لمبائی کسی حد تک زیادہ معلوم ہوتی اور بالوں کے سرے بھی اوپر مڑے ہوئے تھے۔ ماتھے پر چند ابھری لکیریں جیسے کتاب کا کوئی دیباچہ رقم ہو۔

تجھے تشبیہ کا دوں آسرا کیا
تو خود اک چاند ہے پھر چاند سا کیا

میجر (ریٹائرڈ) غلام یٰسین صاحب جو ان دنوں مدراس میں متعین تھے اور انہیں غازی

موصوف کے قریب رہنے کا طویل موقع ملا، فرماتے ہیں کہ غازی موصوف کا جسم دبلا، سفید کمر بند، اسی رنگ کی جاذب نظر چادر، ایک سلیقے سے سر پر پگڑی سجائے یا صافہ لپیٹے رکھتے۔ چہرے پر نور اور اطمینان کی کہانی۔ آنکھوں میں خمار بھری چمک، دھیمی آواز میں بات کرتے تو ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی۔ کبھی کسی قسم کا گلہ وشکایت زبان پر نہ لاتے تھے۔ یہ ہے غازی موصوف کے پیکر حسن کا مختصر خاکہ۔ ان کی بود و باش کے حقائق اختتام پذیر ہوئے۔ اب زندگی کا یادگار دور شروع ہونے والا تھا۔ یہی وہ موسم ہے جس میں خونِ جگر کی آمیزش اور مہک دکھائی دیتی ہے۔

اس نے جب پلکوں کو جنبش دی عدم
رائیگاں سب گفتگو کے فن گئے

ہندو ڈوگرہ قتل ہوتا ہے

۱۶۔ مئی ۱۹۳۷ء کا سورج بھی عام دنوں کی طرح طلوع ہوا۔ کسے خبر تھی کہ امروز کسی کی محبت کا امتحاں ہوگا۔ صبح سے شام تک کا سفر معمول کے مطابق رہا۔ لیکن رات کے پہلو میں ایک ایسے واقعے کی بنیاد پڑی جو ملک میاں محمد نامی ایک نوجوان کو ملتِ اسلامیہ کا محبوب بنا گیا۔ اچانک اس کی اُمیدوں کے چراغ جل اٹھے کیونکہ ناموس رسالتؐ پر قربان ہونے کی سعادت بخشنے والا مبارک لمحہ آن پہنچا تھا۔

اس خوش پوش نوجوان کی قسمت یوں جاگی کہ سینٹ تھامس ماؤنٹ چھاؤنی کی کوارٹر گارد، پر کھڑے سنتری کی ڈیوٹی نبھا رہے تھے۔ قلعے میں بیٹھے ہوئے مختلف مذاہب اور اقوام برادریوں سے تعلق رکھنے والے فوجی عہدیدار خوش گپیوں میں محو تھے۔ ان میں دو ہندو ڈوگرے اور چند مسلمان سپاہی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ ہوا یوں کہ ایک ہندو ڈوگرہ نے کوئی نعتیہ غزل باآواز بلند ترنم سے پڑھنی شروع کی۔ وہ خوش الحان تو تھا ہی، لہجے میں مٹھاس اور عقیدت کا رنگ بھی دلچسپی کا سامان کر گیا۔ مسلمان فوجی اپنی اپنی جگہوں سے کھسک کر اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ اس نعت کا آخری مصرع تھا: واہ! واہ! پیارے محمدؐ ہندو نعت گو، بارگاہ رسالت مآبؐ میں نذرانۂ عقیدت کچھ اس ادا سے پیش کر رہا تھا کہ جوش مسرت سے مسلمانوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اِدھر محمد عربی کا اسم مبارک ہندو مذکور کے منہ سے نکلا تو اُدھر ایک دوسرا ڈوگرہ سپاہی جل بھن کر رہ گیا۔ اس نے غلیظ الفاظ میں اپنے ساتھی کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا: ''......محمدؐ کو ......کرو۔ کسی اور کا نام لو۔ تو ہندو دھرم کا مجرم ہے اور تیرا یہ پاپ ہرگز معاف نہیں کیا جاسکتا''۔

یہ تمام کارروائی سید الرسلؐ کے غلاموں کی آنکھوں کے سامنے ہوئی۔ میاں محمد بھی یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ آپ نے گستاخ ڈوگرہ سے فرمایا: اسے یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ حضرت محمدؐ کے نام مبارک سے اطمینان قلب حاصل کرے۔ جس کو یہ اچھا لگتا ہے وہ گا کر پڑھ رہا ہے۔ تجھے خبث باطن کے باعث پسند نہیں تو خاموش رہ یا باہر نکل جا۔ خبردار! آئندہ ایسی بکواس مت کرنا۔''

اس مردود نے کہا: میں جو چاہوں کہتا پھروں تجھے کیا۔؟ یہ بیہودہ جواب سن کر غازی صاحب کا خون غصے سے کھول اٹھا۔ غیرت دینی جوش مار رہی تھی۔ آج ہندو ڈوگرے نے پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخی کر کے ان کی حمیت ایمانی کو للکارا تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ غالباً انہیں حضرت علیؓ کی سیرت کا یہ پہلو یاد آ گیا، جب میدان جنگ میں شیر خدا ننگی تلوار لئے ایک کافر پر جھپٹے اور بزدل حریف نے بدحواسی کے عالم میں آپ کے چہرۂ انور پر لعاب دہن گرا دیا تو بجائے اس کے کہ آپ طیش میں آتے اور ملعون کی گردن کاٹ کر رکھ دیتے انہوں نے شمشیر آبدار کو نیام میں کیا اور دشمن اسلام کو بھاگنے کی اجازت دے دی۔ اس لئے کہ جہاد رضائے الٰہی کا مظہر ہے، مگر آج تلوار چل جاتی تو ذاتی رنجش اور عزت نفس کی تسکین کا پہلو بھی درمیان میں آ سکتا تھا اور مخالفین کہہ سکتے کہ حضرت ابوترابؓ کی تلوار اسلام کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذات کے لئے اٹھا کرتی ہے۔

الحاصل غازی موصوف نے چند ثانیے توقف کیا، چپ رہے، کچھ سوچا، ایک فیصلہ کیا اور سوال و جواب کی تکرار سے ہٹ کر اسے دوبارہ تنبیہ کی:

''اپنی ناپاک زبان سے ہمارے نبیؐ کی شان میں گستاخانہ جملے کہنے کی جرأت ہرگز نہ کرنا، ورنہ یہ بدتمیزی تجھے بہت جلد ذلت ناک انجام سے دوچار کر دے گی''۔

بدقسمت ڈوگرے سپاہی نے دوبارہ یہی جواب دیا کہ اس سے روکنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ حضرت میاں محمد صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ آپ نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا:

''اچھا میں تمہیں جلد ہی بتاؤں گا کہ مجھے اس بارے میں حق ہے یا نہیں''۔

الغرض غازی میاں محمد کی ڈیوٹی چھ بجے شام شروع ہو کر آٹھ بجے ختم ہوئی۔ اس دوران وہ ایک اہم فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن اتمام حجت کی خاطر ان کو ایک مرحلہ ابھی طے کرنا تھا۔ وہ ڈیوٹی

سے فارغ ہوتے ہی سیدھے اپنے حوالدار کے پاس پہنچے اور تمام حالات بالتفصیل گوش گزار کیئے۔ نیز اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا: ''وہ...... برسرعام تہ دل سے معافی کا خواستگار نہ ہوا اور اگر تحریری طور پر توبہ نامہ لکھ کر نہ دیا تو اپنی زندگی سے کھیلنا مجھ پر فرض ہو جاتا ہے''۔ حوالدار صاحب نے اس انتہائی نازک مسئلے پر کوئی خاص توجہ نہ دی بلکہ یہ کہتے ہوئے ٹرخا دیا کہ میں اسے سمجھاؤں گا آئندہ احتیاط برتے مگر معافی نامہ کی مشروط صورت پر اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا''۔

اس کی سرد مہری اور عدم دلچسپی کا یہ حال دیکھ کر قبلہ غازی صاحب تڑپ کر رہ گئے۔ دراصل حوالدار مذکور بھی ہندو تھا اور گستاخِ رسول کی اس بیباکانہ جرأت پر اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔ آپ فوجی قواعد کے مطابق اس واقعہ کی شکایت کر چکے مگر شنوائی نہ ہوئی۔ اب اس امر کا کون نوٹس لیتا، میاں موصوف انہی سوچوں میں گم اپنی بیرک میں پہنچے۔ وردی تبدیل کی اور اس پہلو پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے لگے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے نمازِ عشاء ادا کی، کچھ مزید نوافل بھی پڑھے۔ اب وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ گویا عقل مات کھا گئی اور عشق بازی جیت گیا۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

غازی صاحب بارگاہ رب العزت میں دُعا مانگ رہے تھے: ''اے میرے خالق و مالک! میں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ تیرے محبوب کی شان میں ہرزہ سرائی کے مرتکب کا کام تمام کر دوں۔ لعین سے انتقام لینے کے لئے میں پیچ و تاب کھا رہا ہوں۔ تو مسبب الاسباب ہے۔ اپنے حقیر بندے کو حوصلہ اور استقامت عطا فرما۔ خدایا! اپنے نبیؐ کی حرمت و تقدیس پر جان لڑانے کی توفیق بخش اور میری قربانی بھی منظور فرما لے''۔

نماز و دعا سے فارغ ہو کر حضرت قبلہ میاں محمد صاحب چپکے سے کوارٹر گارڈ جا پہنچے جہاں رسول پاکؐ کی شان میں گستاخی کرنے والا کمینہ فطرت ڈوگرہ سپاہی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ غازی میاں محمد شہید اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گارڈ روم میں جا داخل ہوئے۔ اپنی رائفل نکالی، میگزین کو لوڈ کیا اور باہر نکلتے ہی للکارا: ارے کم بخت! اب بتا کہ میرے نبی کی شان میں توہین کا مرتکب ہونے پر میں تم سے باز پرس کرنے کا حق رکھتا ہوں یا نہیں؟ یہ سن کر ڈیوٹی پر متعین شاتم رسولؐ نے بھی پوزیشن سنبھال لی اور رائفل کا رخ آپ کی طرف موڑا مگر اس کے ساتھ ہی ناموس رسالتؐ کے شیدائی کی گولی ہندو ڈوگرے کو ڈھیر کر چکی تھی۔ رائفل کی دس گولیاں اس کے جسم سے

پار کرنے کے بعد چہرے پر سنگین سے ضربیں لگاتے رہے۔ نبی اکرمؐ کی ذات پر حرف گیری کرنے والی گستاخ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی، لیکن ابھی مومن مجاہد کی تسکین نہیں ہوئی۔ آپ سنگین کی نوک، اس ذلیل کے منہ پر مارتے اور بار بار یہ کہتے جاتے تھے:

''بے غیرت! اس ناپاک اور گندی زبان سے تو نے میرے پیارے رسولؐ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ جی چاہتا ہے، تیرا پلید جسم کتوں اور کوؤں سے نچوا ڈالوں''۔

جب فائر شروع ہوا تو ڈیوٹی پر تمام سنتری گارد روم کی کوٹھڑیوں میں جا گھسے اور دروازے بند کر لئے۔ فائرنگ ختم ہوتے ہی ایک بگلر دوڑتا ہوا آپ کے نزدیک آیا۔ غازی صاحب نے اسے سختی سے منع کیا کہ تھوڑی دیر انتظار کرو۔ وہ خوف وہراس سے کانپ رہا تھا۔ جب غازی صاحب اپنا غصہ نکال چکے اور مردود کے جہنم واصل ہونے کا پختہ یقین کر لیا تو خطرے کی گھنٹی اپنے ہاتھوں سے بجائی اور بگلر کو مسلسل بگل بجاتے رہنے کے لئے کہا۔ پہلے فائرنگ کی آواز پردۂ سماعت سے ٹکرائی تھی پھر خطرے کے آلارم اور بگل بجنے پر ساری پلٹن جمع ہوگئی۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بلند آواز میں پوچھا:

''قلعہ میں فائر کس نے اور کیوں کیا ہے؟''

غازی صاحب نے جواب دیا:

''میں ہوں سپاہی میاں محمد نمبر ۱۵۳۰۵۔''

اس آدمی نے پھر کہا: کمانڈنگ آفیسر صاحب کا حکم ہے کہ رائفل اندر ہی رکھ کر باہر آجاؤ۔ آپ نے فرمایا: اگر کوئی مسلمان افسر میرے پاس آئے تو میں رائفل پھینک کر خود کو اس کے حوالے کر دوں گا۔ مذکورہ شخص نے تیسری مرتبہ ہم کلام ہوتے ہوئے کہا: کمانڈنگ آفیسر حکم دے رہے ہیں کہ باہر آجاؤ۔ تمہاری گرفتاری کے لئے ایک مسلمان افسر منتظر کھڑا ہے۔

چنانچہ غازی صاحب رائفل اندر ہی رکھ کر اپنے دونوں بازو پھیلائے ہوئے باہر آگئے۔ پلٹن کے جمعدار ایڈ جوٹنٹ عباس خاں جو ڈھوک ٹاہلیاں تحصیل تلہ گنگ کے رہنے والے تھے۔ آگے بڑھے اور غازی صاحب نے خود کو ان کے حوالے کر دیا۔ جب آپ کو پلٹن کے سامنے لایا گیا تو انگریز کمانڈنگ افسر نے غازی موصوف سے پوچھا:

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

انہوں نے جواب دیا:

''چرن داس (مقتول ڈوگرہ) نے ہمارے رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی اور بدکلامی کی تھی۔ میں نے اس کو روکا لیکن وہ باز نہ آیا۔ پس میں نے اس کو ہلاک کر دیا۔ اب جیسا آپ کا جی چاہے قانونی تقاضے پورے کریں''۔

اس پر خود کمانڈنگ افسر نے تاکید کی: میاں محمدؐ ذرا سوچ کر بات کرو، ہوش میں آؤ۔ آپ کے ابتدائی بیان قلمبند ہو رہے ہیں۔ ان میں ردوبدل ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس لئے سوچ سمجھ کر بیان دو۔ غازی صاحب نے جواب دیا: میں بالکل ہوش میں ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا، خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میرا ایک ایک حرف صداقت پر مبنی ہے۔ میں نے حوالدار سے بھی اس کے گستاخانہ رویئے کی شکایت کی تھی لیکن کوئی مثبت جواب نہ ملا۔ اس کے بعد میرے سامنے صرف دو ہی راستے رہ گئے تھے دولتِ ایمان سے محروم ہو کر بے غیرتی اور بزدلی کی زندگی قبول کر لیتا یا کوئی عملی اقدام اٹھاتا۔ میں نے بالآخر دوسری صورت قبول کی۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ رسول پاکؐ اگر راضی ہو جائیں اور تمام دنیا بگڑ بیٹھے تو مجھے کیا غم۔ مجھے اپنے کیئے پر مطلقاً کوئی پچھتاوا نہیں۔ البتہ اپنے مقدر پر نازاں ضرور ہوں۔

کمانڈنگ افسر اس بیان سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس کو شک گزرا کہ میاں محمد نے یہ سب کچھ نشے کی حالت میں کیا ہے۔ چونکہ آپ کی آنکھوں میں خمار اور غنودگی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی، لہٰذا اس نے فی الفور آپ کو ڈاکٹری معائنے کے لئے بھجوا دیا۔

ان دنوں ڈاکٹر (کرنل) نور احمد صاحب وہاں متعین تھے۔ انہوں نے آپ کا طبی معائنہ کیا اور غازی صاحب کو اسلامی اخوت کے جذبے سے سرشار ہو کر کہا: ''آپ اپنا بیان سوچ سمجھ کر دیں۔ آپ جو سٹیٹ منٹ کمانڈنگ افسر کے سامنے دے چکے ہیں، شاید اس سے صرفِ نظر ہو سکتا ہے، لیکن جو بیان آپ اب دیں گے۔ تمام معاملے کا انحصار اسی پر ہوگا۔ اس لئے پہلے بیان میں تبدیلی کر لینے میں ہی بہتری ہے''۔

غازی ممدوح نے جواب دیا۔

> ''ڈاکٹر صاحب! آپ کا خیال ہوگا کہ اگر میں بیان تبدیل کر لوں تو میری جان بچ جائے گی۔ لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ ایک جان تو کیا، اگر میری ہزار جانیں ہوتیں تو میں اپنے پیارے رسولؐ کے غلاموں کی

عزت پر بھی قربان کر دیتا''۔

پھر جو بیان غازی صاحب نے کمانڈنگ افسر کے پاس دیا تھا وہی بیان ڈاکٹر صاحب کو لکھوا دیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مذکور نے اپنی پہلی رپورٹ میں لکھا کہ میاں محمد نے کسی قسم کا کوئی نشہ وغیرہ نہیں کیا۔ البتہ اس کی گفتگو سے جذباتیت ضرور ٹپک رہی ہے۔

⊙

مقتول ڈوگرہ کون اور کہاں کا رہنے والا تھا؟ اس نے گستاخیٔ رسولؐ کا بھیانک گناہ کیوں کیا؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں زیادہ تفصیلات حاصل نہیں ہو سکیں۔ تاہم اس بدزبان کا نام چرن داس تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ کشمیر کے کسی گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان سوامی دیانند سرسوتی کا انتہا پسند و متعصب عقیدت مند تھا۔ ذات کے لحاظ سے وہ ڈوگرہ تھا۔ جو ہندوؤں کے نزدیک قابل احترام اور معزز خیال کی جاتی ہے۔

چرن داس ذاتی طور پر دو ہندو سورماؤں سوامی شردھانند اور مہاشہ راجپال سے متاثر تھا اور ان کی خباثتیں اسے بھی ذلت ناک موت کے سائے میں دھکیل لائیں۔ یہ بدزبان بھی فوج میں بھرتی ہوا اور ٹریننگ کے بعد اپنے دم توڑنے کی جگہ مدراس پہنچا۔ مرگ ناگہانی کا شکار ہونے کے بعد قواعد کے مطابق اس کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ ازاں بعد چند شرائط پر میت ہندو ورثاء کے حوالے کی گئی۔ جنہوں نے اس ناپاک وجود کو آگ کے لپکتے شعلوں میں جھونک دیا۔

وہ......شان رسولؐ میں یاوہ گوئی کی ایک علامت تھی، جسے شیر دل مجاہد......نے نوک سنگین سے کھرچ ڈالا۔ اب باطل کی فصل اجڑ چکی تھی اور حق کی کھیتیاں لہلہانے لگیں۔ مردود کی پامال راکھ اپنے ہم قدموں کے لئے عبرت کا ایک نشان چھوڑ گئی۔ لیکن حضرت غازیؒ کی زندگی شجاعت و جوانمردی کی حقیقت بنی۔ بلاشبہ ایسے لوگ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے اور اسلام کوئی مٹنے والی چیز نہیں۔

رقص کرنے کا ملا حکم . جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لئے پاؤں میں

وقوعہ کی شب غازی اپنے فوجی افسروں کی کڑی نگرانی اور حفاظت میں رہے۔ دوسرے روز ۱۷۔ مئی ۱۹۳۷ء کو انہیں مقدمے کی تفتیش کے لئے حوالۂ پولیس کر دیا گیا۔ دس دن مدراس پولیس کی حفاظت میں رہ چکے تو کمانڈر انچیف (جی ایچ کیو دہلی) کے حکم سے ۲۷۔ مئی کو واپس پلٹن میں لائے گئے تاکہ فوجی قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔

قتل کی واردات کے فوراً بعد فوج کے اعلیٰ افسروں نے پلٹن کے عہدیداروں کے ذریعے بعض مصلحتوں کے پیش نظر سختی کے ساتھ یہ ہدایت کردی تھی کہ غازی میاں محمد صاحب کے والدین کو کوئی آدمی اطلاع نہیں کرے گا۔ لیکن دندہ شاہ بلال کے ایک جرأت مند مسلمان سید صدرالدین صاحب جو کوارٹر ماسٹر حوالدار تھے، انہوں نے بذریعہ تار صوبیدار (ریٹائرڈ) ملک غلام محمد صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع کردی۔

میجر غلام یٰسین صاحب کے بقول سید صدرالدین صاحب کو حکم کی خلاف ورزی پر گرفتار کر لیا گیا اور یہ کسی جرم کی سزا نہیں بلکہ خلوص عمل کی جزا تھی کہ وہ جیل میں زیادہ سے زیادہ وقت غازی موصوف کی قربت میں گزار سکیں اور اس نسبت رفاقت سے ان کا یہ تاریخی کردار اہمیت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ غازی موصوف کی وجد آفرین تنہائیوں کا رازدار بھی بن جائے۔

الغرض ۲۰۔ مئی ۱۹۳۷ء کو ٹیلی گرام کے ذریعے تلہ گنگ میں اس امر کی اطلاع پہنچی اور جناب غازی صاحب کے والد بزرگوار ۲۲۔ مئی کو رخت سفر باندھ کر روانہ ہوئے۔ چار دن راستے کی صعوبتوں اور سفر کی کوفتوں سے دوچار ہوئے۔ ۲۶۔ مئی کو مدراس پہنچ گئے۔

اگرچہ اس وقت مذکورہ پلٹن کے صوبیدار میجر فضل خان سکنہ چکوال تھے اور معاملے کی نوعیت بھی اس کی متقاضی تھی مگر ہندوؤں اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر حضرت غازی میاں محمد صاحب کے والد محترم کو پلٹن میں رہائش کی سہولت نہ دی گئی، حالانکہ وہ خود بلوچ رجمنٹ کے پنشنر صوبیدار تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس علاقے سے متعلق کئی جونیئر عہدیدار بھی پلٹن میں موجود تھے۔ جن کے ملک غلام محمد صاحب کے ساتھ خاندانی تعلقات استوار تھے اور ان میں بعض تو غازی صاحب کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر صوبیدار میجر فضل خان کے ڈر سے وہ بھی احتیاط برتتے رہے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ مذکورہ صوبیدار میجر نے کئی قسم کی رکاوٹیں اور مشکلات پیدا کیں۔ لہٰذا ملک صاحب کو مجبوراً مدراس صدر میں ایک مسلمان پوسٹ ماسٹر سید سیف علی شاہ صاحب کے ہاں مقیم ہونا پڑا۔ شاہ صاحب بڑے نیک دل اور صاحب درد مسلمان تھے۔ انہوں نے جس فراخدلی اور محبت کے ساتھ غازی صاحب کے لواحقین کی رہائش کا بندوبست کیا، وہ مثالی ہے۔ ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑا۔ رویے میں اس قدر اپنائیت تھی کہ اپنا ہی گھر معلوم ہوتا۔

مدراس کے مقامی مسلمانوں نے بھی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ ان کی گہری دلچسپی اس بات

سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے مقدمے کی پیروی کی پیشکش کی اور جملہ مصارف اپنے ذمے لینے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ گو اس کی زیادہ ذمہ داریاں غازی صاحب کے والد بزرگوار نے خود ہی سنبھالے رکھیں؛ لیکن ان کی ہمدردیوں کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔ عدالتی چارہ جوئی اور مقدمے کے پیچیدہ مسائل سے نپٹنے کے لئے ایک مقامی مسلمان ایڈووکیٹ سید نور حسین شاہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وکیل مذکور نے قانون کا امتحان لندن سے پاس کیا تھا اور ایک مدت تک وہیں وکالت بھی کرتے رہے۔ ان کا آبائی تعلق مدراس کے کسی قریبی گاؤں سے تھا۔ بہرحال ایڈووکیٹ موصوف بڑی دیانتداری اور فرض شناسی سے یہ عظیم ذمہ داری نبھاتے رہے۔ ابتدائی سماعت کے لئے ان کی تیار کردہ فائل بتاتی ہے کہ انہوں نے بڑے وزنی اور قانونی نکات کی نشاندہی کی تھی۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہی دنوں ایک بار وہ اپنے گاؤں گئے تو خاندانی رنجش کی بنا پر کسی سنگدل نے محافظ کی موجودگی میں ان کو چھرا گھونپ دیا۔ زخم کاری اور مہلک تھے، جس سے وہ رحلت کر گئے۔

ان کے بعد یہ مقدمہ معروف قانون دان اصغر علی صاحب ایڈووکیٹ کے سپرد کیا گیا۔ یہ بھی ولایت کے تعلیم یافتہ تھے۔ قانون دان طبقہ کے برخلاف مذکورہ دونوں وکیل نہایت مخلص ثابت ہوئے۔ انہوں نے پیشیوں کے عوضانہ میں ایک پائی کا مطالبہ بھی نہ کیا، بلکہ آمدورفت اور کیس کی تیاری میں اٹھنے والے بیشتر اخراجات خود اپنی گرہ سے ہی ادا کرتے رہے۔



سماعت مقدمہ

مقدمے کی باقاعدہ کارروائی سے پہلے فوج کے قانون کے مطابق ابتداً ۳۱ مئی سے ۶۔ جون ۱۹۳۷ء تک انکوائری ہوتی رہی جو عوامل، جزئیات اور تفصیلات پر محیط تھی۔ چھ جون کو دماغی امراض کے ماہر نے غازی صاحب کا ڈاکٹر معائنہ کیا اور رپورٹ میں لکھا:

> ''میری رائے میں ان کو...... ایسا عارضہ لاحق ہے جس کے باعث یہ عارضی طور پر جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اس دوران یہ غلط اور صحیح میں تمیز نہیں کر سکتے۔ یہ فعل بھی ایسی ہی کیفیت میں سرزد ہوا ہے''۔

۱۹۔ جون کو گورنمنٹ مینٹل ہسپتال مدراس کے سپرنٹنڈنٹ نے غازی صاحب کا چیک اپ کیا۔ جن کی سفارش پر انہیں ۲۵۔ جون سے ۲۴۔ جولائی تک ایک ماہ کے لئے مینٹل ہسپتال میں

رکھا گیا۔ جب آپ ہسپتال میں داخل ہوئے تو اس روز، ان کا وزن ۱۳۳۔ پونڈ تھا۔ ایک ماہ بعد جب وہاں سے فارغ ہوئے تو بجائے کم ہونے کے ایک پونڈ وزن بڑھ چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تفصیلی رپورٹ میں درج کیا: میں نے پورا مہینہ میاں محمد کو ٹیسٹ کیا۔ نفسیاتی جائزہ لیا۔ چھپ کر دیکھا اور ظاہراً بھی۔ لیکن اس عرصے میں یہ کبھی بھی فکر مند یا سوچ بچار کرتے ہوئے نہیں پائے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ماہ میں ان کا وزن ایک پونڈ بڑھ گیا ہے۔ اگر ان کو یہ فکر لاحق ہوتی کہ وہ قتل کے مقدمے میں ملوث ہیں اور خدا جانے کیا حشر ہوگا تو کسی نہ کسی وقت تو ضرور فکر مند ہوتے۔ اس الجھن میں ان کا وزن کم ہوتا نہ کہ زیادہ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں ہرگز کوئی فکر نہیں کہ انہوں نے کیا کیا یا ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ مزید یہ کہ جب 'چرن داس' ایک ہی گولی لگنے سے مر گیا تھا تو ساری گولیاں چلانے اور پھر سنگین سے زخم لگانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور ایسی حالت میں جب کہ کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا یہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ میرا تجربہ یا میڈیکل کا تجزیہ یہی بتاتا ہے کہ ارتکاب فعل جذباتیت کا اثر ہے اور تمام معاملہ جذباتی نوعیت کا ہے، اس میں سنجیدگی اور پروگرام کا قطعاً کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا''۔

طبّی معائنوں کے بعد غازی صاحب کا جنرل کورٹ مارشل ۱۶۔ اگست کو شروع ہوا اور لگاتار پانچ دن ۲۰۔ اگست ۱۹۳۷ء تک کارروائی ہوتی رہی۔ کل اٹھارہ گواہوں کے بیانات قلمبند ہوئے۔ دیگر گواہان کے علاوہ تین ڈاکٹروں کی شہادت بھی ریکارڈ پر آئی۔ جرح کے دوران انہوں نے متفقہ موقف اختیار کیا کہ اس آدمی نے جو کچھ کیا ہے ہماری رائے میں وقوعہ کے وقت اسے اپنے جذبات پر قابو نہیں تھا۔ مگر غازی صاحب اپنے سابقہ بیان پر ڈٹے رہے اور کہا:

''میں نے جو کچھ کیا، خوب سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر کیا ہے،
کیونکہ چرن داس نے میرے رسول پاکؐ کی شان میں گستاخی کی تھی''۔

کورٹ مارشل کے دوران ان کو ایک قانونی رائے دی گئی کہ آپ یہ کہیں کہ گولی چلانا اپنی جان بچانے کو جوابی حملہ تھا، لیکن غازی صاحب کسی قسم کی تاویل و تحریف پر رضامند نہ تھے انہوں نے دوٹوک جواب دیا:

''میں اپنی جان بچانے کے لئے اس واقعے کو کوئی دوسرا رنگ نہیں دینا چاہتا، بلاعذر و معذرت جان حاضر ہے''۔

حسب ضابطہ کورٹ مارشل کے فیصلے کی توثیق کے لئے کاغذات انڈین آرمی کے کمانڈر

انچیف کے پاس بھیج دیئے گئے جوان دنوں موسم گرما کے سبب شملہ میں تھے۔ ملک غلام محمد صاحب تقریباً تین ماہ تک مدراس میں قیام کرنے کے بعد ۲۲۔ اگست ۱۹۳۷ء کو واپس تلہ گنگ آ گئے پھر گھر سے شملہ کا چکر بھی لگایا تھا کہ اگر بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہو تو کوشش کر دیکھیں۔ چونکہ انگریزوں کی حکومت تھی اور تمام دفاتر میں غیر مسلموں کی اکثریت، نیز برطانوی سامراج کو یہ بھی خدشہ تھا کہ فوج میں ایسے واقعات راہ نہ پکڑ لیں، اس لئے بریت کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آئندہ ماہ ستمبر کی ۱۷۔ تاریخ کو کمانڈر انچیف نے حسب توقع سزا کی منظوری دے کر کاغذات مدراس بھیج دیئے۔ ۲۳۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو فوجی رواج کے مطابق پلٹن میں غازی صاحب کو سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

میرے ماتھے پہ خون سے لکھا ہے
میں نے دیوار کو بھی در جانا

پریوی کونسل

غازی موصوف کے والد ملک غلام محمد صاحب نے ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو وائسرائے ہند کے پاس دہلی میں اپیل کی جو مسترد ہو گئی۔ ازاں بعد رحم کی اپیل بھی نامنظور ہوئی۔ آخر کار اسی وقت لاہور ہائی کورٹ کے مشہور مسلمان وکیل ڈاکٹر شیخ محمد عالم کی وساطت سے ٹی ایل ولسن اینڈ کمپنی کو متعلقہ کاغذات بذریعہ ہوائی ڈاک ارسال کئے گئے کہ وہ پریوی کونسل لندن میں اپیل دائر کریں۔ ان دنوں ہوائی ڈاک پر بھی پچھتر روپے خرچ اٹھا۔ یاد رہے کہ غازی علم الدین شہیدؒ کی اپیل میں بھی اسی کمپنی نے معاونت کی تھی۔

الغرض ۳۰۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کو پریوی کونسل میں اپیل دائر کی گئی۔ مسٹر پرنگل جو برطانیہ کے مشہور اور کامیاب ترین وکیل تھے نے اس کی پیروی کی۔ پریوی کونسل نے بھی اس کیس کی فائل پر ''نامنظور'' کے الفاظ لکھ دیئے اور ۲۱۔ فروری ۱۹۳۸ء کو اپیل رد کئے جانے کی باضابطہ طور پر اطلاع دے دی گئی۔

مرقومہ بالا روداد عدالتی کارروائیوں کی ایک مختصر جھلک تھی۔ تفصیلی تذکرے کے لئے پریوی کونسل میں اپیل کی نقل اور کمپنی مذکور کے خطوط کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ٹی۔ ایل ولسن اینڈ کمپنی جس کا مرکزی دفتر ۵۔ وکٹوریہ سٹریٹ لندن ایس ڈبلیو آئی میں تھا، نے ۲۷۔ جنوری ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر شیخ محمد عالم بیرسٹرایٹ لاء۔ لٹن روڈ لاہور کے نام اپنے ایک مراسلے میں لکھا۔

''ہم جے ایم پرنگل وکیل کے ایما پر درخواست بنام شہنشاہ معظم کی ایک نقل آپ کی اطلاع کے لئے بھجوا رہے ہیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ اپیل کے حقائق کا مواد اور نفس مضمون جس کی وضاحت آخری پیرے میں مکمل طور پر کی جا چکی ہے، کی رو سے ہمیں کامیابی کی ہلکی سی کرن نظر آتی ہے۔ ہم نے انڈین آرمی ایکٹ نمبر ۱۲۹۔ بی کی ترامیم جو کہ جولائی ۱۹۳۵ء میں کی جا چکی ہیں، کے مختلف پہلوؤں پر کونسل کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا ہے۔ ہم خائف ہیں کہ ارباب حکومت عدالتی معاملات میں مخل نہیں ہوں گے، جبکہ عدالت ملزم کے گواہان صفائی کو بھی طلب کرتی ہے۔

آپ کو یقین ہونا چاہئے کہ ہم، ملزم کے حق میں جتنا بھی ممکن ہوسکا، کوشاں رہیں گے اور مقدمے کی سماعت کی تمام کارروائی سے آپ کو مطلع کرتے رہیں گے۔ ہم نے ملزم کے والد صاحب صوبیدار غلام محمد جو کہ آج کل اٹک میں ہیں کو اپیل کی ایک نقل بھجوا دی ہے اور امید رکھتے ہیں کہ آپ بھی انہیں ایک نقل بھجوا دیں گے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ بیٹے کے ایسے معاملات میں حقیقی باپ کا مضطرب ہونا یقینی چیز ہے اور انہیں یقین دہانی کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں آپ کے معاملے میں گہری دلچسپی ہے اور جملہ اقدامات جو یہاں اٹھائے جائیں گے ان سے ان کو ہر وقت آگاہ کرتے رہیں گے۔

۲۴۔ فروری ۱۹۳۸ء کو کمپنی مذکورہ نے صوبیدار غلام محمد صاحب کو ایک خط کے جواب میں تحریر کیا:

''ہمیں آپ کا مراسلہ ۱۲، ۱۵ فروری ۱۹۳۸ء کے درمیان موصول ہوا۔ پریوی کونسل میں آپ کے بیٹے کی درخواست رحم دائر ہو چکی ہے۔ ہم آپ کو گیارہ فروری کے اس خط کی نقل بھجوا چکے ہیں، جو ہم نے ڈاکٹر شیخ محمد عالم بیرسٹرایٹ لاء کے نام لکھا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ تا حال آپ کو مل چکا ہوگا۔ دراصل مارشل لاء عدالت کا طریقِ کار عام تعزیراتی مقدمات سے مختلف ہے۔ اس میں اپیل کنندہ کے حق کا کوئی تعین نہیں اور

اگر کوئی سپاہی کورٹ مارشل کی سزا پائے تو اس کا کیس صرف کمانڈر انچیف کے پاس برائے تصدیق بھیجا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کے بیٹے کے کیس میں بھی یہی سلوک روا رکھا گیا اور کمانڈر انچیف نے اس کی بھی توثیق کی۔ اب ہمارے لئے یہی ایک راہ تھی کہ خصوصی حالات کے پیش نظر پریوی کونسل میں درخواست گزارتے جیسا کہ ہم نے کیا اور ارباب بست وکشاد نے اس میں مداخلت نہ کی۔ ایسے مقدمات میں رحم کی اپیل کا انحصار صرف وائسرائے کی ذات تک محدود ہوتا ہے، جس کا نتیجہ عدالتی فیصلے سے قطعی مختلف نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم اعتراف پر مجبور ہیں کہ ۱۱۔ فروری، جس روز آپ کو مکتوب ارسال کیا گیا کے بعد کوئی خاص پیش قدمی نہیں کر سکے"۔

اپیل کا وہ مسودہ جو شہنشاہ معظم (برطانیہ) کی عدالت میں بوساطت پریوی کونسل زیر بحث لایا گیا بارہ نکات پر مشتمل ہے۔ اس سے حالات و واقعات کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ یہ فائل جے ایم پرنگل کی زیر نگرانی تیار کی گئی تھی۔ اس کے مندرجات حسب ذیل ہیں:

- ......اپیل کنندہ ۳ بٹالین ۱۰ بلوچ رجمنٹ انڈین آرمی میں سپاہی ہے۔ وہ ۱۹۳۵ء میں فوج میں بھرتی ہوا تھا، اس کے فوجی کاغذات ظاہر کرتے ہیں کہ دوران سروس اس کا کردار مثالی رہا۔
- ......ملزم (میاں محمد) اپنے ساتھی سپاہی "چرن داس" جو کہ اس رجمنٹ کا رکن تھا کے مقدمہ قتل میں ۲۰۔ اگست ۱۹۳۷ء کو تھامس ماؤنٹ مدراس (ایس۔ ٹی) جنرل کی فوجی عدالت سے سزائے موت کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ ملزم کو بوساطت کمانڈر انچیف انڈین آرمی ۱۷۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو انڈین آرمی ایکٹ نمبر ۸ اور ترمیم شدہ ایکٹ نمبر ۳۳ (۱۹۳۴ء) کے تحت مستوجب سزا ٹھہرایا گیا۔
- ......عائد شدہ الزامات و واقعات کی تفصیل درج ذیل ہے ۱۶۔ مئی ۱۹۳۷ء کی ایک شام جب کہ نو سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ جن میں ایک بگلر، ایک لانس نائیک اور ایک حوالدار میجر بھی تھا، تھامس ماؤنٹ مدراس کے قلعہ منرو بیرکس پر حفاظتی دستہ کی حیثیت سے مقرر کئے جانے والے تھے۔ حفاظتی دستہ پانچ بجے شام متعین ہوا تھا۔ تین سپاہیوں کو قلعے کے مختلف مقامات پر متعین کیا گیا جبکہ ان کی ڈیوٹی ساڑھے چھ بجے سے لے کر آٹھ بجے شام تک تھی اور سپاہی میاں محمد بھی اس پہلی شفٹ میں شامل تھا۔ وہ آٹھ بجے وہاں سے فارغ ہوا جبکہ مقتول

چرن داس کو دوسری شفٹ میں آٹھ بجے وہاں پہنچنا تھا۔ قاتل مذکور ڈیوٹی سے فارغ ہوا، بندوق رکھی اور لیٹ گیا۔ وہ ایک گھنٹے کا تین چوتھائی حصہ (۴۵ منٹ) وہاں لیٹا رہا۔ تب وہ اچانک اٹھا۔ گارڈ روم سے باہر دوڑا۔ اپنی بندوق سے چرن داس جو کہ متعین ڈیوٹی تھا، پرپے درپے فائر کھول دیا، جس سے وہ موت کے گھاٹ اتر گیا۔ قاتل نے حوالدار میجر اور بگلر کے جائے موقع پر پہنچنے کی بھی کوئی پروانہ کی۔ تب اس نے اپنی رائفل رکھی اور صوبیدار میجر کے پیش ہوگیا۔ میجر ہاروے جو کہ اس بٹالین کے آفیسر کمانڈنگ تھے، ان کو بلا لیا گیا۔ جمعدار ہیڈ کلرک جو کہ میجر کی معیت میں تھا، نے بیان کیا ہے کہ جب اپیل کنندہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو اس نے وضاحت کی کہ ساڑھے پانچ بجے جب دستہ متعین ہوا تو ایک ایسا آدمی جس کا میں نام نہیں جانتا لیکن شکل سے پہچانتا ہوں، نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے اور منع کرنے کے باوجود متواتر اس کی رٹ لگائے رکھی۔ بعد ازاں سب اسسٹنٹ سرجن جو کہ انڈین میڈیکل ہسپتال سے متعلق ہیں، کیپٹن ''اش'' کے ساتھ جو ہسپتال کے کمانڈر ہیں (موقع پر) پہنچے۔ انہوں نے اس امر کی تصدیق کی کہ مقتول نے ہی یہ الفاظ بولے تھے۔

○......اس کے بعد ملزم کو گرفتار کر لیا گیا اور کیس کی سماعت ۳۱۔ مئی، یکم جون، ۴ جون اور ۶ جون ۱۹۳۷ء کی تاریخوں کو ہوتی رہی۔

○......۶۔ جون کو پیشی کے بعد ملزم کا میجر میکڈوگل جو کہ ذہنی امراض کے مغربی کمانڈ کے سپیشلسٹ تھے سے معائنہ کروایا گیا۔ انہوں نے اس بارے میں جو خفیہ رپورٹ کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم مذکور انتہائی جذباتی حالت میں تھا اور اس کی تمیز کھو چکا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

○......۱۹۔ جون ۱۹۳۷ء کو ملزم دوبارہ ذہنی و طبی معائنہ کی خاطر گورنمنٹ ذہنی امراض کے ہسپتال کے انچارج سپرنٹنڈنٹ کے پاس ۲۵ جون سے ۲۴ جولائی تک رکھا گیا یہ متعلقہ ڈاکٹر کی سفارش پر ہوا۔

○......قاتل مذکور کا معائنہ ۸۔ اگست اور ۱۳۔ اگست کو ایک مرتبہ پھر ماہر ڈاکٹروں سے کروایا گیا۔

○......جیسا کہ پیراگراف نمبر ۴ میں عدالت ماتحت کے تاثرات ہیں کہ میجر کمانڈر بٹالین کی چارج شیٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۶۔ مئی ۱۹۳۷ء کو تھامس ماؤنٹ مدراس کے قلعے پر سپاہی نمبر ۱۴۶۵۳، جس کا نام چرن داس تھا، کی موت واقع ہوئی۔ اس وقت چارج سیکشن ۴۱۔ ایکٹ جو کہ فوجی کورٹ مارشل کی عدالت میں ملزم نے آپے سے باہر ہو کر فوجی احکامات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اقدام قتل کیا ہے۔

۲۔اگست ۱۹۳۷ء کو ضلع مدراس کے بریگیڈیئر کمانڈر نے کیس ہذا، ۹۔ اگست کو جنرل کورٹ مارشل میں مع گواہان بھجوا دیا اور مقدمہ ۱۴۔ اگست سے ۲۰۔ اگست تک فیصلے کی خاطر عدالت مذکور میں مزید سماعت رہا۔

O......سیکشن نمبر ۷ (۲۲) قانون جو کہ لاگو کیا گیا اور انڈین پینل کوڈ (مخصوص جیوری) اور قانون گواہی نمبر ۸۸ جو کہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں کے تحت گواہیاں قلمبند کی گئیں۔ قانون کی دفعہ ۱۱۳، حکومت برطانیہ کی طرف سے کیس کی سماعت ہوئی اور اس قانون کے جزو ۴ جو کہ کورٹ مارشل کا حصہ ہے اور ہندوستان میں عدالت میں عام مقدمات سننے کا مجاز بھی ہے، میں سرکاری طور پر گواہیاں مکمل کی گئیں اور ملزم کو صفائی کا موقع دیا گیا اور اسے کہا کہ اگر تمہارا کوئی گواہ ہو تو عدالت میں پیش کیا جائے۔ معذوری کے بعد عدالت نے رسمی چھان بین کے بعد فیصلہ سنا دیا۔ ۱۲۹ بی قانون تعزیرات جس میں حکومت برطانیہ نے جولائی ۱۹۳۵ء میں نظریہ ضرورت کے تحت ترمیم کی تھی لاگو کیا گیا اور اس میں وضاحت کی کہ اب قاتل کی طرف سے کسی قسم کی کوئی گواہی قابل قبول نہیں ہوگی۔

O......پس مقدمہ سرکارِ وکیل کے دلائل اور اٹھارہ گواہان پر مشتمل بیانات جن کی وضاحت پیراگرف نمبر ۳ میں ہو چکی ہے اور قاتل کے قریب کھڑے ہوئے ساتھی کی، اس کے حق میں گواہی سے معذوری پر جبکہ مقتول گولی کھا کر گرا، ملزم کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ واقعے کی رات مقتول کے توہین آمیز کلمات سے وہ مشتعل تھا۔ اس کی بنا پر اسے مختلف ذہنی معائنوں سے گزارا گیا جن کی وضاحت پیراگراف نمبر ۵ میں درج ہے اور دو مختلف ڈاکٹروں کی آراء پیراگرف نمبر ۷ میں نقل ہیں۔

مندرجہ بالا رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم اس قدر جذباتی تھا کہ وہ اچھے اور برے کی تمیز کھو بیٹھا تھا اور ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر غضبناک روپ دھار چکا تھا جیسا کہ ایکٹ نمبر ۱۲۹ بی کے تحت پیراگراف نمبر ۶ میں وضاحت ہے۔ قطع نظر اس کے کہ سرکاری ماہر دماغ کی رپورٹ اور گواہوں کے بیانات کے پیشِ نظر ملزم کو قتل عمد کے ارتکاب کے ضمن میں اور سرکاری وکیل کی جرح نمبر ۱۹ کے تحت پیراگراف نمبر ۲ کی رو سے سزائے موت کا مستحق قرار دیا گیا۔

O......دفعہ ۱۳۲ بی میں ماضی قریب ہی میں ترمیم کی گئی تھی۔ اس پر عدالت کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن یہ نکتہ اس وجہ سے قابل اعتنا نہ سمجھا گیا کہ مقدمے کی بحث آخری مراحل میں ہے۔ سرکاری وکیل نے پرزور دلیل دیتے ہوئے کہا کہ معاملہ سراسر جذباتی نوعیت کا ہے۔ اس

کے علاوہ مقدمے کی صفائی میں کسی کی گواہی موجود نہیں ہے اور ایکٹ نمبر ۱۲۹ بی ارتکاب جرم کے مطابق ملزم کو سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ (پس مندرجہ بالا حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے عدالت نے سزائے موت سنائی تھی)



منتشر اوراق

پریوی کونسل سے اپیل خارج ہو چکی تھی اور اب صرف شہادت کے دن کا تعین باقی تھا۔ غازی صاحب کی امیدیں بر آنے کا وقت قریب پہنچ گیا اور انتظار کے جاں لیوا لمحات گزر چکے تھے۔ فوجی حکام نے ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۸ء کے روز سزا پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا۔ یہی وہ دن ہے جو غازی موصوفؒ کے نزدیک روزِ عید سے کم نہیں تھا۔ یوم شہادت کا دن مقرر ہونا ان کے لئے ایک خوشخبری تھی جسے سننے کے لئے وہ مہینوں سے بے قرار تھے۔ جب یہ نوید مسرت حضرت قبلہ غازی میاں محمد صاحبؒ نے سنی تو ان کا چہرہ یوں کھل اٹھا جیسے کسی نے ہولے سے صبح عید کا پیغام دیا ہو۔

اپیل مسترد ہونے کی اطلاع ملتے ہی قبلہ غازی صاحب کے والد بزرگوار، والدہ صاحبہ اور چھوٹا بھائی عطا محمد مارچ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں مدراس پہنچ گئے۔ جب یہ مختصر سا قافلہ اپنی منزل پر پہنچا تو وہاں کی مسلمان آبادی نے اپنی آنکھیں فرشِ راہ کیں۔ یہ لوگ اُردو روانی سے بول سکتے تھے۔ انہوں نے حتی المقدور غازی صاحب کی خدمت کی اور ان کے لواحقین کے ساتھ بھی ہر قسم کا تعاون کیا۔ اب حالات یکسر بدل چکے تھے۔ جب پہلی بار غلام محمد صاحب یہاں آئے تو انہیں گونا گوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بیگانوں کی تو بات ہی کیا۔ اپنوں کی چنی ہوئی دیواریں ہٹانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ صوبیدار میجر فضل خان جن کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے نے ہندو نوازی کے جذبے سے مغلوب ہو کر بڑی پریشانیاں پیدا کیں۔ اُس نے پابندی لگا رکھی تھی کہ حضرت غازی میاں محمد سے ہفتے میں صرف دوبارہ ملاقات کی جاسکتی ہے اور وہ بھی صرف آدھ گھنٹے کے لئے۔ اس کے سبب ملک غلام محمد صاحب کو بالعموم ملاقات کے لئے خصوصی اجازت لینا پڑتی۔ اس کی پالیسی یہاں تک معاندانہ تھی کہ غازی صاحب ہمہ وقت کڑی نگرانی میں رکھے جاتے۔ ان کے کھانے پینے کا بھی کوئی معقول بندوبست نہیں تھا۔ خط و کتابت کی اجازت تھی اور نہ ہی ہوا خوری کا موقع دیا جاتا۔ یہ سختیاں اور پابندیاں ایک معمول بن چکی تھیں۔ کچھ مدت بعد یہ الجھن اس طرح دور ہوئی کہ مقدمہ شروع ہونے کے ایک عرصہ بعد ان کی اپنی بلوچ پلٹن تبدیل ہو کر کراچی چلی گئی

اوراس کی جگہ آپ ۱۳۔۲ فرنٹیئر فورس کی پلٹن اس چھاؤنی میں آ گئی۔اگر چہ غازی صاحب کو ایک گورا پلٹن کی زیر حراست رکھا گیا تھا لیکن بلوچ پلٹن کے چلے جانے پر ان کو عملاً ۱۳/۲ فرنٹیئر فورس کی سپردگی میں دے دیا گیا۔

اس کے برعکس حقیقت حال یہ ہے کہ گورے سنتری غازی ممدوح کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انگریز افسر اور سپاہیوں کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ اگر انہیں آزاد بھی رکھا جائے تو یہ کہیں نہیں جائیں گے۔ اس کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جس کوٹھڑی میں قبلہ غازی صاحب زیر حراست تھے اس کے تالے کی چابی بھی آپ کے پاس ہی رہتی۔ ایک دن ایم۔ای۔ایس کے چند مستری بغرض مرمت بیرک میں آئے تو انہوں نے آپ کے کمرے میں بجلی کا ایک چھت والا پنکھا لگا دیا اور لائٹ سپلائی کا مناسب انتظام کر گئے۔ اس کے باوجود کبھی کسی انگریز افسر نے اعتراض نہیں کیا کہ قتل کے مقدمے میں ملوث قیدی کی کوٹھڑی میں یہ پنکھا کس نے اور کیوں لگایا ہے۔

پتوں کے خشک ڈھیر پر جب چاندنی کھلی
اپنے دکھوں کے ساتھ تیری بات بھی چلی

میجر غلام یٰسین صاحب نے ان دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے:

''جب ہماری پلٹن ۱۳/۲ فرنٹیئر فورس رائفلز ،جس کا پرانا نام ۵۶ بھائی بند ہے اور اب اسے ۸۔ ایف ایف آر کہتے ہیں، ۱۹۳۷ء میں مدراس، تھامس ماؤنٹ پہنچی تو ہمیں ایک ایسی اضافی ڈیوٹی ملی جس کو مسلمان نفری نے بخوشی قبول کیا، بلکہ جس کسی نے بھی اس کام میں کسی صورت بھی حصہ لیا وہ اس پر فخر محسوس کرتا ہے۔ یہ خدمت کیا تھی؟ ایمان تازہ رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ دراصل ہمارے پڑوس میں ایک گورا پلٹن کی کوارٹر گارد میں ایک قیدی تھا۔ بلوچ رجمنٹ سے اس مسلمان مجاہد کو وردی مہیا کرنا اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہمارے سپرد ہوا۔ یہ ملک میاں محمد صاحب تھے، جو گستاخ رسولؐ کو واصل فی النار کر کے ''غازی'' بنے اور بارگاہ رسالتؐ میں اپنی جان کا تحفہ پیش کر کے ''شہید'' کے بلند رتبے پر فائز ہو جانے والے تھے۔

میاں مرحومؒ دھیمے مزاج کے نوجوان تھے۔ جلدی غصے میں ہرگز نہ آیا کرتے۔ اپنے متعلق یا قرب و جوار میں جو کچھ بھی ہو اس کے خلاف سن سکتے تھے۔ لیکن شانِ رسول ﷺ میں گستاخی ان کے لئے کسی طرح بھی قابل برداشت نہ تھی۔ آپؐ کی ذات، آپؐ کی ناموس، آپؐ کی محبت اور آپؐ کی خاک قدم غازی میاں محمد شہیدؒ کی عزیز ترین متاع تھی۔ اس کے خلاف سننے کا یارا نہ تھا۔ جب چرن داس مردود نے بے ادبی کی تو انہیں سوچنے کا موقع تھا نہ بحث میں الجھنے کی مہلت۔ اپنے انجام کی فکر تھی نہ جان کی کوئی پرواہ! دل میں شوق و محبت کے ولولے، ہونٹوں پر درود و سلام کے ترانے اور ہاتھوں میں آگ اگلتی بندوق لئے آگے بڑھے اور ایک ہی وار میں عاشق رسولؐ نے گستاخ رسول کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ سب کچھ ہمارے مدراس جانے سے پہلے ہو چکا تھا۔ میں اس وقت بلحاظ عہدہ سپاہی کلرک تھا۔ جب غازی صاحب کی خدمت ہمارے سپرد ہوئی تو اُس وقت وہ ساتھ والی گورا پلٹن کی کوارٹر گارد میں فیصلے پر عملدرآمد کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہم اکثر میاں محمد صاحبؒ کی ملاقات کو جاتے۔ عموماً عصر کے وقت جانا ہوتا یا چھٹی کے روز قبل از دوپہر حاضر ہوتے۔ جب بھی گئے ان کو تلاوت کلام پاک کرتے پایا۔ ہم زیارت کے لئے جاتے تو قرآن پاک عارضی طور پر بند فرما لیتے۔ ہاتھ وہیں رکھا رہتا جہاں سے پڑھ رہے ہوتے، جیسے منتظر ہوں کہ جونہی ہم جائیں پھر سے بلا تاخیر تلاوت شروع کر دیں۔

غازی صاحب کی والدہ محترمہ اور والد صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے تو ان کی میزبانی کا شرف بھی ہمیں حاصل ہوا۔ اور غازی و شہید کی تجہیز و تکفین کا انتظام بھی ہمارے ذمہ تھا۔ کیپٹن نظام خاں صاحب جو اس وقت جمعدار ایڈ جوٹنٹ تھے، مجاہدانہ صفات کے مالک اور ہمارے ''ٹیپو سلطان'' تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کس کی مجال تھی کہ شہید رسالت کو ذرا سی رنجش کا موقع بھی دے! عیدالفطر آئی تو حضرت قبلہ غازی صاحب کو ہماری پلٹن میں نماز عید کے لئے شامل ہونے کی اجازت مل گئی۔ میں ان صفوں پر بیٹھا تھا جہاں میاں صاحب کے لئے جگہ مخصوص

تھی اور نماز کے فوراً بعد ان کو چلے جانا تھا۔ وہ اپنے اردلی اور سنتری کے ہمراہ آئے۔ دائیں بائیں چند نمازیوں سے مصافحہ کیا۔ آپ کے چہرے پر وہ وقار اور نور و مسرت کی ایسی بہار تھی کہ آج بھی وہ منظر یاد آئے تو آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔

ایک ملاقات کے دوران میں نے منصور حلاجؒ کا قصہ سنایا کہ حضرت منصورؒ کو جب قاضی القضاۃ نے سزائے موت سنائی تو اس فیصلے پر عملدرآمد کے انتظار کی مدت میں ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسالت مآبؐ ایک خوبصورت خیمے کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔ خیمہ کے بالائی پردے میں ایک سوراخ ہے جہاں سے دھوپ کی کرنیں چھن چھن کر آپ کے رخ انور پر پڑ رہی ہیں۔ شیخ منصورؒ بار بار کوشش کرتے ہیں کہ یہ سوراخ بند ہو جائے لیکن بند نہیں ہوتا۔ اچانک حضرت منصور بن حلاجؒ کو اشارہ ہوتا ہے کہ موت کے کنارے پہنچ کر انتظار کیسا! جان کی قربانی پوری ہوئی تو یہ سوراخ بھی بند ہو جائے گا۔

یہ حکایت سن کر غازی میاں محمد صاحب کا چہرہ دمک اٹھا۔ آنکھوں میں ایک شعلہ لپکتا دکھائی دیا۔ کانپتے ہونٹوں سے کہنے لگے" تاخیر مجھ سے تو نہیں ہوئی۔ میں تو کب سے جان حاضر کئے بیٹھا ہوں۔ غازی میاں محمد صاحب، عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے پیکر اور فنا فی الرسول تھے۔ چند دن بعد یہ قافلۂ عشق منزل پہ پہنچ گیا"۔

کیپٹن نظام خاں صاحب جو فوجی حلقوں میں "ٹیپو سلطان" کے نام سے متعارف ہیں، نے ایک اخباری نمائندے کی مخلصانہ خواہش پر اس روح افزا واقعہ کے حالات و واقعات اور اپنے جذبات و احساسات کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ جامہ الفاظ پہنایا تھا۔ ان کے تاثرات سے حضرت شہیدؒ کی اسیری کے شب و روز اور مدراس کی آب و ہوا کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ چند صفحات تاریخ کا ایک سنہری باب ہیں۔

انہوں نے لکھا ہے:

"میں ۱۹۳۸ء میں ۲۱۳۔ فرنٹیئر فورس رائفلز میں جمعدار ایڈ جوٹنٹ

تھا۔ مجھے اپنے کرنل فری لین نے غازی میاں محمد صاحب کے بارے میں بتایا کہ فلاں تاریخ سے ان کے متعلق تمام ذمہ داریاں ہماری ہوں گی۔ ان کے کھانے پینے اور کپڑوں کی صفائی وغیرہ کا بندوبست بھی ہمارے حصے میں آنے والا ہے؛ کیونکہ ۱۰۔۳ بلوچ رجمنٹ کی افسر پارٹی کراچی جا رہی ہے۔

غازی صاحب کو گورا پلٹن کے کوارٹر گارد میں ایک کمرہ ملا تھا جو کہ ۱۴x۱۴ تھا، جس میں ایک پلنگ، ایک پنکھا اور بجلی کا بلب لگا ہوا تھا۔ ان کے پاس قرآن مجید کا نسخہ بھی موجود رہا جس کی آپ تلاوت کیا کرتے۔ وضو کے لئے ایک لوٹا بھی وہیں پڑا رہتا۔ دو سپاہی، ایک حوالدار اور ایک لانس نائیک اکبر شاہ نامی حضرت غازی صاحب کو ہر روز صبح اور شام کے وقت گھنٹہ بھر کے لئے سیر و تفریح کی خاطر لے جایا کرتے۔ لانس نائیک اکبر شاہ بطور ترجمان غازی صاحب کے ساتھ مقرر تھا، کیونکہ غازی صاحب انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔

شمع رسالتؐ کے پروانے کی تفریح کا مقام سینٹ تھامس ماؤنٹین تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر سینٹ تھامس نامی ایک پادری صاحب کی قبر ہے۔ مدراس یہاں سے دس میل دور ہے۔ اس پہاڑی پر بیٹھ کر تمام مدراس کی سڑکوں اور بارونق بازاروں کا بخوبی نظارہ کیا جا سکتا ہے اور ساتھ ساتھ سمندر کی مچلتی موجیں بھی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیتی ہیں۔ اس خوبصورت پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ کر ناموس رسالت کا محافظ اپنی خوش قسمتی پر سجدۂ شکر بجالایا کرتا تھا۔ عام حالات میں اس مقام پر جانے کی اجازت کسی افسر کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کسی کی کیا مجال جو آپ کو منع کرتا!

میرے مقدر کا ستارہ چمک اٹھا تھا۔ میں نے یہ فرائض سنبھالتے ہوئے بہشتی (پانی پلانے والا) گلاب خاں کو غازی صاحب کی خدمت پر مامور کرتے ہوئے کہا: اگر حضرت میاں محمد صاحبؒ کے معاملے میں تم

نے ذرا بھی کوتاہی کی تو مجھے کبھی اپنا دوست خیال نہ کرنا۔ حالانکہ وہ بذات خود بہت ہی فرض شناس اور اچھا آدمی تھا۔ ۳/۱۰ بلوچ رجمنٹ کی پارٹی کے چلے جانے کے بعد حالات میں کافی تبدیلی رونما ہوگئی تھی۔ غازی صاحب نے اس کا سبب دریافت کیا تو انہیں بتایا گیا کہ یہ تبدیلی ہمارے جمعدار ایڈ جوٹنٹ کی آپ کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس پر انہوں نے ہمارے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

آپ فرنٹیئر رائفلز کے ارکان پر بہت مہربان تھے، حالانکہ یہ تبدیلی کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ تو قدرت کی طرف سے ایک انعام تھا۔ جب پہلے لوگ عاشق نبی کی قدر نہ کر سکے تو یہ عظیم سعادت ان سے چھن گئی۔ ہم اسے کرشمہ خداوندی سمجھتے ہیں۔ چونکہ میں خدمت انچارج تھا اس لئے میری طرف سے تمام خدمت گاروں کو ہدایت تھی کہ اگر کوتاہی سے کام لیا گیا تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔ مجھ سے جو ممکن ہوسکتا تھا میں نے کیا اور مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ مجھے قدرت نے ایک شہید رسالتؐ کی خدمت پر مامور رکھا۔

میں نے آپ کی خدمت کے سلسلے مین جو کچھ کیا ہے اس کے بدلے اگر کوئی مجھے دنیا کی بادشاہی بھی دے تو ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ میرے مالک حقیقی نے مجھ پر یہ احسان عظیم کیا تھا۔ اس پر بندۂ احقر اپنے مالک وخالق اور رسول پاک ﷺ کا اتنا شکر گزار ہے کہ میں تمام زندگی اگر سر بسجود رہوں تو ادائے شکر پھر بھی ممکن نہیں۔ بہر حال میں پوری کوشش کیا کرتا تھا کہ غازی صاحب کو گرم گرم روٹی، صاف ستھرے کپڑے اور غسل کے لئے ان کی پسند کا پانی مہیا ہو۔ میری ہمیشہ خواہش رہتی کہ آپ کا کمرہ خوشبوؤں سے معطر رہے۔

انہی دنوں اپیل پریوی کونسل سے نامنظور ہوئی تو غازی صاحب کے والدین اور ایک چھوٹا بھائی مدراس آئے۔ میں نے ان کی میزبانی کو ایک سعادت خیال کرتے ہوئے جے۔ سی۔ او کوارٹر انہیں دے دیا اور

دیگر خدمات کے لئے ایک اردلی کی ڈیوٹی بھی لگادی۔

ہر ہفتے غازی صاحب کا ڈاکٹری معائنہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر مختار احمد (خوشاب) نے یہ خدمات بطریق احسن سرانجام دیں۔ جب بھی غازی موصوف معائنے کے لئے تشریف لاتے تو ڈاکٹر مذکور ان کا پرتپاک استقبال کرتے۔ ان کا رویہ اس قدر ہمدردانہ ومخلصانہ ہوتا کہ اس کی تعریف الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

مدراس کے مسلمان شہید مصطفیٰ کے بڑے عقیدت مند تھے۔ ان کی اکثر و بیشتر یہ خواہش ہوتی کہ آپ سے ملاقات کی جائے۔ وہ لوگ جب بھی ملنے آتے نہایت خلوص واردات سے تحائف پیش کرتے۔ ہمارے ان مسلمان بھائیوں نے اسلامی اخوت، انسانی ہمدردی اور رواداری کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ آج بھی دل پر نقش ہیں۔ چونکہ وہ میرے حال اور قبلہ موصوف کے ساتھ عقیدت سے واقف تھے، اس لئے مجھے رات کی تاریکیوں میں ملتے تھے اور کبھی دن کی روشنیوں میں آموجود ہوتے۔ وہ کبھی کبھار اس بات پر حیران بھی ہوتے تھے کہ یہ کیسا آدمی ہے، جو انگریزوں کی حکمرانی اور ہندوؤں کے اثر ورسوخ میں نہایت دلیری کے ساتھ یہ کام سرانجام دے رہا ہے، حالانکہ میں صرف اپنا فرض نبھا رہا تھا۔ نام محمد ﷺ پر قربان ہونے والے کی خدمت سے بڑھ کر اور کیا فرض ہوسکتا ہے!

ایک بار مجھے مدراس کے بعض جرأت مند مسلمانوں نے یہ پیشکش بھی کی کہ ہم ملک میاں محمد صاحبؒ کو فرار کرانے کی تمام ذمہ داریاں سنبھالنے کو تیار ہیں بشرطیکہ غازی موصوف رضامند ہوں۔ لیکن اس تجویز کی حوصلہ افزائی نہ ہوسکی کیونکہ جانباز پروانہ قبل ازیں بھی اسے مسترد کرچکا تھا۔ آپ نے تاثرات تحریر کرنے کو کہا ہے۔ میرے پاس اس کے لئے مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ شاید ایسے مقامات پر زبان کا دامن ہمیشہ تنگ دکھائی دیتا ہے۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ جب بھی یہ واقعہ بیان کرتا ہوں تو

خوشی کے مارے اب بھی کئی بار زار و قطار رو پڑتا ہوں۔ مجھے اس بات پر خوشی ہوئی کہ غازی صاحب کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ اتنی مدت گزرنے کے باوجود ان کو نہایت عزت کے ساتھ یاد کیا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں انہیں بھلا دینا ممکن ہی نہیں۔ ویسے بھی زندہ قومیں اپنے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں''۔

مذکورہ بالا روایات کی تصدیق کے لئے میجر غلام یٰسین صاحب اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب کی تحریری شہادتیں بھی موجود ہیں۔ بلاشبہ کیپٹن نظام خان صاحب کا کردار قابلِ رشک ہے اور ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ ڈاکٹر میجر مختار احمد قاضی کے بقول: غازی صاحب کورٹ مارشل کے دوران ہر ساتویں روز ہسپتال میں معائنے کے لئے لائے جاتے تھے۔ ان کے منہ سے کبھی گلہ وشکایت کی بات نہیں نکلی۔ آپ کے چہرے سے ایک دن بھی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ حضور اکرم ﷺ کے مخلص فدائی اور سچے شیدائی تھے۔

جان تو جاتے ہی جائے گی قیامت یہ ہے
کہ یہاں مرنے پہ ٹھہرا ہے نظارہ تیرا

۱۳/۲ فرنٹیئر فورس کا صوبیدار میجر، گو ایک ہندو تھا لیکن اس کے دل میں تعصب کارفرما نہیں تھا۔ اس نے مقتول ڈوگرے کی ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے جداگانہ راہ اپنائی۔ وہ گارد انچارج اور ان کے ساتھیوں پر مکمل اعتبار کرتا رہا۔ اس معاملہ کے جملہ امور نظام خان صاحب کی صوابدید سے طے پاتے تھے۔ اس دوران گورا پلٹن جو رسمی طور پر آپ کی حفاظت کی ذمہ دار تھی کو قیدی پر بڑا اعتماد تھا۔ فرنٹیئر فورس کے مسلم ارکان نے دینی فرض سمجھ کر آپ کی خدمت کو شعار بنالیا تھا۔ اسے غازی ممدوح کی سادگی وشرافت سمجھئے کہ انتظامیہ کے یقین کا اثر یا خدائی نعمتوں کا منہ بولتا ثبوت کہ جب دوسری مرتبہ صوبیدار ملک غلام محمد اپنی بیوی اور چھوٹے بیٹے عطا محمد کو لے کر مدراس گئے تو ایک دن کورٹ مارشل کیس کا ملزم غازی میاں محمد، ایام اسیری میں عام اجازت سے اپنے چھوٹے بھائی کو سائیکل پر بٹھا کر ایئرپورٹ پر ہوائی جہاز دکھانے لے گیا۔ آپ ننھے بھائی کو چومتے تھے اور کبھی گلے لگاتے اور سیر وتفریح کے بعد برادر حقیقی کے ساتھ پیار ومحبت کی باتیں کرتے ہنستے مسکراتے ہوئے لوٹ آئے۔

آپ پر کڑی نگرانی تھی نہ کوئی خاص پابندی۔ غازی صاحب ایک دو محافظوں کی موجودگی

میں آزادانہ گھومتے پھرتے تھے۔ اکثر اوقات مناظر قدرت دیکھنے کی غرض سے پہاڑی مقام پر تشریف لے جاتے۔ خان بہادر عبدالرحمٰن صاحب جو نہایت ذی مرتبہ و رعب دار شخصیت کے مالک اور مدراس چھاؤنی سے بالکل قریب رہائش پذیر تھے، بالعموم شمع رسالتؐ کے اس پروانے کی زیارت کے شوق میں کھنچے چلتے آتے۔ ان کو معلوم تھا کہ گورے ان کی دیکھ بھال میں بہت بے پرواہ ہیں۔ خان بہادر نے ایک موقع پر غازی صاحب سے کہا: میں حفاظت کا ناقص انتظام اچھی طرح دیکھ بھال چکا ہوں۔ آپ بڑی آسانی سے میرے بنگلہ تک آسکتے ہیں۔ اگر آپ وہاں پہنچ جائیں تو آگے کا میں ذمہ لیتا ہوں کہ ہندوستان کے اندر یا باہر جس جگہ بھی آپ کہیں گے، نیازمند وہاں بھجوانے کا معقول بندوبست کر دے گا۔ غازی صاحب نے ان کو جواب دیا: آپ کا مقصد یہ ہے کہ میں اس حسین موت سے بچ جاؤں جو درحقیقت موت نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے یقین دلا سکتے ہیں کہ موت کا فرشتہ پھر میرے بدن کو نہیں چھوئے گا۔ جب اس کا ایک وقت مقرر ہی ہے تو آپ مجھے اس سعادت سے محروم کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ زندگی اچھی چیز ہے لیکن ایسی موت کو ہر وقت سینے سے لگانے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ للٰہذا میں کسی صورت ان لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر بھاگنے کا سوچ بھی نہیں سکتا''۔



گوروں کے بچے غازی صاحب سے اس قدر مانوس تھے کہ وہ کھیلتے کھیلتے آپ کے پاس پہنچ جاتے اور پہروں کوٹھڑی کے سامنے کھڑے رہتے۔ انگریز افسروں کی بیگمات کے نزدیک یہ ایک عجوبہ تھا کہ کوئی شخص موت کو اس قدر قریب پا کر بھی خوش و خرم رہے۔ اس لئے وہ آہنی سلاخوں میں سزائے موت کے ایک قیدی کی تصویریں بنانے آجاتیں تاکہ البم کی زینت بنا سکیں اور اپنے اندر خوشیوں کو سمیٹے ہوئے یہ ''پوز'' ہم وطنوں کو دکھا کر حیرت سے غرق کر دیں۔

غازی صاحب نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ واقعہ قتل سے قبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ اس کے بعد انہوں نے فرض نماز کبھی ترک نہیں کی۔ ہمہ وقت تلاوت کلام پاک میں مشغول رہتے تھے۔ رمضان المبارک کا پورا مہینہ تو انہوں نے جاگ کر گزار دیا۔ آپ نوافل ادا کرتے تھے اور درود شریف کے ورد میں مگن رہتے۔ شہادت سے چند ماہ پہلے اسیری کے ایام میں عیدالفطر آئی تو غازی صاحبؒ نے آزادانہ طور پر نماز عید کی ادائیگی کی خواہش ظاہر کی۔ چونکہ ایسے مواقع پر انتظامیہ کو کئی خدشات ہوتے ہیں، بعض اوقات ہنگامہ آرائی کی نوبت بھی آجاتی ہے، اس

لئے کیپٹن نظام خان، جمعدار حلیم گل اور صوبیدار امیر خان کو ضمانت دینی پڑی اور حکومت نے مطمئن ہونے کے بعد کہ کوئی گڑ بڑ نہیں ہوگی۔ اس کی اجازت دے دی۔

میجر (ریٹائرڈ) غلام یٰسین صاحب مزید بتاتے ہیں کہ عید آئی تو بعض سرفروش مسلمانوں کی ضمانت پر غازی میاں محمدؒ کو ہماری پلٹن میں نماز پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ ان کے چہرے پر وہ نور اور وقار تھا کہ آج بھی یہ روحانی منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ نماز عید کے بعد غازی صاحب پلٹن اور نزدیکی حلقے کے افراد سے فرداً فرداً گلے ملے اور اس سے پہلے جم غفیر کے سامنے مختصراً خطاب بھی فرمایا۔ دوسری عید آئی تو اجازت نہ مل سکی کیونکہ ہندوؤں نے اس پر زبردست احتجاج کیا تھا۔

کیپٹن نظام صاحب کے بقول: جب ہم غازی صاحب کے ساتھ عید گاہ پہنچ گئے تو پیش امام مولوی میر عالم صاحب کے دائیں ہاتھ کے ساتھ ان کے لئے جگہ خاص بنائی گئی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

> ''پیارے بھائیو! اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرو۔ آپس میں بھائیوں کی طرح اور پُرامن رہو۔ میں، پیارے رسول ﷺ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ مجھ میں سوائے اس کے کوئی خوبی نہیں کہ میرے ہاتھوں سے شانِ رسول ﷺ پر ناروا حملے کرنے والا ایک مردود جہنم رسید ہوا ہے۔ تاجدار مدینہ کی ذرا سی توہین بھی ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی۔ خدانخواستہ آئندہ کسی ایک گستاخ نے آپ ﷺ کی ذات کی طرف دیکھا تو ناموس رسالت ﷺ کے ہزاروں محافظ سربکف مقتل کی طرف بڑھیں گے۔ یہ بات ہر کس و ناکس کے علم میں آجانی چاہئے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میری قربانی سے دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔ میرا کردار کسی تنہا فرد کا نہیں بلکہ پوری قوم کا کردار ہے۔ گستاخوں اور محبوں کا باہم مل کر رہنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ تمام بھائی دعا کریں کہ خداوند کریم راضی ہو اور بارگاہ رسالت ﷺ میں مجھ ناچیز کی جان جیسی حقیر قربانی قبول ہو جائے یہ میری آپ لوگوں سے شائد آخری ملاقات ہو۔ میں ہر ایک سے ملنا چاہتا ہوں''۔

اس کے بعد غازی صاحب تمام بھائیوں سے ملے اور احوال دریافت فرمائے۔ جب میرے نزدیک آئے تو ہاتھ ملاتے وقت ایسی رقت انگیز کیفیت طاری ہوئی کہ ہم دونوں کوئی بات نہیں کر پائے تھے۔



ایک خط

غازی میاں محمد شہیدؒ کی بے قراری کے دن ختم ہو چکے تھے۔ ہجر و فراق کا موسم بیت گیا۔ جب پریوی کونسل سے اپیل مسترد ہو چکی تو آخر کار شہادت کا دن مقرر ہو گیا۔ اس کی اطلاع ۲۱ فروری ۱۹۳۸ء کو دی گئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس مقدمے میں جتنی بار اور جہاں بھی اپیل کی گئی یہ غازی صاحبؒ کی مرضی کے بالکل خلاف تھی۔ ہر بار ان کا یہی اصرار ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سعادت نصیب کی ہے، آپ مجھے اس سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے والدین سے یہی عرض کرتے کہ یہ بات آپ کے لئے خوشی کا باعث ہونی چاہئے کہ آپ کا بیٹا ناموس مصطفیٰ ﷺ پر فدا ہو رہا ہے۔ غالباً آپ کے اسی جذبے کا اثر تھا کہ ہر جگہ سے اپیلیں خارج ہوتی گئیں۔ آخری اپیل کے مسترد ہونے کی خبر ملنے پر آپ کے والدین اور چھوٹا بھائی مدراس پہنچ چکے تھے۔

پہلے دن غازی صاحبؒ کی والدہ محترمہ آپ سے ملنے گئیں تو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں۔ آخر ماں تھیں۔ بیٹے کو قید میں دیکھا، موت جس سے صرف چند قدم دور بازو پھیلائے کھڑی مسکرا رہی تھی تو وہ رونے لگیں۔ غازی صاحب دنیا میں سب سے شفیق ہستی اور ہمدرد ذات کے سامنے کھڑے تھے۔ محبت و مہربانی کا وہ عظیم روپ، جسے ماں کہتے ہیں۔ وہ ماں جو شیر خواری کے زمانے میں آپ کو سینے سے چمٹائے رکھتی تھی۔ بچپن میں اگر کبھی آپ کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا تو یوں بلبلا اٹھتیں جیسے یہ زخم ان کے جگر پر آیا ہو۔ کبھی سکول سے آتے ہوئے دیر ہو جاتی تو ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوئی کہتیں: خدایا! میرا بیٹا ابھی تک گھر نہیں آیا۔ ایسے میں ان کے کان گوش برآواز ہوتے اور آنکھیں دروازے پر لگی رہتیں۔ جوانی کا موسم آیا۔ نورِ چشم اگر ایک پل نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو پوری کائنات تاریک دکھائی دینے لگتی تھی۔ آج وہی بیٹا اپنے گلے میں پھولوں کے ہار پہنے دست شفقت کا طالب تھا۔ گویا لخت جگر کہہ رہا ہے: ماں! میں سوئے مقتل جانے والا ہوں، مجھے اپنے کانپتے ہونٹوں سے خدا حافظ کہہ دو۔ بہرحال غازی صاحبؒ نے اپنی

والدہ محترمہ سے عرض کیا: ماں! میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا، جس سے آپ کو ندامت یا شرمندگی ہو بلکہ میں نے جو کچھ کیا اس پر آپ کو خوش ہونا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب آپ مجھ سے ملنے آئیں تو رویا نہ کریں۔

آخر انہوں نے اپنی والدہ صاحبہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ رویا نہیں کریں گی۔ جہاں تک ان کے والد صاحب کے صبر اور حوصلہ کا تعلق ہے، یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ وہ گلوگیر ہوتے تھے نہ کبھی آبدیدہ۔ زمانہ دیکھا بھالا ہوا تھا اور زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ سے گزر چکے تھے۔ وہ نہایت باہمت اور صابر و شاکر انسان تھے۔ باپ بیٹے کا حوصلہ بڑھاتا تھا اور بیٹا باپ کا۔

فقط یہ سوچ کر میں نے پیئے ہیں عمر بھر آنسو
وفورِ غم سے تیری آنکھ بھر آئی تو کیا ہو گا

غازی صاحب اپنے آقا و مولا کی ناموس کی خاطر جان دینے ہی کو مقصد حیات سمجھتے تھے۔ بات صرف روایتوں کی ہوتی تو مبالغہ خیال کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں کے تاثرات میں بھی افسانوی پہلو کا شائبہ ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ لیکن ذاتی نوعیت کا ایک ایسا خط، جو بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی کو لکھا ہو، اس میں کوئی افسانوی رنگ اور غیر حقیقی موضوع کیسے آ سکتا ہے۔

غازی میاں محمد شہیدؒ نے شہادت سے صرف چار یوم قبل یعنی ۷۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے بھائی ملک نور محمد صاحب کے نام ایک خط اپنے ہاتھوں سے لکھا اور خوش قسمتی سے اب بھی اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ چار فل سکیپ صفحوں پر یہ طویل خط اپنے اندر محبت و عشق، سوز و ساز شوق و ولولہ اور پاکیزہ جذبات کی ایک دنیا سموئے ہوئے ہے۔ میرے خیال میں اگر ان کی زندگی کے دیگر تفصیلی حالات و واقعات دستیاب نہ بھی ہوتے تو صرف یہی ایک خط ان کے جذبۂ قربانی کے اظہار کے لئے کافی تھا۔ سرفروشی کا یہ اشتیاق اپنی قوم کا ورثہ تھا جو مدت ہوئی شاید ہم سے چھن گیا ہے۔ آج پھر اس کا تذکرہ مقصود ہے کہ پھر سے رگ حمیت پھڑک اٹھے۔

چونکہ بول چال میں تلہ گنگ کا لہجہ، پشتو زبان اور کسی حد تک پوٹھوہاری تہذیب سے متاثر ہے، اس لئے تذکیر و تانیث کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا۔ بنابریں بعض جگہ فقرہ بندی اور الفاظ کی ترکیب بھی کھٹکتی ہے۔ لیکن اصول گرائمر اور انداز تحریر کی پابندیوں سے ہٹ کر مناسب یہی ہے کہ اسے من و عن رقم کیا جائے تاکہ بلاواسطہ دل کی دنیا پر اثر انداز ہو اور کسی تبدیلی سے تاریخ اسلام کا یہ گرانقدر سرمایہ گڈ مڈ نہ ہو جائے۔ تاہم بعض جگہ مطالعے کی آسانی کے لئے بریکٹ میں

وضاحت کی گئی ہے۔ غازی صاحب نے دائیں کونے پر جائے مقام اور بائیں طرف تاریخ لکھنے کے بعد اپنے برادر حقیقی کو یوں مخاطب کیا ہے:

''برادرم جان میرے پیارے بھائی نور محمد سلامت باشد''

از طرف آپ کا تابعدار، خاکسار، چند گھڑیوں کا مہمان بھائی میاں محمد۔ بعد اسلام علیکم کے واضح ہو کہ یہاں پر خیریت ہے اور خیریت آپ کی خداوند کریم سے ہمیشہ نیک احوال چاہتا ہوں۔ میرے پیارے بھائی! عرض یہ ہے کہ آپ تمام حال سن ہی چکے ہوں گے۔ کل مورخہ ۶۔اپریل ۱۹۳۸ء کو دہلی سے ایک خط جو کہ جناب والد صاحب کے نام پر آیا ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ لنڈن سے خبر آئی ہے کہ تمہاری اپیل نامنظور ہو گئی ہے، اور میاں محمد کو سزائے موت کی سزا ہے۔ جس کی بابت میں سزا کی تاریخ ادھر مدراس میں ایک گورا پلٹن کا کمانڈنگ افسر مقرر کرے گا۔

بھائی صاحب عرض یہ ہے کہ جو چٹھی والد صاحب کو ملا ہے، اس میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس قسم کی ایک چٹھی ہم نے تمہارے گھر کے پتہ پر بھی روانہ کر دی ہے۔ بھائی جان! عرض ہے کہ کوئی تاریخ ابھی تک بندہ کی قربانی کو مقرر نہیں ہوئی، لیکن اُمید ہے کہ شائد کل تک کوئی تاریخ مقرر راور ہو جاوے۔ اگر زیادہ انہوں نے عرصہ رکھا تو تین دن کی میعاد رکھیں گے۔ خیر کچھ بھی ہو خداوند کریم کی ذات بہتر جانتی ہے۔

بھائی جان! آپ کی برادرانہ محبت نے مجبور کیا ہے کہ چل آخری دفعہ اپنے پیارے بھائی کی طرف ایک خط عرض کروں اور چند باتیں بطور نصیحت کے عرض کروں۔ جن پر آپ کو ضرور عمل کرنا ہوگا۔ ان کو بالکل اچھی طرح پڑھ لینا اور یہ خط اپنے بھائی کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا۔

بھائی جان! ذرا غور سے پڑھنا۔ میرے پیارے بھائی! بندہ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کے دل پر اپنے بھائی سے جدا ہونے کا کس قدر غم ہوگا۔ پھر جدائی بھی وہ کہ آخری دفعہ بھائیوں کی ملاقات بھی نہ ہو۔

یہ سب کچھ خداوند کریم کی شان ہے۔ آپ خداوند کریم کی رضا پر راضی رہنا اور ہر حالت میں صبر کرنا اور خداوند کریم کا ہزار ہزار شکریہ ادا کرنا۔ آپ اپنے دل کے غم کو اندر ہی رکھنا۔ باقی لوگو (لوگوں) پر آپ کا غم نہ ظاہر ہو۔ بھائی جان! آپ لوگ صبر کرنا اور خبردار، زبان پر شکایت کا حرف نہ آنے پائے۔ بھائی جان! آپ پر یہ سخت نازک وقت ہے کہ والدین بھی گھر میں نہیں ہیں۔ لیکن ہمت اور استقلال سے کام لینا اور ادھر جناب والد صاحب کا جس قدر حوصلہ ہے، دنیا میں بہت کم آدمی کا ایسا ہوگا اور خداوند کریم ان کو انشاء اللہ اس صبر کا اجر دے گا۔ آمین ثم آمین اور شائد آپ کے دل میں یہ خیال ہوگا کہ شائد میاں محمد بھی گھابر (گھبرا) گیا ہوگا۔

بھائی جان! اگر آپ کے دل میں یہ شک ہے تو اس شک کو دور کر دینا۔ بھائی جان! میں قسم کر (کھا) کے کہتا ہوں کہ بندہ کا دل اس قدر خوش ہے کہ جس خوشی کا حساب اور دوسرا آدمی کوئی نہیں کر سکتا۔ میری دلی آرزو یہی تھی، جو کہ میرے خداوند کریم نے پوری کر دی۔ میں گناہ کے سمندر میں غرق تھا اور میری بخشش کا ایک سہارا بنا دیا اور اس مالک کی اس مہربانی کا ہزار ہزار شکریہ اور بھائی! آپ گھر میں سب کو تسلی دینا اور آپ کو اس بات کی سخت تاکید کرتا ہوں کہ آپ خود بھی اور گھر کے آدمی بھی یعنی بندہ کی ہمشیرہ صاحبہ اور بندہ کی عیال اور بھائی جان فتح محمد، بھائی صاحب محمد خان ان کو بالکل نہیں رونے دینا اور دوسرے آدمی جو کہ آپ کے پاس افسوس کرنے آویں گے، تمام مرد اور عورتوں کو نہیں رونے دینا اور ان کو روکنا اور ان کو بتا دینا کہ میرے بھائی نے لکھا ہے کہ مجھ کو کوئی آدمی نہیں روئے گا۔

اور بندہ کی طرف سے بندہ کی عیال (بیوی) کو واضح ہو کہ میں آپ پر نہایت خوش اور راضی ہوں اور دل و جان سے دُعا گو ہو (ہوں) کہ خداوند کریم نے تم کو ابھی (تک) میرے والدین کا فرمانبردار رکھا ہے۔

آئندہ بھی اسی طرح قائم رکھے اور میں حد سے زیادہ خوش ہوں، کیونکہ تو نے میرے والدین کی بہت اچھی طرح خدمت کی ہے۔ میں تم پر بہت ہی راضی ہوں اور تم نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی، جس کو (پر) کہ ابھی تم کو معافی کا خواستگار ہونا پڑتا (پڑے)۔ اگر میرے اوپر کسی قسم کی ناراضگی ہو تو خدا واسطے مجھ خطا وار کو میری خطا بخش دینا اور بندہ کو والدین کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آپ بہت غمزدہ رہتی ہیں۔ لیکن آپ بالکل حوصلہ رکھنا اور جہاں تک ہو سکے صبر کرنا۔

جب خداوند کریم کو یہ منظور ہو تو پھر اس کے حکم کو کون روک سکتا ہے اور بندہ نے جناب والد صاحب کو آپ کے بارے میں سب باتیں عرض کر دی ہیں، جو کہ آپ کو گھر آنے پر بتا دیویں گے۔ اگر آپ نے ان باتوں پر عمل کیا اور آپ اپنے ماموں صاحب کے کہنے پر چلی (چلیں) تو آپ کو انشاء اللہ کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی اور اپنے غریب اور مسکین ماموں کا خیال کرنا اور تمہارے آگے میں ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہوں اور خدا کا واسطہ ڈالتا ہوں کہ اپنے مسکین ماموں صاحب یعنی بندہ کے والد صاحب کی عزت کا خیال رکھنا اور ان کے کہنے پر عمل کرنا اور بجائے رونے دھونے کے اپنے رب کو یاد کرنا، نماز پڑھنا۔ اپنے رب کی بندگی کرنا اور بندہ کی بخشش کے لئے دُعا فرمانا۔ آپ مہربانی سے تسلی رکھنا۔ ابھی خط بند کرتا ہوں۔ میری باتوں کا ذرا خیال رکھنا۔

بھائی جان! بندہ کی ہمشیرہ صاحبہ کو بھی بندہ کی طرف سے واضح ہو کہ بالکل حوصلہ اور تسلی سے کام لینا اور رونے دھونے کی بجائے اپنی نماز ادا کرنا اور اپنے رب کی بندگی کرنا اور میرنے لئے بھی دُعا کرنا اور آپ کو بے شک بھائی کا بہت افسوس ہوگا۔ لیکن خداوند کریم (سے) کسی کا زور نہیں چل سکتا۔ اور اس کی رضا پر راضی رہنا چاہیئے۔ بندہ کو بھی اس بات کا افسوس ہے کہ آخری وقت بہن بھائی کی ملاقات بھی نہ ہوئی۔ لیکن میری پیاری ہمشیرہ! جب ہمارے خداوند کریم کو یہی منظور تھا تو کوئی بھی کچھ نہیں

کر سکتا اور خود بھی حوصلہ رکھنا اور اپنے چھوٹے بھائی فتح محمد کو بھی تسلی دینا۔ پھوپھی صاحبہ کو اور جو کوئی آدمی روئے اس کو رونے سے منع کرنا کہ میرے بھائی کو مت روؤ اور بالکل صبر کرنا اور صبر سے کام لینا۔ سوائے صبر کے کچھ نہیں ہو سکتا اور آپ کو شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ آپ کا بھائی اپنے سچے اسلام کی خاطر قربان ہو گیا۔

بھائی جان! عرض یہ ہے کہ بندہ کو یہ بات کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ میں بار بار لکھتا ہوں کہ صبر کرنا...... بھلا یہ بھی کیا بات ہے کہ بھائی جدا ہونے لگے ہوں۔ جدائی بھی وہ کہ عمر بھر، زندگی بھر کی جدائی اور وہ جدائی کے (کہ) آخری ملاقات بھی نہ ہو۔ اور دنیا میں بھائی ایک عجیب چیز ہوتی ہے۔ انہیں جدائی کا بے شک افسوس ہوتا ہے لیکن میرا یہ عین فرض تھا کہ میں آپ کو صبر کرنے اور حوصلہ رکھنے کے لئے عرض کرتا۔ دراصل اگر خیال کیا جاوے تو یہ دنیا کی زندگی کچھ بھی نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا کچھ بھی نہیں ہے، صرف فریب اور دھوکھا (دھوکا) ہے۔ آدمی دنیا کے لالچ میں اس (میں) پھنس کر اندھا ہو جاتا ہے لیکن اگر صاف نذر (نظر) اور غور سے دیکھا جاوے تو یہ دنیا کچھ چیز نہیں۔

آہ! خداوند کریم نے اپنے پیارے محبوب ﷺ کی خاطر (دو) جہان بنائے تھے اور جن کی خاطر (دو) جہان بنے، جب وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے تو بھائی اور کون حستی (ہستی) دنیا میں رہے گی۔ ان کے نام اپنی جان قربان کر دو۔ اور گھر بار ان پر فدا کر دو۔ میں گناہگار، بدکار تو کچھ چیز بھی نہیں۔ ان کے غلاموں کی جوتیوں (کی) خاک کے برابر بھی نہیں۔ اگر وہ خاک بھی ہوں تو بھی کچھ ہستی ہو لیکن میں ناچیز تو آپ کے غلاموں کی جوتیوں کی خاک جتنا قدر بھی نہیں رکھتا۔ ذرا آپ اور خیال کرنا کہ رسول خدا ﷺ کے پیارے امام حسینؓ پر کیا وقت گزرا ہے۔

آہ۔ آہ۔ بھائی جان! جس دن کی دنیا بنی ہے، بڑے دکھ اور بڑی بڑی تکلیفیں آدمیوں نے اور خاص کر پیغمبر علیہ السلام نے بڑی بڑی

تکلیفیں اٹھائی ہیں۔لیکن امام حسینؓ جتنا صبر کرنا۔

آہ۔آہ۔ وہ صبر جس کی مثل دنیا میں نہیں ملتی۔اور نہ ہی ملے گی۔ بھائی جان! ان کے برابر تو کوئی صبر نہیں کر سکتا۔ کسی کا جگر ہی نہیں کہ اس موافق تکلیف اٹھا کر اس طرح صبر کرے۔لیکن یہ مثال آپ کے سامنے ہے اور آپ کو اس بات کا افسوس نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ خداوند کریم نے یہ تو اپنی مہربانی کی ہے۔آپ کو اس بات سے (پر) مالک کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کیونکہ شکر ہے خداوند کریم کا کہ بندہ سے آخری وقت کوئی ایسا کام نہیں ہو گیا، جس سے دنیا میں اور آخرت میں بھی بندہ کو شرمسار اور سزاوار ہونا پڑتا۔اور اس کے بعد آپ لوگوں کو (کی) بھی بدنامی ہوتی۔ بھائی جان! یہ تو مالک نے اپنی رحمت کی ہے اور مہربانی کی ہے بندہ تو ہزار ہزار شکریہ ادا کرتا ہے اور ہر وقت آپ کے لئے دُعا گو ہوں اور اپنی (اپنے) آخری لمحہ تک بندہ کے دل میں رہے گی اور آپ ابھی بندہ کی بخشش کے لئے دُعا کرنا اور دُعا کرنا کہ خداوند کریم آپ کے بھائی کی قربانی کو منظور کرے۔آمین ثم آمین۔

سب سے پیاری چیز، خدا کے نام پر دینی چاہئے۔ میں آپ کا اگر بہت پیارا تھا تو آپ یہ کہیں کہ ہم نے خدا کے نام پر اپنا بھائی قربان کر دیا ہے۔ آخری میری آرزو یہی ہے کہ صبر کرنا اور دل کو قابو میں رکھنا اور شکایت کا حرف لب پہ نہ آنے دینا اور رب کی رضا پر رہنا اور امید ہے اس فیصلے کے بعد والدین جلد روانہ ہو جاویں گے۔لیکن آپ کو روانہ ہونے سے پہلے ضرور اطلاع دے دیں گے اور آپ کو تاکید ہے کہ آپ اپنے چچا صاحب کے ساتھ سلوک سے رہنا اور ان کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھنا۔ ہمارے چچا صاحب باقی دنیا کے دوسرے لوگوں کے چچا کی طرح نہیں ہیں۔ آپ کو سب کچھ حرف بحرف معلوم ہے، جو کچھ چچا صاحب نے ہمارے ساتھ کیا اس زمانے میں کوئی نہیں کرتا۔آپ پھر ان باتوں کا خیال رکھنا۔ باقی آپ اپنی برادری کے ساتھ بھی سلوک سے رہنا اور تمام برادری جب آپ کے گھر میں آوے تو میری طرف سے ہاتھ باندھ کر

عرض کر دینا کہ مجھ ناچیز پر اگر کسی کو ناراضگی ہو تو ابھی برائے خدا معاف کر دینا اور سب کو بندہ کی طرف سے سلام دینا اور چچی صاحبہ اور عزیزم کے ساتھ اور اپنی پھوپھی صاحبہ سے سلوک سے رہنا اور پھوپھی صاحبہ سے بھی بندہ کی طرف سے معافی مانگنا اور ان کو بھی حوصلہ دینا۔ بھائی جان یہ اپنے (تمہارے) بھائی کا آخری خط ہے۔اس کے بعد آپ کی طرف خط نہیں لکھ سکتا اور جناب والد صاحب اور والدہ صاحبہ اور عزیزم عطا محمد خیریت سے ہیں اور بڑے صبر میں ہیں۔ آپ ان کی کچھ فکر نہ کریں اور جناب والد صاحب کی طرف سے اور والدہ صاحبہ کی طرف سے آپ بھائی صاحب فتح محمد، بھائی صاحب محمد خان، خدیجہ، نیکاں کو پیار قبول ہو اور بھائی صاحب عطا محمد کی طرف سے بھی آپ کو اسلام علیکم اور خدیجہ، نیکاں کو پچھنا (پوچھنا) قبول ہو۔ بندہ کی طرف سے آپ کو اور بھائی فتح محمد اور بھائی صاحب خان کو، بابا صاحب محمد یار، بابا صاحب بہادر خاں، نور خاں، غلام محمد، لعل خاں، حیدر خاں، فتح خاں، ابھی آپ ہی بتاویں کس کس کے نام لکھوں، تمام جو کوئی بندہ کو پوچھے، سب کو بندہ کا آخری سلام قبول ہو۔ آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر بندۂ ناچیز پر کوئی ناراضگی ہو تو معاف فرمانا اور آپ میرے بعد اپنی ہمشیرہ صاحبہ کا خیال رکھنا۔ اپنی ہمشیرہ کو ہر طرح سے راضی رکھنے کی کوشش کرنا۔

اچھا خدا حافظ

ہم تو جاتے ہیں خدا حافظ پر اتنی ہے گزارش میری
بخشش کی میرے حق میں دعا کرنا



الوداع: پر میرے بعد نہ رویئو
نہ خاک اڑا کے نہ چلا کے رویئو

آخری سلام آپ کو قبول ہو

آپ کا مسافر بھائی

میاں محمد

سفرِ شہادت

غازی میاں محمد صاحب کی شہادت کا دن قریب آ چکا تھا۔ کوائف کی خانہ پری کے لئے ضابطہ کے مطابق ۸۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو ان کا وزن کیا گیا جو ۳۸ پونڈ ہوا۔ گویا دورانِ اسیری اس جانباز پروانے کے وزن میں دو پونڈ کا مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر اس حقیقت پر حیران ہیں اور طبیب خاموش۔ وزن کا بڑھ جانا غم کی علامت نہیں، خوشی کا ثبوت ہوتا ہے۔ جب موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہو تو سامانِ مسرت کہاں سے آئے!

پھانسی کا دن مقرر ہونے پر نگاہوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کیسی؟ اس صورت حال سے دوچار ہو کر تو مایوسیاں، پریشانیاں، اداسیاں اور تاریکیاں گھیر لیتی ہیں۔ ایسے میں انسان مرنے سے پہلے کئی بار مرتا ہے۔ صحت کا روز فزوں ہونا تو کجا، چہرے سے سرخی بھی اڑ جاتی ہے۔ کنج اسارت میں وزن کا بڑھ جانا ایک راز ہے۔ اسے فلاسفر سمجھ سکتے ہیں نہ حکیم و طبیب۔ یہ نکتہ صرف سرکارِ ہر عالم ﷺ کے دیوانے پا سکتے ہیں۔ اس کا تعلق دل کی دنیا سے ہے۔ دل مطمئن ہو تو صحرا کے سناٹے بھی گا سکتے ہیں اور اگر یہ گھر ہی اجڑ جائے تو شہروں میں بھی تنہائیوں کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ جن پلکوں پر جلووں نے آشیانے بنا رکھے ہوں وہ پنکھڑی گلاب میں بھی پورا چمن دیکھ لیتی ہیں۔ بات خلوت یا جلوت کی ہے نہ قید و آزادی کی۔ طالب جب اور جہاں بھی مطلوب کو پا لے بات بن جاتی ہے۔

پھانسی کے جملہ انتظامات کا باقاعدہ جائزہ لینے ۱۰/۳ بلوچ رجمنٹ کا ایک افسر کراچی سے مدراس آیا۔ افسر مذکور اور متعلقہ یونٹ کا ایک اعلیٰ عہدیدار حضرت قبلہ غازی صاحب کے پاس گئے اور ان کو بتایا کہ فلاں تاریخ کو آپ شہید کر دیئے جائیں گے، اپنی آخری خواہش کا اظہار کریں۔ آپ نے والدین اور اپنے چھوٹے بھائی سے ملاقات کی تمنا ظاہر کی۔ کیپٹن نظام خان صاحب بتاتے ہیں کہ افسروں نے مجھ سے کہا کہ اگر والدین یا بھائی غازی صاحب سے آزادانہ ملیں تو ایسا نہ ہو کہ وہ خودکشی کر لیں۔ اب کے موت کے فاصلے سمٹ چکے ہیں۔ اس ماحول میں بڑے دل گردے والوں کے حواس بھی جواب دے جاتے ہیں۔ میں نے جواباً کہا:

بظاہر تو ایسا ہونے کا امکان نظر نہیں آتا اور میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے مجھے ملاقات کے دن غازی صاحب کے گارڈ میں شامل کر دیا۔ اگلے دن غازی صاحب کے ترجمان نے مجھے ان کا سلام دیا۔ میں یہ کہتے ہوئے زار زار رو دیا کہ غازی

صاحب کو بتانا عنقریب میں آپ کو پھانسی دینے والا ہوں۔

یوں تو والدین ہر روز ان سے ملتے تھے، لیکن آخری دفعہ ملاقات کا انداز کچھ اور ہی تھا۔ والدین کی ملاقات سے پہلے میں حضرت قبلہ غازی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے شکریے کے چند الفاظ ادا کیے۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا کہ اگر پھر آپ نے احسان مندی کا اظہار کیا تو میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ آپ نے جو بے مثال قربانی دی ہے، اس کے لئے میں اور میرے ساتھی آپ کی خدمت کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارے لئے ایک انعام خداوندی ہے۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میں مجاہد اسلام کی خدمت پر مامور ہوں۔ غازی صاحب نے مجھے تسلی دی اور فرمایا میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہنے کی خداوند کریم سے دعا کرتا ہوں۔

غازی صاحب کا باڈی گارڈ دستہ چھ سپاہیوں، ایک انگریز افسر اور مجھ پر مشتمل تھا۔ پھر آخری ملاقات ہوئی لیکن صبر، چہرے پر تر و تازگی اور آنکھوں میں خمار کی چمک پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ بڑے خوشگوار ماحول میں والدین سے باتیں کرتے رہے۔ ان کی والدہ محترمہ دیوانہ وار سر چومتی تھیں اور کبھی منہ اور کبھی نوجوان بیٹے کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتیں۔

غازی صاحب اپنے چھوٹے بھائی کے ہونٹ چومتے جاتے اور بڑی تحمل مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے کہتے "امی! صبر کرو"۔ ہزاروں باتیں کیں۔ اپنی اہلیہ سے متعلق وصیت کو دہرایا۔ تاکید کی کہ خدائے واحد کی عبادت کرتے رہنا۔ رسول اللہ ﷺ کی سچی محبت کو حرزِ جان بنائے رکھنا۔ گھریلو معاملات اور برادری کے تعلقات پر بھی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ حضرت قبلہ غازی صاحب کے والد محترم کی آنکھیں بھی دو ایک بار ڈبڈبا گئیں، لیکن شبنم کے قطرے پلکوں میں جذب ہو کر رہ گئے اور یوں ماں کی اپنے لختِ جگر کے ساتھ، باپ کی بیٹے سے اور بھائی کی بھائی سے آخری ملاقات مکمل ہوئی۔

بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وقتِ شہادت قریب آ پہنچا۔ روانگی کا دن قریب آیا۔ جب انچارج دستہ وہاں آیا جہاں غازی صاحب قیام پذیر تھے تو آپ تعظیماً کھڑے ہو گئے اور اپنے والد صاحب کو کچھ اشیاء دے کر فرمایا کہ یہ فلاں فلاں کو دے دیں۔ اس وقت بھی ان کا حوصلہ قابل دید تھا۔

۱۲۔ اپریل کی رات آپ مدراس کی سول جیل میں لائے گئے۔ شہادت گاہ تک غازی

صاحب کی سواری کے لئے ایک فوجی ٹرک کا انتظام کیا گیا تھا۔ ٹرک میں انگریز اور انڈین آفیسر بنچوں پر بیٹھ گئے جبکہ غازی صاحب درمیان میں رکھی گئی ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ اس قافلہ میں چھ باڈی گارڈز تھے، جن کے انچارج کیپٹن نظام خان صاحب تھے۔ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ گیارہ اور بارہ اپریل کی درمیانی شب جیل کی کوٹھڑی میں غازی میاں محمدؒ اپنے والد اور پلٹن کے مولوی صاحب کے ساتھ رات بھر تلاوت قرآن حکیم میں مشغول رہے۔ ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو علی الصبح آپ نے غسل فرمایا۔ سفید لباس زیب تن کیا۔ نماز فجر ادا کی۔ سر پر کلاہ باندھ کے اپنی پگڑی والدہ صاحبہ کے سپرد کی۔ سرکاری طور پر غازی صاحب کا ایک فوٹو لیا گیا جو بعد ازاں آپ کے ورثا کے حوالے کیا گیا۔ اس میں آپ بے حد ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔

اس نوجوان کے متعلق یہ گمان نہیں ہوسکتا تھا کہ موت کی طرف قدم بڑھا رہا ہے بلکہ محسوس ہوتا کہ جیسے منزل جاودانی کی طرف گامزن ہو۔ مسلمان ارکان کی ضمانت پر غازی صاحب کے والد بزرگوار اور ۲/۱۳ فرنٹیئر فورس کے مولوی صاحب آخری وقت تک جیل کے اندر موجود رہے۔ مگر آپ کی والدہ محترمہ اور چھوٹے بھائی کو جیل کے اندر جانے کی اجازت نہ دی گئی۔

چونکہ جملہ امور کی ذمہ داری کیپٹن نظام صاحب کے حوالے تھی۔ انہوں نے کسی کی پروانہ کرتے ہوئے خلاف قواعد ہر معائنہ آسان کر دیا۔ غازی صاحب کے والد محترم مقررہ وقت تک جیل میں موجود رہے۔ باپ بیٹے نے کمال صبر اور ضبط کا مظاہرہ کیا۔ قبلہ غازی اپنے والد صاحب کے ساتھ نہایت تسلی اور دلیری سے باتیں کرتے اور ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ مقررہ وقت پر بتایا گیا کہ اب قربانی کا وقت آ گیا ہے۔ غازی صاحب پہلے والد بزرگوار سے بغل گیر ہوئے اور پھر مولوی صاحب سے گلے ملے۔ ملک نور محمد صاحب کے بقول: قبلہ والد صاحب پھانسی کے وقت کوٹھڑی میں بھی موجود تھے بلکہ کنٹوپ بھی اپنے ہی ہاتھوں سے بیٹے کو پہنایا اور تمام وقت کلمہ شریف و درود شریف کا ورد کرتے رہے۔ واقعی ایسے وقت میں روحانی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

خیر! غازی صاحب شان وشوکت سے چلتے ہوئے تختۂ دار پر جا کھڑے ہوئے۔ نعرہ تکبیر بلند کیا۔ ایک بار مدینہ منورہ کی طرف چہرہ اٹھا کے دیکھا اور پھر بڑی عقیدت سے سر جھکا لیا۔ کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے پھانسی کا پھندا اپنے والد محترم سے پکڑا اور دو بار چوم کر گلے میں ڈال لیا۔

تھوڑی دیر بعد تختہ کھینچ دیا گیا۔ فضا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ آپ کے چہرے سے نور برستا تھا اور ماحول خوشبو سے معطر ہو گیا۔ دائیں بائیں حوریں گلدستے لئے کھڑی تھیں، مگر آپ نے ادھر ہنس کر دیکھا۔ غالباً آنکھوں کے سامنے مقصود کائنات کے وجود مسعود کی جھلک اپنی شان دکھلا رہی تھی۔ بے قرار روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے آقا و مولا کے قدوم میمنت لزوم سے لپٹ گئی۔ آپ علیہ السلام ایک جلو میں اپنے دیوانے کے استقبال کو تشریف لائے تھے۔

بروز منگل ۱۰۔ صفر المظفر ۱۳۵۷ء مطابق ۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء صبح ٹھیک پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر ہندوستان کا یہ خوش قسمت مے کش طیبہ کے میخانے میں اپنے ساقی کے قدموں میں بیٹھا جام پہ جام لنڈھا رہا تھا۔ ہشاش بشاش چہرے پر موت کے آثار تک نہیں تھے۔ آپ تختۂ دار پر تڑپے تھے نہ گردن لٹکی۔ ہاں بائیں آنکھ ذرا سی کھلی تھی، جانے...... کیوں......؟

ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر بھی آپ کی شہادت کی تصدیق کر چکا تھا۔ نعش ورثا کے حوالے کر دی گئی۔ شہادت کے وقت کھلتی ہوئی سفید رنگت والے خوبصورت جواں غازی، میاں محمد شہیدؒ کی عمر صرف ۲۳ برس تھی۔

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

آخری آرام گاہ

غازی میاں محمد شہیدؒ کے ورثاء نے نعش کو تلہ گنگ لانے کے لئے مکمل انتظامات کر رکھے تھے۔ انہوں نے ایک ریلوے بوگی ریزرو بھی کروائی ہوئی تھی۔ مدراس سے چکوال ریلوے اسٹیشن تک جو کہ تلہ گنگ سے تیس میل دور ہے، اس کے اخراجات چار ہزار دو سو روپے بھی پیشگی جمع کروا دیئے گئے۔ لیکن جب اس امر کی درخواست گزاری گئی تو حکومت نے قبلہ شہید کی میت کو وطن مالوف لانے کی اجازت نہ دی۔ اربابِ اختیار کو اس سے نقصِ امنِ عامہ کا اندیشہ تھا۔ ان کا موقف تھا کہ یہ ایک فوجی معاملہ ہے اس لئے میت کے سفر سے فسادات بھڑک اٹھنے کا خدشہ ہے، تاہم تجہیز و تکفین کے سلسلے میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کی مکمل اجازت تھی۔

چونکہ شہر کے لوگوں کو معلوم تھا کہ آج غازی صاحب کی شہادت کا دن ہے، اس لئے ساری مسلمان آبادی امڈ آئی۔ وہ سب نمازِ جنازہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ جنازے کو کندھا دے سکیں۔ صبح سات بجے کے قریب آپ کے جسد خاکی کو

غسل دینے کے لئے شہر کی جامع مسجد میں لایا گیا۔ نماز جنازہ کے لئے نو بجے کا وقت مقرر تھا۔ کئی ہزار لوگ جمع ہو گئے۔ مسلمانوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ میت کو جنازہ گاہ پہنچانے تک اہلِ مدراس اور نواحی بستیوں سے مسلمانوں کے کئی قافلے آ چکے تھے۔ شہر میں تو شاید ہی کوئی مسلمان اس عظیم سعادت سے محروم رہا ہو۔

بنا بریں گرد و نواح سے رسولِ عربی ﷺ کے ان گنت نام لیوا اپنے شہید کی زیارت کے لئے کھنچے چلے آئے تھے۔ کالجوں اور سکولوں کے مسلمان طلبا عطر کی شیشیاں اور پھولوں کی چادریں لئے ہوئے بغرض دیدار حاضر ہو رہے تھے۔ مسلمان خواتین بھی کسی سے پیچھے نہ تھیں۔ جنازہ نمازیں جامع مسجد میں ہی ادا کی گئیں۔ جنازہ کے بعد رجمنٹ کے امام مولوی میر عالم صاحب نے مندرجہ ذیل الفاظ میں شہید موصوف کے والد محترم کو مبارکباد دی:

"بیٹے کی شہادت مبارک ہو۔"

تین دفعہ ایسا کہا اور پھر زار زار رونے لگے۔

لحد میں عشق رخ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

جنازے میں مدراس کے معروف عالم دین عینی شاہ بھی موجود تھے مگر پہلی نمازِ جنازہ پڑھانے کا شرف میر عالم صاحب ہی کو حاصل ہوا۔ مقامی اخبار "سلیم" نے اس موقع پر ایک بہت لمبا چوڑا اداریہ لکھا اور شاندار الفاظ میں غازی میاں محمد شہید کو خراج تحسین پیش کیا۔

میجر غلام یٰسین صاحب کا بیان ہے کہ تجہیز و تکفین کی سعادت کا فریضہ ہمیں نصیب ہوا۔ ہم نے غازی و شہید کی قبر مشہور بزرگ اور ولی کامل حضرت پیر دستگیر ساویؒ کے پہلو میں پہلے ہی کھدوا رکھی تھی۔ یہ جگہ قبرستان کی انتظامیہ نے از راہ عقیدت پیش کی تھی۔ جہاں آپ کا مقبرہ واقع ہے، بقول ان کے: اگر یہ جگہ کوئی بادشاہ بھی مانگتا تو نہ مل سکتی۔ مگر ان کے لئے تو قبلہ سید المشائخؒ خود اشارہ فرما چکے ہیں۔

غازی میاں محمد شہیدؒ کی تدفین کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب جوش جذبات سے مغلوب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے اشک بہاتے اور کپکپاتے ہونٹوں سے ایک ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے دیگر لوگوں کو غیرت دلائی: تم لوگ غازی صاحب اور ان کے والدین کے نزدیک نہ جاتے تھے کہ انگریز افسر اور ہندو میجر ناراض نہ ہوں۔ ان لوگوں نے نظام خاں کا کیا بگاڑ لیا ہے، جو

میدان میں اکیلا کام کرتا رہا! آپ دیکھ چکے ہیں کہ عشقِ رسول ﷺ میں مرمٹنے والوں کی کیا عزت ہوتی ہے۔ ہمیں دُعا کرنی چاہئے کہ ہر مسلمان کو آپ کا سا جذبہٗ ایمان نصیب ہو۔



مدراس (بھارت) سنٹرل ریلوے اسٹیشن سے تین میل دور واقع ایک بڑے قبرستان میں معروف ولی اللہ حضرت پیر دستگیر ساویؒ کے مقبرہ اور مسجد کے درمیان مقبرہ کے ساتھ بائیں جانب سطح زمین سے کافی اونچے چبوترہ پر ایک قبر کے ساتھ نصب شدہ پتھر پر قرآن پاک کی ایک آیت کے ساتھ ہی یہ لکھا ہے:

''قطعہ شہادت میاں محمد صاحبؒ مرحوم سابق سپاہی ۳/۱۰ بلوچ رجمنٹ، فرزند غلام محمد صوبیدار، بمقام تلہ گنگ ضلع کیمبل پور (پنجاب)''

تاریخ وفات ۱۰ صفر ۱۳۵۷ھ، مطابق ۱۲۔اپریل ۱۹۳۸ء

اے یادگارِ عزتِ ناموسِ مصطفیٰؐ
کیا خوب انتخاب تھا تیری حیات کا
بدلہ لیا ہے دشمنِ احمد کا تونے خوب
منظور کر چکا ہے شہادت تیری خداؐ''

حضرت پیر دستگیر ساویؒ کا مقبرہ سمندر کے کنارے سطح زمین سے کافی اونچی جگہ موجود ہے۔ اس وسیع چبوترے پر مزار کے چاروں طرف قبروں کی دو قطاریں ہیں۔ دربار کے دروازے کے سامنے والی طرف دوسری قطار میں چبوترے پر ہی میاں محمد شہیدؒ کی آخری آرام گاہ ہے اور نیچے مسجد ہے۔ مندرجہ بالا قطعہ ڈاکٹر مختار احمد قاضی صاحب نے خاص آپ کی شہادت کے لئے لکھوا نذر کیا تھا۔ شہادت کے بعد آپ کے والدین اور سب سے چھوٹا بھائی ملک عطا محمد ۱۴۔اپریل ۱۹۳۸ء تک مدراس اس میں ہی مقیم رہے۔ اس دوران مقبرہ پختہ کروایا گیا اور لوحِ مزار نصب ہوئی۔

بعد ازاں بھی شہید موصوف کے والد گرامی کی خان بہادر عبدالرحمٰن خان صاحب (ریٹائرڈ ڈی آئی جی) کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت رہی۔ خان صاحب نے مدراس سے اپنے ایک طویل خط میں لکھا:۔

''ہزاروں لوگ قبلہ شہیدؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوتے ہیں، خصوصاً جمعرات کے دن۔ یہ سلسلہ متواتر چل رہا ہے۔ زائرین جوشِ عقیدت سے کھنچے چلے آتے ہیں اور اپنے دلوں کو نورِ ایمان

سے بھرتے ہیں۔ میں نے خود سنا ہے کہ بعض اوقات غازی صاحبؒ کے مزار سے تلاتِ کلام پاک کی آواز آتی ہے''۔

حوالدار مستری فضل حسین، ان کا تعلق موضع ملکوال اور ان کے سسرال کی رہائش ملک غلام محمد صاحب کے قریب تھی، نے حسب وعدہ ۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو صوبیدار موصوف کے نام مدراس سے، جہاں وہ بسلسلہ ملازمت مقرر تھے ایک خط میں تحریر کیا:

''ایک دن میں راستہ پوچھتے پوچھتے وہاں قبرستان جا پہنچا۔ شہید میاں محمدؒ کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کے بعد اردگرد سے گھاس وغیرہ ہٹا کر دیکھا۔ صرف قبر کی بائیں طرف کچھ معمولی سا سیمنٹ گرا ہوا تھا۔ کوئی خاص نقص نہیں ہے۔ پتھر کالے رنگ کا ہے۔ غازی صاحبؒ کے قدموں کی طرف ایک جنگلہ ہے جس میں میاں بیوی کی دو قبریں ہیں''۔

غازی صاحب موصوف کے بھائی ملک نور محمد صاحب سروس کے دوران ۴۴-۱۹۴۳ء میں کچھ دیر بمبئی اور کلکتہ بھی ٹھہرے رہے تھے۔ لیکن انہیں زبردست خواہش کے باوجود اپنے شہید بھائی کی قبر دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ بایں ہمہ وہ اس کے لئے مضطرب تھے۔ جب وہ پہلی بار حج کو گئے تو روزنامہ ''سعودیہ گزٹ'' میں حصول ملازمت کی خاطر مدراس کے ایک شخص کا اشتہار چھپا۔ آپ نے شائع شدہ ایڈریس پر اس مضمون کا خط ارسال کیا کہ میں آپ کے ذریعے اپنے مرحوم بھائی کے مقبرے کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ جوابی مراسلے میں سید ریاض احمد شاہ، جن کے نام خط لکھا گیا تھا، نے ۲۰۔جنوری ۱۹۷۹ء کو انگریزی زبان میں ایک تفصیلی مکتوب قلمبند کیا۔ شاہ صاحب کی رہائش درج ذیل پتہ پر ہے۔

نیا نمبر ۶۴ پرانا نمبر ۳۳ پیٹرس روڈ، رائی پیٹا، مدارس: ۶۰۰۰ بھارت۔ انہوں نے لکھا:

''میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے کہ میں بذریعہ خط ایک پاکستانی بھائی سے متعارف ہو رہا ہوں۔ حضرت پیر دستگیر ساویؒ کے قبرستان کو میں بخوبی جانتا ہوں اور میرے تمام رشتہ دار مع میرے والد صاحب وہیں دفن ہیں۔ پس میں قبرستان گیا۔ مزاروں کی زیارت کی۔ میرے لئے آپ کے بھائی کی قبر کو تلاش کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ مسٹر قادر نامی ایک تاجر ان کے مقبرے کی شکست و ریخت کا خاص خیال رکھتے

ہیں۔ ان کی توجہ سے اب قبر مرمت ہو چکی ہے اور یہ سرخ رنگ میں صحیح حالت میں موجود ہے۔ لوحِ مزار پر ان کا نام بخوبی پڑھا جا سکتا ہے۔ تاجر مذکور کے علاوہ پیش امام صاحب اور تین گورکن جو آپؒ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ بھی قبر کی نگرانی کرتے ہیں۔ میں گزشتہ کئی سالوں سے قبر سے آگاہ اور شہیدؒ کی تاریخ سے واقف ہوں۔ بہر حال شبِ برات کے موقع پر قبر کو پھولوں سے سجایا جاتا ہے۔ ذکر کلمہ، وردِ درود اور تلاوت کلام کی جاتی ہے، مدراس کے تقریباً تمام مسلمان شہید کی قربانی سے کسی نہ کسی طرح آگاہ ہیں''۔

^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^

غازی محمد عبداللہ شہیدؒ

برطانوی ہند کے آخری دور میں رسول مقبول ﷺ کے عاشقان ومحبان نے اپنی وفاداری وجاں سپاری کے جوانمٹ نقوش جریدۂ عالم پر ثبت کئے، وہ اب بھی تازہ ہیں اور یہ مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ حبیب خدا، سید الانبیا ﷺ کے انہی پروانوں اور دیوانوں میں سے ایک خوش نصیب کا نام غازی محمد عبداللہ شہیدؒ ہے۔

نبی پاک ﷺ کے اس سچے عاشق ومخلص جانثار کے نام اور کام سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔ تحفظِ ناموس رسول ﷺ کے باب میں قصور سے دو مجاہدین کو پروانۂ ماموری کے ساتھ سرفراز فرمایا گیا تھا۔ ایک غازی محمد صدیقؒ جبکہ دوسرے سرفروش کو ہم غازی محمد عبداللہ شہیدؒ کے نام سے جانتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ انہیں خود رسول اکرم ﷺ نے خواب میں ارشاد فرمایا:

''صوفی عبداللہ! یہ مرتد مجھے دکھ پہنچا رہا ہے اس کی زبان بند کرو''

صوفی محمد عبداللہ انصاریؒ موضع پٹی مال ضلع قصور کا رہنے والا اور باعتبار پیشہ جولاہا تھا۔ عمر تیس بتیس کے پیٹے میں۔ خوبصورت چہرہ، گوری رنگت اور بھری بھری سیاہ داڑھی۔ جب آپ کو پروانۂ ماموریت عطا ہوا تو عالم شباب کا جوش وجذبہ جہاد کے لئے مضطرب تھا۔

قصور کے ایک قصبہ میں زندگی کے شب وروز گزارنے والا یہ فقیر بے نوا مقدر کا دھنی تھا۔ صدق وصفا کی دولت سے مالا مال جب اس عظیم مجاہد کو سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی زیارت سے مشرف فرمایا تو اب انہیں فقط یہ فکر دامن گیر تھی کہ کب اور کس طرح مردودِ ازلی کو ٹھکانے لگائیں۔

شمع رسالت ﷺ کا پروانہ نماز پڑھ کر پہروں چپ چاپ بیٹھا رہتا اور دلی آرزو کو ہمکنار تکمیل کرنے کی ترکیبیں سوچتا۔ بالآخر کہیں سے ایک معمولی چھری خریدی، اسے تیز کیا اور یہ راز اپنے دل میں چھپائے شاتم رسولؐ کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس کا شکار لاہور سے سرگودھا روڈ پر واقع ایک قصبہ خانقاہ ڈوگراں سے کچھ دور ایک بستی میں موجود تھا۔ خانقاہ ڈوگراں سے جانب جنوب، چک ۱۲۴۔ خورد میں بہت سے افراد تاحال بقید حیات ہیں، جنہوں نے قبل از آزادی اس واقعے کو بچشم خود دیکھا۔

بدنام زمانہ مردود گستاخ چنچل سنگھ پہلے مسلمان تھا اور اس کا نام نور محمد تھا۔ وہ شاہنواں ماڑی سے ایک عورت کو اغوا کر کے روپوش ہوگیا۔ چونکہ اس معاملے نے بہت طول پکڑ لیا تھا اور پولیس ہر وقت تعاقب میں رہتی، اس نے بچاؤ کے لئے سکھوں کی پشت پناہی چاہی۔ سکھوں نے شرط عائد کر دی کہ جب تک تم ہمارے مذہب میں داخل نہیں ہوتے، ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ وہ چھوکری کے عشق میں یوں مبتلا ہوا کہ دیوانگی تک جا پہنچا اور چار سکھ مت کا پیروکار بن گیا اور اپنے نئے ہم مذہبوں کے سالانہ جلسے جو ۱۲۴ بڑی میں منعقد ہوا کرتا تھا، رسول پاک علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات بھی کہے۔ اس نے کہا کہ پہلے مجھ کو پورا علم نہیں تھا۔ اب سکھ مت میں داخل ہوا ہوں تو پتہ چلا ہے کہ مسلمانوں کے نبی...... ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ وہ بدبخت و بدکردار عورت بھی پہلے مسلمان تھی۔ اولاً، یہ جوڑا فیصل آباد میں روپوش رہا اور پھر چک ۱۲۴۔ خورد میں آ کر اعلانیہ طور پر سکھ ہوگیا۔ المختصر یہ کہ چنچل سنگھ مردود کی اس بے ہودگی وسفلہ پن پر مسلمانوں کا غیظ وغضب لازم تھا۔ بھلا فرزندان اسلام یہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی نانہجاران کے آقا و مولا علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی و بے ادبی کی جرأت کرے۔ علاقہ کے بہت سے مسلم نوجوان اسے جہنم رسید کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن خداوند کریم نے یہ عظیم شرف تو ایک پردیسی مجاہد کے مقدر میں لکھ دیا ہوا تھا۔

صوفی عبداللہ انصاری، آقا و مولا علیہ وسلم کا حکم پا کر اپنے اندر ایک عجیب سی قوت اور جوش و جذبہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ اٹھا اور کسی کو بتائے بغیر مرتد کے گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔ اِدھر ایک تنہا نوجوان اُدھر مجرمانہ سرگرمیوں میں سفاکی اور خونریزیوں میں بدنام سکھ۔ لیکن پروانۂ چراغِ مصطفوی اپنی دھن میں چلا جارہا تھا۔ اسے نہ تو سکھوں کی کثرت وطاقت کی پرواہ تھی اور نہ ہی اپنی کم مائیگی و بے چارگی کا احساس۔ وہ بادۂ عشق میں سرشار اپنے سرکار علیہ وسلم کا فرمان بجالانا چاہتا تھا۔

ایک جگہ غازی عبداللہ کے سفر نصیب کی روداد مندرجہ ذیل الفاظ میں مذکور ہے:

> "صوفی عبداللہ اپنی دھن میں کھوئے سکھوں کے اس گاؤں میں پہنچے۔ صبح کا وقت تھا۔ انہوں نے چنچل سنگھ کے بارے میں پوچھا۔ پتہ چلا، وہ گاؤں سے باہر کنویں پر ہے۔ صوفی صاحب نے کنویں کا رخ کیا۔ وہ کنویں پر بیٹھا تھا۔ بہت سے سکھ قریبی کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ کچھ اس بدبخت سے ذرا ہٹ کر اسی کنویں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ 'مجھے

چنچل سنگھ سے ملنا ہے'......غازی عبداللہ نے ان کے قریب پہنچ کر کہا.....'وہ سامنے بیٹھا ہے'......ادھیڑ عمر کے ایک سکھ نے اشارہ کیا۔

صوفی عبداللہ بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور اسے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ چنچل سنگھ اس ناگہانی افتاد سے سنبھلتا، صوفی عبداللہ نے اسے لٹا کر چھری اس کی گردن پر پھیر دی۔ چنچل سنگھ خاصا ہٹا کٹا تھا، لیکن اس کی مضبوط گردن دیکھتے ہی دیکھتے کٹ گئی۔ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ غازی عبداللہ نے چھری زمین پر رکھ دی اور سجدۂ شکر بجالائے کہ انہیں محبوب خدا ﷺ کے تعمیل ارشاد کی توفیق بخشی گئی''۔

''ناموسِ رسالت کا ایک گمنام شہیدؒ''......میں مضمون نگار پروفیسر افضل علوی صاحب کی تمام تر معلومات سنی سنائی ہیں۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ ان کے بارے میں بے علمی کا یہ حال ہے کہ خود مجھے پہلی بار ان کا پتہ مولانا سید امین الحق صاحب ڈویژنل خطیب اوقاف شیخوپورہ سے اس وقت چلا جب ہم غازی علم الدین شہیدؒ کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے اسی وقت صوفی عبداللہ کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرنے کا ارادہ کیا لیکن افسوس ہے میری عملی کوتاہی آڑے آئی۔ تاہم مولانا امین الحق صاحب نے صوفی صاحب کے جو حالات بتائے انہیں بیان کیے دیتا ہوں۔

نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے وقوعہ مذکورہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شقی پہلے مسلمان تھا اور کہتے ہیں کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا تھا مگر ایک سکھ عورت کے عشق میں اس بری طرح سے مبتلا ہوا کہ بالکل ہی مت ماری گئی اور اس عورت سے شادی کرنے کی خاطر مرتد ہو کر سکھ دھرم اختیار کر لیا اور اس کے گاؤں میں جا بسا جو ضلع شیخوپورہ میں وارث شاہ کے گاؤں جنڈیالہ شیر خاں کے قرب و جوار میں تھا۔

بہر حال موصوف کے متذکرہ مضمون سے یہ ضرور ہوا کہ اہل ذوق موضوع سے متعلق صحیح حالات و واقعات کی تلاش میں چل پڑے۔ ایم اے حکیم ایڈووکیٹ کا ایک مختصر پمفلٹ......''اسلام کے ایک گمنام شہیدؒ کی داستان''......اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''یہ ۱۹۳۸ء میں رونما ہونے والا واقعہ ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ تحصیل شیخوپورہ کے تھانہ خانقاہ ڈوگراں کے حلقے میں دو

چک ہیں جن کی آبادیاں الگ الگ حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک چک ۱۲۴ شریف کہلاتی ہے دوسری چک ۱۲۴ چھوٹی کے نام سے موسوم ہے۔ موخر الذکر چک میں ایک بدنصیب نور محمد جٹ کاہلوں رہتا تھا۔ جس کے ناجائز تعلقات ایک شادی شدہ عورت سے تھے۔ جو قریب کے موضع برنالہ کی رہنے والی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے کہ کسی طرح ان کی آپس میں شادی ہوجائے۔ لیکن عورت پہلے ہی شادی شدہ تھی، اس لئے آپس میں مشورہ کیا گیا کہ اگر اسلام سے منہ موڑ لیں اور عیسائیت اختیار کرلیں تو یہ مرحلہ طے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ دونوں سانگلہ ہل گئے اور گرجے کے پادری کے ہاتھ پر عیسائیت اختیار کرلی۔ مگر مسئلہ خاطر خواہ پھر بھی حل نہ ہوا۔

آخر کار دونوں بھاگ کھڑے ہوئے اور امرتسر پہنچ کر سکھ مذہب اختیار کرلیا۔ نور محمد نے اپنا نام چنچل سنگھ اور عورت نے دلجیت کور رکھ لیا اور کچھ عرصہ قیام امرتسر کے دوران مذہب کے قواعد وضوابط کی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد چک ۱۲۴ چھوٹی میں آکر آباد ہوگئے۔ جہاں بیشتر آبادی سکھوں کی تھی۔ مگر سکھ اُس کو ہمیشہ مشکوک نظروں ہی سے دیکھتے رہے، حالانکہ ہر دو مرتدین نے انہیں ہر صورت یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ واقعی دل سے سکھ مذہب اختیار کر چکے ہیں مگر سکھوں نے انہیں تسلیم نہ کیا اور چند شرائط پیش کیں: ایک یہ کہ وہ سرعام جھٹکے کا گوشت کھائیں۔ اس بدقسمت جوڑے نے یہ شرط پوری کردی۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ایک بڑا اجتماع جسے سکھ لوگ اکھنڈ پاٹ کے نام سے موسوم کرتے ہیں منعقد کیا جائے اور یہ دونوں اس اجتماع میں رسول پاک ﷺ کی بے حرمتی کریں۔ (نعوذ باللہ) ان دونوں نے ایسا ہی کیا۔ اس حرکت سے آس پاس کے مسلمانوں کی سخت دلآزاری ہوئی اور تمام علاقہ میں ہیجان پھیل گیا۔ جس پر سکھوں نے مسلمانوں کے مجمع عام سے اس بے ہودہ حرکت کی معافی مانگی...... چنانچہ ایک دوسرے اجتماع میں اس جوڑے نے بھی مسلمانوں سے معافی مانگی مگر سکھ مذہب پر اسی طرح قائم رہے“۔

۱۰۔اکتوبر ۱۹۸۶ء کو راقم الحروف اس واقعے کی بکھری کڑیاں یکجا کرنے نکلا تو کئی ایک نئے گوشے وا ہوئے۔ غلام محمد ولد اروڑہ قوم واہلہ، جن کے چہرے کی جھریاں ان کی پیرانہ سالی وضعف کی غماز تھیں نے اپنی یادداشتوں اور شہید رسالت کے ساتھ ملاقاتوں کے حوالے سے مجھے بتایا کہ غازی عبداللہ انصاری صاحب پہلے ''میلی برج'' میں دین محمد دکاندار کے پاس ٹھہرے رہے تھے۔ اس کے بعد دو تین روز گھنے جنگل میں؛ کیونکہ ان دنوں ۱۲۴ چکوک کے اردگرد کی بیشتر اراضی یا تو بنجر پڑی تھی یا پھر گھنے درختوں میں گھری ہوئی۔ بقول ان کے مجھے غازی صاحب نے ایک ملاقات میں بتایا تھا:

''میں جنگل میں رہ کر کھجوریں کھاتا اور سوچتا تھا کہ بے غیرت ملیچھ کبھی تو اس طرف سے گزرے گا۔ لیکن میں اس انتظار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا میں مردود کمینے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور اس کے مربعے تک جا پہنچا جو کہ سڑک پر ایک سیم نالا کے قریب ہے۔ کم بخت جوڑا اپنے مربع میں فصل پر موجود تھا۔ جب مردِ غازی ان کے نزدیک گئے تو للکارا اور کہا: غلیظ کتے! تیار ہو جا۔ آج ''دل بجھ'' والے آگئے ہیں۔ (دل بجھ کے الفاظ مردود مذکور نے پیارے نبی ﷺ اور مسلمانوں کے بارے میں کہے تھے) اب تو بچ کر کہیں نہیں جاسکتا۔

قوی ہیکل چنچل سنگھ کرپان تان کر آپ کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ اللہ کے شیر نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے چھری سے حملہ کر کے دیکھتے ہی دیکھتے مردود کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ وہ زمین پر گرا اور تڑپ تڑپ کر جہنم رسید ہو گیا۔ قریب ہی کھیت میں اس کی بیوی دلجیت کور موجود تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ بھاگ جانا چاہتی تھی کہ شاہین صفت مجاہد نے اسے بھی کچھ دور جالیا اور سر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے چنچل سنگھ کے قریب لاکر حوالۂ جہنم کر دیا۔ معلوم ہوا کہ جب غازی صاحب مرتد کو فی النار کر کے اس کی عورت کے پیچھے بھاگے تو وہ آگے آگے فصل کے اردگرد دوڑتی اور کہتی جاتی: ''خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔'' بہرحال انہوں نے دیکھا کہ شاید چنچل سنگھ کا سانس ابھی باقی ہے۔ فرمایا: ''حرام زادے! تو ابھی زندہ ہے'' یہ کہہ کر دونوں کی شہ رگ کاٹ دی۔

کثیر تعداد میں سکھ یہ منظر کھیتوں میں کھڑے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی قریب آنے یا بچانے کی جرأت نہ کرسکا۔ صوفی عبداللہ اپنے کام سے فارغ ہو کر بڑے سکون سے سیم نالہ کی طرف چل دیے۔ غسل کیا اور کپڑے دھو کر نوافل شکرانہ ادا کیے۔ اتنے میں پولیس پہنچ گئی۔ کیونکہ یہ رنگڑ نگر میں بغرض تفتیش پہلے سے ہی موجود تھی۔ واقعے کی

اطلاع پا کر لوگوں کا جم غفیر ہو گیا۔ خدشہ تھا کہ سکھ کھلے بندوں حملہ نہ کر دیں۔ لہٰذا مسلمان بھی مسلح تھے۔ بہر حال پولیس اہلکار آپ کو بحفاظت تھانہ خانقاہ ڈوگراں میں لے آئے۔ تمام گواہ سکھ تھے۔ چالان مکمل ہوا اور اس دوران آپ کو ڈسٹرکٹ جیل شیخوپورہ میں بند رکھا گیا۔

روایت ہے کہ جب آپ کی گرفتاری عمل میں آئی تو غازی عبداللہ اتنے خوش اور ہشاش بشاش تھے، جیسے شادی میں آئے ہوئے ہوں۔ چہرہ پر رونق تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کناں! ابتداً مرافعہ شیخوپورہ عدالت میں چلتا رہا۔ آپ کی طرف سے فاضل قانون دان محمد انور ایڈووکیٹ (یہ قیام پاکستان کے فوراً بعد گورنر کے مشیر اعلیٰ مقرر ہوئے تھے) پیروکار تھے۔ قریباً ایک برس مقدمہ زیر سماعت رہا۔ بالآخر آپ کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی۔ کیوں نہیں، آپ کے نصیب میں تو بارگاہ رسالت ﷺ کی حاضری لکھی تھی۔ شہادت سے سرفراز کئے جانے کی خوشخبری سن کر ان کا چہرہ بشاشت و مسرت سے چمک اٹھا۔ وہ خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کام سے عہدہ برآ کیا اور کامیابی سے ہمکنار فرمایا۔

غازی محمد عبداللہ انصاری کو ضلع شیخوپورہ میں کوئی گواہ شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ نیز بہت سی قانونی موشگافیوں کی بنا پر سزا سے بچ نکلنے کی گنجائش موجود تھی بشرطیکہ آپ اقرار فعل نہ کرتے۔ آپ کو مقامی مسلمانوں کی طرف سے مالی و قانونی امداد کی بھرپور پیشکش کی گئی۔ لیکن غازی صاحب انکار کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ یہ مشورہ بھی تھا کہ وہ خاموش کھڑے رہیں تو بآسانی عدالت سے رہا ہو جائیں گے مگر عشق رسول ﷺ کے متوالے نے اس قسم کی کسی پیشکش کو قبول نہ کیا اور کہا کہ میں اس ثواب عظمیٰ اور سعادت دارین سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔

دراصل حضرت قبلہ غازی صاحب کا مسلک اس موقف کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جب اس نابکار جوڑے نے مسلمانوں سے معافی مانگی تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اب اس قضیہ کو نہیں چھیڑنا چاہئے مگر مجاہد اسلام نے برملا کہا تھا کہ ان مرتدین نے جو گناہ کیا ہے اس کی معافی اللہ اور اس کے حبیب پاک ﷺ کے سوا کوئی اور دینے کا مجاز نہیں۔ انہوں نے جو گستاخی و بے ادبی شہنشاہ کونین ﷺ کی شان میں کی ہے، اس کی سزا دنیا میں دی جانی چاہئے اور یہ سزا میں دوں گا کیونکہ اس نے میرے پیارے آقا ﷺ کی توہین کی ہے اور سرکار مدینہ ﷺ کے ایک ادنیٰ غلام کی حیثیت سے اس بد باطن کو میں واصل جہنم کروں گا۔

یہ بھی بتاتے ہیں کہ صوفی محمد عبداللہ انصاری اس بستی میں اجنبی نہیں تھے بلکہ پہلے سے ان کا یہاں آنا جانا تھا کیونکہ چک نمبر ۱۲۴ شریف میں ان کا پیرخانہ تھا۔ بابا سید شیر شاہ صاحب کا

آبائی علاقہ نجھانہ تحصیل وضلع گورداسپور بتایا جاتا ہے۔آپ مرشد کے حکم سے یہاں تشریف لے آئے تھے۔جب چنچل سنگھ کی بدقسمتی شروع ہوئی تو اس نے ایک روز شاہ صاحب سے کہا:

''سیدا! یہ تلوار تیرا خون مانگتی ہے''۔

آپ نے فرمایا:

''تیری بے حیائی کے دن ختم ہونے والے ہیں اور اس مقصد کے لئے ایک مجاہد مامور کیا جا چکا ہے۔وہ اُدھر پہنچنے ہی والا ہے''۔

اسی دوران بارگاہ رسالت مآب ﷺ سے ایک فقیر بے نوا کا انتخاب ہو چکا تھا۔ارشاد ہوا عبداللہ جاؤ اور فلاں گاؤں پہنچ کر میرے گستاخ کو ٹھکانے لگا دو۔

قبل ازیں یہ لکھا جا چکا ہے کہ چنچل سنگھ پہلے مسلمان تھا اور نام بھی نور محمد رکھتا تھا۔اس کی پہلی اہلیہ سے چار بیٹے ہیں، جو سچے اور پکے مسلمان ہیں۔یہ اپنے کم ظرف اور سیاہ بخت باپ کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔مقتول مردود کی پہلی مسلمان شریکۂ حیات ''فضل بی بی'' نے اس کے ذکر پر نفرت سے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا اور کہنے لگیں:

''ہم لوگ بے غیرت، بے ایمان اور ملعون زمانہ کا نام سننا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔الحمدللہ ہم مسلمان ہیں۔میں بی بی عائشہ صدیقہؓ اور خاتون جنت، بی بی فاطمہؓ کی ادنیٰ کنیز ہوں۔ وہ ہمارے پیارے رسول ﷺ کا دشمن ہو گیا تھا۔ہمارا اس ناپاک ملیچھ سے کیا تعلق؟ اے کاش وہ لعنتی ہماری زندگیوں میں داخل ہی نہ ہوا ہوتا!''

غازی عبداللہ انصاری نے اپنے وکلاء، علماء اور مقامی زعما سے بطیب خاطر ہمیشہ یہی کہا تھا کہ مجھے بارگاہ نبوت میں حاضری کی سعادت سے محروم ہونا کسی طور منظور نہیں اور پھر میں اس فعل سے کیسے انکار کروں جس پر مجھے فخر و ناز ہے اور جو میری مغفرت کے لئے میری زندگی کا سب سے بڑا عمل ہے۔

غازی محمد عبداللہ انصاری کو تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے سلسلے میں جام شہادت پینا تھا، لہٰذا آپ کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔مقامی مسلمان بضد تھے کہ آپ کو چک ۱۲۴ شریف کے قبرستان میں حضرت بابا سید شیر شاہ کی خانقاہ میں دفن کیا جائے مگر اس کی اجازت نہیں مل سکی اور آپ کی نعش کو آبائی گاؤں ''پٹی مال'' میں لے جا کر سپرد خاک کر دیا گیا۔

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

شمع رسالت کے دو گمنام پروانے

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ جس طرح قوم حجاز نے محسن انسانیت ﷺ کی حرمت و ناموس کا تحفظ کیا اور مختلف ادوار میں نوجوانان ملت اپنے خون کا نذرانہ پیش کرتے رہے وہ بے مثال ہے اور لازوال بھی۔ عاشقان رسولؐ جس دل گردے، جرأت مندی، صبر و تحمل اور ذوق وشوق کے ساتھ گستاخان نبیؐ پر جھپٹے، اس کا نمونہ آج تک کسی اور قوم نے پیش نہیں کیا۔ کلمہ گو مائیں اپنے بیٹوں کو پھولوں کے ہار پہنا کر سوئے مقتل روانہ کرتی رہیں۔ عفت مآب بہنوں نے اپنے بھائی اس مقدس جذبے پر وار دیئے اور نیک سرشت بیویوں نے اپنے سرتاج تاجدار مدینہ ﷺ کے نعلین مبارک پر قربان کیے۔ یہ ولولہ، یہ جذبہ، یہ سعادت اس قوم کے مقدر میں کیوں نہ لکھی جاتی۔ ملتِ اسلامیہ کا تو خمیر ہی طیبہ کی مٹی میں گوندھا گیا ہے! ''باخدا دیوانہ باش با محمد ہشیار باش'' اس قوم کا نظریۂ حیات ہے۔ لہٰذا جب بھی کوئی ایسا مرحلہ آتا ہے تو دیوانگان عشق بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتے ہیں۔

دفتر پارینہ میں اس طرز کی کئی ایک مثالیں موجود و محفوظ ہیں۔ اس باب میں دو گمنام مجاہدوں کا کردار بھی شامل ہے، جنھوں نے برصغیر میں انگریز عملداری کے دوران اسلامی غیرت وحمیت کا ایک ناقابل فراموش ثبوت فراہم کیا تھا۔

۷۔ مئی ۱۹۳۱ء کی بات ہے کہ قریب گیارہ بجے دوپہر دو خوش پوش نوجوان ''سین برادرز بک سیلرز''...... (کالج روڈ ہربنس پورہ کلکتہ) میں داخل ہوئے اور نہایت اطمینان کے ساتھ مصنف و پبلشر بھولا ناتھ سین اور اس کے ملازم مسمی ہری داس کے خنجر گھونپ دیئے جبکہ ایک ہندو کلرک گوپال بینر جی شدید زخمی ہوا اور کچھ دیر ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد وہ بھی واصل فی النار ہو گیا۔ استغاثہ کے مطابق مذکورہ تینوں آریہ سماجی ہندوؤں کے قتل کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ بھولا ناتھ نے محافظان ناموس رسالتؐ کو اپنا گاہک خیال کیا اور ان سے پوچھنے لگا کہ آپ کیا خریدیں گے؟ انہوں نے جواباً نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فضا میں بیک وقت دو خنجر لہرائے۔ اس کے نتیجے میں اول الذکر دونوں موقع پر جہنم رسید ہو گئے۔ جبکہ تیسرا شخص سخت مجروح ہوا۔ ایف۔ آئی۔ آر مطابق واردات کے فوراً بعد دونوں حملہ آور بڑے اعتماد سے باہر نکل گئے۔

یہ دونوں نوجوان کون تھے؟ اور کہاں سے آئے؟ یہ حوالہ بڑا حیرت افزا اور راحت انگیز ہے۔اس کی کڑیاں گڑھی شاہو لاہور میں انعقاد پذیر ایک احتجاجی جلسہ سے ملتی ہیں، جو ۲۲۔فروری ۱۹۳۱ء کو زیر صدارت صوفی غلام نبی صاحب بی اے (ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول کوہ منصوری) ہوا۔ اس میں جناب مولانا غلام محمد مکی نے ایک طویل و جامع تقریر آقائے نامدار ﷺ کے اوصاف و فضائل میں فرمائی۔ بعد میں سید الکونین ﷺ کی عصمت و ناموس کے حوالے سے صوفی صاحب نے مختصر لیکن نہایت ہی پر جوش خطاب کیا۔

اسلامیان گڑھی شاہو کا یہ عظیم الشان اجتماع بنگالی زبان میں مطبوعہ ایک رسوائے زمانہ کتاب...... ''پراچین کہانی'' ......کی مذمت اور اظہار غم و غصہ کے لئے منعقد ہوا تھا۔اس کا لکھاری ایک بدزبان اور کمینہ فطرت ہندو ''بھولا ناتھ سین'' تھا۔ اس بدنام رسالے میں خواجہ دو جہاں باعث تخلیق کون و مکاں، حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ کا ایک مصنوعی فوٹو اور گستاخانہ عبارتیں شامل تھیں۔ جلسے کی کارروائی کے دوران سامعین زار و قطار رو رہے تھے۔ ہر طرف آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔شدت غم سے چند عاشقانِ رسولؐ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔بے غیرت مصنف مذکور کے بارے میں نفرت و حقارت کا اظہار کر کے جلسہ کیا منتشر ہوا، شاتم نبیؐ پر غیظ و غضب کی ایک بجلی گری، جس میں یہ کم بخت نرگباش ہوا اور ساکنانِ گڑھی شاہو کے غیور و جسور ہونے پر زمانے نے بھرپور گواہی دی۔

کلکتہ میں شائع ہونے والی کتاب کے خلاف ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔متعدد مقامات پر مظاہرے ہوئے۔اسلامی جرائد و رسائل میں اس کی تردید میں بیسیوں مضامین لکھے گئے اور حکومت سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ ناپاک کتاب کے مصنف اور ناشر کو قرار واقعی سزا دی جائے کیونکہ اس نے امن عامہ کو شدید نقصان پہنچایا اور مسلمانانِ عالم کے جذبات و احساسات کو بری طرح سے مجروح کیا ہے۔

بعض اخبارات میں راجپال کے واقعہ قتل کو زیر بحث لا کر لکھا گیا کہ تمام مسلمان اپنے آقا و مولا ﷺ کی حرمت پر تن من دھن قربان کر دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دراصل آریہ سماجیوں کی پشت پر انگریز عملداری کا پورا پورا ہاتھ تھا اور ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت برصغیر پاک و ہند میں تحریک شاتت رسول شروع کروائی گئی تھی۔تاہم غلامانِ مصطفیٰ نے بھی اس مذموم تحریک کا ہر میدان میں ہر وقت، ہر جگہ اور ہر طرح مقابلہ کیا۔قانونی چارہ

جوئیاں تو محض اتمام حجت کے طور پر ہوا کرتی تھیں وگرنہ ہر سچا مسلمان دشمن رسول کے لئے موت کا پیغام ٹھہرا۔

دشمن رسول، بھولا ناتھ سین کے پیٹ میں خنجر اتارنے والے یہ مجاہد میاں عبداللہ خاں اور امیر احمد تھے۔ میاں عبداللہ خاں اوران کے والد میراں بخش ریلوے ورکشاپ مغل پورہ میں ملازم تھے۔ دو چار ماہ قبل غازی میاں عبداللہ خاں کا تبادلہ لاہور سے امرتسر ریلوے ورکشاپ میں ہوا۔ موصوف ایک مدت گڑھی شاہو سے اس درجہ غیر متعلق رہے کہ عام طور پر لوگوں نے انہیں دس سال سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر ان کی شوخی قسمت تھی کہ وہ ۲۲۔ فروری کو اپنے محلّہ ہی میں موجود تھے اور اس رات حزب الاحناف لاہور کی تحریک وتائید سے مسلمانوں کا جلسہ جو...... ''پراچین کہانی'' ......اور اس کے بنگالی مصنف کے خلاف بطور احتجاج منعقد ہوا تھا میں اتفاقاً تشریف لے آئے اور یہ حسن اتفاق حسن تقدیر بن گیا۔ جلسے میں مختلف اصحاب کی تقریروں اور قرار دادوں سے انہیں معلوم ہوا کہ کلکتہ میں بھولا ناتھ نے ایک کتاب مرتب کی ہے اور وہ ہندو اکثریت کے علاقوں اور مدارس میں داخل نصاب کی جاچکی ہے۔ مزید براں یہ کہ اس میں آقائے دو جہاں، محسن و ہادیٔ، فخر بنی نوع انساں ﷺ کی اہانت آمیز تصویر بھی چھاپی گئی ہے۔

اس اندوہناک معاملے کا علم ہونے پر انہوں نے تحفظ ناموس رسالت ﷺ کی خاطر جام شہادت نوش کرنے کا پختہ عزم کرلیا۔ چنانچہ عید کے دن حضرت قبلہ غازی صاحب لاہور آئے تو دوسرے دن اپنے قریبی دوست امیر احمد ولد محمد ابراہیم جن کا مکان چوک رنگ محل میں تھا کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ امیر احمد نے کہا: ''ہم ایک ساتھ جئے ہیں اور اب رسول پاک ﷺ کی عزت و وقار پر ایک ساتھ ہی مریں گے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس عظیم کام میں پیچھے رہ جاؤں!''

الغرض امیر احمد اور میاں عبداللہ خاں نے کلکتہ کے لئے رختِ سفر باندھا۔ دونوں مخلص و با وفا دوست کلکتہ پہنچے اور مسافر خانہ میں رہائش رکھی۔ اگلے روز دفتر خلافت میں گئے۔ یہاں انہوں نے کتاب اور ہتک آمیز فوٹو کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ وقوعہ کے روز عاشقانِ مصطفیٰ اور بدزبان مصنف کے درمیان مکالمہ بازی کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ الغرض واردات کے بعد غازی امیر احمد صاحب موقع پر ہی گرفتار ہوگئے، جبکہ غازی عبداللہ خاں صاحب بوقت شام مسافر خانہ کے قریب تھانے میں ازخود پہنچے اور گرفتاری دی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ میاں عبداللہ خاں اوران کے والد محترم

بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ نیز یہ کہ غازی امیر احمد صاحب بھی باعتبار پیشہ ترکھان تھے اور غازی علم الدین شہیدؒ کے دُور کے عزیز بتائے جاتے ہیں۔ ان کے والدین فوت ہو چکے تھے اور ان کے کوئی بھائی نہیں تھا۔

باقاعدہ تفتیش شروع ہوئی تو کلکتہ سے ایک پولیس انسپکٹر سید غلام حیدر شاہ پشاوری لاہور وارد ہوئے اور تین چار دن متواتر محرکات قتل کا سراغ لگایا۔ عبداللہ خاں کے گھر کی تلاشی لی گئی تو غازی علم الدین شہیدؒ کی بڑی سائز میں ایک تصویر اور واردات کے اسباب و علل سے غیر متعلقہ چند کاغذات برآمد ہوئے۔ اس کے علاوہ انسپکٹر مذکور نے حزب الاحناف کے چند ارکان کو بھی جن کے اہتمام سے یہ جلسہ ہوا تھا بغرض دریافت حال بلوا لیا۔ پوچھ گچھ کے اس موڑ پر انہوں نے برملا کہا کہ جلسے کا اہتمام و انتظام واقعی انہوں نے کیا۔ اس میں اظہار غیظ و غضب کی قرار دادیں بھی منظور ہوئیں اور قرار پایا کہ ان کی نقول اخبارات کو بھیجی جائیں۔ ان قرار دادوں میں حکومت پر زور دیا گیا تھا کہ یہ گمراہ کن کتاب ضبط کی جائے اور مصنف کے خلاف قانونی چارہ جوئی عمل میں لائی جائے۔ انسپکٹر پولیس نے مسلم اخبارات بالخصوص روزنامہ ''سیاست'' لاہور کی ان تفصیلات کو بھی جو ان جلسوں سے متعلق تھیں جمع کیا اور تفصیلی معلومات کے ساتھ کلکتہ پہنچ گیا۔

غازی امیر احمدؒ جائے واردات سے کچھ فاصلے پر بجانب شمال ایک گلی میں گرفتار ہوئے اور غازی عبداللہ خاں بھی بصد شوق از خود پولیس سٹیشن گئے تھے۔ انہوں نے پولیس کے روبرو نہایت بے باکی اور جوانمردی کے ساتھ بیان فرمایا:

> ''ہم نے ہی ان نابکاروں کو بقائمی ہوش و حواس اور پورے پروگرام کے ساتھ واصل جہنم کیا ہے۔ اس فعل پر ہمیں نہ کسی نے اکسایا نہ سازش میں کوئی شریک ہے۔ ہم اب بھی خوش و خرم اور اپنے اس عمل پر نازاں ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ اپنی کامیابی پر اظہار تشکر کرتے رہیں گے۔ ہم نے اپنے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی حرمت کے تحفظ اور آپ ﷺ کی توہین کا بدلہ لینے کے لئے قتل کا ارتکاب کیا ہے اور آئندہ بھی کسی ایسے خبیث و دلوث کو ہرگز معاف نہیں کریں گے۔ وہ مسلمان ہی کیا جو اپنے پیارے نبی ﷺ کی توہین دیکھے اور خاموش رہے۔ جذبۂ عشق اور ایمان کا تقاضا ہے کہ گستاخان نبیؐ کو موت کے گھاٹ اتارا جائے

اوران کی بوٹیاں آوارہ کتوں کے آگے ڈال دی جائیں''۔

مقدمہ کی تاریخ سماعت نزدیک آئی تو کلکتہ سے ایک مسلمان وکیل کی طرف سے میاں عبداللہ خاں اور میاں امیر احمد صاحب کے اعزا ورفقاء کو تار موصول ہوا کہ پیروی کے لئے یہاں پہنچو۔ بیان ہے کہ غازیان ملت کے متعلقین خوشحال نہیں تھے مگر باوجود اس کے ان کو بہرحال کلکتہ جانا تھا۔ امیر احمد صاحب کے چچازاد بھائی اوران کی خالہ صاحبہ ملاقات اور مرافعہ کی پیروی کے لئے کلکتہ گئے، جبکہ عبداللہ خاں کے والد امرتسر سے ہوتے ہوئے کہ وہاں ان کی رشتہ داری تھی، کسی ایک عزیز کے ہمراہ وہ بھی اپنے لخت جگر کی ملاقات کو پہنچ گئے۔

اگست ۱۹۳۱ء تک مسلم آزار کتاب ''پراچین کہانی'' کے ہندو مصنف اور اس کے دو ملازموں کا مقدمہ قتل کلکتہ کے سیشن جج ''بورٹ ولیمز'' کی عدالت میں زیر سماعت رہا۔ ارتکاب قتل کے موقعے کا کوئی گواہ موجود نہیں تھا۔ صرف ایسے گواہان پیش ہوئے جنہوں نے ملزموں کو بھاگتے ہوئے دیکھا یا ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چھری دیکھی۔ دوران سماعت ملزمان کی شناخت سے متعلق گواہ بھی عجیب بدحواسی کا شکار نظر آئے۔ ایک گواہ نے وکیل استغاثہ کی انتہائی کوشش اور اعانت کے باوجود بار بار عبداللہ خاں کو امیر احمد اور امیر احمد کو عبداللہ خاں بتایا۔ اس مضحکہ خیز ناواقفیت پر مستزاد یہ کہ ازروئے قانون امیر احمد کے خلاف کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔

ناموس رسالت کے ان دو محافظوں کے مرافعے میں کلکتہ کے ایک مسلمان وکیل اور مسٹر گریگوری دفاع میں پیش ہوئے۔ انہوں نے مختلف پیشیوں میں دلائل کے ساتھ ثابت کرنا چاہا کہ ملزمان بالکل بے گناہ ہیں، ان کو قلت ثبوت اور شک کا فائدہ بھی پہنچتا ہے۔ نیز بعض دیگر قانونی حالات کا تقاضا ہے کہ کم از کم فرض کئے گئے قاتلوں کو سزائے موت نہ دی جائے بلکہ اسے حبس دوام عبور دریائے شور میں تبدیل کریں۔ المختصر وکلاء کی قانونی نکتہ سنجیاں بجا لیکن غازیان قوم نے سیشن کورٹ میں بھی پراعتماد لہجے میں اور یقین وولولہ کے ساتھ فرمایا:

> ''یہ گواہ جھوٹے مگر مقدمہ سچا ہے۔ ہم نے ہی خوب سوچ سمجھ کر ان مردودان ازلی کو ہلاک کیا۔ ہم نے ارتکاب فعل سے انکار کیا ہے نہ کبھی کریں گے۔ وجہ قتل بہت عظیم وارفع اور ہمارے لئے سکون بخش ہے۔ ہمارا مقتولوں کے ساتھ زن، زر یا زمین کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ بدبخت ناشر ومصنف نے حضور محبوب خدا ﷺ کی توہین پر مبنی کتاب شائع کی اور

ہم نے اپنا مذہبی فریضہ ادا کیا۔ رسول پاک ﷺ کی عزت و ناموس کا تحفظ مسلمان قوم پر فرض کفایہ ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ان ذلیل کتوں کی ہلاکت ہمارے ہاتھوں سے ہوئی۔ عدالت زیادہ سے زیادہ جو سزا دے سکتی ہے دے لے۔ بارگاہ رسالت مآب ﷺ سے ہمیں اس قربانی کا اجر عظیم ملے گا''۔

سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ ملزمان خان عبداللہ خان اور امیر احمد نے اعتراف کیا ہے کہ واقعی وہ اس واردات کے ذمہ دار ہیں۔ لہٰذا دونوں ملزمان کے لئے سزائے موت تجویز کی جاتی ہے۔ ان دو عاشقانِ رسولؐ کو ہائی کورٹ وغیرہ میں اپیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم مسلمانانِ کلکتہ میں از حد جوش و خروش تھا۔ جب پیشی کے دوران غازیان ملت عدالت میں لائے جاتے تو لاکھوں کی تعداد میں فرزندان توحید زیارت کو ٹوٹ پڑتے۔ بعض اوقات سرگرم نوجوانوں نے اپنے مجاہدین کی حمایت و محبت میں عدالت کے اندر اور باہر بہت بڑے مظاہرے کئے۔ ہائی کورٹ کلکتہ میں یہ فیصلہ بحال رہا اور ۱۲۔ فروری ۱۹۳۲ء کا دن سزا پر عملدر آمد کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ لیکن چند دن پہلے ہی بعض ناگزیر وجوہ یا مصلحتوں کی بنا پر تاریخ ملتوی کر دی گئی۔ ادھر حکومت بنگال کی طرف سے حکومت ہند کو ٹیلی گرام دیا گیا کہ پھانسی کی سزا حبس دوام میں بدل دیں مگر صوبائی گورنمنٹ کی یہ استدعا در خور اعتنا نہ سمجھی گئی۔ شمع رسالت کے پروانوں کا مقدر بام عروج پر تھا اور قدرت کو گوارا نہیں ہوا کہ محبانِ رسول کو شہادت کے انعام سے محروم کر دیا جائے۔

یہی سبب تھا کہ ۹۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو فدایان رسول اکرمؐ، عبداللہ خاں اور میاں امیر احمد مرتبہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ گو یوم شہادت سرکاری طور پر مشتہر نہ کیا گیا تھا اور نہ ہی علاقے میں اس کی اطلاع تھی لیکن پھر بھی محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار مسلمانوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ بیان ہے کہ شہادت کے وقت نہ صرف شمع رسالت ﷺ کے دونوں پروانے ہشاش بشاش تھے بلکہ لمحہ وصال کے بعد ان کے چہرے سے نور برستا تھا اور حسن و جمال کچھ اس طرح نکھرا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔

پھانسی دیئے جانے کے بعد پولیس شہداء کی نعشوں کو اسلامی قبرستان میں لے گئی جو جیل سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں نعشیں اس سمجھوتے کے مطابق جو ایک شب پہلے متعلقہ حکام اور مسلم لیڈروں کے مابین طے پایا تھا، شہیدانِ ناز کے اعزا و اقربا کے حوالے کر دی گئیں۔ ورثاء

نے اپنے شہدا کے ساتھ جیل میں آخری مرتبہ ایک بجے شب کو ملاقات کی تھی اور پھانسی دو گھنٹہ بعد ہوئی۔ بتایا جاتا ہے کہ ہر دو شہداء کو ایک دوسرے کے پاس تختۂ دار پر چڑھایا گیا۔ اس موقع پر شہداء کی وصیت کے مطابق مسلمان مکمل طور پر پرامن رہے۔ تاہم شہر کے مسلمانوں نے ہڑتال کی ، دکانیں بند رکھیں اور فرزندان توحید کا ایک جم غفیر مسجد ناخدا میں جمع ہو گیا۔ پولیس بہ تعداد کثیر متعین تھی۔ ایک دن قبل پولیس سارجنٹ اور گورا فوج کے متعدد دستے چوراہوں اور اہم مراکز پر تعینات تھے۔ شہداء کو مسلح پولیس کی حفاظت میں قبرستان میں پہنچایا گیا۔ قبرستان میں پچاس ہزار افراد پر مشتمل ہجوم کے ایک حصہ نے شہداء کے جنازے کے ساتھ جلوس نکالنے کی کوشش کی۔ اس سے جوش اور سنسنی پھیل گئی۔ لیکن بروقت مداخلت اور ممتاز و سرکردہ مسلمان رہنماؤں کے کہنے پر رضا کاروں نے صورت حال کو نازک ہونے سے بچا لیا اور قبرستان کے دروازے بند کر دیئے۔ اس پر پولیس نے رضا کاروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور تدفین وغیرہ کی رسمیں بغیر کسی رکاوٹ کے عمل میں آئیں۔ انتظامیہ نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ایک ہفتہ سے زائد عرصہ تک قبرستان کی حفاظت کی جائے گی۔

''صلہ شہید کیا ہے تب و تاب و جاودانہ''

۱۵۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو مجلس خلافت کلکتہ کا ایک جلسہ زیر صدارت مسٹر حسین شہید سہروردی منعقد ہوا۔ اس میں شہیدانِ رسالت، خان عبداللہ خان اور میاں امیر احمد کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور حسین شہید سہروردی صدر مجلس خلافت نے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار اور اعلان کیا کہ میں عبداللہ خاں کے شیر خوار بچہ کو بیس روپے ماہوار دیا کروں گا جب تک وہ سن شعور کو پہنچ کر خود اپنی ضروریات کے قابل نہ ہو جائے گا۔

۱۸۔ مارچ بروز جمعۃ المبارک کو یوم شہیدانِ رسالت منانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس موقع پر تمام مساجد میں قرآن خوانی کا بھی اہتمام ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حسین شہید سہروردی نے بیس روپے ماہانہ وظیفے کی جس رقم کا اعلان کیا تھا وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک ان کے گھر پہنچتی رہی مگر صرف بیس روپے نہ کم نہ زیادہ۔



آٹھ نو برس ادھر کی بات ہے کہ ایک روز دیال سنگھ کالج کے دو طالب علم میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا تعلق گڑھی شاہو سے تھا۔ میری زبانی غازی امیر احمد شہیدؒ اور غازی عبداللہ

خاں شہیدؒ کی کہانی سنی تو پہلے وہ حیران ہوئے پھر پریشان! راقم الحروف نے ان سے کہا کہ مجھے مذکورہ شہیدان ناموسِ رسالت کے موجودہ لواحقین کا نام و پتہ درکار ہے۔ کیا آپ میری مدد فرمائیں گے؟

چند دنوں کے بعد وہ کامیابی کی خبر لے کر آئے۔ ان کی رہنمائی سے گڑھی شاہو میں غازی عبداللہ خاں شہیدؒ کے حقیقی بھانجے سے ان کے خاندانی حالات و واقعات اور بعض دیگر معلومات کا حصول ممکن ہوسکا۔ یہ سرگزشت از حد نشاط انگیز اور راحت آمیز ہے۔

گڑھی شاہو میں غازی عبداللہ کے نام سے ایک محلّہ آباد ہے۔ اس کی گلی نمبر ۱۶ کے مکان نمبر ۱۲۴ میں شہید موصوف کے بھانجا رہتے ہیں۔ یہ محلّہ دراصل آپ ہی کی یاد میں آباد ہوا تھا۔ صد افسوس کہ اب اہل محلّہ میں سے غالب ترین اکثریت کو اس وجہ تسمیہ کا بھی علم نہیں ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ قیام پاکستان کے وقت آبادی میں غیر معمولی حد تک اتھل پتھل ہوئی اور نئے آنے والے لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ اہل محلّہ میں سے زیادہ تر لوگ وقتاً فوقتاً نقل مکانی کر کے نئی بستیوں میں سکونت پذیر ہو جاتے رہے۔ تیسرا یہ کہ پروانۂ شمع رسالت کی قربانی کے وقت اس جگہ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ تب یہاں ایک بہت بڑا باغ ہوا کرتا چوتھا یہ کہ قبل ازیں شہید ناموسِ رسالت کا عرس محلّہ کے لوگ انتہائی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے جو کہ آپ کے والد محترم کی رحلت کے بعد بوجوہ سمٹ کر ورثاء تک محدود رہ گیا ہے۔

غازی عبداللہ خاں شہیدؒ کے والد صاحب کا نام میراں بخش تھا۔ آپ پیشہ کے اعتبار سے ترکھان لیکن نسلاً پٹھان تھے۔ مستقلاً لاہور میں رہنے کے سبب پنجابی پٹھان بھی کہہ سکتے ہیں۔ الغرض یہ کہ آپ کو خان صاحب کہہ کر بلایا جاتا۔ غازی عبداللہ خاں شہیدؒ کا پورا خاندان ابتدا سے ہی سنی العقیدہ مسلمان چلا آرہا ہے۔ عظیم باپ نے ہی اپنے عظیم بیٹے کی یاد میں عرس کے موقع پر نعت خوانی وغیرہ کا سلسلہ شروع کروایا تھا جو کہ ان کی وفات کے بعد زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکا۔ آپ کی والدہ محترمہ زینب بی بی اور والد صاحب میراں بخش خان صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ رحمت اللہ خان بڑے بیٹے تھے۔ ان سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں یادگار ہیں۔ ان کی رہائش دھرم پورہ لاہور میں ہے۔ غازی عبداللہ خان شہیدؒ کے حقیقی برادر اکبر ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ عالم آخرت کو سدھار گئے تھے۔ غازی عبداللہ خان شہیدؒ کی سگی بہن غلام فاطمہ بھی عالم فانی سے رخصت ہو چکی ہیں۔

ان کے تین بیٹے ہوئے جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں: محمد یونس خان، معراج دین خان، خالد محمود خان۔ علاوہ ان کے ولایت اختر اور سکینہ بی بی نام کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ خالد محمود خان سمن آباد لاہور جبکہ بقیہ افراد خانہ گڑھی شاہو میں ہی قیام پذیر ہیں۔

غازی عبداللہ خان شہیدؒ بھی اپنے باپ دادا کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے، یعنی ترکھانوں والا کام کرتے رہے۔ پروانۂ شمع رسالت کی شادی خانہ آبادی ایک وفا شعار، خوش کردار دوشیزہ زہرا بیگم سے ہوئی تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ نے گستاخ رسول کو ٹھکانے لگانے کی غرض سے اپنے عزیز از جان دوست، غازی میاں امیر احمد خان کے ہمراہ کلکتہ کا سفر اختیار کر لیا اور پھر بھولا ناتھ سین کے قتل میں ہنستے مسکراتے اور اپنے آقا و مولا ﷺ کی نعتیں گنگناتے تختۂ دار کی زینت بن گئے۔

غازی عبداللہ خان شہیدؒ کی شہادت سے صرف چند ہفتے قبل آپ کے ایک چاند سا بیٹا ہوا۔ آپ کی اہلیہ زہرا بیگم، جب دیگر رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کے ساتھ اپنے سرتاج سے آخری ملاقات کو کلکتہ گئی تو نور نظر کو بھی گود میں لے گئی تھیں۔ غازی صاحب نے اپنے معصوم لختِ جگر کو جیل میں دیکھا تو بے ساختہ مسکرا دیئے۔ بڑی دیر تک اپنے سینہ سے چمٹائے رکھا اور خوب پیار کیا۔ بتاتے ہیں کہ آپ کی خواہش پر ہی بچے کا نام عبدالغفور خان تجویز ہوا۔

عبدالغفور خان مڈل سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر پائے۔ انہوں نے کچھ وقت گھی مل باٹا پور میں بھی ملازمت اختیار کیے رکھی۔ ان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ بیٹی تو گھوڑے شاہ میں بیاہی گئی، جبکہ بیٹے فیصل آباد میں ہوتے ہیں۔ پروانۂ شمع رسالت، غازی عبداللہ خان شہیدؒ کے حقیقی بھانجے محمد یونس خان نے بوقت ملاقات بتایا:

> ''غازی عبداللہ خان شہیدؒ میرے سگے ماموں ہیں۔ آپ کی سوانح حیات اور مقدمہ و شہادت سے متعلق اصل معلومات نانا جی کے پاس تھیں۔ جب تک نانا حضور اس دنیا میں رہے باقاعدگی سے ہر سال شہید ناموس رسالت کا عرس منایا جاتا تھا۔ عموماً یہ تقریب انجن شیڈ والی مسجد میں ہوا کرتی۔ اس میں محلّہ کے معروف نعت خواں جان محمد ضرور حاضر ہوا کرتے تھے اور مولوی غلام رسول صاحب کی تقریر بھی اپنا کام دکھایا کرتی۔ آپ کی شہادت سے متعلق واقعہ تو ایک ہی ہوتا لیکن انداز ہر سال

بدل جایا کرتا تھا اور لگتا کہ جیسے ہم پہلی بار یہ روداد سن رہے ہیں۔

ماموں جان غازی عبداللہ خان کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی جب انہوں نے گستاخِ رسول کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ انہوں نے کلکتہ کا یہ سفر اختیار کرنے سے قبل اپنے ابو جی اور امی جان کے علاوہ اہلیہ سے بھی باقاعدہ اجازت لی تھی۔ فداکار رسالت نے کہا تھا کہ اپنے آقا و مولا ﷺ کی شانِ اقدس میں بھولا ناتھ سین کی یاوہ گوئیوں کے سبب ایک عرصہ سے مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ میرا فرض مجھے سوئے دار پکارتا ہے۔ اس پر گھر والوں نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

ماموں جان کی شہادت سے لے کر ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء تک گڑھی شاہو سے بیسیوں افراد آپ کی قبر کی زیارت کو ہر سال کلکتہ جایا کرتے تھے۔ عرس کے موقع پر تو لوگوں کا تانتا بندھ جاتا۔ میں بھی ایک بار نانا حضورؒ کے سایۂ شفقت میں دیوانہ وار خاص اس نیت سے کلکتہ گیا اور آپ کی تربت پر حاضر ہوا تھا۔ مقامی لوگوں کا اس موقع پر ایک بہت بڑا اجتماع ہوا کرتا اور وہ لوگ لاہور سے آنے والے مہمانوں پر بالعموم اور فدیۂ رسولِ عربی کے رشتہ داروں پر بالخصوص جان چھڑکا کرتے تھے۔ بعض اہلِ دل تو یہ بھی کہتے کہ غازی عبداللہ خان شہیدؒ کے شہر سے نسبت بھی خوش نصیبی ہے۔ رسولِ عربی ﷺ کے اس نوعمر اور لاڈلے مجاہد نے لاہور سے آ کر ہمارا قرض اور فرض ادا کر دیا تھا۔ فرض کفایہ! اگر وہ بروقت نہ آتے تو شاید ہم بدنصیبی کے ہاتھوں مارے جاتے اور پھر قیامت تک یہ داغ نہ دھلتا۔

نانا جان فرمایا کرتے تھے کہ جب اللہ کے شیروں نے دشمن رسول کو للکارا تو اس کے تمام ملازم بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف اطمینان کے ساتھ محبوب خدا ﷺ کے گستاخ کو ٹھکانے لگایا بلکہ اس کے بعد دکان میں موجود کتابوں کو اٹھا اٹھا کر پانی میں پھینکتے رہے اور پھر از خود تھانے میں جا کر پیش ہو گئے تھے"۔

مسلمانان کلکتہ نے غازی عبداللہ خان شہیدؒ اور غازی امیر احمد خان شہیدؒ کے اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھا کہ وہ لاہور سے آ کر ان کی شان اور ایمان بچا گئے ۔ مقدمے کی پیروی میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھی تھی ۔ جب غازیان دین وملت کے رشتہ دار اور دیگر لوگ بغرض ملاقات کلکتہ جاتے تو وہ ان کی راہ میں اپنی آنکھیں اور دل کی دھڑکنیں بچھا دیتے ۔ ازاں بعد ہر سال بڑی دھوم دھام سے آپ کا عرس مناتے رہے ۔ میرا خیال ہے کہ وفاؤں کا یہ سفر اب بھی جاری ہوگا ۔

کیا یہ ایک عجیب بات نہیں ہے کہ غازی عبداللہ خان شہیدؒ کے حقیقی بھانجے کو بھی اپنے ماموں جان کے خوش قسمت رفیق سفر غازی میاں امیر احمد شہیدؒ اور ان کے دور ونزدیک کے کسی رشتہ دار کے بارے میں مطلقاً معلوم نہیں تھا ۔ گویا قوم اپنے ان محسنوں کو مکمل طور پر بھلا بیٹھی ہے حالانکہ یہ ہماری قومی تاریخ کا ایک زندہ باب ہیں ۔ کیا اس تلخ حقیقت کی روشنی میں بھی ہم ایک زندہ قوم ہیں؟ اس سوال کا جواب پوری ملت پر فرض بلکہ قرض ہے ۔

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

چند بھولی بسری یادیں

اقوام عالم کے سامنے ملتِ اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے کہ اس نے اپنے آقا و مولا ﷺ کی بارگاہ ناز میں ہمیشہ ہر دو طرح سے نعتیہ نذرانے پیش کئے ہیں۔نوک قلم سے بھی اور تلوار کی نوک کے ساتھ بھی۔تحفظِ ناموسِ رسالت جیسے مقدس فریضہ کی تکمیل خونِ جگر سے کی گئی۔بنا بریں برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر یہ عمل جس خلوص نیت، ذوق وشوق اور والہانہ شیفتگی و وارفتگی کے ساتھ نبھایا گیا یہ اپنی مثال آپ اور لازوال ہے۔خطہ ہند کے طول وعرض میں آباد کلمہ گوؤں نے ایسی عظیم الشان اور ایمان افروز روایات قائم کیں کہ سبحان اللہ۔ان نعت گوؤں کے عشق سرکار ﷺ پر آج بھی مقتل کی دیواریں گواہ ہیں، کیونکہ انہوں نے ثنائے رسول اکرم ﷺ کا ایک ایک بند اپنے خون کے قطروں سے لکھا تھا۔ان مدحت گرانِ پیغمبر ﷺ میں بعض کا نام اور کام تا ہنوز پردہ گمنامی میں رہا۔اہلِ قلم نے عدم توجہی روا رکھی۔قومی سطح پر اعتراف حقیقت تو بڑی بات تھی، انفرادی طور پر بھی کسی قابل ذکر جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں ہوا۔شمع رسالت کے ان پروانوں کے بارے میں جو عام طور پر فراموش کئے جا چکے ہیں چند کڑیاں مندرجہ ذیل ہیں۔



گزشتہ دنوں وفاقی شرعی عدالت میں توہین رسالت ﷺ پر سزائے موت سے متعلق ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔اس میں محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ نے راجا سید اکبر ایڈووکیٹ کے حوالے سے بتایا کہ ایک انگریز جج کے خانساماں نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی پر ایک میجر کو چھری مار کر قتل کر دیا تھا۔سر میاں محمد شفیع جو پارلیمینٹ کے رکن تھے، نے اس خانساماں کے مقدمے کی پیروی کی۔دو انگریز جج سماعت کر رہے تھے۔سر میاں محمد شفیع کارروائی کے دوران رسول اکرم ﷺ کے ذکر پر جذباتی ہو گئے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ججوں نے کہا: سر شفیع! آپ کے پایہ کے قانون دان بھی اس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں؟

اس پر میاں صاحب نے تاریخی جواب دیا:

''ہاں اگر میں بھی اس خانساماں کی جگہ ہوتا تو یہی کچھ کرتا:''

ایک دفعہ مولانا محمد علی جوہر کو دیگر رہنماؤں کے ہمراہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے کراچی لایا گیا، جہاں ایک انگریز جج کی عدالت میں ان کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ مولانا جوہر عدالت میں اپنے اس تاریخی خطاب کے دوران آقا و مولا ﷺ کا حوالہ دینا چاہتے تھے۔

انگریز جج نے کہا:

"ختم کرو یہ قصہ اور چھوڑو اپنے پیغمبر ﷺ کی بات:"

اس پر مولانا جوہر طیش میں آ گئے:

"کروں گا اور ضرور کروں گا، میں اپنے پیغمبر ﷺ کی بات۔ تم واپس لو اپنے الفاظ"

ذرا دیر خاموش رہے اور پھر پوری قوت سے کہا:

"میں کہتا ہوں اپنے الفاظ واپس لو۔ خبردار! جو شخص بھی میرے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرے گا، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا"۔

اس سے تلخی بڑھ گئی۔ مولانا جوہر بپھرے شیر کی طرح گرج رہے تھے۔ آخر شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا اور گھگھی بندھ گئی۔ اس کے بعد پولیس انہیں واپس لے گئی۔



حکیم اہل سنت و محقق دوراں محمد موسیٰ امرتسری مرحوم اپنی یادداشتوں کے حوالے سے بتایا کرتے تھے کہ حضرت ابوحنیفہ کوفیؒ کے عرس پاک منعقدہ "مسجد جان محمد" امرتسر کے اجتماع میں امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہؒ صاحب نے ایک واقعہ بیان فرمایا تھا:

"امرتسر کے گرجا گھر کے سامنے کھڑا ہو کر ایک پادری حضرت عیسیٰؑ کے فضائل اور عیسائیت کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ وہ دورانِ تقریر حضور پُرنور ﷺ کا نام نامی اسم گرامی ادب و احترام سے نہیں لیتا تھا۔ سامعین میں ایک بھنگڑ اس حالت میں کھڑا تھا کہ بھنگ گھوٹنے والا ڈنڈا اس کے کاندھے پر تھا۔ اس خوش بخت نے کہا:

''پادری! ہم حضرت عیسیٰؑ کو برحق نبی مانتے ہیں اور ان کا نام ادب سے لیتے ہیں۔ تو بھی ہماری سچی سرکار ﷺ کا نام ادب سے لے۔''

پادری پر اس بات کا کچھ اثر نہیں ہوا تو اس عالی ہمت نے پھر ٹوکا۔ جب پادری نے تیسری بار بھی اسی طرح نام لیا تو اس پاک نہاد نے اپنا ڈنڈا جس سے بھنگ گھوٹتا تھا اس زور سے پادری کے سر پر دے مارا کہ اس کا سر پھٹ کر بھیجا باہر آ گیا اور مردود وہیں موقع پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ غیرت مند ملنگ پکڑا گیا۔ موت کی سزا ہوئی۔ ازاں بعد اپیل میں انگریز جج نے بری کر دیا اور لکھا تھا:

''پادری کا قاتل تکیہ نشین بھنگڑ ہے کوئی مولوی نہیں۔ مولوی اور پادری کی کوئی باہمی رنجش ہو سکتی ہے۔ بھنگڑ سے پادری کی دیرینہ یا تازہ رنجش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ پادری نے ضرور اس کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ لہٰذا اسے بری کیا جاتا ہے''۔



غازی محمد منیر شہیدؒ، موضع موگہ ضلع فیروز پور (بھارتی پنجاب) کے وٹرنری ہسپتال میں بلحاظ پیشہ چپڑاسی تھے۔ مگر جذبۂ عشق رسول ﷺ سے سرشار یہ شاہین صفت جانباز ایک موقع پر تحفظِ ناموس نبی ﷺ کے لئے آگے بڑھا اور جان پر کھیل گیا۔ شاتم رسولؐ کو واصل فی النار کیا اور عدالت نے انہیں سزائے موت کا مستحق گردانا۔ وہ جام شہادت کے متمنی تھے اور سرِ دار لٹک کر لافانی نسخۂ حیات پایا اور سمجھا گئے۔

دنیائے صحافت میں شہید موصوف کا ذریعۂ تعارف ایک مضمون ''نوجوانانِ اسلام کی حرمت وشان'' بنا جو جنوری ۱۹۷۳ء کے دوران ''نوائے وقت'' میں شائع ہوا تھا۔ مگر مجھے ان کا سراغ غازی میاں محمد شہیدؒ کے برادر حقیقی ملک نور محمد صاحب کی کمال مہربانی سے ملا۔



غازی حنیف شہیدؒ نے اپنی بے مثال وفاؤں کا باب ایک مسلم ریاستی دارالحکومت ''بھوپال'' میں رقم کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وسطی ہند کے اس تہذیبی شہر میں ایک گرلز ہائی سکول کی انگریز ہیڈ مسٹریس نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت مدرسے کی صفائی کے بہانے قرآن پاک کے

بوسیدہ اوراق ایک ہندو جمعدارنی کے ہاتھوں کوڑے میں ڈلوائے اور جب اس پر احتجاج کیا گیا تو اس بدزبان و بدنصیب عورت نے قرآن پاک، دین متین اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں نازیبا اور اشتعال انگیز الفاظ کہے۔ بھوپال کے ایک غیرت مند نوجوان محمد حنیف نے جو پیشے کے اعتبار سے قصاب تھے، اس انگریز عورت کو راستے میں روک لیا اور کہا کہ وہ اپنی اس ناپاک جسارت اور شیطانی حرکت پر شہر کے مسلمانوں سے باقاعدہ معافی مانگے اور اعلان توبہ کرے وگرنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ انگریز حکومت کے نشے میں چور اس بنتِ ابلیس نے یہ مطالبہ ٹھکرا دیا اور مجاہدِ ملت کے ہاتھوں موت سے دوچار ہوئی۔

غازی محمد حنیف اس غلط کار و بدنہاد عورت کو کیفر کردار تک پہنچا کر خود تھانے میں حاضر ہو گئے۔ اقبال فعل کیا اور تمام عدالتوں میں بھی اعتراف حقیقت فرمایا۔ کچھ عرصہ جیل میں گزرا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور مرد غازی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ بالآخر یہ مجاہد ''الصلوٰۃ والسلام علیک یا سیدی یا رسول اللہ'' کا ورد فرماتے ہوئے تختۂ دار پر جھول گیا۔

ابتدا میں شہید موصوف سے متعلق چند تعارفی جملے سہ ماہی ''صدف'' پاکستان نمبر جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ صفحہ ۳۹ میں شائع ہوئے۔ مضمون نگار محترمہ فرزانہ اسد صاحبہ تھیں۔ اس کی فراہمی پر بندہ اپنے محسن ومکرم عبدالغفار شیخ صاحب (کوٹری سندھ) کا تہہ دل سے ممنون ہے۔



ضلع گجرات کے معروف قصبہ منڈی بہاؤالدین سے نزدیکی گاؤں ''آہلہ'' میں بھی ایک سکھ گستاخ رسول ؐ کو جہنم رسید کیا گیا تھا۔ قاتل کا نام غازی محمد اعظم بتایا جاتا ہے۔ بنا بریں موٹر وے پر واقع پنڈی بھٹیاں کے علاقہ میں چک ذخیرہ نمبر ا میں بھی اسی طرز کا ایک تاریخی واقعہ پیش آیا۔ قاتل و مقتول ہم جماعت اور قریبی دوست تھے۔ ہندو طالب علم نے شانِ رسول ﷺ میں ارتکاب گستاخی کیا تو نوعمر عاشق رسول ﷺ نے اسے فنافی النار کر دیا۔ کم عمری کی بنا پر عدالت نے کوئی سخت سزا نہ دی۔ اس مجاہد کا نام میاں اسلام دین تھا۔



گستاخ آریہ سماجی ''لیکھ رام'' کو بھی کسی نامعلوم مسلمان نے نزگباش کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا قادیانی نے بھی اس ملعون کی ہلاکت کی پیشین گوئی داغ رکھی تھی۔ یہی سبب ہے کہ پولیس کی تفتیش میں مرزا قادیانی پر تحریک قتل اور اعانت کا شبہ ہوا اور اس کی خانہ تلاشی لی گئی

مگر کوئی ثبوت بہم نہ پہنچ سکا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ مردود کا قاتل بھی کوئی مسلمان ہی ہوسکتا ہے۔ مرزائیوں کا تحفظ ناموس رسالت ﷺ سے کیا؟ وہ تو خود تحریک شاتمیت رسولؐ کی ایک کڑی اور سازشوں کا دیباچہ ہیں۔ الغرض مرزا قادیانی کی پیش گوئی اس سوچ کا تجرباتی مظہر نظر آتی ہے کہ غیرت مند مسلمان اس ناپاک وجود کو برداشت نہیں کرسکیں گے۔



پکا قلعہ حیدر آباد (سندھ) میں قیام پاکستان سے فقط ایک برس قبل ۱۹۴۶ء میں ہندو جن سنگھیوں کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا تھا۔ اس میں آٹھ دس ہزار ہندو شریک تھے۔ مذکورہ جلسے میں ملتِ اسلامیہ کو نہ صرف غلیظ گالیاں دی گئیں بلکہ ان کے ایک گرو، نینوں مہاراج نے نبی اکرم ﷺ کی شانِ مبارک میں بھی گستاخانہ باتیں کیں۔ اس بات نے تین نمبر تالاب کے مسلم نوجوانوں کو بے تاب کر دیا۔ جب پچیس نوجوان، حرمت نبی ﷺ پر اپنی جانیں نچھاور کرنے کا جذبہ لئے قلعہ پر حملہ آور ہوئے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا تو جلسے میں بھگدڑ مچ گئی۔ عاشقان مصطفیٰ نے بے تحاشا ڈنڈے اور لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ اسی اثنا میں نینوں مہاراج، ایک جوشیلے نوجوان عبدالخالق قریشی ولد محمد ابراہیم قریشی کے سامنے آگیا۔ نوجوان نے اس بے غیرت ملیچھ کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ وار کاری ثابت ہوا اور شاتم مصطفیٰ اپنے پیروکاروں کے درمیان تڑپ تڑپ کر جہنم رسید ہوگیا۔ جن سنگھی بدحواس ہو کر اپنی لاٹھیاں، جوتیاں، تلواریں اور دوسرے ہتھیار، چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس واقعے میں حصہ لینے والے چند دیگر خوش قسمت اشخاص کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

حاجی محمد بخش عرف موشیدی، اللہ ورایو شیدی، محمد علی شیدی، علی مراد شیدی، لکھانو دایو، صدیق گودز، نبی بخش عرف نبو، میر محمد عرف میرل، اللہ ڈنو شیدی، رحیم بخش، ابراہیم حجام، لالہ مجیدی پشوری۔



۴۔ اپریل ۱۹۳۵ء کو ہندوستان کے مسلم اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ یکم اپریل کو بمبئی میں ایک باغیرت مسلمان نے ایک کمینہ فطرت ہندو کو ہلاک کر دیا اور پولیس کے سامنے بیان دیا کہ مقتول نے ایک مقامی ورنیکلر اخبار میں حضرت رسول اکرم ﷺ کی عکسی تصویر شائع کر کے اس کے جذبات مجروح کئے تھے۔



۲۸۔اپریل ۱۹۳۵ء کے روز ایک اور خبر نمایاں تھی کہ ملتان شہر میں ۱۴۔اپریل کو سات بجے شام مسمی ''ویر بھان'' آریہ سماجی نے حضور ختمی مرتبت آقائے دو جہاں ﷺ کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے تھے۔آج بعد دوپہر آریہ سماجی مذکورہ کو ساڑھے تین بجے گلی گردھاری لال اندرون پاک دروازہ میں کسی نامعلوم شخص نے پیٹ میں چھرا اتار کر ہلاک کر دیا۔شبہ قتل میں محمد بخش چوب فروش، حاجی فیض بخش، حاجی عبداللہ اور الٰہی بخش کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ازاں بعد وہ عدم ثبوت کی بنا پر عدالت سے رہا ہوئے۔

◉

جہلم شہر میں دریا کے کنارے واقع شمالی محلّہ کے ایک مسلمان غازی غلام محمد شہیدؒ کی سرگزشت بھی قابل ذکر ہے۔ان کا مقدر دفعتاً جاگ اٹھا تھا۔شہنشاہ ہر عالم ﷺ کی ولادت باسعادت کا مبارک دن تھا، ہر طرف خوشیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔کائنات کی نعمت کبریٰ کے ورودِ مسعود پر کون شکر ادا نہ کرتا! اس روز اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم پر پوری ملت اسلامیہ سربسجود تھی۔اظہار مسرت کے طور پر عید میلاد ﷺ کا ایک جلوس تشکیل دیا گیا۔فرزندان توحید کا یہ قافلہ شہر کے ایک چوراہے میں سے گزر رہا تھا۔قریب ہی سکھوں کی آبادی تھی۔سکھ مت کا ایک آوارہ پیروکار آوازے کسنے لگا۔یہ مجاہد اس کے نزدیک کھڑا تمام اوچھی حرکات دیکھ رہا تھا۔اسی اثنا میں جلوس کے پیچھے گدھے پر سوار کوئی لڑکا دکھائی دیا۔اب کے وہ انتہائی دلخراش ولرزہ خیز الفاظ بک رہا تھا۔وہ زور سے چلایا اور شانِ رسالت میں گستاخی کی ''.........'' ان سے رہا نہ گیا۔بعجلت اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور بولے:

''بے غیرت کتے! اپنی زبان کو قابو میں رکھ ورنہ تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دوں گا''۔

مگر وہ اپنی ذلیل حرکت سے باز نہ آیا۔غازی غلام محمد نے غصہ کی حالت میں اپنا چاقو اس کے سینے میں گھونپ دیا اور پے در پے وار کئے۔بجرم قتل آپ کی گرفتاری عمل میں آئی۔عدالت میں مقدمہ چلا اور انہیں سزائے موت کا مستحق ٹھہرایا گیا۔

غازی سائیں غلام محمد عرف بام نے یہ کارنامہ غالباً ۱۹۳۵ء میں سرانجام دیا تھا۔ان کے والد محترم کا نام غریب علی تھا۔آپ چار بھائی تھے۔صوفی محمد دین، فضل کریم، فیروز دین اور غلام محمد۔غازی غلام محمد شہیدؒ کی آخری آرام گاہ جنازہ گاہ جہلم کے قریب مشہور قبرستان میں واقع ہے۔



میاں عبدالرشید اپنے کالم ''نورِ بصیرت'' میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر غلام رسول مرحوم میرے ہمسائے اور دوست تھے۔۱۹۶۲ء میں انہوں نے مجھے اپنی ابتدائی زندگی کا یہ سچا واقعہ سنایا:

''یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے۔ میں انگلستان سے ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد نیا نیا ہندوستان آیا تھا۔ بالکل مغربی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ داڑھی مونچھ صفاچٹ، کوٹ پتلون میں ملبوس اور منہ میں ہر وقت پائپ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا ہندوؤں اور عیسائیوں کا وطیرہ بن چکا تھا۔ پہلے پہل مجھے پالم پور میں بطور اسسٹنٹ سول سرجن تعینات کیا گیا۔ یہ ہندو اکثریت کا علاقہ تھا۔ میرے سوا وہاں کے سب بڑے بڑے افسر غیر مسلم تھے۔ ایک روز ہم سب کلب میں بیٹھے تھے۔ وہاں کے فارسٹ افسر نے جو لمبا تڑنگا ہندو تھا حضور پاک ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کی باتیں شروع کر دیں۔ شاید اس کا خیال ہو کہ میں مغرب زدہ اور ترقی پسند ہونے کے باعث جھوٹی رواداری کے تحت اس کی باتوں کو برداشت کر جاؤں گا۔ یا وہ سمجھتا ہو کہ میں اکیلا ہونے کے باعث اس کی باتوں پر کسی شدید ردعمل کا اظہار نہیں کروں گا۔ مگر اس کی باتیں سن کر میرے اندر کا مسلمان بیدار ہو گیا۔ غصہ سے میرا خون کھول اٹھا۔ میں کرسی سے اٹھا اور میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر فرش پر دے پٹکا۔ گھونسوں اور لاتوں سے اس کی خوب مرمت کی۔ وہاں کئی اور ہندو افسر موجود تھے مگر کسی نے نزدیک آنے کی کوشش نہ کی۔ جب میں اسے مار مار کر تھک گیا تو اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی میں نے اسے کہا کہ اگر تو نے اس واقعہ کو ہوا دی تو تجھے گولی مار دوں گا۔ اگلے روز میں کلب گیا تو اس ہندو افسر نے اپنے طرز عمل پر ندامت کا اظہار کیا اور مجھ سے معافی مانگی''۔



۱۹۳۹ء میں جھنگ شہر کی بات ہے۔ حیدر بخش نامی ایک مسلم مزدور سبزی منڈی میں پلے داری کرتا تھا۔ یہ شخص ۱۳۔ رجب المرجب کو تاخیر سے کام پر گیا۔ ہندو آڑھتی نے اس سے پوچھا

کہ اتنی تاخیر کیوں ہوئی؟ اس نے بتایا کہ حضرت علی المرتضیٰ کا یوم ولادت تھا، اس وجہ سے ایک مذہبی تقریب میں شامل ہونا تھا۔ چھترہ رام آڑھتی نے اس کے جواب میں حضرت علیؓ اور حضور نبی اقدس ﷺ کی شان میں گستاخانہ فقرے کہے۔ حیدر بخش اس ہندو کی گستاخی نہ سہہ سکا اور دل برداشتہ ہو کر منڈی سے واپس آ گیا۔ اس نے اپنے محلے داروں کو واقعہ سنایا۔ چنانچہ اسلام کے دو رغیور نوجوان، ملک محمد اکبر علی اور محمد شفیع ڈھڈھی اس گستاخ رسول کو قتل کر دینے پر کمربستہ ہو گئے۔ لیکن کئی دن تک ان کو موقع میسر نہ آ سکا۔ رمضان المبارک میں دونوں نے تخت یا تختہ کا فیصلہ کر کے منڈی میں جا کر چھترہ رام پر تلوار سے حملہ کر دیا جبکہ بیسیوں لوگ موجود تھے۔ زبان دراز ہندو خون میں لت پت ہو گیا۔ دونوں تلواریں لہراتے ہوئے مسجد میں آ گئے، جہاں انہوں نے خون صاف کیا۔ جمعہ کی نماز پڑھی اور خود کو حوالۂ پولیس کر دیا۔



غازی اللہ دتہ شہیدؒ کا مولد و مدفن ضلع گجرات کا ایک تاریخی اور مشہور قصبہ ''کنجاہ'' ہے۔ ایک غیر مسلم تھانیدار بغرض تفتیش آیا ہوا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں اپنے خبث باطن کا اظہار شروع کر دیا۔ ازاں بعد کھل کر رسول پاک ﷺ کی شان اقدس میں ناقابل بیان و ناقابلِ برداشت الفاظ ادا کیے۔ اس پر عاشق رسول اللہ دتہ کی غیرت جوش میں آئی اور بھرے مجمع میں ہزاروں عوام کے سامنے اس یاوہ گو پولیس افسر کو آتشِ جہنم تک پہنچا دیا اور خود غازی و شہید کے مرتبے پر فائز ہو کر بارگاہ نبوت میں پہنچ گئے۔

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

انکشافات

یہ کہانی......ایک ناپاک دفتر ''رنگیلا رسول'' کی طباعت سے شروع ہوتی ہے۔ ہندوؤں کی چال یہ تھی کہ وہ اس تلخ و نازک معاملے میں اپنے ساتھ کسی نامور مسلمان کو بھی ملوث کر لیں۔ اس زمرے میں کئی پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔ یہ امر خاصا حیران کن ہے کہ اس بدنام زمانہ رسالے کی کتابت کی غلطیاں علامہ تاجور نجیب آبادی نے درست کی تھیں جو اس وقت ایک ہندو پرنٹنگ پریس ''مکتبہ گلاب سنگھ'' میں ملازم تھے۔ مذکورہ کتاب کی پرنٹنگ بھی اسی پریس سے ہوئی تھی۔ مذاق تحقیق رکھنے والے اس کے ثبوت میں راجپال کا وہ بیان بھی پیش کرتے ہیں جس میں اس نے کہا تھا:

> ''مسلمان خود بھی اس کتاب کو قابل اعتراض نہیں سمجھتے۔ اگر واقعی یہ مجموعۂ بہتان ہوتا تو علامہ تاجور نجیب آبادی ہرگز عبارتی غلطیاں (پروف ریڈنگ) درست نہ کرتے''۔

غازی علم الدین شہیدؒ کے حقیقی بھتیجے شیخ رشید احمد بھی اس روایت کی برملا تصدیق کرتے ہیں۔ تاہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھلا کوئی مسلمان ایسا کیونکر کرسکتا ہے؟ جواباً کہا جاتا ہے کہ علامہ موصوف کا علمی مزاج دینی نہیں ادبی تھا۔ لہٰذا رواداری کے فریب یا ملازمت کے لالچ میں کسی بھی دنیا پرست شخص سے ایسا رویہ غیر متوقع نہیں۔

ایک موقف یہ ہے کہ علامہ تاجور نجیب آبادی کا نام لیا جانا، مکار راجپال کی ایک اور ترچھی چال تھی۔ علامہ مذکور ایک بلند پایہ ادیب اور شہرت یافتہ انسان تھے۔ انہوں نے شاید ایسا نہ کیا ہو۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ ایمان سوزی کے تلخ و نازک مرحلے سے گزرتے وقت بحیثیت مسلمان ان کی پیشانی پر ضرور سلوٹیں ابھرتیں۔ بہرحال کچھ بھی ہو راجپال مردود نے ہماری داخلی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور علامہ تاجور نجیب آبادی کا نام شریک جرم ہونے میں ہمیشہ لیا جاتا رہا ہے۔ بقول راوی: اگر مذکور نے اس جرم کا ارتکاب خواہ کسی مصلحت یا مفاد کے تحت ہی کیا ہو۔ اہل اسلام کے چہرے پر بدنما داغ اور ایک انمٹ دھبہ ہے۔

گستاخ رسول، مہاشہ راجپال کے واقعہ قتل کے تین روز بعد یعنی 9۔ اپریل کو روزنامہ

'انقلاب' لاہور میں ایک حیرت انگیز خبر شائع ہوئی، لکھا تھا:

''شام چھ بجے نوجوانان بھارت سبھا کے ایک جلسہ میں جو اسیران میرٹھ سے اظہار ہمدردی کے لئے ہونے والا تھا۔ اس میں حادثہ مذکور کے باعث مسٹر احسان الٰہی کی تحریک اور خواجہ غلام محمد کی تائید سے قاتل (غازی میاں علم الدین) کی کھل کر مذمت کی گئی اور راجپال کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا''۔

یہ قوم سے غداری اور رسول پاک ﷺ سے بے وفائی کا ایک نمونہ ہے۔ امرتسر سے شائع ہونے والے اہل حدیث مکتبہ فکر کے ایک پرچے ''اہل حدیث'' میں انہی دنوں ''مہاشہ راجپال کا قتل ناجائز'' کے عنوان سے ایک مضمون چھپا۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ راجپال کا قتل بلا جواز، ناجائز اور زیادتی ہے۔ کسی بھی صورت اس کے قتل کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی قاتل کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہنا چاہیے۔



اس موقع پر قادیانی خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے خبثِ باطن کا اظہار کرتے ہوئے جمعہ کے ایک خطبے میں غازی علم الدین سے متعلق کہا:

''وہ نبی بھی کیسا نبی ہے، جس کی عزت بچانے کے لئے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں۔ جس کو بچانے کے لئے اپنا دین تباہ کرنا پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول ﷺ کی عزت کے لئے قتل کرنا جائز ہے، سخت نادانی ہے۔ وہ لوگ جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں وہ مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جو ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔ میرے نزدیک تو اگر یہی شخص راجپال کا قاتل ہے، جو گرفتار ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ وہی ہوسکتا ہے، جو اس کے پاس جائے اور اسے سمجھائے کہ دینوی سزا تو اب تمہیں ملے گی ہی، لیکن قبل اس کے کہ وہ ملے تمہیں چاہئے کہ خدا سے صلح کرلو۔ اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔''



یہ بھی درست ہے کہ راجپال پر پہلے قاتلانہ حملے کے دوران سر میاں محمد شفیع اور مولانا محمد

علی جوہر نے بھی اظہار تاسف و ناپسندیدگی کیا تھا۔ تاہم ان کا نقطۂ نگاہ دوسرا تھا۔ ان کے خیال میں آریہ سماجی تحریک اور اس قسم کی پاجیانہ حرکتوں کے پیچھے انگریزی سازش کارفرما تھی۔ یہ ساری کوششیں اس لئے تھیں کہ ہندوستان کے باشندے مذہب کے نام پر آپس میں لڑ پڑیں اور یوں برطانوی اقتدار کو مزید مہلت مل جائے۔



راجپال کی فطری خباثت اس کے پسماندگان میں بھی جھلکتی رہی ہے۔ مقتول مردود کی ایک بیٹی 'پربھا' طویل عرصہ تک انڈین فلموں میں اداکارہ کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ وہ آتما ترنگ عرف نغمۂ دل میں ہیروئن تھی۔ فلمی دنیا میں ہوتے ہوئے بھی اس قدر متعصب تھی کہ کسی مسلم آرٹسٹ یا کیریکٹر سے تعاون کرنا اس کے نزدیک پاپ تھا۔ یہی بنیاد تھی کہ اس نے اپنا ہم خیال نہ ہونے پر 'انیل کمار' کو صید ہوس" کی کاسٹ سے الگ کروا دیا تھا اور یہ کہ اس کا نام بہت سے جنسی سیکنڈلوں کی زد میں بھی رہا ہے۔

غازی علم الدین شہیدؒ کے واقعہ جہاد میں دو پہلوؤں پر ہمیشہ چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں۔ اولاً یہ کہ غازی موصوف نے سیشن کورٹ میں انکار فعل کر دیا۔ ثانیاً حضرت قائداعظم نے اس مقدمہ قتل میں پیروی کے لئے بھاری فیس وصول کی تھی۔ متذکرہ موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر اسے زیر بحث لایا جانا ناگزیر ہے۔

جنگ پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہونے والی ظفر اقبال نگینہ کی کتاب "غازی علم الدین شہیدؒ" میں اس بات کو خاص طور پر اچھالا گیا ہے کہ علم الدین نے عدالت میں راجپال کے قتل سے انکار کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کتاب کی تقریب رونمائی سے خطاب کرتے ہوئے اداکار محمد علی نے کہا علم الدین شہیدؒ کا کردار فلموں میں بھی فلمایا گیا ہے اور ان میں یہی نعرہ لگایا جاتا رہا ہے اور ہم شروع سے سنتے بھی آرہے تھے کہ علم الدین شہیدؒ پکار کر کہتا ہے کہ راجپال کا قتل میں نے کیا ہے مگر آج کتاب سے معلوم ہوا ہے کہ اصل حقائق کیا تھے اور اکاون سال بعد شہید کا لفظ خطرے میں پڑ گیا ہے۔

حالانکہ بات فقط اس قدر ہے کہ اہل خانہ، احباب اور اعزا و اقربا کے کہنے سے آپ نے کٹہرے میں ایک طرح قتل سے واقعی انکار کر دیا تھا، مگر جس روز فیصلہ صادر کیا جانے والا تھا اور مسٹر سلیم ایڈووکیٹ اپنے دلائل و قانونی مباحث سے فارغ ہو چکے تو اس کے تھوڑی دیر بعد لیکن

فیصلہ سنائے جانے سے کچھ دیر قبل آپ کھڑے ہو گئے اور باآواز بلند کہا:

"جناب! گستاخ نبی، راجپال کو میں نے ہی قتل کیا ہے میں پہلا بیان دینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اب میں حقیقت حال واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کوئی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے یہ پہلو ذہن نشین رکھئے گا۔"

نہ صرف یہ بلکہ جب واصل بحق ہونے میں ایک گھڑی باقی تھی تو پھر بھی آپ نے تختہ دار پر کھڑے ہو کر فرمایا:

"حاضرین! بلاشبہ شاتم رسول کا قاتل میں ہوں۔ میں نے ہی اسے جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر قتل کیا۔ اب سب میرے کلمہ کے گواہ رہو۔"

تاہم ایک بار سہی لیکن سیشن کورٹ میں انحراف کرنا ان کے مقام و مرتبہ کے خلاف تھا۔ مگر اس کا ازالہ تو انہوں نے اس عدالت میں ہی قبل از فیصلہ کر دیا تھا۔



ایک لحاظ سے یہ بات درست ہے کہ اس مقدمہ قتل میں قائداعظم نے قانونی پیروی کے لئے فیس وصول کی تھی لیکن اس کے پس منظر میں کچھ باتیں بالکل نئی، دلچسپ، حیران کن اور بے بہا تاریخی متاع ہیں۔

غازی علم الدین شہید کے مقدمہ قتل میں قائداعظم سے رابطہ فتح محمد شیر فروش نے بمبئی میں کیا تھا۔ اس سے متعلق غازی صاحب کے ورثاء کے ساتھ ان کی خط و کتابت بھی ہوئی۔ یہ ٹائپ شدہ خطوط جن پر مسٹر محمد علی جناح نے دستخط ثبت کئے تھے، اب تک محفوظ ہیں۔ ہائی کورٹ میں پیروی کے لئے ان کا انتخاب، شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے مشورے سے ہوا تھا۔ المختصر ایم اے جناح ایڈووکیٹ نے "علم الدین ڈیفینس کمیٹی" سے کہا کہ وہ ساڑھے سات ہزار روپے (۷۵۰۰) پیشگی جمع کروائیں۔ سو ایسا ہوا۔ چونکہ ان کی ایک ہی پیشی کی نوبت آئی تھی، لہٰذا انہوں نے معاہدہ کے مطابق پندرہ سو روپے (۱۵۰۰) رکھ کر مبلغ چھ ہزار روپے (۶۰۰۰) ڈیفینس کمیٹی کو لوٹا دیئے۔ اس دوران کسی اخباری نمائندے نے جناح صاحب پر اعتراض کیا کہ انہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے اسلام کے اس عظیم مقدمہ کی پیروی کے لئے فیس وصول کی ہے جو کہ باعث شرم ہے۔ موصوف ابھی لاہور میں تھے۔ انہوں نے علم الدین ڈیفینس کمیٹی کے کارکنان و عہدیداران سے باتیں کرتے ہوئے کہا:

"وکالت میرا پیشہ ہے اور فیس لینا میرا پیشہ وارانہ اخلاق! آپ مجھ سے کمیٹی کے لئے چندہ طلب کیجئے اور جتنا جی چاہے لیجئے۔ میں آپ کو خالی چیک دے دیتا ہوں، خود بھر لیجئے"۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ عوام نے جناح صاحب کے اس اقدام کو کبھی بھی نگاہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا اور اب بھی قائداعظم کے تمام تر احترام کے باوجود یہ بات سن کر اہل وطن کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آتی ہیں۔



چونکہ جناح صاحب کو ہائی کورٹ لاہور میں پیروئ مقدمہ کے لئے بلانے، مرافعے کی نوعیت معلوم کرنے اور فیس کے معاملات نمٹانے کے لئے باقاعدہ خط و کتابت ہوئی تھی لہٰذا ۱۹۴۴ء میں جب تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی اور ایم اے جناح ایڈووکیٹ قوم کے دلوں کی دھڑکن بن کر قائداعظم کے مقام و مرتبہ پر فائز ہو چکے تھے، میاں محمد دین (برادر شہید) سے دو آدمی ملنے آئے۔ ان میں سے ایک "پرتاب" اخبار کا رپورٹر تھا۔ انہوں نے قائداعظم کے لکھے ہوئے خطوط حاصل کرنا چاہے اور معاوضے کی پیشکش بھی کی۔ غازی علم الدینؒ کے بھتیجے شیخ رشید احمد نے مجھے بتایا کہ میں ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور یہ بات میری موجودگی میں ہوئی۔ والد صاحب نے ٹال مٹول کرتے ہوئے کہا کہ میں ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔ یہ بات کسی طرح سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو معلوم ہوئی تو وہ چند دن بعد ہمارے گھر تشریف لائے۔ انہوں نے کہا:

"میاں صاحب! آپ ان خطوط کو ضائع کر دیں مگر انہیں مت دینا۔ اس سے مسلمان قوم کو زبردست نقصان ہو سکتا ہے"۔

اس واقعہ کے راوی شیخ رشید احمد صاحب ہیں۔ سید عطاء اللہ بخاری، مجلس احرار کے بانی و قائد، قیام پاکستان کے سخت مخالف، مسلم لیگ کے زبردست حریف اور قائداعظم کے نکتہ چین تھے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی عزت و وقار کا خیال رکھنا اور ہندوؤں کی چالبازیوں سے محفوظ رہنے کی تاکید کرنا ان کے عظمت کردار اور بڑا آدمی ہونے کی ایک دلیل ہے۔



فلمی اداکار محمد علی نے نگینہ صاحب کی کتاب کے حوالے سے تبصرہ کیا تھا اور کتاب کے

بارے میں مصنف کے یہ الفاظ بجائے خود ایک تبصرہ ہیں جو انہوں نے فلمساز حیدر صاحب کو لکھے تھے:

''آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ آپ کی فلم ''غازی علم الدین شہیدؒ'' دیکھ کر ہی میں نے تاریخ کے اس عظیم الشان باب پر اپنی تصنیف ''غازی علم الدین شہید'' مرتب کی تھی۔''



جب عاشق رسول غازی علم الدین جام شہادت نوش فرما چکے تو مسلمانوں میں کچھ ایسے خام طبع لوگ بھی موجود تھے جن کا موقف تھا کہ علم الدین کو شہید نہیں کہا جاسکتا۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ ابتدائے شہادت میں ہزاروں پروانے روز و شب غازی صاحب علم الدین شہید کی قبر کی زیارت کے لئے میانی صاحب جایا کرتے۔ اس دوران بعض متعصب افراد نے فتویٰ دیا: لوگ وہاں مرادیں مانگتے جاتے ہیں اور یہ شرک ہے۔ کچھ نے کہا: عورتیں اور اوباش قسم کے مرد یہاں برائی کی نیت سے جمع ہوتے ہیں۔

ایک بار ایسے ہی مزاج کے کوئی لوگ حکیم الامت ڈاکٹر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: آج کل یہ موضوع گرم ہے کہ علم الدین کو شہید کہا جاسکتا ہے کہ نہیں؟ کیونکہ شہید وہ ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں مارا جائے جبکہ علم الدین تو رسول پاک ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لئے مارا گیا۔ یہ بات سن کر علامہ صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور فرمایا:

علم الدین تو رسول اللہ ﷺ کی راہ میں مارا گیا ہے، آئندہ جو شخص علم الدین کی عزت و ناموس کا تحفظ کرتے ہوئے مارا جائے میرے خیال میں تو وہ بھی شہید ہوگا۔



اسی موضوع پر سید حبیب شاہ صاحب نے روزنامہ ''سیاست'' لاہور میں ایک مفصل مضمون لکھا، جس میں ایک واقعہ بھی قلمبند کیا گیا تھا کہ سکھ بھی آپ کو شہید سمجھتے ہیں۔ شہید

رسالت کی آخری آرام گاہ پر روح کو جلا ملتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ لوگ وہاں جائیں اور ان کی سوئی ہوئی دینی غیرت بھی تڑپ اٹھے۔



فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جو لوگ انگریز کے غلام تھے ہمارے آقا بن بیٹھے۔ جن کی وفاداریاں برطانوی حکومت سے استوار تھیں قیام پاکستان کے بعد وہی تاج و تخت کے وارث ہوئے۔ جو سفید چمڑی والوں کے اشارہ ابرو پر ہمارے مستقبل سے کھیلتے رہے، معرکہ خاک و خون کے فوراً بعد ہم پر مسلط ہو گئے، چرخ نیلی فام کی گردش انسان کو آغوش حیرت میں سلا دیتی ہے کہ گلستان کی تزئین و آرائش میں جن کا خون شامل ہوتا ہے، بہار آنے پر وہ نظاروں سے محروم رہتے ہیں اور چمن کو اجاڑنے والے فصل بہار میں مزے لوٹتے نظر آتے ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال غازی علم الدین کی اسیری کے دنوں میں سامنے آئی۔ ملک فیروز خان نون اس وقت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے چہیتے ممبر تھے۔ میاں طالع مندان کے پاس گئے اور اپنا تعارف کروایا۔ اس پر وہ بڑی سرعت رفتاری کے ساتھ جوتیاں پہنے بغیر آپ کو دفتر سے باہر لے آئے اور کہا: دیکھیں کوئی دیکھنے نہ پائے۔ اگر انگریز کو علم ہو گیا تو مجھ پر عتاب کی بجلیاں گریں گی۔ اس رویہ سے شہید کے والد محترم مایوس و ناکام لوٹ آئے۔



انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قوم، شہیدان ناموس رسالت ﷺ کو صحیح مقام نہیں دے سکی۔ پاکستان میں ان کا جو احترام ہونا چاہئے تھا ہنوز نہیں ہے۔ ہندوستان میں اب بھی ''راجپال ڈے'' منایا جاتا ہے، لیکن یہاں ایسے جذبے کی کوئی مثال نہیں۔ ۱۹۷۴ء کے آخر میں وزارت مذہبی امور اسلام آباد کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ غازی علم الدین شہید کے پرانے مزار کی جگہ ان کی عظمت کے شایان شان مزار تعمیر کیا جائے گا۔ عوام نے اس اعلان کا جوش و خروش سے خیر مقدم کیا تھا مگر یہ منصوبہ تاحال معرض التوا میں ہے اور ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔



شدھی تحریک کا بانی سوامی شردھانند، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں نازیبا باتیں کرتا تھا۔ غازی عبدالرشید شہید نے اسے فنا فی النار کر دیا تو جہاں مسلم عوام کی ہمدردی اور

جذباتی وابستگی حضرت قبلہ غازی صاحب کے ساتھ تھی، وہاں بعض مذہبی اور سیاسی لیڈروں کے دل گستاخ رسول، شردھا نند کے ساتھ دھڑکتے تھے۔ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیت العلماء ہند نے غازی عبدالرشید کی سزائے موت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انہیں مخبوط الحواس اور بے وقوف گردانا تھا۔



مفتی کفایت اللہ دہلوی صاحب ایک قدم مزید آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے غازی عبدالرشید شہید کے لئے فتویٰ دیا کہ وہ جنت سے محروم ہے۔ انہوں نے کہا:
''کافر معاہد کا قاتل، جنت کی بو بھی نہیں سونگھے گا''۔
سوامی شردھا نند کے واصل فی النار ہونے کے قریباً دو ماہ بعد خلافت کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۲۶، ۲۷، ۲۸ فروری کی صدارت کرتے ہوئے سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون نے ہندوؤں اور ان کے لیڈر شردھا نند (شدھی تحریک کا بانی) کے ساتھ اپنی محبت جتلاتے ہوئے، غازی عبدالرشید کے اقدام قتل پر اظہار تاسف کیا اور کہا تھا:

> ''سوامی شردھا نند کے قتل کے واقعہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور ناانصافی کی خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ جس طرح اس قتل کا ہونا بیان کیا ہے، وہ بہت ہی افسوس ناک ہے اور ہم مسلم پریس اور مسلم لیڈر اس واقعہ پر افسوس کر چکے ہیں اور مجھے بھی ہندو بھائیوں کے ساتھ اس صدمہ میں دلی ہمدردی ہے۔''



اب کے کچھ بیان داستان محبت کے ارقام کی راہ میں مشکلات کا بھی ہو جانا چاہیئے۔ راقم الحروف کو ان لوگوں کے پاس بھی جانا پڑا۔ جنہوں نے تمسخر اڑایا۔ بعض جگہ تو عزت نفس بری طرح مجروح ہوئی۔ تاہم یہ روداد دلچسپ ضرور ہے۔
شہید عشق رسول غازی علم الدین شہیدؒ کے جذبۂ قربانی اور جرأت وشہادت پر کام شروع کیا تو آپ کے حقیقی بھتیجے شیخ رشید احمد صاحب سے ملاقاتیں ٹھہریں۔ بعض نشستیں تو از حد طویل ہوتی تھیں۔ میں جمعہ کے روز اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا۔ اس کے باوجود مجھے حصول مقصد کے لئے لمبی مدت انتظار کرنا پڑا۔ ان کا رویہ مشفقانہ تھا مگر لہجہ نہایت محتاط! میں وعدے

کے مطابق کوچۂ چابکسواراں پہنچتا۔ لیکن گھر پر موجود نہ ہوتے اور کبھی کسی سرکاری دورے پر تیاری میں مصروف پائے جاتے۔ ایک دو دفعہ ان کی طبعیت ناساز تھی۔ کبھی دیگر مسائل کا سامنا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وقت کم ہونے کے باعث وہ خاندانی دستاویزات کو نہ کھنگال سکے۔ بے وفا لوگوں کے قصے سنانے کے بعد صبح آنے کو کہتے اور کبھی شام کو۔ میں گاؤں سے پہنچتا اور کبھی ہفتوں لاہور میں ہی اٹکا رہتا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے بڑی حد تک محروم تمنا رہنا پڑا۔ مجھے شہید عشق رسول کی ایک نایاب حقیقی تصویر کہیں سے میسر آئی تھی۔ میں انہیں بھی شریک مسرت کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے دیکھی، پکڑی اور فائل میں رکھتے ہوئے کہا:

''میں اس کی کاپی بنوالوں، دو چار دن تک لوٹا دوں گا۔''

یہ یکم نومبر ۱۹۸۲ء کی بات ہے اور وہ ''دو چار دن'' ابھی تک نہیں آئے۔ بعد ازاں بتایا گیا کہ تصویر کسی طرح سے ضائع ہوگئی ہے جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ حضرت قبل غازی صاحب کے فوٹو کی عدم دستیابی سے مجھے آج بھی اذیت محسوس ہو رہی ہے۔



راقم الحروف، عجائب گھر لائبریری لاہور میں 'انقلاب۔ سیاست۔ زمیندار۔ الجمعیۃ۔ شہباز اور احسان کے فائل دیکھ رہا تھا کہ ایک جگہ شمع رسالت ﷺ کے پروانہ ''غازی محمد صدیق شہیدؒ'' کا خوبصورت نام آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر گیا۔ تلاش و جستجو اور محبت و دیوانگی قصور میں لے گئی۔ دن بھر ڈھونڈا۔ پرندے تھک ہار کر جب گھونسلوں کو جا رہے تھے۔ بمشکل اس وقت مقبرہ شہید کا سراغ مل سکا اور شہید موصوف کے چھوٹے بھائی کو جاننے والے ایک صاحب کا موہوم سا پتہ بھی۔ ان کی وساطت سے بیڈن روڈ کنسرن الیکٹرک کارپوریشن پر حاضری دی اور محمد شفیع طاہر (ایم ایس طاہر) کا معلوم کیا۔ استفسار پر وجۂ دریافت بتائی۔ جانے کیوں جواب میں جھڑکیاں اور تلخیاں ملیں۔ خدا معلوم انہیں مجھ سے چڑ تھی یا شہید عشق رسول سے دوری۔ جب مایوسی کا سایہ بڑھنے لگا تو چند ہفتے بعد ادھر سے گزرتے ہوئے قسمت آزمائی کے لئے ایک بار پھر دکان میں داخلہ ہوا۔ اب کے خوش نصیبی سے ایک اور صاحب ملے، جنہوں نے کمال شفقت سے ایم ایس طاہر صاحب کا ٹیلی فون نمبر عطا فرما دیا۔ جب موصوف کی قربت حاصل ہوئی تو سب دکھ درد بھول گئے۔



ایک روز اپنے مخلص کرم فرما کے ساتھ میں ضلع ہزارہ کے ایک دور افتادہ قصبے ''غازی'' میں جا دھمکا۔ یہی مقام غازی عبدالقیوم شہید کا مولد و مسکن ہے۔ جنہوں نے ۱۹۳۵ء کو کراچی میں اپنی غیرت مندی کا تاریخی اور ولولہ انگیز ثبوت دیا تھا اور راہ حق میں شہید ہوئے۔ آپ کے ایک سن رسیدہ بھتیجے سے ملاقات ممکن ہوئی۔ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر حق نواز خان صاحب۔ ہاتھ میں تسبیح، باریش اور ماتھے پر محراب۔ سلام دعا، مرحلۂ تعارف اور آمد کا سبب؟ ہماری گفتگو ملاحظہ کیجئے!

میں: اس سے نوجوانانِ ملت کے سینے میں جرأت ایمانی پیدا ہوگی۔

وہ: (زیرلب تبسم) عبدالقیوم ایک اوباش (استغفراللہ) لڑکا تھا۔ جوئے میں طاق اور لڑائی جھگڑے میں آگے۔ اس نے غصہ میں ایک ہندو کو قتل کر دیا تھا اور بس۔!

میں: آپ نے کبھی ان کے مزار پر حاضری دی؟

وہ: مجھے مزار اور صاحب مزار۔ سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میں: آپ نے ''ضرب کلیم'' میں شہید رسالت سے متعلق علامہ اقبال کی نظم بعنوان ''لاہور و کراچی'' پڑھ رکھی ہے؟

وہ: نہ پڑھی ہے نہ پڑھنا چاہوں گا۔ ''وہ'' یونہی لکھتا رہتا تھا۔

میں: خدارا کچھ تو بتائیں۔

وہ: ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ کراچی والوں سے جا کر پوچھیں۔

میں: اپنے خاندان اور علاقائی حالات سے متعلق کچھ کہیے؟

وہ: (طویل خاموشی اور اخبار کا مطالعہ)

''عزیز من! آیئے، میں آپ کو بتاتا ہوں''...... یہ بزرگ، شہید موصوف کے ضرب تقسیم سے رشتہ دار اور رفیق کار تھے، عرفان صاحب۔ انہوں نے کہا:

> ''اس علاقے میں مولانا اسماعیل دہلوی صاحب کی تعلیمات کا اثر عام ہے اور یہ اثر ہمارے گھروں تک بھی پہنچ چکا۔ اکثر لوگ ایسے ہی خشک مزاج اور روحانیت سے بے بہرہ ہیں۔ ان کو فقط بے حضور امام اور بے سرور نماز سے غرض ہے۔ رسول خدا ﷺ کی یاد میں خود تڑپنا اور نہ ہی آپ کی یاد میں تڑپنے والوں سے کوئی لگاؤ۔ حضرت صاحب پکے اور خالص ''موحد'' ہیں۔ ان کے بقول ان کے: ''عبدالقیوم ایک بے وقوف نوجوان تھا، جو طیش

میں بلاوجہ اپنی جان پر کھیل اور زندگی سے گزر گیا۔ یہ پڑھے لکھے ہیں اور میں قریب قریب ناخواندہ۔ تاہم ان سے آپ کو کوئی تعاون نہیں مل سکے گا۔ میں آپ کو تفصیلات بتاتا ہوں۔"

^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^

دو قومی نظریے کا پس منظر

''میں نے ایک ملاقات میں جناح صاحب سے پوچھا کہ سب سے پہلے پاکستان کا تصور آپ کے ذہن میں کب پیدا ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ۱۹۳۰ء میں''۔

یہ بات ایولن رنچ، ایک انگریز مصنف نے اپنی کتاب "IMMORTAL YEARS" (لافانی سال) میں لکھی ہے۔ اتفاق سے اسی برس علامہ اقبالؒ نے بھی خطبہ آلہ آباد میں تصور پاکستان پیش کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم کی پوری سیاسی زندگی کے تجربات واحساسات کا نچوڑ ایک بیان ہے، جو انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ہزاروں افراد کے روبرو فرمایا تھا:

''میں نے اسلامی تاریخ و قانون کا بغور مطالعہ کیا ہے جس سے مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ہندو و مسلم اتحاد ممکن ہے نہ قابل عمل''۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جب ۱۹۲۶ء میں غازی عبدالرشید نے دہلی میں شان رسالت ﷺ میں گستاخی کے مرتکب، سوامی شردھانند کو اس کی ہرزہ سرائیوں کے باعث واصل فی النار کیا تو بہت سے ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ حالات کہیں نیا رخ اختیار نہ کر جائیں۔ آگے چل کر ۱۹۲۹ء میں لاہور کی سرزمین پر ایک تاریخی واقعہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی راستے بھی جدا جدا ہو گئے، جب راجپال کے بدنام رسالے کے متعلق عدالتوں میں کوئی تسلی بخش فیصلہ نہ ہو سکا اور غازی علم الدین شہیدؒ نے اس کمینہ فطرت کا کام تمام کر دیا۔ قائداعظمؒ اس مقدمے کی پیروی کے لئے علامہ اقبال کی تائید و تحریک پر لاہور تشریف لائے۔ اس سفر کے دوران انہیں نہ صرف پنجاب کے لیڈروں سے ملاقات کا موقع ملا، بلکہ دونوں قوموں کے درمیان پھیلی ہوئی مذہبی منافرت اور اس کے پس منظر کا علم بھی ہوا۔

یہ جولائی ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ آپ کے موکل یعنی ملتِ اسلامیہ کے ہیرو کی پھانسی کی سزا بحال رہی، لیکن بمبئی سے لاہور آنے والا یہ عظیم قانون دان اب پوری قوم کی آزادی و بقا کا مقدمہ لڑنے پر کمر بستہ ہو گیا۔ ان کی باریک بین نگاہیں اور خدا داد بصیرت، مستقبل کا ادراک پا

چکی تھیں۔ دو تین ماہ کے غور و تدبر اور تاریخی مطالعہ سے ان کے گوشۂ ذہن میں ایک علیحدہ اسلامی مملکت کا نقش ابھر آیا جو آہستہ آہستہ پختہ ہوتا گیا۔ اقبال مرحوم کی فلسفیانہ نگاہ برصغیر پاک و ہند میں رونما ہونے والے حالات و واقعات سے بیگانہ نہیں رہ سکتی تھی۔ ان کا خطبہ الہ آباد انہی خیالات کے سمندر کا مدو جزر اور مختلف النوع افکار کے اتار چڑھاؤ کا ماحصل ہے۔

شہیدانِ ناموس رسالت کے فکر و عمل کی اہمیت حضرت علامہ محمد اقبال کے اس مکتوب سے بھی اجاگر ہوتی ہے جو انہوں نے مسٹر محمد علی جناح کو ۲۱ جون ۱۹۳۷ء، بصیغۂ خاص لکھا۔ آپ کا یہ خط نہایت طویل ہے۔ اس میں بین الاقوامی سیاست اور خصوصاً برصغیر پاک و ہند کے حالات پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ ایک مقام پر علامہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ سا قائم ہو چکا ہے۔ صرف شمال مغربی ہند میں ان تین ماہ میں کم از کم تین فرقہ ورانہ فسادات رونما ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسول کی کم از کم چار وارداتیں پیش آ چکی ہیں۔ توہین رسول کی ان چار وارداتوں میں ہر مجرم فی النار کر دیا گیا۔ سندھ میں قرآن کریم نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ صورت حال کا نظر غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان حالات کے اسباب مذہبی ہیں نہ معاشی، بلکہ خالص سیاسی ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی ہندو اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کر دینا ہے''۔



غازی علم الدین شہیدؒ کی میت کا حصول ایک ایسی ایمان افروز جدوجہد تھی جس نے پوری قوم کا زاویہ نگاہ بدل کر رکھ دیا۔ اس سے متاثر ہو کر حضرت علامہ اقبال نے سوچا کہ ''علم الدین شہیدؒ کمیٹی'' کے پرچم تلے جو کارکن اور اخبار نویس اکٹھے ہوئے ہیں ان کی قوتوں کو اس طرح بروئے کار لایا جائے کہ وہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں مددگار ہو سکیں، بالخصوص مسلمانان پنجاب کے حقوق کی حفاظت کے لئے۔ چنانچہ انہی کے مشورے سے کارکنوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا اور چھپن فیصد کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا نصب العین یہ تھا کہ

پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فیصد ہے، اس لئے انہیں تمام جمہوری اداروں میں چھپن فیصد نیابت دلائی جائے۔ اس تحریک نے فوراً عوامی رنگ لے لیا۔ ہر طرف چھپن فیصد کا غلغلہ ہوا۔ علامہ صاحب اس میں براہ راست تو شریک نہیں تھے لیکن پس پردہ رہنمائی کرتے رہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۔ نومبر کے اخبار میں ملک لال دین قیصر کے نام اپیل شائع کی گئی تھی۔ اب اس کے دوسرے دن ہی ''انقلاب'' کی ایک خبر جو جلی حروف میں شائع ہوئی اس کی چند سرخیاں یہ ہیں:...... ''کانگریس کو مسلمانوں کا آخری الٹی میٹم'' ...... ''لاہور میں حفاظت حقوق کی مہم شروع ہوگئی'' ...... ''علم الدین کمیٹی کے مجاہدوں کا نیا میدان عمل'' ...... ''چھپن فیصد کمیٹی اور کور کا قیام۔'' ۱۹۔ نومبر کی شام کو عبدالمجید سالک کے زیر صدارت دفتر ''انقلاب'' میں جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں مسلمانوں کے جملہ حقوق کے لئے قربانی پر آمادہ رہنے کا حلف اٹھایا گیا اور حفاظت حقوق کے لئے ''چھپن فیصد کمیٹی'' کی مجلس عاملہ تشکیل دی گئی جس کے ارکان درج ذیل تھے سید عبدالقادر پروفیسر اسلامیہ کالج، ملک لال دین قیصر، شیخ غلام مصطفیٰ حیرت، ملک عبدالمجید ایڈیٹر مسلم آؤٹ لک، عبدالمجید قرشی، محمد دین تاثیر، پروفیسر اسلامیہ کالج، شمس الدین حسن ایڈیٹر خاور، میر عزیز الرحمٰن اور مسٹر امام علی نازش رضوی۔

اس جماعت کا دفتر کوچہ چابکسواراں میں قائم کیا گیا۔ شیخ غلام مصطفیٰ حیرت ان دنوں کوچہ چابکسواراں میں رہتے تھے اور ملک لال دین قیصر بھی قریب ہی کوچہ ککے زئیاں میں رہائش پذیر تھے۔ شیخ غلام مصطفیٰ حیرت کی یہ بیٹھک اس زمانے میں شعر و سیاست سے دلچسپی رکھنے والے باغی قسم کے نوجوانوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ شیخ غلام مصطفیٰ حیرت، مشن سکول کے سامنے مسجد فضل الٰہی کے نیچے سٹیشنری کی دکان کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی یہ دکان، ان نوجوانوں کا مرکز ہوتی اور شام کو اندرون کوچہ چابکسواراں میں ان کی بیٹھک میں یہ سب نوجوان جمع ہوتے تھے۔ اسی بیٹھک سے اپنے وقت کا مشہور ادبی ماہنامہ ''فردوس'' جاری ہوا۔ اس سلسلے میں انکار نہیں کہ چھپن فیصد حقوق کمیٹی کی سرگرمیاں چند روز کے اندر ہی سرد پڑ گئیں اور کارکن اس تحریک میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ لیکن یہ چند روز کی تحریک نئے دور کا پہلا باب ثابت ہوئی۔ اس کے فوراً بعد مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا۔ گو مجلس احرار نے الگ اسلامی ریاست کی تشکیل میں کوئی دلچسپی نہ لی، البتہ آزادیٔ ہند کی تحریک میں ان کا کردار یادگار رہے گا۔

راجپال ایجی ٹیشن کے دوران میں کوچہ چابکسواراں کے منشی احمد دین نامی نے ایک پمفلٹ ''امان اللہ کو کافر کہنے والا خود کافر ہے'' لکھا۔ یہ افغانستان کے غازی امان اللہ خان سے متعلق تھا۔ اسے خدمت کمیٹی کے رضا کار میاں نیاز احمد اور میاں محمد دین مختلف جگھوں پر چوری چھپے تقسیم کیا کرتے۔ غازی علم الدین کی شہادت کے بعد ان کی سرگرمیاں مزید بڑھ گئیں۔ پمفلٹ اور ایسے دیگر اشتہارات سے انگریز کو خاصی چڑ تھی اور پریشانی رفع کرنے کی لئے یہ لٹریچر تقسیم کرنے والوں کی گرفتاری کے لئے خصوصی ٹیمیں مقرر کی گئیں۔ اس کے باوجود رضا کاروں نے ایک مدت تک حکومت کا ناک میں دم کئے رکھا۔

غازی علم الدین شہیدؒ کی شجاعت وجواں مردی سے علیحدگی پسند اور انگریز و ہندو دشمن مجاہدوں کی ایک وافر تعداد پیدا ہوگئی۔ بلکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو مترشح ہوگا کہ تحریک تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ اور غازیان دین وملت کی جاں فشانیوں سے پورے برصغیر میں افق سیاست پر انمٹ اثرات مرتب ہوئے۔ راجپال ایجی ٹیشن اور غازی علم الدین کی شہادت سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہندو و مسلم کسی ایک ملک میں امن وامان سے نہیں رہ سکتے۔ حصول نعش کی جدوجہد سے سیاست کا پانسہ بالکل الٹ گیا۔ ذی اثر اربابِ سیاست کا اندازِ فکر اسی دوران میں بدلا اور بہت سے مسلم اکابرین، کانگریس اور دیگر جماعتوں کو خیر باد کہنے لگے۔ ان واقعات سے جنم لینے والا علیحدگی کا جذبہ ہی دوقومی نظریئے کی روح ہے۔



اگر پاک و ہند کی تاریخ پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو ایک بات جو ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس دن ہی ہندوؤں سے ذہنی طور پر علیحدگی اختیار کر لی تھی جس دن پہلی بار آریہ سماج کے موسس سوامی دیانند سرسوتی نے پیغمبر اسلام ﷺ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس تناظر میں کئی اور ناقابل تردید ثبوت اور حیرت انگیز حوالے بھی بہم پہنچتے ہیں۔

مسلم کشی کی ترغیب سوامی دیانند سرسوتی کے ناپاک عزائم کی ابتدا تھی۔ ایک اشارے پر پورے ہندوستان میں مذہبی فسادات کے دروازے کھل گئے۔ ۱۳۔ جنوری ۱۹۲۵ء کے روزنامہ ''ملاپ'' میں ایک متعصب ہندو رہنما کا بیان چھپا:

> ''پس اگر ہندوستان کو کبھی آزادی ملی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کی شدھی اور افغانستان کی فتح وغیرہ کے آدرش بھی

پورے ہو جائیں گے“۔

دسمبر ۱۹۳۶ء کے ”طلوع اسلام“ میں کانگریس پارٹی (بنگال) کے رہنما ڈاکٹر رادھا مکر جی کی ایک تقریر کا اقتباس شائع ہوا۔ مذکور نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس لاہور کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

”ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہئے جس کا کلچر ہندو جس کا مذہب ہندو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو“۔

۵۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو روزنامہ ’آریہ مسافر‘ کے اداریئے میں لکھا گیا:

”ملکی اور مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کو ویدک دھرم اور ویدک تہذیب کے نزدیک لانا از حد ضروری ہے۔ جب تک مسلمان سرزمین حجاز کے عاشق ہیں، عرب کی سرزمین اور کھجوروں پر جان نثار کرتے ہیں اور زمزم کو گنگا پر ترجیح دیتے ہیں، وہ ہندوستان سے محبت نہیں کر سکتے۔ اس لئے ملک میں ایک قوم پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم ویدک دھرم کا پیغام جلد از جلد ان تک پہنچائیں“۔

روزنامہ ’پرتاپ‘ میں واضح طور پر لکھ دیا گیا تھا کہ اس ملک میں حکومت عددی اکثریت پر موقوف ہے۔ اسی لئے شدھی کی تحریک ہندوؤں کے لئے موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ مسلمان ایک حقیر اقلیت سے سات کروڑ کی تعداد تک پہنچ چکے ہیں۔ عیسائی چالیس لاکھ ہیں اور ملک کے بائیس کروڑ ہندو ان کی وجہ سے بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر ان کی تعداد یونہی بڑھتی رہی تو نہ جانے کیا حشر ہوگا۔ شدھی کی تحریک بنیادی طور پر مذہبی تحریک ہے۔ مگر اس کے دوسرے مضمرات نے تمام ہندوؤں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے مذہب میں قبول کر لیں۔

ہندو پریس اپنی قوم کو بڑی شدومد کے ساتھ ترغیب دے رہا تھا کہ جس طرح انگلستان انگریزوں کا ہے۔ فرانس فرانسیسیوں کا اور جرمنی جرمنوں کا۔ اسی طرح ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ اگر ہندو منظم ہو جائیں تو وہ انگریزوں اور ان کے پٹھو مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں۔ ہندوؤں کو اپنی دنیا آپ پیدا کرنی ہے، جو شدھی اور سنگھٹن کے سہارے پروان چڑھے گی۔

ہندو احیا کے حامی و داعی اخبار ”ینگ انڈیا“ کے ایک آرٹیکل میں لکھا گیا:

''مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا وہ لوگ جو ہم میں سے تھے اور اب ہم سے الگ ہو چکے ہیں۔ اگر ہمیں اپنا وقار قائم رکھنا ہے تو ہمیں صرف تین طریقے اختیار کرنا پڑیں گے:

۱...... مسلمانوں کو اسلام سے الگ کر کے ان کے پرانے دھرم پر واپس لایا جائے۔

۲...... اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان لوگوں کو ہندوستان میں رعایا بنا کر رکھا جائے۔

۳...... اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو ان کے اپنے قدیم علاقے میں واپس بھیج دیا جائے''

ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے ایک کتاب "THE REAL HINDU ISM" لکھی تھی۔ اس میں ویدوں کی روح پیش کرنے اور اصل ہندو عقیدہ پیش کرنے کی سعی کی گئی۔ کتاب میں سوامی دیانند کا وہ بیان بھی شامل ہے جو مذکور نے بستر مرگ سے جاری کیا کہ مسلمان اپنی حدوں کو عبور کرتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اے ہندوؤ! کب تک غفلت کی نیند میں کروٹیں لیتے رہو گے۔''

سوتری دیوی نے ۱۹۳۹ء میں ایک کتاب "A WARNING TO INDIA" میں لکھا تھا کہ جب میں بنگال میں کسی داڑھی والے کو ایک خاص لباس اور ترکی ٹوپی سجائے دیکھتی ہوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ شکلیں تو قاہرہ اور بغداد میں پائی جانی چاہئیں۔ یہاں کہاں وارد ہوئیں!

۱۹۴۴ء میں ایک اور کتاب "CAST AND OUT CAST" منظر عام پر آئی۔ مصنف کا نام J.E.SANJANA ہے۔ سنجانا نے مشہور کانگریسی لیڈر کے۔ ایم۔ منشی کی زبان سے نقل کیا ہے کہ ہم ہندوؤں نے اپنے برہمنوں کی عنایت سے مسلمان بادشاہوں کو بھی اچھوت ہی جانا اور ان کے حق میں بھی تمدنی عدم تعاون جاری رکھا۔ دن بادشاہ کے دربار میں گزار کے جب ہمارے بزرگ گھر پہنچتے تھے تو بدن کو پوتر کرنے والا اشنان فرماتے تھے۔

پروفیسر بلراج مدھوک نے مارچ ۱۹۴۶ء میں اپنی کتاب "HINDUSTAN ON THE CROSS ROAD" جو لاہور سے شائع ہوئی میں لکھا تھا:

''ہندوستان تو مذاہب و ادیان کی ری پبلک ہے۔ یہاں تعصب نام کی کوئی شے نہیں۔ یہ ہندو و مسلم مناقشہ آناً فاناً ختم ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان چاہیں۔ بڑا بے ضرر نسخہ ہے جس میں مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ انہیں چاہیے کہ غیر ہندی نام نہ رکھیں۔ غیر ہندی یعنی باہر کی زبانیں چھوڑ دیں۔ غیر ہندی تمدن ترک کر دیں۔ غیر ہندی اکابر اور ہیروز کو

آئیڈیل نہ بنائیں بلکہ فقط ہندوستان کے ہندو بہادروں کو اپنا تاریخی اثاثہ جانیں۔ اگر مسلمان یہ ذراسی بات مان لیں تو سارا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے''۔

پروفیسر مذکور نے اظہار افسوس کرتے ہوئے مزید لکھا تھا کہ جس طرح ہم نے مہاتما بدھ کا بت بنایا اور اس طرح ہندوؤں کے بتوں سے بدھ مت والوں کی نفرت دور کر کے آخر ان کو ہندومت میں ضم کر لیا، اسی طرح ہم نے حضرت محمد ﷺ کا بت کیوں نہ بنا کے مسجدوں کے سامنے اور مندروں کے مقابل رکھا؟ ہمیں ایک ہزار برس قبل یہ کوشش شروع کرنی چاہئے تھی۔ چلئے ابھی سے آغاز کر دیجئے تا کہ مسلمان حضرت محمد ﷺ کو پوجتے پوجتے ہمارے بتوں سے بھی محبت کرنے لگیں اور پھر بدھ مت کے ماننے والوں کی طرح ہم میں گم ہو جائیں۔ پھر اگر نیت یہ ہو کہ مسلمان قوم کو بے نشان کر کے چھوڑنا ہے تو وہاں مسلمان قوم کی مسجدوں کو کیوں آباد اور باقی رہنے دیا جائے؟ یہی کچھ سپین والوں نے کیا تھا۔ یہی کچھ مشرقی یورپ کے مسیحی روشن ضمیروں نے کیا تھا۔ یہی کچھ یہودی مسجد اقصیٰ کے ضمن میں کر رہے ہیں۔

ایک ہندو لیڈر کہا کرتا تھا:

''جب شدھی کے ذریعے تمام مسلمان ہندو ہو جائیں گے تو ہماری آزادی کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی''

بعض وجوہات کی بنا پر اس سے متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ شدھی تحریک کی یہ کار گزاری ہندو عوام اور خواص دونوں کے لئے غیر تسلی بخش تھی۔ ان کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور شدھی کی بنیاد پر سنگھٹن کی عمارت اٹھائی گئی۔ اس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ سنگھٹن کا اصل قائد ڈاکٹر مونجے تھا۔ "HISTORY OF FREEDOM MOVEMENT" کے صفحہ ۲۵۷ تا ۲۶۱ پر اسی موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان تاریخی دستاویزات کے مطابق، ہندوؤں کو یہ احساس دلایا جاتا تھا کہ ۷۰ ملین مسلمان ۲۲۰ ملین ہندوؤں کے لئے شدید خطرہ ہیں اور مسلمانوں کی تعداد میں اتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ اگر وہ اسی رفتار سے بڑھتے رہے تو ساڑھے چار سو سال بعد ہندوستان میں ایک بھی ہندو نہ رہے گا۔ اس لئے ہندوؤں کو اپنا دفاع کرنے اور بقا کے لئے مسلح ہو جانا چاہئے۔

سنگھٹن کے تحت ایسے مراکز قائم کئے جاتے تھے جہاں ہندو نوجوانوں کو ورزش و کشتی کے

علاوہ جوڈو کراٹے اور لاٹھیوں اور خنجروں کا استعمال سکھایا جاتا تھا۔ اسی تنظیم کے کارکن ہندو مسلم فسادات کرواتے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پیش پیش رہتے۔ ایک موقع پر ڈاکٹر مونجے نے واضح الفاظ میں کہا تھا:

''تم اس وقت تک مسلمانوں کو ہندو بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے، جب تک کہ تم ثابت نہ کر دو کہ تمہارے جسموں میں جان ہے۔''

مسٹر گاندھی ایسے محبّ وطن ہندو لیڈر کا زاویہ نگاہ بھی دراصل نہایت متعصّبانہ تھا۔ اس طرز فکر کی ایک مثال ان کا وہ خط ہے جو ایک انگریز مسٹر ارون کے نام لکھا گیا۔ ازاں بعد اس کا عکس موقر جریدے ''اسٹیٹسمین'' میں بھی شائع ہوا۔

''غلط یا صحیح، گائے کی پوجا ہندو فطرت میں داخل ہے اور مجھ کو اس سے کوئی مفر نظر نہیں آتا کہ عیسائی اور مسلمان ایک طرف ہوں، ہندو دوسری طرف، اور ان کے درمیان اس مسئلے پر نہایت متعصّبانہ اور خونیں جنگ ہو......لیکن ہندوستان کے طول وعرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جس کو یہ توقع نہ ہو کہ وہ ایک دن اپنے ملک کو گاؤ کشی سے پاک کرے گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ہندو مذہب کے مزاج کے خلاف وہ اس سے بھی دریغ نہ کرے گا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کو بزور شمشیر گاؤ کشی کے ترک پر مجبور کرے گا''۔

ہر دیال سنگھ جو پہلی جنگ عظیم کے دوران غدر پارٹی کے قائدین میں سے تھا، ہندوستان پہنچا اور سنگھٹن میں زبردست دلچسپی لینے لگا۔ اس نے برملا کہہ دیا:

''ہندو سنگھٹن کا مقصد ہندوستان میں ایک مضبوط، طاقتور، متحدہ اور بیدار سیاسی جماعت کی تشکیل ہے جو ایک آزاد ہندو ریاست پر مبنی ہوگی۔ مثلاً سنسکرت و ہندی زبان، ہندو میلے، ہندو قومی لیڈروں کا احترام، ہندوؤں کے مقدس مقامات سے محبت اور ہندوؤں کی ثقافت سے لگاؤ وغیرہ''۔

موہن لعل بھٹنا گر نے لکھا:

''مسلمان اصحاب یاد رکھیں کہ گئو ہتیا کرنے سے شدھی رکے گی نہیں بلکہ زیادہ زور شور سے ہوگی۔ شدھی ہی ایک ایسا علاج ہے جس سے گئو ہتیا رک سکتی ہے۔ مسلمانوں نے خود ہی اندازہ لگایا ہے کہ دو کروڑ ایسے مسلمان ہیں جو ارتداد کی چوکھٹ پر کھڑے ہیں۔ اگر یہ سب شدھ ہوجائیں تو کیا گئو ہتیا بہت حد تک کم نہ ہوجائے گی؟ ہندو یقین رکھیں کہ شدھی سے ہی گاؤ کشی رکے گی یا یہی ان تمام دکھ دردوں کی دوا ہے۔ یہی ان کی مشکل کشا ہے۔''

شردھانند کا منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو جن کے باپ دادا ہندو تھے شدھ کر کے دوبارہ ہندو بنا لیا جائے۔ بنابریں مشہور کانگریسی لیڈر راج کمار ایس منٹھی نے کھلم کھلا اعلان کیا کہ بغیر شدھی کے ''ہندو مسلم اتحاد'' نہیں ہوسکتا۔ جس وقت سب مسلمان شدھی ہوکر ہندو ہوجائیں گے تو اس ہندوستان میں سب ہندو ہی ہندو ہوں گے۔

ایک مدت سے مسلمانوں کو غیر ملکی حملہ آور، ڈاکو، جرائم پیشہ اور ضرر رساں مخلوق قرار دیا جا رہا تھا۔ شردھانند کے بیٹے کا ایک اخبار ''ارجن'' اور دہلی سے ''تیج'' اور گورو گھنٹال وغیرہ بڑھ چڑھ کر اس آگ کو ہوا دے رہے تھے۔ اب انہوں نے عملی طور پر ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ ''پاکستان ناگزیر تھا'' میں ان واقعات کو بالتفصیل قلمبند کیا گیا ہے۔

''۱۹۲۲ء میں محرم کے موقع پر سب سے پہلا بلوہ ملتان میں ہوا اور پھر بلوؤں کی بہار آگئی۔ دہلی، الہٰ آباد، لکھنو، ناگپور، جبل پور، شاہجہان پور اور کوہاٹ میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے۔ پھر سوامی شردھانند کے قتل کے بعد ان کی تعداد بڑھی اور یو پی میں دس بلوئے ہوئے۔ بمبئی میں چھ، پنجاب، سی پی، بنگال، بہار اور دہلی میں دو دو دو......
لارڈ اروِن نے ۲۹۔ اگست ۱۹۲۷ء کو مرکزی مجلس واضعان قانون کے مشترکہ اجلاس میں جو ایڈریس دیا اس میں ان بلوؤں کا خصوصیت سے ذکر تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اٹھارہ مہینے سے کم مدت کے اندر اِن بلوؤں میں ۲۵۰ آدمی قتل اور ۲۵۰۰ زخمی ہوئے۔ ڈاکٹر امبید کر نے ۱۹۲۰ء سے

۱۹۴۰ء تک کے بلووں کا اپنی کتاب موسومہ ''پاکستان'' میں مفصل ذکر کیا ہے اور ان کے نزدیک یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی تھی۔ صوبہ بمبئی میں فروری ۱۹۲۹ء سے اپریل ۱۹۳۸ء تک مسلسل ۲۱۰ روز ہنگامے ہوتے رہے۔ ان میں ۵۶۰ آدمی قتل اور ۴۵۰۰ زخمی ہوئے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کانپور کا ہنگامہ ہوا جس میں کم سے کم ۵۰۰ آدمی ہلاک ہوئے''۔

ایک اور جگہ مرقوم ہے:

''............مسلمانوں کی محرومیاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ پھر اس فوج (ہندوؤں) نے دو فیصلہ کن حملے کئے۔ ایک جان و مال پر، دوسرا دین و مذہب پر۔ فساد روزمرہ کا معمول ہو گیا اور گاہے گاہے دل آزار کتابیں بھی شائع ہونے لگیں......قرار داد پاکستان کی مخالفت نے شدت اختیار کر لی۔ ہندو مہاسبھا کے صدر ساورکر نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ پاکستان ہندوؤں کے لئے خودکشی کے مترادف ہے۔ ہندوستان کی وحدت اگر قائم رہ سکتی ہے تو ہندوؤں کی عسکری تنظیم کے بل پر اور انہی کے زور بازو پر......''

ہندو مہاسبھا کا ایک اور اجلاس ہوا۔ اس کی کارروائی یکم جنوری ۱۹۴۴ء کے اخبار میں یوں چھپی: ''پاکستان کے زہر کا تریاق یہ ہے کہ ہر نو مسلم کو دوبارہ ہندو بنا لیا جائے اور باقی مسلمانوں کی شدھی کر دی جائے۔ اگر یہ کام ہو گیا تو پھر پاکستان کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ اس جوش اور ولولے کے کئی نام ہیں۔ یہ نام ہم قافیہ تو نہیں مگر ہم وزن ضرور ہیں۔ کل یہ شردھانند، مونجے اور ساورکر کہلاتا تھا، آج اسے ٹنڈن اور مکرجی کہتے ہیں۔ کل اسے مدھوک اور گوالکر کہا جائے گا۔ سچ ہی تو کہتے ہیں کہ ہندو مذہب میں آواگون برحق ہے''۔



یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دوقومی نظریئے کی بنیاد ام الکتاب قرآن حکیم سے پڑی جبکہ

تقسیم ہند کا سب سے بڑا سبب گمراہ کن رسالہ 'سیتارتھ پرکاش' ہے۔ اس کتاب کے اثر سے آریہ سماج نے جنم لیا۔ شدھی اور سنگھٹن جیسی تنظمیں اسی کا حصہ تھیں۔ لاہور سے شائع ہونے والا، رسوائے عالم رسالہ ''رنگیلا رسول'' اس قدر زہر آلود تھا کہ ۱۲۔ اگست ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مولانا محمد علی جوہر نے 'ہندوستان ٹائمز' کے نمائندہ سے صوبہ سرحد میں تنازعۂ ہندو مسلم کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر راجپال ہائی کورٹ سے بری ہونے کے بعد معذرت شائع نہ کرتا یعنی اس کتاب کو چھاپنے کا وہ دوبارہ مرتکب ہوتا تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا۔

بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ شہیدانِ ناموسِ رسالت کی قربانیوں سے برصغیر کی فضائے سیاست پر دور رس اثرات مرتب ہوئے اور انہی اسباب و واقعات کو دیکھ کر دوقومی نظریئے کا عقیدہ نہ صرف مستحکم ہوا بلکہ مسلمانان ہند نے علیحدہ وطن کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں۔

روزنامہ 'انقلاب' لاہور نے ۱۹۔ نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک اداریہ سپرد قلم کیا، جس میں ''علم الدین شہیدؒ کمیٹی'' کی بہادری، جواں مردی کی تعریف کی گئی، ملک لال دین قیصر اور ان کے رفقا کی خدمات کو سراہا گیا۔ اس اداریئے کا عنوان تھا ''ملک لال دین قیصر سے خطاب، شہید علم الدین کی میت ایک اہم سبق۔'' چنانچہ اداریئے میں لکھا تھا:

> ''آج ہم انتہائی دل سوزی کے ساتھ قیصر اور ان کے رفقاء سے عرض کرتے ہیں کہ وہ ملت اسلامیہ ہند کے زہرہ گداز مصائب پر بھی توجہ مبذول فرمائیں۔ مسلمان افتراق سے دوچار ہو چکے ہیں۔ فرقہ بندی میں اپنی حکومت کھو چکے ہیں۔ ان کی تعداد کم نہیں۔ ان میں ہمت و جرأت کا فقدان نہیں۔ ان میں قربانیوں کا جوش و خروش موجود ہے مگر ان کی ساری قوتیں خانہ جنگی میں ضائع ہو رہی ہیں۔ وقت نازک ہے۔ حالات اضطراب انگیز ہیں۔ ہندو متحد اور قدم قدم پر فائدے اٹھا رہے ہیں لیکن مسلمان متفرق و منتشر ہیں اور ہر جگہ نقصان و خسران سے تباہ ہو رہے ہیں۔ گاندھی جی جو خود حریت حقہ سے بے بہرہ ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس کی دعویداری، حریت مالویہ کی حکومت پرستی سے قطعاً شرمسار نہیں ہوتی۔ وہ مالویہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں اور اس کی تعریف میں۔ رطب اللسان ہیں۔ موتی نہرو، جواہر لال نہرو، سری

نواس آئنگر اور تمام دوسرے ہندوؤں کی یہی حالت ہے۔ مگر مسلمانوں کا کوئی ابوالکلام کسی محمد علی سے ملنے کے لئے تیار نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابو الکلام اور انصاری بھی تباہ حال ہیں اور ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے پر جی رہے ہیں اور محمد علی، اقبال اور سر شفیع کی تمام مساعی بھی بے نتیجہ اور بے اثر ہیں۔ کیا کوئی اللہ کا بندہ ان دردانگیز حالات کی درستی کے لئے اٹھے گا''

آریہ سماجی تحریک کے پس منظر میں دراصل مذہبی جوش وجنون کا سخت ہنگامہ تھا۔ علاوہ ازیں اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں بابوموہن رائے نے معاشرتی اور مذہبی اصلاحات کے پیش نگاہ کام شروع کیا۔ اس سے برہموسماج پیدا ہوا۔ بابوموہن رائے کے بعد کیشب چند رائے نے اس کو اور آگے بڑھایا۔ نہ صرف یہ بلکہ بنگال کی طرح ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسی تحریکوں نے زور پکڑا۔ مثلاً پونا میں پرارتھنا سماج، اس کے لیڈر ایم جی راناڈے تھے۔

انتہا پسند ہندو تنظیموں اور شاتمانِ نبی نے خانہ کعبہ پر آریائی جھنڈا لہرانے اور گنبد خضرا کو (نعوذ باللہ) گرانے کی بات بھی کی۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ہند سے باہر نکال دیں بلکہ ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے مکہ ومدینہ تک جائیں گے اور اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹادیں گے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا نہ صرف جغرافیہ بلکہ تاریخ بھی جدا ہے۔ عقائد مختلف، نظریات الگ، تہذیب علیحدہ، انداز معاشرت منفرد اور زاویۂ فکر میں فرق۔ ہمارے ہیرو ان کے دشمن اور ان کے دشمن ہمارے دوست۔ آقا ومولا صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ راجپال اور رام گوپال جیسے یاوہ گو ہندوؤں کے لیڈر اور ان کے برعکس ملتِ اسلامیہ ان مجاہدوں سے نسبت غلامی رکھتی ہے، جنہوں نے شاتمانِ نبی کی ناپاک وغلیظ زبانیں کاٹ دیں۔

حکیم الامت علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت اور مومنانہ فراست کا ہلکا سا اشارہ اس خطاب سے بھی ملتا ہے جو آپ نے مولانا آزاد وغیرہ کی ترکِ موالات کی حمایت پر مبنی تقاریر کے رد میں ۲۱۔ نومبر ۱۹۲۰ء کو انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں فرمایا تھا۔ درویش لاہوری نے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے رپورٹ پیش فرمائی اور مندرجہ ذیل محتاط الفاظ میں اظہار خیال کیا:

''میں ہمیشہ ہر معاملہ کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور جب

تک کسی امر میں پورا پورا غور و خوض نہیں کر لیتا قطعی رائے قائم نہیں کرتا۔ میں مسلمانوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ آج شریعت کے احکام پر نہ چلے تو ہندوستان میں ان کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے بالکل تباہ ہو جائے گی''۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی، دینی غیرت اور عشق رسول ﷺ کی وجہ سے کسی طور بھی ہندوؤں سے اتحاد کے حامی نہ تھے۔ ان کو ہرگز یہ برداشت نہیں تھا کہ رسول عربی ﷺ کے نام لیوا آپ ﷺ کی حرمت و توقیر کے دشمنوں سے مل بیٹھیں۔ ان کے متعلق ممتاز صحافی اور صوفی دانشور میاں عبدالرشید، کالم نگار ''نورِ بصیرت'' (روزنامہ نوائے وقت لاہور) نے اعتراف حقیقت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''گاندھی کی آندھی نے جو خاک اڑائی تھی اس میں بڑے بڑوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور بینائی زائل ہو گئی مگر علامہ اقبال اور قائداعظم کے علاوہ تیسری بڑی شخصیت جو اس شور و غوغا اور ہلڑ بازی سے قطعاً متاثر نہ ہوئی حضرت احمد رضا خان تھے۔ آپ نے ان دنوں بھی اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ انگریز اور ہندو دونوں ہمارے دشمن ہیں۔

کانگریسی مسلمانوں نے صرف اپنی ایک آنکھ کھلی رکھی تھی۔ وہ صرف انگریز کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ان دنوں چونکہ سارے پریس پر ہندوؤں یا ہندو نوازوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے حضرت احمد رضا خان بریلوی اور آپ کے ہم خیال لوگوں کے خلاف سخت پروپیگنڈہ کیا گیا اور بدنام کرنے کی مہم چلائی گئی''۔

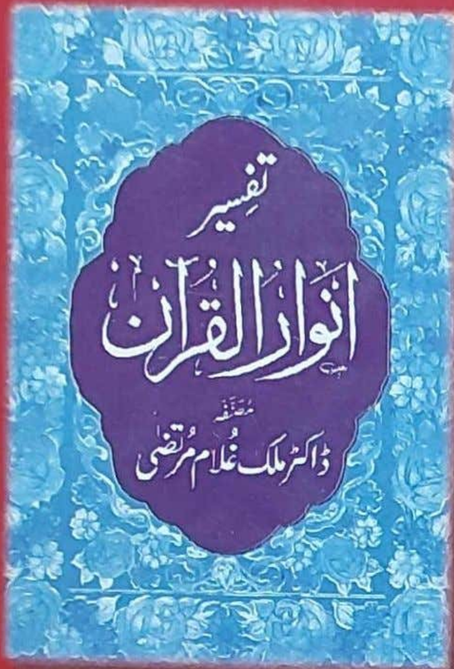
ہندو رہنما اور آریہ سماجی لیڈر مذہبی تحریکوں کے پردے میں سیاسی جنگ لڑ رہے تھے۔ واقعات کا تسلسل شاہد ہے کہ قاضی عبدالرشیدؒ دہلوی کی شہادت سے دوقومی نظریہ کی اہمیت اجاگر ہوئی۔ غازی علم الدین شہیدؒ کی موت مسلمانانِ ہند کی زندگی کا آغاز ہے۔ غازی عبدالقیوم شہیدؒ کے لہو سے اقبال مرحوم نے پاکستان کی تصویر میں رنگ بھرا۔ غازی میاں محمد شہیدؒ غازی مرید حسین شہیدؒ، غازی عبدالرشید شہیدؒ، غازی امیر احمد شہیدؒ اور غازی محمد حنیف شہیدؒ وغیرہ کی ایمانی

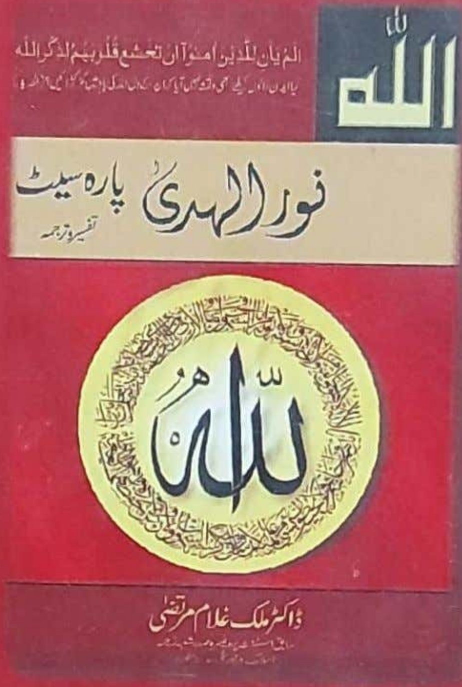
جرأت اس نظریاتی مملکت کی اساس ٹھہری! مگر افسوس کہ ہم نے آزادی کے اصل پس منظر کو حوالہ غفلت کر رکھا ہے۔ میرا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ آزادی کی غیر مترقبہ نعمت ہمیں شہدائے رسالت کے طفیل ملی اور پاکستان اُن کے قطرہ ہائے خون کا صلہ ہے۔

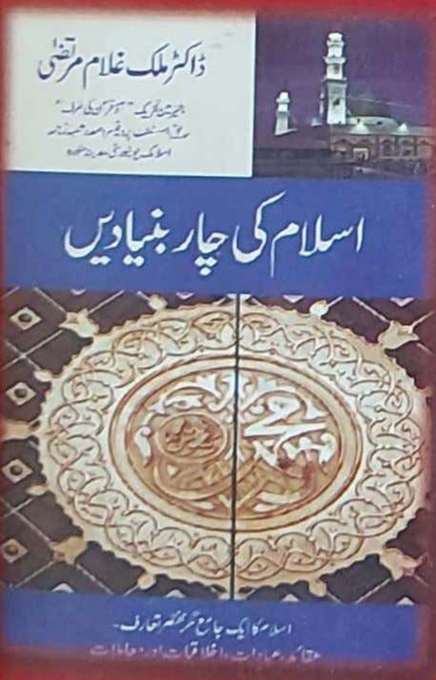
یہ بات بحوالہ ۱۹۳۰ء، ایک انگریز مصنف کے چونکا دینے والے انکشاف سے شروع ہوئی تھی۔ غازی علم الدینؒ کی شہادت اور ہندو مسلم مذہبی منافرت کی وجہ سے قائداعظم کے ذہن میں علیحدہ اسلامی ملک کا جو ابتدائی تصور پیدا ہوا وہ دھیرے دھیرے پختہ ہوتا چلا گیا اور بالآخر شہیدانِ رسالت کی والہانہ شیفتگی وسعی جمیلہ سے یہ معاملہ نوشتہ تقدیر بن گیا اور یوں علامہ اقبال کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

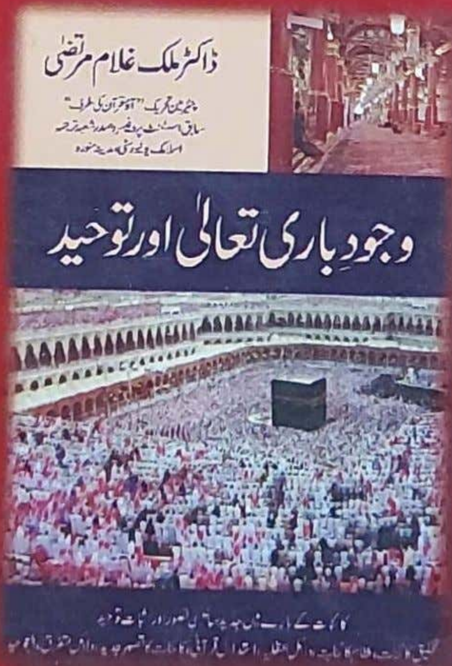
AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

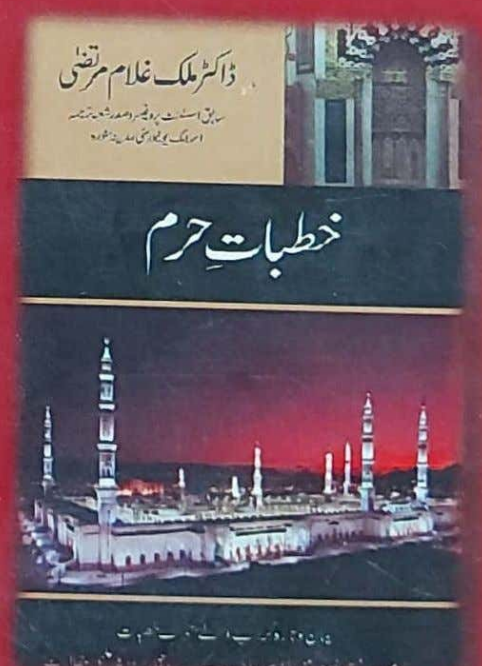
ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ کی کتب













جہانگیر بک ڈپو

اُردو بازار، لاہور۔ فون: 042-7220879
اقبال روڈ، راولپنڈی۔ فون: 051-5552929
بوہڑ گیٹ، ملتان۔ فون: 061-781781
اُردو بازار، کراچی۔ فون: 021-2765086
نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر رسالہ روڈ۔ حیدر آباد